اورینٹل کالج میگزین

جلد ۵۰ : عدد ۱، ۲، ۳، ۴

شمارہ مسلسل : ۱۹۶، ۱۹۷، ۱۹۸، ۱۹۹

۱۹۷۴ء

خصوصی شمارہ بتقریب جشن صد سالہ تاسیس اورینٹل کالج لاہور

مدیر

ڈاکٹر عبادت بریلوی

پرنسپل یونیورسٹی اورینٹل کالج، لاہور

مجلس ادارت

ناشر :

ڈاکٹر محمد بشیر حسین، یونیورسٹی اورینٹل کالج، لاہور

مطبع :

پنجاب یونیورسٹی پریس، لاہور

بسم الله الرحمن الرحیم
نحمده و نصلی علی رسوله الکریم

سید هجویر مخدوم امم
مرقد او پیر سنجر را حرم

خاک پنجاب از دم او زنده گشت
صبح ما از مهر او تابنده گشت

دکتر علامه محمد اقبال مرحوم

فہرستِ مضامین

فہرست مضامین

پہلا اجلاس
(افتتاحی)

دوسرا اجلاس
(اوریئنٹل کالج کی ادبی خدمات)

تیسرا اجلاس

(اسلامی علوم اور عربی زبان و ادب)

چوتھا اجلاس

(ایران اور فارسی زبان و ادب)

پانچواں اجلاس

(اردو زبان و ادب و ثقافت اسلامیان پاکستان و هند)

فہرست تصاویر

جشن صد سالہ کے مناظر

۴ - سنڈیکیٹ روم میں چائے

۵ - ڈاکٹر عبادت بریلوی غیر ملکی مندوبین کے ساتھ

۶ - ڈاکٹر جلال متینی (مشہد یونیورسٹی) اور ڈاکٹر عبادت بریلوی

۷ - پروفیسر مجتبی مینوی ، پروفیسر ناصر الدین شاہ حسینی اور آقای منو چہر ظلی سفیر کبیر شہنشاہ آریامہر

۸ - پروفیسر ڈاکٹر جلال متینی (مشہد) ایک اجلاس میں تقریر کر رہے ہیں

۹ - ڈاکٹر عبادت بریلوی، آقای پروفیسر مجتبی مینوی، پروفیسر جلال متینی، ڈاکٹر ناصر الدین شاہ حسینی اور سفیر کبیر ایران آقای منو چہر ظلی

۱۰ - ڈاکٹر عبادت بریلوی، جسٹس ایس۔اے رحمان، پروفیسر مجتبی مینوی، ڈاکٹر مظاہر مصفا اور ڈاکٹر ناصرالدین شاہ حسینی

۱۱ - جسٹس۔ ایس ۔ اے۔ رحمان اور ڈاکٹر عبادت بریلوی غیر ملکی مہمانوں کے ساتھ ایک عصرانے میں

۱۲ - ڈاکٹر عبادت بریلوی، پروفیسر مجتبی مینوی، پروفیسر جلال متینی، پروفیسر شاہ حسینی اور آقای منو چہر ظلی، سفیر کبیر ایران

۱۳ - ڈاکٹر مظاہر مصفا، ڈاکٹر عبادت بریلوی، پروفیسر مجتبی مینوی، پروفیسر صوفی تبسم اور دوسرے مندوبین

۱۴ - استاد مجتبی مینوی، پروفیسر جلال متینی، ڈاکٹر مظاہر مصفا اور خانم مصفا

۱۵ - پروفیسر ممتاز حسین، ڈاکٹر فرمان فتحپوری، پروفیسر رالف رسل اور پروفیسر حمید احمد خاں

۱۶ - پروفیسر رالف رسل، ڈاکٹر عبادت بریلوی اور ڈاکٹر غلام مصطفے خاں

۱۷ - مندوبین

۱۸ - کانگریس میں شرکت کرنے والے مندوبین

۱۹ - پروفیسر عبدالقادر کرہ خان (استنبول، ترکی)

۲۰ - ڈاکٹر عبادت بریلوی، پروفیسر وصی اللہ سمیعی، اور ڈاکٹر عبدالشکور احسن

۲۱ - الوادعی عشائیہ منجانب پنجاب یونیورسٹی

پیش لفظ

پیش لفظ

اللہ تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ اورینٹل کالج کا جشن صد سالہ بخیر و خوبی انجام پایا اور اس موقع پر ماہرین علوم مشرقی کی جو کانگرس ترتیب دی گئی تھی، وہ توقع سے کہیں زیادہ کامیاب رہی ۔ دنیا کے تقریباً تمام اہم ممالک کی یونیورسٹیوں اور تحقیقی اداروں کے نمائندے اس میں شریک ہوئے اور اس طرح دنیا کے ہر ملک نے اورینٹل کالج اور اس کی ادبی خدمات کو خراج عقیدت پیش کیا ۔ جتنے مندوبین اس کانگرس کے مختلف اجلاسوں میں شرکت کرنے کے لیے آئے ان کے اخراجات یا تو ان کی حکومتوں نے ادا کیے، یا ان کی یونیورسٹیوں نے انھیں گرانٹ دی ۔ اورینٹل کالج اس تعاون کے لیے ان ممالک ، یونیورسٹیوں اور تحقیقی اداروں کا شکر گزار ہے جنھوں نے اس طرح اورینٹل کالج کے ساتھ تعاون کیا ۔ جو ادارے ان تقریبات میں کسی مجبوری کی وجہ سے شریک نہ ہو سکے، انھوں نے اس موقع کے لیے خصوصی پیغامات ارسال کیے اور جو مندوبین اس موقع پر تشریف لائے انھوں نے اپنے خاص موضوعات پر نہایت عالمانہ مقالے پڑھے ۔ ان سب کا شکریہ ادا کرنا بھی ہمارا خوشگوار فرض ہے ۔

اورینٹل کالج کے جشن صد سالہ کی یہ تقریبات اور اس موقع پر ہونے والی بین الاقوامی علوم مشرقی کی کانگرس اور تقریبات کا سلسلہ ۱۳ مارچ ۱۹۷۳ء سے ۱۷ مارچ ۱۹۷۳ء تک جاری رہا ۔ دن دن بھر نو بجے صبح سے لے کر پانچ بجے شام تک اس کے مختلف اجلاس ہوتے رہے

جن میں مہمان علما نے اپنے گراں قدر مقالے پڑھے ۔ ان مقالات کو بڑی توجہ سے سنا گیا ۔ پنجاب یونیورسٹی کے سینٹ ہال میں یہ اجلاس ہوئے اور صبح سے شام تک کیفیت یہ تھی کہ یہ ہال سامعین سے بھرا رہتا تھا۔ اور خاموشی کا یہ عالم تھا کہ سوائے معزز مقالہ نگار کے بیان کے کوئی اور آواز سنائی نہیں دیتی تھی ۔ یہ سب کچھ اللہ تعالٰی کے فضل و کرم سے ہوا ۔ غیبی مدد کے بغیر اس طرح کے کام انجام نہیں پاتے ۔ اس خاکسار نے انگلستان کے دوران قیام میں ماہرین علوم مشرقی کی کئی کانفرنسوں میں شرکت کی، جو سب اپنی اپنی جگہ اہم تھیں ۔ لیکن سامعین کی اتنی بڑی تعداد کہیں نظر نہیں آئی اور وہ مخصوص ماحول بھی نہیں دیکھا جو اوریئنٹل کالج کے جشن صد سالہ کی تقریبات کے سلسلے میں ہونے والی اس کانگرس کے اجلاسوں میں تھا۔

ان تقریبات کے موقع پر جو کچھ ہوا اس کی تفصیل اب اس روداد کی صورت میں پیش کی جا رہی ہے۔ اس موقع پر جو پروگرام ترتیب دیا گیا، وہ خطبات جو اہم شخصیتوں نے دیے اور وہ مقالے جو مختلف اجلاسوں میں پڑھے گئے، وہ سب اس میں یکجا کر دیے گئے ہیں۔ ایک رپورتاژ بھی اس میں شامل ہے جو ان تقریبات کی تفصیلات کو مکمل طور پر پیش کرتا ہے۔ وہ تصویریں جو اس موقع پر کھینچی گئیں، وہ بھی اس روداد کے ساتھ شامل کی جا رہی ہیں تاکہ ان تقریبات کی ایک مکمل تصویر سامنے آ جائے ۔

میں سب سے پہلے صدر پاکستان (اب وزیر اعظم، اسلامی جمہوریۂ پاکستان) جناب ذوالفقار علی بھٹو صاحب کا شکریہ ادا کرنا ضروری سمجھتا ہوں جنھوں نے اوریئنٹل کالج کے جشن صد سالہ کی تقریبات میں دلچسپی لی ۔ اس موقع پر انھوں نے اپنے گراں قدر پیغام سے اس خاکسار کو نوازا اور اس طرح اوریئنٹل کالج کی حوصلہ افزائی فرمائی۔ وفاقی حکومت پاکستان، حکومت پنجاب اور پنجاب یونیورسٹی نے بھی کالج کے جشن صد سالہ کی تقریبات منانے میں اوریئنٹل کالج کے ساتھ مکمل تعاون کیا جس کے لیے میں ان کا شکر گزار ہوں ۔

جناب مولانا کوثر نیازی صاحب، وزیر اطلاعات و نشریات و حج و اوقاف کا شکریہ ادا کرنا بھی میرا خوشگوار فرض ہے جو نیشنل اسمبلی کے اجلاس کے باوجود خاص طور پر اسلام آباد سے لاہور تشریف لائے اور اردو کے اجلاس میں ایک گراں قدر خطبہ بھی ارشاد فرمایا ۔ فیض صاحب کا شکریہ بھی ادا کرنا ضروری سمجھتا ہوں، جو میری درخواست پر اورینٹل کالج کے دوسرے اجلاس کی صدارت کے لئے اسلام آباد سے لاھور تشریف لائے اور صدارتی تقریر فرمائی ۔ ڈاکٹر محمد اجمل صاحب، وائس چانسلر، پنجاب یونیورسٹی (اب سکریٹری، تعلیمات حکومت پاکستان)، عزت مآب ڈاکٹر جسٹس ایس اے رحمان اور پروفیسر خواجہ صلاح الدین کا بھی شکر گزار ہوں جن کی رہنمائی اور تعاون کے بغیر یہ تقریبات کامیاب نہیں ہو سکتی تھیں۔ سفیر کبیر شہنشاہ آریا مہر، جناب آقای منوچہر ظلّی کا بھی میں خاص طور پر شکریہ ادا کرنا ضروری سمجھتا ہوں جنھوں نے از راہ نوازش اس خاکسار کی دعوت کو قبول فرمایا اور خاص طور بر فارسی زبان و ادب کے اجلاس کے افتتاح کے لیے اسلام آباد سے لاھور تشریف لائے اور نہایت گراں قدر خطبہ ارشاد فرمایا ۔

جشن صد سالہ اور اس موقع پر ہونے والی کانگریس کی اس روداد کی ترتیب و طباعت میں میرے تمام رفقاء نے میرے ساتھ تعاون کیا ۔ میں ان سب کا شکر گزار ہوں ۔ ڈاکٹر رانا احسان الہی، جناب سید وزیر الحسن عابدی، ڈاکٹر میاں بشیر حسین ، ڈاکٹر سید ناظر حسن زیدی، ڈاکٹر ظہور احمد اظہر، سید سجاد باقر رضوی، ڈاکٹر عبید اللہ خان، ڈاکٹر تبسم کاشمیری، ڈاکٹر آفتاب اصغر اور سہیل احمد خان صاحب خصوصیت کے ساتھ شکریے کے مستحق ھیں، جن کو میں نے بعض تحریروں کے ترجمہ کرنے اور پروف دیکھنے کی زحمت بھی دی ۔

عبادت بریلوی

۲۰ جنوری ۱۹۷۴

پیغامات



جناب ذوالفقار علی بھٹو، صدر پاکستان

مترجم : سید سجاد باقر رضوی

پیغام صدر پاکستان

مجھے یہ جان کر مسرت ہوئی ہے کہ پنجاب یونیورسٹی اورینٹل کالج لاہور ۱۲ مارچ ۱۹۷۳ء کو اپنا جشن صد سالہ منا رہا ہے اور اس موقع پر مستشرقین کی بین الاقوامی کانفرنس بھی منعقد ہوگی۔

یہ کالج برصغیر میں مشرقی زبانوں اور علوم کی سب سے قدیم درسگاہ ہے۔ اسے مشرق و مغرب کا سنگم بھی کہا جا سکتا ہے۔ اس ادارے سے ایسی عظیم شخصیتیں، مثلاً ڈاکٹر جی۔ ڈبلیو۔ لائٹنر، ڈاکٹر سٹرائن، ڈاکٹر آرنلڈ، سر آرل اسٹائن، ڈاکٹر وولنر، مولانا محمد حسین آزاد، مولانا فیض الحسن، علامہ اقبال اور ڈاکٹر شفیع وغیرہم وابستہ رہی ہیں، جنھوں نے جنوبی مشرقی ایشیا کے برصغیر اور وسطی ایشیا کی زبانوں میں ایسے تحقیقی کارنامے سر انجام دیئے ہیں جنھیں بین الاقوامی طور پر تسلیم کیا گیا ہے۔

پاکستان کی جدید تعلیمی پالیسی میں پاکستانی زبانوں اور ہم عصر قوموں کے علوم کے مطالعے پر بہت زیادہ زور دیا گیا ہے۔ مجھے اس بارے میں کوئی شک نہیں کہ اورینٹل کالج آنے والے دور میں پاکستان کی تعلیمی اور تہذیبی ترقی کے لئے زیادہ نمایاں خدمات سر انجام دے گا۔

میں مستشرقین کی اس بین الاقوامی کانفرنس میں حصہ لینے والے اساتذہ، ممتاز دانشوروں اور اورینٹل کالج کی اعلیٰ کارگزاریوں کے لئے دعا گو ہوں۔

ذوالفقار علی بھٹو
صدر، اسلامیہ جمہوریہ پاکستان

مترجم: دکتر آفتاب اصغر

پیام رئیس جمهوری پاکستان

این امر برای من موجب خوشحالی است که دانشکدهٔ خاور شناسی دانشگاه پنجاب، لاهور، روز دوازدهم مارس ۱۹۷۳ میلادی، صدمین سال تأسیس خود را جشن میگیرد و بدین مناسبت کنگره ای بین المللی خاورشناسان را تشکیل میسازد۔

این دانشکده در این منطقهٔ جهان، قدیمترین مؤسسه های زبانهای شرقی و خاور شناسی است و بحق میتوان آنرا نقطهٔ برخورد خاور و باختر نامید۔ بعضی از ستارگان درخشان آسمان دانش و ادب از قبیل دکتر جی، دبلیو لائتنر، دکتر آرنلد دکتر استراتن، سر ارل سٹائن دکتر وولنر، مولانا محمد حسین آزاد، مولانا فیض الحسن، علامه اقبال و دکتر محمد شفیع که در ادوار مختلف باین مؤسسه متعلق بوده اند، در تحقیقات و پژوهش های مربوط به زبانهای شبه قارهٔ جنوب شرقی آسیا و آسیای مرکزی پیشقدم بوده اند و تحقیقات آنان در این زمینه برسطح بین المللی برسمیت شناخته شده است۔

روش فرهنگی تازهٔ پاکستان به تدریس زبانهای پاکستانی و مطالعاتی در زمینهٔ فرهنگ جامعه های معاصر جهانی اکیداً اهمیت میدهد۔ تردیدی ندارم که دانشکده خاور شناسی در آتیهٔ نزدیک در پیشرفت آموزشی و فرهنگی پاکستان نقش مهمتری را ایفاء خواهد کرد۔

در پایان برای دانشکده، اعضای کادر آموزشی و دانشمندان ممتازی که در کنگرهٔ بین المللی خاور شناسان شرکت دارند، بهترین موفقیتها را خواستارم۔

ذوالفقار علی بهوتو
رئیس جمهوری پاکستان

پیغام تہنیت

اورینٹل کالج لاہور برصغیر کی علمی، تہذیبی اور ثقافتی زندگی میں سو برس کی شاندار خدمات سرانجام دے چکا ہے ۔ اس سلسلے میں منعقد ہونے والی صد سالہ تقریبات کے موقع پر میں پرنسپل صاحب، ان کے رفقا اور کارکنوں، نیز طلباء اور طالبات کو ہدیۂ تبریک پیش کرتا ہوں ۔

اس مرحلے پر ہم ان عظیم علمی شخصیتوں کو فراموش نہیں کرسکتے جن کی وابستگی اس ادارے کو دنیا میں ایک ممتاز مقام بخشنے کا باعث بنی ۔ جب ہم اس فہرست پر نظر ڈالتے ہیں تو ان میں ڈاکٹر وولنر، ڈاکٹر مولوی محمد شفیع، حافظ محمود شیرانی اور ڈاکٹر محمد اقبال کے علاوہ ترجمان حقیقت شاعر مشرق حضرت علامہ اقبال کا اسم گرامی بھی نظر آتا ہے ۔ ان رجال عظیم میں سے ہر فرد اپنی اپنی جگہ آسمان علم کا ایک درخشندہ ستارہ ہے ۔

اورینٹل کالج پچھلی صدی میں اس مرحلے میں معرض وجود میں آیا جب ملک میں رونما ہونے والی سیاسی تبدیلیوں کی بنا پر مشرقی علوم اور زبانیں زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا تھیں ۔ مغربی علوم اور زبانوں بالخصوص انگریزی کی جارحانہ پیش قدمی کے سامنے عربی، فارسی اور برصغیر کی دوسری زبانوں کا چراغ ٹمٹماتا ہوا نظر آ رہا تھا ۔ یہ زبانیں اپنے دامن میں مشرقی اقوام بالخصوص مسلمانوں کا ایک عظیم علمی اور تہذیبی ورثہ رکھتی تھیں ۔ آج سو برس گذرنے کے بعد یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ ان عظیم زبانوں کے تحفظ اور ترقی میں سب سے بڑا حصہ اورینٹل کالج کا ہے ۔ اس ادارے کی علمی کارکردگی اور روایات اتنی بلند ہیں کہ ان پر جتنا بھی فخر کیا جائے کم ہے ۔

میری دلی تمنا اور دعا ہے کہ اس ادارہ کا مستقبل ویسا ہی تابناک رہے جیسا کہ اس کا ماضی رہا ہے ۔

(مولانا کوثر نیازی)
وزیر اطلاعات و نشریات، اوقاف و حج،
حکومت پاکستان

مترجم : سید سجاد باقر رضوی

لندن یونیورسٹی

اسکول آف اورئینٹل اینڈ افریکن اسٹڈیز،
یونیورسٹی آف لندن

۳۰ نومبر ۱۹۷۲ء

میں اپنے ہم کاروں کی جانب سے، یونیورسٹی اورینٹل کالج کے، جو مشرقی علوم کی افزائش کے لئے سالہا سال سے اعلی خدمات سرانجام دیتا رہا ہے ، جشن صد سالہ کے مبارک موقع پر، آپ کو مبارک باد دیتا ہوں، ہمیں توقع ہے کہ آنے والے برسوں میں کالج توانا سے توانا تر ہوتا جائے گا۔

یہ بات عین مناسب ہے کہ کالج کے جشن کے سلسلے میں مستشرقین کی ایک بین الاقوامی مجلس بھی منعقد ہو، اور میں اس موقع پر اس مجلس کی کامیابی کے لئے دعاگو ہوں۔ مجھے اس کا افسوس ہے کہ میں شرکت نہ کر سکوں گا۔

(پروفیسر) سی ۔ ایچ ۔ فلپس
ڈائریکٹر

مترجم : سید سجاد باقر رضوی

آکسفورڈ یونیورسٹی

یونیورسٹی اورینٹل کالج کے جشن صد سالہ کے موقع پر، جو لاہور میں ۱۲ مارچ سے ۱۷ مارچ ۱۹۷۳ء تک منایا جا رہا ہے، آکسفورڈ یونیورسٹی، پروفیسر سراج الدین سابق رکن اکزیٹر کالج، اور ایم اے، بی لٹ (آکسفورڈ) کے ذریعہ اپنی نمائندگی پر مسرت کا اظہار کرتی ہے -

پروفیسر سراج الدین کے توسل سے آکسفورڈ یونیورسٹی کے چانسلر، اساتذہ اور دانشور، یونیورسٹی اورینٹل کالج لاہور کے پرنسپل، اراکین شعبہ جات اور طلباء کو اس تاریخی موقع پر مبارکباد دیتے ہیں اور پرخلوص خواہشات کا اظہار کرتے ہیں -

(جیوفرے کیسٹن)
رجسٹرار

۱۰ نومبر ۱۹۷۲ء

مترجم : سید سجاد باقر رضوی

کیمبرج یونیورسٹی

کیمبرج یونیورسٹی کے چانسلر، اساتذہ اور دانشور پنجاب یونیورسٹی اوریئنٹل کالج کے جشن صد سالہ میں نمایندگی حاصل کرنے پر فخر محسوس کرتے ہیں - پاکستان کے ساتھ اس یونیورسٹی کے قدیمی و قریبی تعلق کے پیش نظر ہم اپنے نمایندے رفیع محمد چودھری، ڈاکٹر آف فلاسفی، رکن فٹزولیم کالج، فیلو پاکستان سائنس اکیڈمی اور پنجاب یونیورسٹی میں طبیعیات کے اعزازی پروفیسر، کے ذریعے اس مبارک موقع پر ہدیہ مبارکباد پیش کرتے ہیں -

١

۷ دسمبر ۱۹۷۲ء

محترمی و مکرمی!

آپ کا گرامی نامہ مورخہ ۲۳ نومبر موصول ہوا۔ شکر گزار ہوں۔ مجھے یہ معلوم کر کے افتخار حاصل ہوا ہے کہ جناب نے ناچیز کی تحریر کی قدر دانی فرمائی کہ اس کو اس تاریخی کانفرنس کے افتتاحی اجلاس میں پڑھ کر سنایا جائے گا۔

اس کے علاوہ آپ نے جو مجھ پر حد سے زیادہ عنایتیں فرمائیں میں ان کا شکر گزار ہوں۔ ایک طرف اخراجات سفر کے سلسلے میں اشارہ، دوسری طرف ناچیز کے مقالے کو اس کی غیر حاضری کی صورت میں کانفرنس کے لئے پڑھوانے کے موقع کا عطا فرمانا۔ آپ کے کرم کے یہ نقوش اور تأثرات تادیر ذہن میں تازہ رہیں گے۔

ہزار افسوس کے ساتھ معذرت کرتا ہوں کہ آخرالامر میں حاضر نہیں ہو سکتا اور اگر گنجائش ہوئی تو اپنا مقالہ بعد میں چھپنے کے لئے بھجواؤں گا۔ افسوس اتنے کم وقت میں کانفرنس میں پڑھنے کے لئے کوئی چیز پیش نہیں کر سکتا۔

دعا ہے کہ کانفرنس توفیق الٰہی سے کامیاب ہو۔

آپ کا مخلص
کان کاگایا
ٹوکیو یونیورسٹی، جاپان
صدر شعبۂ ہند و پاک

پشاور

۱۰ مارچ ۱۹۷۳ء

مجھے یہ جان کر بے حد مسرت ہوئی کہ پنجاب یونیورسٹی اورینٹل کالج کا جشن صد سالہ ۱۲ مارچ سے ۱۷ مارچ ۱۹۷۳ء تک منایا جا رہا ہے ۔

پنجاب میں اورینٹل کالج کو پنجاب یونیورسٹی کے پیش رو کی حیثیت سے وہی شرف حاصل ہے جو پشاور یونیورسٹی کی تاریخ میں اسلامیہ کالج، پشاور کو حاصل ہوا ۔

اورینٹل کالج نے تدریس علوم و السنہ نیز تحقیق و تصنیف و اشاعت کا جو کام گذشتہ سو برس میں کیا اور قدیم و جدید اور مشرقی اور مغربی علوم کے سنگم کی حیثیت سے اس نے برصغیر کی تہذیب و ثقافت کی جس صحت مند روایت کی طرح ڈالی ہے، اس سے کوئی بھی ذی ہوش اور ذی علم انکار نہیں کر سکتا ۔

اورینٹل کالج نے علوم و تہذیب و ثقافت کو ایک لامحدود وسعت دی۔ علوم و فنون کو معیار اور فضیلت عطا کی اور جامعیت و حسن بخشا، اور بر صغیر میں ایسی شخصیتوں کو جنم دیا جنھوں نے ملک و ملت کا نام روشن کیا ۔ اس مادر علوم کی کارکردگی برصغیر کی تاریخ میں سنہری حروف سے لکھی جا چکی ہے ۔

میں اس مبارک موقع پر پنجاب یونیورسٹی اورینٹل کالج کو مبارک باد پیش کرتا ہوں کہ اس کے سرگرم کارکنوں نے اس صد سالہ جشن کے موقع پر ماہرین علوم شرقیہ کی ایک بین الاقوامی کانفرنس منعقد کر کے اس جشن کو ایک ایسے اجتماع کی صورت دے دی جس کی افادیت مسلّم اور جس کا علمی پہلو نمایاں ہے ۔

(عبدالهاشم)
وائس چانسلر
پشاور یونیورسٹی

۱۴ ستمبر ۱۹۷۳ء

مکرمی، سلام مسنون،

گرامی نامہ موصول ہوا - یاد آوری کا شکریہ، میں یونیورسٹی اوریئنٹل کالج کے جشن صد سالہ میں ضرور شریک ہوتا لیکن میں ایک ہفتہ کے بعد ہی انگلستان جا رہا ہوں اور کئی ماہ تک وہاں قیام پذیر رہوں گا۔ بدین وجہ شرکت سے معذور ہوں۔ انگلستان میں مصروفیات کی کچھ ایسی نوعیت ہوگی کہ مقالہ لکھنا ناممکن ہوگا۔ اس لئے مقالے کی وساطت سے بھی شریک نہیں ہو سکتا۔ مجھے افسوس ہے کہ اس قدر اہم صحبت میں شریک نہ ہو سکوں گا۔ میری دعا ہے کہ جشن کامیاب ہو اور کالج اپنی شاندار علمی خدمات کی روایات کو ہمیشہ قائم رکھ سکے۔ والسلام مع الاکرام -

مخلص

(ڈاکٹر) اشتیاق حسین قریشی

وائس چانسلر، کراچی یونیورسٹی

پروگرام

پروگرام

پیر ۱۲ مارچ ۱۹۷۳ء

۴ بجے سہ پہر

افتتاح

تلاوت کلام مجید	:	جناب قاری محمد ظریف
خطبۂ استقبالیہ	:	ڈاکٹر عبادت بریلوی، پرنسپل اورینٹل کالج، ڈین فیکلٹی آف اورینٹل اینڈ اسلامک لرننگ، سکریٹری جنرل
پیغامات	:	سکریٹری جنرل
خطبۂ استقبالیہ	:	ڈاکٹر محمد اجمل، وائس چانسلر، پنجاب یونیورسٹی، صدر مجلس استقبالیہ
خطبہ صدارت	:	ڈاکٹر جسٹس ایس اے رحمان، صدر جشن صد سالہ کمیٹی
خطبۂ افتتاحیہ	:	ملک معراج خالد، وزیر اعلیٰ حکومت پنجاب
شکریہ	:	ڈاکٹر عبادت بریلوی، سکریٹری جنرل
استقبالیہ	:	منجانب پنجاب یونیورسٹی
مقام	:	چمن بالمقابل یونیورسٹی ھال
وقت	:	۵ بجے سہ پہر
عشائیہ	:	منجانب پرنسپل اورینٹل کالج، ڈین فیکلٹی آف اورینٹل اینڈ اسلامک لرننگ، پنجاب یونیورسٹی
مقام	:	یونیورسٹی اورینٹل کالج، لاھور
وقت	:	۸ بجے شب

منگل ۱۳ مارچ ۱۹۷۳ء

۹ بجے صبح (چمن اورینٹل کالج)

نمائش : اورینٹل کالج کی علمی و ادبی خدمات

افتتاح : جناب ڈاکٹر عبدالخالق، وزیر تعلیم، حکومت پنجاب

۱۰ بجے صبح (سینٹ ہال)

پہلا اجلاس

مذاکرہ : اورینٹل کالج کی علمی و ادبی خدمات

افتتاح : جناب محمد حنیف رامے، وزیر خزانہ، حکومت پنجاب

صدر : پروفیسر حمید احمد خاں، سابق وائس چانسلر، پنجاب یونیورسٹی

مقالات

۱- پروفیسر شیخ عبدالرشید
۲- ڈاکٹر محمد حمید اللہ (پیرس)
۳- پروفیسر ڈاکٹر وحید مرزا
۴- پروفیسر ڈاکٹر عبدالحمید
۵- پروفیسر ڈاکٹر رضی واسطی
٦- پروفیسر ڈاکٹر سید محمد عبداللہ
۷- پروفیسر ڈاکٹر محمد باقر
۸- پروفیسر ڈاکٹر ابواللیث صدیقی (کراچی یونیورسٹی)
۹- پروفیسر سید وقار عظیم
۱۰- ڈاکٹر وزیر آغا
۱۱- ڈاکٹر وحید قریشی
۱۲- ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار
۱۳- ڈاکٹر ناظر حسن زیدی
۱۴- پروفیسر ڈاکٹر میاں عبدالشکور احسن

۱۵- سید وزیر الحسن عابدی
۱۶- ڈاکٹر رانا احسان الٰہی
۱۷- پروفیسر ڈاکٹر عبادت بریلوی

دوسرا اجلاس

۲ بجے بعد دوپہر

صدر : جناب فیض احمد فیض

مقالات

۱- شیخ محمد الفحام (الازہر)
۲- چودھری غلام رسول اظہر
۳- پروفیسر صوفی غلام مصطفیٰ تبسم
۴- احمد ندیم قاسمی
۵- ڈاکٹر غلام یسین خان نیازی
۶- خواجہ محمد اسلم
۷- پروفیسر جان ہے وڈ - ڈرہم (انگلستان)
۸- پروفیسر رالف رسل (لندن)
۹- پروفیسر ڈاکٹر عبدالقادر قراهان (استنبول، ترکیہ)
۱۰- پروفیسر خواجہ صلاح الدین
۱۱- پروفیسر محمد طاہر فاروقی (پشاور)
۱۲- آقا بیدار بخت خان
۱۳- پروفیسر علامہ علاء الدین صدیقی
۱۴- ڈاکٹر عبداللہ چغتائی
۱۵- مولانا عبدالقدوس
۱۶- حکیم نیر واسطی
۱۷- جناب عشرت رحمانی
۱۸- ڈاکٹر صابر علی خان
۱۹- پروفیسر صدیق کلیم
۲۰- محترمہ الطاف فاطمہ

۲۱- ملک بشیر الرحمٰن
۲۲- راحت افزا بخاری
۲۳- امجد اسلام امجد
۲۴- حسن رضوی
۲۵- مظفر عباس

چائے : ساڑھے پانچ بجے سہ پہر (چمن بالمقابل دفتر وائس چانسلر)
عشائیہ : منجانب یونائیٹڈ بنک لمیٹڈ، لاہور، وقت ۸ بجے شب

بدھ ۱۴ مارچ ۱۹۷۳ء

عربی زبان و ادب اور اسلامی علوم

پہلا اجلاس

۹ بجے صبح

افتتاح : سفیر مراکش
صدر : پروفیسر جے - ایم - ایس بالجان (لائیڈن، ہالینڈ)

مقالات

۱- ہزایکسیلنسی ڈاکٹر ایم - السادانی (مراکش)
۲- ڈاکٹر فاطمہ موسیٰ محمود (قاہرہ، مصر)
۳- ڈاکٹر جے - ڈڈلے وڈبری (ہارورڈ، امریکہ)
۴- پروفیسر جان ے وڈ (ڈرہم، انگلستان)
۵- شیخ محمد ناصر العبودی (مدینہ)
۶- ڈاکٹر پیر محمد حسن (راولپنڈی)
۷- ڈاکٹر رشید احمد (لاہور)
۸- ڈاکٹر عابد احمد علی (لاہور)
۹- ڈاکٹر مارا استیپانینس (سویٹ یونین)
۱۰- ڈاکٹر شیخ عنایت اللہ (لاہور)
۱۱- ڈاکٹر رانا ایم - این احسان الٰہی (لاہور)
۱۲- ڈاکٹر ایم ضیاء الحق صوفی (لاہور)

۱۳- مولانا عبدالقدوس (پشاور)
۱۴- ڈاکٹر رحمان ولی شاہ (اسلام آباد)
۱۵- ڈاکٹر امین اللہ وثیر (لاہور)

دوسرا اجلاس

۲ بجے بعد دوپہر

صدر : ہزایکسلینسی ڈاکٹر ایم السادانی (سفیر مراکش)

مقالات

۱- ڈاکٹر ایم - ایم - فہام (مصر)
۲- ڈاکٹر جے - ایم - ایس بالجان (لائیڈن، ہالینڈ)
۳- ڈاکٹر ایم خالد (مراکو)
۴- مس اسماء رشید (ملتان)
۵- پروفیسر عبدالمقصود شلقامی (قاہرہ، مصر)
۶- ڈاکٹر محمد زینی (جدہ)
۷- ڈاکٹر ایس - ایم یوسف (کراچی)
۸- مولانا عبدالصمد صارم
۹- پروفیسر عبدالقیوم
۱۰- ڈاکٹر ہالی پوتہ (سندھ، حیدرآباد)
۱۱- ڈاکٹر میر ولی خان (پشاور)
۱۲- مسٹر محمد یحیی
۱۳- سید محمد کبیر احمد مظہر
۱۴- پروفیسر غلام احمد حریری (لائل پور)
۱۵- مس زرینہ کاردار (بہاولپور)
۱۶- ڈاکٹر مس زبیدہ صدیقی
۱۷- مولانا نورالحسن خان
۱۸- حافظ محمد طفیل (اسلام آباد)

چائے : پانچ بجے سہ پہر (چمن بالمقابل دفتر وائس چانسلر)
عشائیہ : منجانب خانہ فرہنگ ایران، ۶- مین گلبرگ، لاہور
وقت : ۸ بجے شب

جمعرات ۱۵ مارچ ۱۹۷۳ء

فارسی زبان و ادب اور ایرانی ثقافت

پہلا اجلاس

افتتاح : سفیر کبیر شاہنشاہ آریا مہر ہزایکسیلنسی آقای منوچہر ظلی

صدر : پروفیسر دکتر مجتبی مینوی

دکتر سید ناصر الدین شاہ حسینی (تہران، ایران)

مقالات

۱- پروفیسر دکتر جلال متینی (مشہد، ایران)
۲- پروفیسر ولی اللہ سمیعی (کابل، افغانستان)
۳- پروفیسر مہدی محقق (تہران، ایران)
۴- پروفیسر عبدالحسن مشکاۃ الدینی (مشہد، ایران)
۵- ڈاکٹر احمد علی پناہی (تہران، ایران)
۶- ڈاکٹر سید محمد عبداللہ (لاہور)
۷- ڈاکٹر محمد باقر (لاہور)
۸- پروفیسر ڈاکٹر عبدالشکور احسن
۹- سید وزیر الحسن عابدی
۱۰- ڈاکٹر سید محمد اکرم شاہ

دوسرا اجلاس

۲ بجے بعد دوپہر

صدر : پروفیسر ولی اللہ سمیعی (کابل، افغانستان)

مقالات

۱- پروفیسر ناصر الدین شاہ حسینی (تہران، ایران)
۲- پروفیسر سعید افغانی (کابل)
۳- پروفیسر دکتر عبدالقادر قراہان (استنبول، ترکیہ)
۴- پروفیسر دکترضیاء الدین سجادی (تہران)
۵- ڈاکٹر غلام مصطفی خان (حیدر آباد، سندھ)

۶- پروفیسر صوفی غلام مصطفی تبسم
۷- ڈاکٹر عابد علی خاں (کراچی)
۸- ڈاکٹر کے- بی- نسیم (پشاور)
۹- ڈاکٹر میاں محمد بشیر حسین (لاہور)
۱۰- ڈاکٹر آغا یمین خاں (لاہور)
۱۱- ڈاکٹر آفتاب اصغر (لاہور)

چائے : ساڑھے چار بجے سہ پہر (چمن بالمقابل دفتر وائس چانسلر)
عشائیہ : منجانب پیکیجز لمیٹڈ، فیروز پور روڈ، لاہور
وقت : ۸ بجے شب

جمعہ ۱۶ مارچ ۱۹۷۳ء

اردو زبان و ادب اور تاریخ و ثقافت مسلمانان ہند و پاکستان

پہلا اجلاس

۹ بجے صبح

افتتاح : مولانا کوثر نیازی (وزیر اطلاعات و نشریات، حج و اوقاف حکومت پاکستان)
صدر : پروفیسر رالف رسل (اسکول آف اوریئنٹل اینڈ افریکن اسٹڈیز، لندن یونیورسٹی

مقالات

۱- ڈاکٹر کارلو کپولا (مشیگن، امریکہ)
۲- پروفیسر بالجان (لائیڈن، ہالینڈ)
۳- پروفیسر حمید احمد خاں (سابق وائس چانسلر، پنجاب یونیورسٹی)
۴- پروفیسر مارا استیپانینس (سوویٹ یونین)
۵- ڈاکٹر ریاض الاسلام (کراچی)
۶- ڈاکٹر غلام مصطفی خاں (حیدر آباد، سندھ)
۷- ڈاکٹر محمد شمس الدین صدیقی (پشاور)

۸- ڈاکٹر فرمان فتحپوری (کراچی)
۹- جناب خاطر غزنوی (پشاور)
۱۰- مولانا جعفر قاسمی (علماء اکادمی، لاہور)
۱۱- پروفیسر صدیق کلیم (لاہور)
۱۲- ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی
۱۳- ڈاکٹر ناظر حسن زیدی
۱۴- ڈاکٹر وحید قریشی
۱۵- پروفیسر ڈاکٹر عبادت بریلوی
۱۶- حکیم نیر واسطی
۱۷- ڈاکٹر عبیداللہ خاں

ظہرانہ : ۱ بجے (چمن بالمقابل دفتر وائس چانسلر)

دوسرا اجلاس

۲ بجے بعد دوپہر

صدر : ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں (پروفیسر و صدر شعبۂ اردو، سندھ یونیورسٹی، حیدر آباد)

مقالات

۱- پروفیسر رالف رسل (لندن)
۲- پروفیسر اے۔ ایچ ۔ دانی (اسلام آباد)
۳- ڈاکٹر ابواللیث صدیقی (کراچی)
۴- ڈاکٹر منظور احمد (کراچی)
۵- ڈاکٹر سید محمد عبداللہ (لاہور)
۶- پروفیسر محمد طاہر فاروقی (پشاور)
۷- پروفیسر صوفی غلام مصطفیٰ تبسم
۸- پروفیسر سید وقار عظیم
۹- ڈاکٹر اے۔ ڈی۔ شبنم
۱۰- ڈاکٹر افتخار احمد غوری (جوہر آباد)

۱۱۔ ڈاکٹر سید مرتضٰی جعفری (پشاور)
۱۲۔ ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار
۱۳۔ سید سجاد باقر رضوی
۱۴۔ خواجہ محمد زکریا
۱۵۔ تبسم کاشمیری
۱۶۔ سہیل احمد خاں

چائے : ۵ بجے سہ پہر (چمن بالمقابل دفتر وائس چانسلر)
عشائیہ : منجانب حبیب بنک لمیٹڈ
مقام : یونیورسٹی ہال
وقت : ۸ بجے شب

ہفتہ ۱۷ مارچ ۱۹۷۳ء

پنجابی زبان و ادب

پہلا اجلاس

۹ بجے صبح

افتتاح : چوہدری ممتاز احمد کاہلون (وزیر اطلاعات و اوقاف، حکومت پنجاب)
صدر : پروفیسر علامہ علاءالدین صدیقی

مقالات

۱۔ ڈاکٹر لئیق بابری
۲۔ مرزا مقبول بیگ بدخشانی
۳۔ پروفیسر اصغر سلیم
۴۔ ڈاکٹر آغا یمین
۵۔ ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار
۶۔ ڈاکٹر وحید قریشی
۷۔ جناب اشفاق احمد

دوسرا اجلاس

۱۱ بجے

صدر : صوفی غلام مصطفیٰ تبسم

۱- بیگم رضیہ مدد علی
۲- جناب جیلانی کامران
۳- پروفیسر قیوم نظر
۴- جناب عین الحق فرید کوٹی
۵- محمد اسمعیل بھٹی

ظہرانہ : ۱ بجے (چمن بالمقابل دفتر وائس چانسلر)

تیسرا اجلاس

۲ بجے بعد دوپہر

مذاکرہ : علوم شرقیہ کے مسائل

افتتاح : چوہدری ممتاز احمد کاہلون (وزیر اوقاف، حکومت پنجاب)

صدر : پروفیسر ڈاکٹر عبدالقادر قراھان، (استنبول، ترکیہ)

تمام مندوب حصہ لیں گے اور علوم شرقیہ کے متعلق قرار دادیں پیش کی جائیں گی -

چائے : ۵ بجے سہ پہر (چمن بالمقابل دفتر وائس چانسلر)

عشائیہ : منجانب وائس چانسلر، پنجاب یونیورسٹی

مقام : مینارڈ ہال اورینٹل کالج

وقت : ۸ بجے شب

فہرستِ مندوبین

فہرست مندوبین

غیر ملکی مندوبین

۱۔ ایران

پروفیسر ڈاکٹر مجتبی مینوی، تہران یونیورسٹی
پروفیسر ڈاکٹر ناصر الدین شاہ حسینی، تہران یونیورسٹی
پروفیسر ڈاکٹر ضیاء الدین سجادی، تہران یونیورسٹی
پروفیسر ڈاکٹر مظاہر مصفا، تہران یونیورسٹی
خانم ڈاکٹر مظاہر مصفا، تہران یونیورسٹی
پروفیسر ڈاکٹر جلال متینی، مشہد یونیورسٹی
پروفیسر عبدالمحسن مشکوۃ الدینی، مشہد یونیورسٹی

۲۔ برطانیہ

پروفیسر رالف رسل، صدر زبان و ادبیات اردو، شعبۂ ثقافت ہندو پاکستان اسکول آف اورینٹل اینڈ افریکن اسٹڈیز، یونیورسٹی آف لنڈن
مسٹر جان ے وڈ ،
ڈائرکٹر اسکول آف اورنٹیل اسٹڈیز، ڈرہم یونیورسٹی، ڈرہم

۳۔ ترکیہ

پروفیسر ڈاکٹر عبدالقادر قراحان، استنبول یونیورسٹی۔

۴۔ جمہوریہ مصر

شیخ محمد الفحام، جامعہ ازہر، قاہرہ
ڈاکٹر فاطمہ موسی محمود*، قاہرہ یونیورسٹی

---

*تشریف نہ لاسکیں۔ مقالہ بھیج دیا۔

۵- ریاستہائے متحدہ امریکہ

پروفیسر ڈاکٹر اینی میری شمل*، (هارورڈ یونیورسٹی)
ڈاکٹر کارلو کبولا، اوک لینڈ یونیورسٹی، میچیگن، امریکہ
ڈاکٹر ڈڈلے ووڈ بیری، (هارورڈ یونیوسٹی)

۶- سعودی عرب

ڈاکٹر محمود زنبی
شاہ عبد العزیز یونیورسٹی، ریاض، (سعودی عرب)
شیخ محمد ابن ناصر العبودی - جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ، (سعودی عرب)

۷- سوئزلینڈ

پروفیسر سی برگل، صدر شعبۂ فارسی، برن یونیورسٹی

۸- سوویٹ یونین

پروفیسر ڈاکٹر مارا استیپانیانس، پروفیسر اوریئنٹل فلاسفی، انسٹی ٹیوٹ آف فلاسفی (ماسکو)

۹- فرانس

ڈاکٹر محمد حمید اللہ*، پیرس

۱۰- نیدرلینڈ

پروفیسر جے - ایم - ایس بالجون ، پروفیسر اسلامیات
لیڈن یونیورسٹی، لیڈن، (نیدر لینڈ)

---

* تشریف نہ لا سکیں - دو مقالے ارسال کیے -
* تشریف نہ لا سکے - مقالہ بھیج دیا -

پاکستانی مندوبین

۱۔ پشاور

مولانا عبدالقدوس، صدر شعبۂ اسلامیات، پشاور یونیورسٹی

ڈاکٹر محمد شمس الدین صدیقی، صدر شعبہ اردو، پشاور یونیورسٹی

ڈاکٹر سید مرتضی جعفری، شعبہ اردو، پشاور یونیورسٹی

ڈاکٹر کے ۔ بی ۔ نسیم، صدر شعبۂ فارسی، پشاور یونیورسٹی

ڈاکٹر میر ولی خان، صدر شعبۂ عربی، پشاور یونیورسٹی

خاطر غزنوی، پشاور یونیورسٹی

۲۔ حیدر آباد

ڈاکٹر غلام مصطفی خان، صدر شعبۂ اردو، سندھ یونیورسٹی حیدر آباد

۳۔ راولپنڈی، اسلام آباد

جناب فیض احمد فیض، ڈائرکٹر نیشنل کونسل آف آرٹس، اسلام آباد

ڈاکٹر مس کنیز یوسف، وائس چانسلر، اسلام آباد یونیورسٹی

پروفیسر قدرت اللہ فاطمی، ڈائرکٹر، آر ۔ سی ۔ ڈی، اسلام آباد

ڈاکٹر سید علی رضا نقوی

ڈاکٹر محمد ریاض

ڈاکٹر محمد صدیق شبلی

ڈاکٹر سید سبط حسن رضوی، راولپنڈی

ڈاکٹر افتخار احمد غوری، گورنمنٹ کالج، جوہرآباد

ڈاکٹر سید مرتضی موسوی، اڈیٹر ہلال، اسلام آباد

ڈاکٹر رحمن شاہ ولی، اسلامک انسٹی ٹیوٹ، اسلام آباد

جناب حافظ طفیل محمد، اسلام آباد

۴- کراچی

ڈاکٹر ریاض الاسلام، پروفیسر تاریخ، کراچی یونیورسٹی

ڈاکٹر ابواللیث صدیقی، پروفیسر اردو، کراچی یونیورسٹی

ڈاکٹر فرمان فتحپوری، شعبہ اردو، کراچی یونیورسٹی

ڈاکٹر منظور احمد، صدر شعبہ فلسفہ، کراچی یونیورسٹی

ڈاکٹر جمیل جالبی، کراچی

ڈاکٹر عابد علی خان، صدر شعبہ فارسی، کراچی

ڈاکٹر محمد یوسف، پروفیسر عربی، کراچی یونیورسٹی

پروفیسر ممتاز حسین، پروفیسر اردو و پرنسپل، سراج الدولہ کالج، کراچی

۵- ساہیوال

ڈاکٹر اے ۔ ڈی ۔ نسیم، ساہیوال

۶- کوئٹہ

پروفیسر کرار حسین، بلوچستان یونیورسٹی، کوئٹہ

جناب خلیل صدیقی، بلوچستان یونیورسٹی، کوئٹہ

۷- ملتان

اسماء رشید

پہلا اجلاس

افتتاحی

خطبات

ڈاکٹر عبادت بریلوی

ڈاکٹر محمد اجمل

ڈاکٹر جسٹس ایس۔ اے رحمٰن



پروفیسر ڈاکٹر عبادت بریلوی، پرنسپل یونیورسٹی اورینٹل کالج، لاہور
سیکرٹری جنرل جشن صد سالہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

خطبۂ استقبالیہ

ڈاکٹر عبادت بریلوی

پرنسپل یونیورسٹی اوریئنٹل کالج، لاہور
سیکریٹری جنرل

جناب صدر محترم و مہمانان گرامی قدر !

آج پنجاب یونیورسٹی اوریئنٹل کالج کے جشن صد سالہ کی اس یادگار تقریب میں مشرق و مغرب کے مختلف مراکز علمی کے نمائندوں کا یہ مبارک اجتماع ہمارے لئے باعث صد فخر و مسرت ہے اور ہم سب ان علماء و محققین کے سپاس گزار ہیں جو اس قدیم درسگاہ کی صد سالہ خدمات کے اعتراف و استحسان کی خاطر طویل مسافت کی زحمتیں برداشت کر کے یہاں تشریف لائے ہیں۔ میں ان سب خواتین و حضرات کو خوش آمدید کہتا ہوں جو اپنی اپنی یونیورسٹیوں اور علمی اداروں کی نمائندگی کرنے کے لئے اوریئنٹل کالج کے جشن صد سالہ کے اس موقع پر آج یہاں تشریف فرما ہیں .

خواتین و حضرات ! ہم معذرت خواہ ہیں کہ اس تقریب کا اہتمام بر وقت نہ کر سکے ۔ تاریخ شاہد ہے کہ اس ادارے کے قیام کو ایک صدی سے زیادہ عرصہ گذر چکا ہے ۔ انجمن پنجاب کے بانی اور احیائے علوم مشرقی کی تحریک کے علمبردار ڈاکٹر لائٹنر نے ۱۸۶۵ء میں ایک اوریئنٹل یونیورسٹی کا تصور پیش کیا تھا اور اگرچہ اس منصوبے کی تکمیل میں سرکاری مصلحتیں حائل رہیں لیکن ۱۸۷۰ء میں ڈاکٹر لائٹنر کی مساعی جمیلہ، مدرسة العلوم مشرقی یا اوریئنٹل اسکول کی صورت میں بار آور ہوئیں۔ لہذا سنہ تأسیس کی رو سے صد سالہ یادگاری تقریب کا انعقاد آج سے دو سال پہلے ہونا چاہیئے تھا لیکن اس دوران میں ایک طویل مدت

تک ہمارا ملک جس سیاسی بحران میں مبتلا رہا، اس سے آپ سب باخبر ہیں۔ اگرچہ آج بھی ہماری قوم کو ایسے سنگین مسائل در پیش ہیں کہ ان حالات میں کسی روایتی جشن کا تصور بھی ممکن نہیں لیکن ہم نے اس موقع کو غنیمت سمجھتے ہوئے ان سادہ سی تقریبات کا اہتمام کیا اور ہمیں امید ہے کہ علوم مشرقیہ کے قدر دانوں کا یہ اجتماع، اس ادارے کے حق میں باعث خیر و برکت ہوگا۔

یہ یادگاری جلسہ جو لاہور کے اس تاریخی شہر اور ایک اہم ثقافتی مرکز میں ترتیب دیا گیا ہے وہ نہ صرف یہ کہ مشرق و مغرب کے "قران السعدین" کا سماں پیش کر رہا ہے بلکہ اس حقیقت کا آئینہ دار بھی ہے کہ اورینٹل کالج اپنی صد سالہ تاریخ کے ہر دور میں علمائے مشرق و مغرب کی علمی و تحقیقی روایات کا سنگم بنا رہا۔ اس ادارے کی تاسیس ڈاکٹر لائٹنر جیسے ہمدرد مستشرق اور مفکر کے ہاتھوں عمل میں آئی، جو فضیلت علمی کے ساتھ بے مثال تنظیمی صلاحیت سے بھی بہرہ مند تھے۔ چنانچہ ان کی قیادت میں علوم و السنۂ مشرق کے بیرونی اور مقامی علماء کے درمیان باہمی تعاون و تعامل اور افادہ و استفادہ کی وہ روایت تازہ ہو گئی جو انیسویں صدی کے نصف اول میں سب سے پہلے فورٹ ولیم کالج اور اس کے بعد قدیم دہلی کالج میں قائم ہوئی تھی۔ لیکن ان دونوں اداروں کا دائرۂ عمل محدود اور عرصۂ حیات مختصر تھا۔ خوش قسمتی سے یہ سعادت اورینٹل کالج کے حصے میں آئی کہ اس کی سرگرمیوں کا دائرہ علوم و السنۂ مشرقیہ کی تدریس کے علاوہ تحقیق و تنقید، تدوین و تالیف اور ترجمہ و تصنیف کے مختلف شعبوں پر محیط ہے اور اس کی خدمات کا سلسلہ، مختلف سیاسی انقلابات کے باوجود، گذشتہ ایک صدی سے اب تک جاری ہے!

اس سلسلے میں جو بات سب سے زیادہ قابل غور ہے وہ یہ ہے کہ اورینٹل کالج نے ابتدا ہی سے عوام کی خدمت کو اپنا مسلک اور نصب‌العین بنایا اور متوسط اور نچلے متوسط طبقے کے ایسے افراد کے لئے تعلیمی سہولتیں فراہم کیں جو دوسرے کالجوں میں داخل ہو کر تعلیم حاصل کرنے کی سکت نہیں رکھتے تھے۔ ان کے مالی حالات ایسے تھے کہ ان کے لئے

انگریزی طرز کے نظام تعلیم میں شریک ہونا ممکن نہیں تھا۔ چنانچہ انہوں نے اوریئنٹل کالج کے نظام سے فائدہ اٹھایا اور اس کالج سے تعلیم حاصل کر کے علم و ادب کی دنیا میں کارہائے نمایاں انجام دیے۔ اس سلسلے میں پروفیسر عبدالعزیز المیمنی، مولانا امتیاز علی خاں عرشی، ڈاکٹر عندلیب شادانی، ڈاکٹر سید عبداللہ اور ڈاکٹر محمد باقر جیسے محققوں اور مصنفوں کے نام لئے جا سکتے ہیں۔ آپ کو یہ سن کر حیرت ہوگی کہ ان بزرگوں نے جس زمانے میں اوریئنٹل کالج میں تعلیم حاصل کی، اس زمانے میں صرف آٹھ آنے فیس لی جاتی تھی اور ہوسٹل کا کرایہ صرف ایک روپیہ مہینہ ہوتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ہندوستان کے دور دراز علاقوں سے لوگ تعلیم حاصل کرنے کے لئے اس درسگاہ میں آتے تھے۔

خواتین و حضرات! اوریئنٹل کالج کے دائرۂ کار کی وسعت اور سلسلۂ خدمات کی طوالت کے ساتھ تجدید عمل کی ان پیہم کوششوں کا ذکر بھی ضروری ہے جن کی بدولت اس ادارے نے تدریس و تحقیق اور تصنیف و تالیف کے ہر میدان میں درخشاں روایات کے لافانی نقوش ثبت کیے۔ آپ جانتے ہیں کہ اس ادارے کے اغراض و مقاصد میں مشرقی علوم و السنہ کی تدریس کو اولیت حاصل ہے۔ ان علوم کی تدریس کے لئے اور بھی درسگاہیں موجود تھیں لیکن روز اول سے اوریئنٹل کالج کو امتیاز و اختصاص کا جو شرف حاصل رہا، اس کا سبب تدریس کا وہ جدید اسلوب اور بلند معیار ہے جسے مغربی ذوق تحقیق اور مشرقی تبحر علمی کے اجتماع کا حاصل کہنا چاہیے۔ ڈاکٹر لائٹنر نے مقامی فضلا پر، زبان و ادب کے مطالعے میں لسانی تحقیق اور تاریخی پس منظر کی اہمیت واضح کی۔ ان کے اس نقطۂ نظر سے متاثر ہو کر مشرقی علوم کے اساتذہ نے تدریس کے نئے اسالیب اختیار کئے۔

یہاں نامور اساتذۂ کرام میں سے صرف ایک مثال پر اکتفا کروں گا۔ وہ بزرگ شخصیت مولانا فیض الحسن سہارنپوری کی ہے۔ یوں تو معقولات و منقولات کے ہر شعبے میں مولانا موصوف کی فضیلت و مہارت مسلّم تھی لیکن ان کی فطرت کا اصل جوہر اوریئنٹل کالج میں آ کر کھلا، جہاں انہوں نے عربی ادب کی تدریس میں ایک نمایاں انقلاب پیدا کیا۔

ہمارے علمائے ادب ، شعرائے متاخرین کی نکتہ آفرینیوں میں الجھے رہتے تھے۔ مولانا نے متقدمین کے کلام کی لسانی و ادبی خوبیوں کی طرف توجہ دلائی اور بالخصوص حماسہ کے درس میں وہ شہرت حاصل کی کہ ادب عربی کے شائقین دور دراز سے کشاں کشاں لاہور پہنچنے لگے۔ حتیٰ کہ علامہ شبلی کا ادبی شغف بھی انہیں مولانا سے کسب فیض کے لیے یہاں لے آیا۔ مولانا فیض الحسن کے ادبی مقام کا اندازہ مولانا سید سلیمان ندوی کے اس قول سے ہوگا : ''مولانا اس پائے کے ادیب تھے کہ خاک ہند نے صدیوں میں شاید ہی کوئی اتنا بڑا امام الادب پیدا کیا ہو''۔

طریق تدریس میں تجدید و اصلاح کے علاوہ ، اس ابتدائی دور میں لسانی و تاریخی تحقیق کی روایت بھی قائم ہوئی۔ عربی و فارسی زبان و ادب کے بیشتر اساتذہ ان علوم و السنہ کے تاریخی پس منظر سے بے خبر تھے۔ ۱۸۷۱ء میں ڈاکٹر لائٹنر نے مولانا فیض الحسن اور بعض دیگر اساتذہ کے تعاون سے، عربی زبان اور اسلامی علوم کی ایک مختصر تاریخ، ''سنین اسلام'' کے نام سے دو جلدوں میں مرتب کی۔ غالباً یہ قیاس بےجا نہ ہوگا کہ یہی کتاب علامہ شبلی کے تاریخی رجحان کی محرک اول ثابت ہوئی۔ مولانا فیض الحسن کی ادارت میں اورینٹل کالج کا ماہوار علمی و تحقیقی مجلہ، ''شفاء الصدور'' شائع ہوتا رہا جو دور اول میں طلبا کے ادبی ذوق کی تربیت اور اساتذہ کی تحقیقی سرگرمیوں کے فروغ کا باعث ہوا۔

اس دور میں علامہ فیض الحسن کے علاوہ، مولانا عبدالحکیم کلانوری، مفتی محمد عبداللہ ٹونکی ، مولانا محمد حسین آزاد، مولوی محمد الدین مختار اور دیگر اساتذہ نے کلاسیکی ادب کے بے شمار شاہکاروں کی تدوین و ترتیب اور ترجمہ و تشریح کے کام میں حصہ لیا۔ ان اساتذہ کی علمی و تدریسی، خدمات کی بدولت انیسویں صدی کے خاتمے تک اس ادارے کو علوم مشرقیہ کے ایک یگانۂ روزگار دارالعلوم کی حیثیت حاصل ہو گئی۔

خواتین و حضرات!

بیسویں صدی کے اوائل ہی میں، اس (ادارے) کو بین الاقوامی شہرت کے عالم مستشرق ڈاکٹر وولنر کی قیادت میسر آ گئی، جو ۱۹۰۳ء

سے ۱۹۳۶ء تک اس کالج کے پرنسپل رہے ۔ ڈاکٹر وولنر سنسکرت کے فاضل تھے اور لسانی ذوق کے علاوہ تحقیق و ترتیب متن میں بھی بڑی مہارت رکھتے تھے ۔ ان کے علمی شغف اور حسن انتظام کے اثر سے کالج کی پرسکون فضا میں علمی سرگرمیوں کی رفتار تیز تر ہو گئی اور تدریسی و تحقیقی روایات میں نت نئے اضافے ہوئے ۔ علمی افادے و استفادے کے اعتبار سے یہاں کے اساتذہ مشرق و مغرب کے مختلف دبستانوں سے فیض یاب ہوئے ۔ ڈاکٹر وولنر اور ڈاکٹر لکشمی سروپ ، آکسفورڈ یونیورسٹی کے فارغ التحصیل تھے ۔ ڈاکٹر مولوی محمد شفیع اور ڈاکٹر محمد اقبال نے کیمبرج یونیورسٹی میں پروفیسر براؤن سے استفادہ کیا ۔ ڈاکٹر عظیم الدین احمد نے جرمنی سے لسانیات میں پی ۔ ایچ ۔ ڈی کی ڈگری حاصل کی ۔ حافظ محمود خان شیرانی لندن میں ڈاکٹر آرنلڈ کے زیر تربیت رہے ۔ مفتی عبداللہ ٹونکی، مولانا شاداں بلگرامی اور مولوی عبدالعزیز میمن ، ملک کی قدیم درس گاہوں اور اکابر علماء کے تربیت یافتہ تھے ۔ اس طرح مغربی انداز نقد و تحقیق اور مشرقی تبحر و تفکر کے امتزاج سے کالج میں تدریس ، تصنیف اور تحقیق کا معیار بلند سے بلند تر ہو گیا اور یہاں کی قدیم روایات کو نئی زندگی و پایندگی حاصل ہوئی مثلاً گذشتہ دور میں لسانی و تاریخی تحقیق کی داغ بیل پڑ چکی تھی، اس دور کے اساتذہ نے قدیم مصادر و مآخذ کے مطالعے اور تاریخی حقائق کی تلاش و انکشاف میں زیادہ انہماک کا ثبوت دیا ۔ ان کی کوششوں سے ملک میں قدیم شاہکاروں اور قلمی نسخوں کی تلاش اور مطالعے کا ذوق عام ہوا ۔ انھوں نے عربی و فارسی کے متعدد قدیم نسخوں کے متون محققانہ کاوش سے مرتب کر کے "ایڈیٹنگ" کا ایک بلند معیار قائم کر دیا ۔ مولوی محمد شفیع مرحوم اور حافظ محمود شیرانی نے نادر مخطوطات کی تلاش اور فراہمی میں اپنی عمر عزیز کا ایک طویل حصہ صرف کیا ۔ ان کی ان تھک محنت اور جانفشانی کے طفیل پنجاب یونیورسٹی کا کتب خانہ، عربی ، فارسی، اردو اور پنجابی کے قلمی نوادر اور نایاب مطبوعات سے مالامال ہو گیا ۔ ان بزرگوں کی یہ خدمات یقیناً ہماری تاریخ کا ایک سنہرا باب ہیں ۔

خواتین و حضرات !

فروری ۱۹۲۰ء میں اورینٹل کالج میگزین کا اجراء ، اس دور کے علمی کارناموں میں سب سے زیادہ اہمیت کا حامل ہے کیوں کہ اس وقت سے لے کر آج تک یہ مجلہ اورینٹل کالج کے دبستان تحقیق کی بہترین نمائندگی کرتا رہا اور دنیا بھر کے علمائے مستشرقین سے ہمارے علمی و فکری رابطے کا ذریعہ بنا ہوا ہے۔ اس مجلے کی امتیازی خصوصیات وہی ہیں جن پر اس دبستان کی روایتی شہرت کا انحصار ہے ، یعنی مشرقی ادبیات کے تاریخی پس منظر کا مطالعہ، حقائق کی چھان بین ، جزئیاتی کاوش، قدیم مصادر و مآخذ کی دریافت اور ان کے متون کی تہذیب و اشاعت ، بلاشبہ برعظیم پاک و ہند کے علمی و تحقیقی حلقوں میں ان رجحانات کو فروغ دینے کا فخر بڑی حد تک اسی مجلے کو حاصل ہے۔ اس مجلے کے ساتھ ساتھ اس تحقیقی کام کو عربک پرشین سوسائٹی اور اس کے مجلے نے بھی آگے بڑھایا جو اورینٹل کالج میگزین کے ساتھ ساتھ اس سوسائٹی کے زیر اہتمام شائع ہوتا رہا ۔ پھر اورینٹل پبلیکیشنز فنڈ سے بھی اہم تحقیقی کتابیں شائع ہوئیں اور اب بھی تحقیقی کام کی طباعت و اشاعت کی یہ روایت اس کالج میں قائم ہے۔

قیام پاکستان کے بعد اورینٹل کالج کی تاریخ کا ایک نیا دور شروع ہوا ۔ سنسکرت اور ہندی شعبوں سے متعلق اساتذہ اور محققین اس ادارے سے رخصت ہو گئے اور یہ شعبے بند ہو گئے ۔ بدلے ہوئے حالات میں ادیب ، عالم اور فاضل کی جماعتوں کی افادیت مشکوک قرار دی گئی اور رفتہ رفتہ ان کی مقبولیت ختم ہو گئی ۔ لیکن جس طرح ہر خزاں ایک نئی بہار کا پیش خیمہ ہوتی ہے، اسی طرح پت جھڑ کا یہ سماں بھی باقی نہ رہا ۔ قیام پاکستان کے فوراً بعد کالج میں ایم ۔ اے اردو کی جماعتیں کھل گئیں اور شعبۂ اردو میں روزافزوں توسیع و ترقی ہونے لگی ۔ فرانسیسی، روسی، ہسپانوی، جرمن، اطالوی اور ترکی زبانوں میں سرٹیفکیٹ اور ڈپلوما کی کلاسیں جاری ہوئیں اور گذشتہ سال پنجابی ایم ۔ اے کی جماعتیں قائم ہونے کے بعد کالج کو تدریس و تحقیق کی ایک نئی جولانگاہ میسر آ گئی جس کی کمی بڑی شدت سے محسوس کی جارہی تھی ۔

خواتین و حضرات ! آپ جانتے ہیں کہ اورینٹل کالج کی اساس علوم مشرقی اور ان علوم کے مخزن یعنی عربی و فارسی زبان و ادب پر ہے۔ اس ادارے کی تاریخ کا دور ماضی جن علمی خدمات پر مشتمل ہے ، ان کا تعلق بیشتر انہی زبانوں سے ہے ۔ قیام پاکستان کے بعد جب دور جدید کا آغاز ہوا تو عربی و فارسی کی اہمیت اور بڑھ گئی کیونکہ یہ زبانیں نہ صرف ہمارے اسلاف کے قابل فخر علمی و ادبی کارناموں کی محافظ اور ہماری تہذیبی روایات کے تسلسل کی ضامن ہیں بلکہ ایک آزاد مسلم مملکت کی حیثیت سے ایشیا اور افریقہ کے دیگر اسلامی ممالک کے ساتھ ہمارے سیاسی و ثقافتی روابط کا وسیلہ بھی ہیں۔ چنانچہ ہمارے عربی و فارسی شعبوں میں جہاں ایک طرف کلاسیکی ادب کے تحقیقی مطالعے کی روایت قائم رہی، وہاں جدید دور کے تقاضوں کے مطابق تدریسی نظام میں مفید تبدیلیاں بھی ہوئیں ۔ ہمارے اساتذہ نے ممالک عرب و عجم کے مطالعاتی دوروں سے استفادہ کرتے ہوئے، محاورۂ جدید کے علاوہ نئے ادبی رجحانات کا گہرا مطالعہ کیا ۔ ان زبانوں کے نصاب میں جدید ادب کو مناسب مقام دیا گیا ۔ اس طرح قدیم و جدید کے متوازن امتزاج سے ان دونوں شعبوں کی اہمیت اور افادیت میں کئی گنا اضافہ ہو گیا ہے ۔

اس آخری دور کا اہم ترین واقعہ ۱۹۴۸ء میں اردو کے ایک مستقل شعبے کا قیام اور ایم ۔ اے اردو کی جماعتوں کا اجراء ہے ۔ قوم کی اس دیرینہ آرزو کی تکمیل کے لئے، ابتداء میں سر شیخ عبدالقادر مرحوم ، مولانا صلاح الدین احمد مرحوم اور ڈاکٹر تأثیر مرحوم جیسے بزرگ ادیبوں اور استادوں نے اعزازی طور پر اپنی تدریسی خدمات پیش کیں لیکن بہت جلد اس شعبے میں مستقل تدریسی عملے کی کمی پوری ہو گئی اور چند ہی سال میں یہ شعبہ ادبی و تحقیقی سرگرمیوں کا مرکز بن گیا ۔ ۱۹۶۰ء کے بعد اس شعبے کی مقبولیت میں بڑی تیزی سے اضافہ ہونے لگا ۔ حتی کہ ایک ایک جماعت میں طلبہ و طالبات کی تعداد ڈیڑھ سو سے متجاوز ہو گئی ۔ جب کالج کے وسیع ترین کمروں میں بھی تنگی محسوس ہونے لگی تو مجبوراً ہمیں داخلوں کی تعداد کو سو تک محدود کرنا پڑا ۔

ماضی میں، ادبی، لسانی و تاریخی تحقیق کی جو شاندار روایت اس ادارے میں قائم ہو چکی تھی، اس سے شعبہ اردو کے اساتذہ اور محققین نے اپنا رشتہ ابتداء ہی سے استوار رکھا۔ چنانچہ چند سال میں شعبۂ اردو کے اساتذہ کے تحقیقی اور تنقیدی کام کی شہرت نہ صرف پاکستان اور ہندوستان میں پھیلی بلکہ دنیا کے ان تمام ممالک کی یونیورسٹیوں تک پہنچی جہاں اردو کی زبان و ادب کی تدریس و تحقیق کا انتظام ہے۔ اور اگر میں یہ کہوں تو خود ستائی نہیں ہو گی کہ اورینٹل کالج کا شعبۂ اردو گذشتہ بیس بائیس سال سے دنیا میں تدریس اور تحقیق و تنقید کا سب سے اہم مرکز رہا ہے۔ جس شعبے میں ڈاکٹر سید عبداللہ، ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی، پروفیسر سید وقار عظیم کے ایسے محقق اور نقاد کام کرتے رہے ہوں اس کی اہمیت سے کون انکار کر سکتا ہے۔ پھر گذشتہ چند سال کے اندر اس شعبے میں پی ایچ ڈی اور ایم۔ اے کی سطح پر جتنا کام ہوا، وہ مقدار و معیار، ہر لحاظ سے اتنا وقیع ہے کہ اس کی مثال کسی اور یونیورسٹی میں مشکل سے ملے گی۔ پی ایچ ڈی کے دو درجن سے زائد مقالوں میں سے بعض شائع ہو کر اہل نظر سے خراج تحسین حاصل کر چکے ہیں۔ ایم۔ اے کے مقالات کی تعداد کم و بیش پانچ سو ہے۔ طلبہ کی یہ مبتدیانہ تنقیدی و تحقیقی کاوشیں اگرچہ دراصل ان کی ادبی تربیت کا ایک حصہ ہیں لیکن ان میں بھی ایسے مقالات کی ایک کثیر تعداد ملے گی جو اپنے مواد و ترتیب کے لحاظ سے قابل اشاعت قرار دیے جا سکتے ہیں اور ان کی اشاعت کا ایک منصوبہ ہمارے پیش نظر ہے۔

خواتین و حضرات! اس میں شک نہیں کہ ہماری تدریس و تحقیق کے موضوعات میں کلاسیکی ادب کو بجا طور پر خاص اہمیت حاصل رہی ہے تاہم جدید ادب اور دور حاضر کے ادبی مسائل و رجحانات کے مطالعے سے ہماری دلچسپی کچھ کم‌تر نہیں۔ اس دلچسپی کا مظاہرہ نہ صرف مذاکروں اور ادبی محفلوں میں ہوتا ہے بلکہ اورینٹل کالج کی تالیفات و تحقیقات کی نمائش گاہ کے ایک سرسری جائزے سے یہ اندازہ ہو جائے گا کہ اس ادارے کے اساتذہ و طلبہ نے جہاں تحقیق و تدقیق کے نئے اصول اپنائے ہیں وہاں نقد و نظر کے نئے زاویوں سے ادب کو پرکھنا بھی سیکھا ہے۔

وہ ادب اور زندگی کے بنیادی رشتے کے گہرے شعور و احساس کے ساتھ اردو زبان و ادب کے ارتقائی سفر کا مشاہدہ کرتے رہے ہیں ۔ اسی ذہنی تربیت کا نتیجہ ہے کہ آج اس ادارے کے فارغ التحصیل طلبہ، معلم ، ادیب، صحافی اور فن کار کی حیثیت سے قوم کی تعمیر نو میں نمایاں حصہ لے رہے ہیں۔ اب چونکہ موجودہ حکومت نے قومی زبان کو مرکز اور صوبوں میں اس کا جائز مقام دلانے کا فیصلہ کر لیا ہے لہذا ہمیں امید ہے کہ اس فیصلے کے عملی نفاذ کے بعد ہمارے طلبہ کو ملک و قوم کی خدمت کے زیادہ مواقع میسر آئیں گے ۔

اس سلسلے میں ہم پر جو نئی ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں ، ان سے بھی ہم غافل نہیں ہیں ۔ اردو زبان میں قومی زندگی کے تقاضوں سے عہدہ برآ ہونے کی لامحدود صلاحیتیں موجود ہیں ۔ اردو کے مخفی امکانات کو اجاگر کرنے اور اس کی صلاحیتوں سے پورا پورا فائدہ اٹھانے کے لئے اجتماعی طور پر منظم جد و جہد کی ضرورت ہے۔ ہم اس اجتماعی جد و جہد کو کامیاب بنانے کا عزم رکھتے ہیں۔ اوریئنٹل کالج کی تاریخ شاہد ہے کہ ہر دور میں ہم اپنے تدریسی و تحقیقی کاموں میں نئے اسالیب و افکار اختیار کرکے آگے بڑھتے رہے ہیں اور انشاء اللہ آئندہ بھی تجدید عمل کے اصول پر عمل کرتے ہوئے نئے دور کے نئے سے نئے تقاضوں کو پورا کرنے کی کوشش کرتے رہیں گے۔

خواتین و حضرات !

اوریئنٹل کالج کے اساتذہ اور طلبہ کا یہی مسلک ہے جس نے اس ادارے کو نہ صرف وطن عزیز میں بلکہ بیرونی ممالک میں بھی محترم بنا دیا ہے ۔ دنیا کی ہر یونیورسٹی میں اس ادارے کا نام عزت سے لیا جاتا ہے اور اس کے تحقیقی اور تدریسی کام قدر کی نگاہوں سے دیکھے جاتے ہیں ۔ آج اس کالج کے جشن صد سالہ کی یہ تقریب، جس میں دور دور سے آئے ہوئے مندوبین شرکت کر رہے ہیں ، اس حقیقت کا بین ثبوت ہے کہ یہ ادارہ اب ایک بین الاقوامی حیثیت اور عالمگیر شہرت کا مالک ہے ۔

ان الفاظ کے ساتھ میں ایک دفعہ پھر آپ سب مہمانان گرامی اور خواتین و حضرات کا خیر مقدم کرتا ہوں، آپ کو خوش آمدید کہتا ہوں اور آپ کی تشریف آوری کا شکریہ ادا کرتا ہوں ۔

(ڈاکٹر) عبادت بریلوی

پرنسپل

ڈین فیکلٹی آف اورینٹل اینڈ اسلامک لرننگ

سکریٹری جنرل، جشن صد سالہ

مترجم : دکتر آفتاب اصغر

بسم الله الرحمن الرحیم

خطابۀ خیرمقدم

دکتر عبادت بریلوی

رئیس دانشکدۀ خاورشناسی، لاهور
دبیر کل

رئیس محترم و میهمانان ارجمند!

اجتماع مبارک امروزی نمایندگان مراکز مختلف علمی شرق و غرب که بمناسبت برگزاری جشن صدمین سال تأسیس دانشکدۀ خاور شناسی دانشگاه پنجاب بعمل آمده است، برای ما موجب افتخار و انبساط زیاد است و همه ما از دانشمندان و محققانی سپاسگزاریم که بمنظور اعتراف و استحسان خدمات این مؤسسۀ قدیم علمی در ظرف صد سال گذشته باتحمل زحمات مسافرتهای طولانی باینجا تشریف آورده اند ـ من به همه خانمها و آقایان خوش آمد میگویم که بنمایندگی از دانشگاه ها و مؤسسه های علمی خود هنگام جشن صدمین سال تأسیس دانشکده خاور شناسی در اینجا تشریف دارند ـ

خانمها و آقایان! از اینکه نتوانستیم بنا بعلل اجتناب ناپذیر این جشن را سر وقت معین برگزار کنیم، عذر میخواهیم ـ

تاریخ شاهد آنست که بیش از صد سال از تأسیس این مؤسسه گذشته است ـ مؤسس انجمن پنجاب و پرچمدار نهضت احیای علوم مشرقی ، دکتر لائتنر (Dr. Lietner)، در سال ۱۸۶۵ میلادی نقشه دانشگاه خاور شناسی را مطرح کرده بود و باوجودیکه بعضی از مصالح مملکتی در راه اجرای این طرح مانع بوده اند در ۱۸۷۰ میلادی تلاشهای حسنۀ دکتر لائتنر بصورت مدرسۀ علوم شرقی یا مدرسۀ خاور شناسی، مثمر گردید ـ بنا برین

طبق سال تأسیس، جشن صدمین سال تأسیس بایستی دو سال زودتر برگزار میشد ولی متأسفانه در خلال این مدت کشور ما بابحرانی سیاسی رو برو بود که همه شما از آن آگاه هستید ـ اگرچه ملت ما تاکنون اینچنین مسائل سنگینی در پیش دارد که حتی تصور برگزاری جشنی سنتی نیز خارج از امکان است ولی ما این فرصت را مغتنم شمرده بدین مناسبت این برنامه‌های ساده را تهیه و تنظیم نموده ایم و امید واریم که این اجتماع علاقمندان علوم شرقی در حق این مؤسسه موجب خیر و برکت خواهد شد ـ

این جلسه فراموش نشدنی که در این شهر تاریخی لاهور و مرکز مهم فرهنگی برگزار میشود نه تنها اینکه‌بمنزله ''قران السعدین'' شرق و غرب است بلکه نمودار این واقعیت نیز هست که دانشکده خاور شناسی در هر مرحله ای از تاریخ صد ساله خود ملتقای سنن و روایات علمی و تحقیقی دانشمندان شرق و غرب بوده است ـ تأسیس این مؤسسه توسط متفکر و خاور شناس دلسوزی مانند دکتر لائتنر بعمل آمد که همزمان با فضیلت علمی با استعداد اداری بیمانندی نیز بهره مند بود ـ بنا برین برهبری او سنت تعاون و همکاری و استفادهٔ متقابل دانشمندان زبانها و دانشهای شرقی خارجی و بومی که نخست از همه در نیمه اول قرن نوزدهم در دانشکده فورت ویلیام و ازان پس در دانشکده دهلی قدیم بوجود آمده بود، تازه گردید ـ حوزهٔ فعالیت هر دو مؤسسه نامبرده محدود و عرصهٔ حیات آنها کوتاه بود ـ خوشبختانه این سعادت نصیب دانشکده خاورشناسی گردید ـ حوزهٔ فعالیتهای آن علاوه بر تدریس علوم و زبانهای شرقی شعب گوناگون تحقیق و تنقید، تصحیح و تدوین و ترجمه و تألیف را نیز در برمیگیرد و سلسلهٔ خدمات آن، باوجود انقلابات سیاسی، از یکصد سال گذشته تا کنون ادامه دارد ـ

در این ضمن چیزی که از همه بیشتر قابل توجه است این است که دانشکده خاور شناسی از همان اوائل خدمت به مردم عامه را شعار و هدف خود قرار داد و به افرادی از طبقه متوسط پایین تسهیلات تحصیلی را فراهم ساخت که برای آنان تحصیل در دانشکده های دیگر غیر مقدور بود زیرا امکانات مالی آنان طوری بود که مطابق سیستم انگلیسی تحصیل علم برای آنان امکان نداشت ـ لذا آنان از سیستم آموزشی دانشکده خاورشناسی استفاده

کردند و پس از کسب دانش در این دانشکده در جهان ادب و دانش کارهای بزرگی انجام دادند ـ در اینمورد میتوان از دانش پژوهان و مؤلفانی از قبیل پروفسور عبدالعزیز المیمنی ، مولانا امتیاز علی خان عرشی ، دکتر عندلیب شادانی، دکتر سید عبدالله و دکتر محمد باقر نام برد ـ شاید این امر برای شما شگفت آور باشد که در زمانی که اینچنین بزرگان در دانشکده خاور شناسی تحصیل کردند، شهریه این دانشکده ماهی هشت آنه (تقریباً پنج ریال) و کرایه اطاق باشگاه ماهی یک روپیه (تقریباً یک تومان) بوده است ـ بهمین علت است که مردم از نقاط دور دست شبه قاره هند و پاکستان بمنظور کسب دانش به این دانشکده روی میاوردند ـ

خانمها و آقایان : در ضمن اشاره به وسعت حوزه فعالیت و سلسلهٔ طولانی خدمات دانشکده خاور شناسی ذکر تلاشهای مداوم آن در مورد تجدید حیات که باعث بوجود آوردن سنن درخشان و جاویدان این مؤسسه در زمینه تدریس و تحقیق و تصنیف و تألیف گردید، نیز لازم است ـ چنانکه مستظهر هستید طبق مرامنامه تدریس علوم و زبانهای شرقی در این مؤسسه در درجه اول قرار میگرد ـ بمنظور تدریس این علوم درسگاههای دیگری نیز وجود داشته است اما از همان روز اول امتیازی که دانشکده خاور شناسی دارای آن بوده است، علتش روش جدید آموزشی و استاندارد عالی آنست که آنرا باید نتیجهٔ تجمع ذوق تحقیق غربی و تبحر علمی شرقی دانست ـ دکتر لائتز اهمیت تتبعات زبانشناسی و دور نمای تاریخی در مطالعات مربوط به زبان و ادب را به دانشمندان بومی خاطر نشان کرد و با در نظر گرفتن نظریات او استادان علوم شرقی روشهای نوین تدریس را اتخاذ نمودند ـ

در اینجا از میان استادان ارجمند این دانشکده برسبیل مثال فقط بذکر مولانا فیض الحسن سهارنپوری بسنده مینماییم ـ اگرچه درهر شعبه ای از شعب مختلف معقول و منقول برتری و ورزیدگی مولانای مزبور مسلم بود ولی جوهر اصلی طبیعت مولانا در دانشکده خاور شناسی بروز کرد که در آنجا او در تدریس ادب عربی انقلاب محسوسی برپا کرد ـ علمای ادب ما معمولاً با معنی آفرینیهای شعرای متأخر درگیر بودند ولی مولانا شاگردان خود را به محسنات ادبی و لسانی کلام شعرای متقدم نیز متوجه ساخت و مخصوصاً در

تدریس حماسه آنچنان شهرتی کسب کرد که علاقمندان ادبیات عرب باذوق و شوق تمام از نقاط دور دست به لاهور روی آوردند تا آنجائیکه ذوق ادبی علامه شبلی نیز او را بمنظور کسب فیض از مولانا فیض‌الحسن به لاهور کشانید ـ برای درک مقام علمی و ادبی مولانا فیض الحسن نقل قول زیر مولانا سید سلیمان ندوی بس است ـ

''پایه ادبی مولانا بقدری بلند بود که شاید بندرت کسی سانند این امام الادب از خاک هند برخاسته باشد'' ـ

علاوه بر تجدید و اصلاح در روش آموزشی ، در این دوره ابتدائی، سنت تحقیق تاریخی و لسانی نیز پایه گذاری شد ـ اغاب استادان زبان و ادب عربی و فارسی از دور نمای تاریخی علوم و زبانهای مشرقی بی اطلاع بودند ـ در سال ۱۸۷۱ میلادی دکتر لائتنر باهمکاری و تشریک مساعی مولانا فیض الحسن و بعضی از اساتید دیگر، تاریخ مختصری از زبان عربی و علوم اسلامی بنام ''سنین اسلام'' در دو جلد تدوین نمود ـ ظاهراً این امر خارج از امکان نیست که همین کتاب در پرورش ذوق تاریخی علامه شبلی عامل نخستین واقع شده باشد ـ تحت مدیریت مولانا فیض الحسن مجله ای علمی و تحقیقی دانشکده خاور شناسی بنام ''شفا الصدر'' نیز منتشر میشده است که در دوره اول دانشکده باعث پرورش ذوق ادبی دانشجویان و موجب تشویق استادان در فعالیتهای تحقیقی واقع شد ـ در ایندوره علاوه بر علامه فیض الحسن، مولانا عبدالحکیم کلانوری، مفتی محمد عبدالله تونکی، مولانامحمد حسین آزاد، مولوی محمد الدین‌مختار و استادانی دیگر درکار ترجمه، تفسیر و تصحیح شاهکارهای بیشمار ادب کلاسیکی شرکت کردند و بواسطه خدمات علمی و آموزشی این استادان تاپایان قرن نوزدهم این مؤسسه مقام دانشکدهٔ خاور شناسی منحصر بفردی را بدست آورد ـ

خانمها و آقایان: در اوائل قرن بیستم رهبری خاورشناسی مثل دکتر وولنر (Dr. Woolner) که دارای شهرت بین‌المللی بود و از سال ۱۹۰۳ تا ۱۹۳۶ میلادی ریاست این دانشکده را بعهده داشت، نصیب این مؤسسه شد ـ دکتر وولنر دانشمند سانسکریت بود و علاوه بر

علاقه به زبانشناسی در کار تحقیق و تصحیح متون نیز مهارت داشت ـ در نتیجه اشتغال علمی و حسن ادارهٔ او در محیط آرام دانشکده فعالیتهای علمی تیزتر و در زمینه آموزشی و تحقیقی سنتهای تازه تر اضافه گردید ـ از لحاظ استفاده متقابل علمی استادان این دانشکده از مکتب های مختلف علمی شرق و غرب کسب فیض نمودند ـ دکتر وولنر و دکتر لکشمن سروپ از فارغ التحصیلان دانشگاه اکسفرد بودند ـ پروفسور مولوی محمد شفیع و دکتر محمد اقبال در دانشگاه کیمبریج از محضر پروفسور برون استفاده کردند ـ دکتر عظیم الدین احمد از آلمان در رشته زبانشناسی دکترا گرفت و در لندن تحت تربیت دکتر آرنلد ماند ـ مفتی عبدالله تونکی ، مولانا شادان بلگرامی و مولوی عبدالعزیز میمن از تربیت یافتگان درسگاهها و علمای بزرگ قدیم بودند ـ بدینترتیب در نتیجه امتزاج روش انتقاد و پژوهش غرب و تبحر و تفکر شرق در زمینهٔ تدریس، تصنیف و تحقیق، استاندارد این دانشکده بیش از پیش عالی تر شد و زندگی تازه تری و پایندگی بیشتری به سنن قدیم اینجا میسر گردید مثلاً در دوره گذشته سنت تحقیق لسانی و تاریخی پایه گذاری شده بود، اساتیدِ اینـدوره در مطالعه مراجع و منابع قـدیم و تحقیق و تـدقیق حقائق تاریخی بیشتر اشتغال ورزیدند ـ بر اثر تلاشهای آنها ذوق جستجو و مطالعه شاهکار های قدیم و نسخ خطی در کشور متداول گردید و آنها باتصحیح متون متعدد نسخ خطی قدیم عربی و فارسی بروش محققانه استاندارد اعلای تصحیح را بوجود آوردنـد ـ مرحوم مولوی محمد شفیع و حافظ محمود شیرانی قسمت اعظمی از عمر عزیز خود را صرف جستجو و فراهم آوردن نسخ خطی منحصر بفرد کردند و بواسطه تلاشهای خستگی ناپذیر آنان کتابخانه دانشگاه پنجاب از نسخ خطی و کتب چاپی نـادر الوجود مالا مال گردیـد ـ خـدمات اینچنین بزرگان باب طلائی تاریخ ماست ـ

خانمها و آقایان : انتشار مجله دانشکده خاور شناسی در فوریه ۱۹۲۵ میلادی از مهمترین کارهای علمی ایندوره است زیرا از آنروز تا بامروز این مجله از مهمترین نمایشگران روش تحقیقی این دانشکده و وسیله روابط فکری ما با خاور شناسان جهان بوده است ـ مختصات برجسته این مجله همانست که روی آن شهرت سنتی این مکتب متکی است یعنی مطالعه دور نمای تاریخی

ادبیات شرق ، تحقیق و تدقیق وقایع، تحلیل و تجزیه ، جستجوی مراجع و منابع و تصحیح و انتشار متون آنها ـ بدون تردید این مجله ایست که بافتخار ترویج و اشاعه اینگونه تمایلات در میان حوزه های علمی و تحقیقی شبه قاره هند و پاکستان مفتخر است ـ همزمان با مجله دانشکده خاور شناسی مجله انجمن عربی و فارسی نیز در پیشبرد کار تحقیقی این دانشکده نقش مهمی را ایفا کرده است ـ بعلاوه کتابهای مهم تحقیقی با ''اعانه مخصوص مطبوعات خاور شناسی'' نیز منتشر گردیده است و تاکنون سنت چاپ و نشر کتابهای تحقیقی در این دانشکده پابرجاست ـ

پس از تأسیس پاکستان دوره جدیدی در تاریخ دانشکده خاور شناسی آغاز گردید ـ استادان و محققان وابسته به‌قسمتهای سانسکریت و هندی از این مؤسسه مرخص و شعب مذکور معطل شدند و در اوضاع عوض شده سودمندی و مفیدیت کلاسهای ''ادیب''، ''عالم'' و ''فاضل'' محل تردید واقع گشت و با گذشت زمان محبوبیت این کلاسها پایان پذیرفت ولی بطوریکه هر خزان بهار تازه ای در دنبال دارد همانطور منظره این خزان نیز ناپدید شد و بلا فاصله پس از استقلال پاکستان در این دانشکده کلاس فوق لیسانس اردو افتتاح شد و شعبه اردو روبه توسعه نهاد ـ علاوه بر آن کلاسهای گواهی نامه و دیپلم زبانهای فرانسه، اسپانی، آلمانی، ایتالیائی و ترکی نیز دائر گردید و با دائر شدن کلاس فوق لیسانس پنجابی در سال گذشته دانشکده خاور شناسی به میدان تازه‌ای از تدریس و تحقیق قدم گذاشته و به جبران کمبود کلاس پنجابی که تأسیس آن خیلی لازم بود، پرداخته است ـ

خانمها و آقایان: چنانکه مسبوقید پایه و اساس دانشکده خاور شناسی بر علوم شرقی و گنجینه این علوم یعنی زبان و ادبیات عربی و فارسی نهاده شده است ـ دوره گذشتهٔ تاریخ این مؤسسه بیشتر مشتمل بر خدماتی است که متعلق به این دو زبان است ـ پس از تأسیس پاکستان وقتی دوره جدیدی آغاز گردید اهمیت زبانهای عربی و فارسی بیش از پیش محسوس گردید برای اینکه این دو زبان نه تنها حافظ افتخارات علمی و ادبی نیاکان و متضمن تواتر سنن فرهنگی ما اند بلکه وسیله روابط سیاسی و فرهنگی کشور مستقل

اسلامی ما با کشور های اسلامی دیگر آسیا و افریقا نیز هستند ـ بنا برین از یک طرف سنت مطالعات و تحقیق ادب کلاسیک در قسمتهای عربی و فارسی پابرجا ماند و از طرف دیگر طبق مقتضیات دوره جدید در سیستم آموزشی تغیرات مفیدی نیز بعمل آمد ـ استادان ما با استفاده از مسافرتهای مطالعاتی خود از ایران و کشور های عرب علاوه بر محاوره جدید تمایلات و تحولات ادبی جدید را نیز دقیقاً مورد مطالعه قرار دادند ـ در برنامه‌های درسی این زبانها به‌ادبیات معاصر محلی که شایسته آن بود داده شد ـ بدینطریق با امتزاج متناسب قدیم و جدید در اهمیت و مفیدیت این دو شعبه بمراتب اضافه شده است ـ

مهمترین وقایع دوره اخیر تأسیس یک شعبه مستقل اردو و دائر شدن کلاس فوق لیسانس اردو در سال ۱۹۴۸ میلادی است ـ بمنظور تحقق بخشیدن این آرزوی دیرینه ملت ، در ابتدا ادیبان و استادان بزرگی مانند سر شیخ عبدالقادر مرحوم، مولانا صلاح‌الدین احمد مرحوم و دکتر تأثیر مرحوم بطور افتخاری و داوطلبانه برای تدریس خدمات خود را در اختیار این دانشکده گذاشتند ولی بزودی در این شعبه گروه مستقل آموزشی بوجود آمد و در ظرف چند سال این شعبه به مرکز فعالیتهای ادبی و تحقیقی مبدل گردید ـ بعد از سال ۱۹۶۰ میلادی به محبوبیت این شعبه بسرعت هرچه تمامتر اضافه گردید تا آنجائیکه تعداد دانشجویان پسرو دانشجویان دختر در هر یک از کلاسهای اردو بالغ برصد و پنجاه نفر گردید ـ وقتی ما حس کردیم که حتی در وسیعترین اطاقهای دانشکده نیز جای کم است ناچار شدیم که تعداد دانشجویان را به صد نفر محدود کنیم ـ

سنت درخشان تحقیقات ادبی، لسانی و تاریخی که در گذشته در این مؤسسه بوجود آمده بود ، استادان و محققان اردو از بدو امر بآن در تماس بودند چنانکه می بینیم آوازه کارهای تحقیقی و انتقادی استادان اردوی این دانشکده نه تنها در پاکستان و هندوستان بلکه در دانشگاههای تمام کشور هائی که درآنجا در زمینه اردو تحقیق و تدریس میشود، پیچید ـ اگر بگوییم که در بیست ودو سال گذشته دانشکده خاور شناسی مهمترین مراکز تدریس و

تحقیق اردو در جهان بوده است نباید حمل بر خود ستائی شود۔ شعبه ای که در آن محققان و منتقدانی از قبیل دکتر سید عبدالله، دکتر ابو اللیث صدیقی، پروفسور وقار عظیم و امثال آنها مشغول کار بوده باشند چه کسی میتوانند منکر اهمیت آن باشد۔ وانگهی کاری که بر سطح دکتری و فوق لیسانس درین شعبه در ظرف چند سال اخیر انجام گرفت از لحاظ کیفیت و کمیت بقدری با ارزش است که نظیر آن درهیچیک از دانشگاه های جهان کمتر دیده میشود۔ از میان بیش از دو دوجین رساله های دکتری بعضی‌ها انتشار یافته و مورد تقدیر ارباب نظر قرار گرفته اند۔ تعداد رساله های فوق لیسانس در حدود پانصد جلد است۔ اگرچه این کوششهای پژوهشی و انتقادی دانشجویان جنبه مقدماتی و آموزشی دارند بازهم از میان اینها تعداد قابل ملاحظه‌ای از رساله های تحقیقی بچشم میخورد که از لحاظ مطالب و ترتیب و تنظیم خود قابل چاپ و انتشار است و ما پروژه‌ای در مورد چاپ و نشر آنها در نظر داریم۔

خانمها و آقایان: در این امر شکی نیست که درمیان موضوعات عمده تدریس و تحقیق ما ادب کلاسیک دارای اهمیت خاص و بجائی داشته است باوجود آن ما به ادبیات جدید و مسائل و تمایلات عصر حاضر نیز کمتر علاقه نداریم۔ نه فقط سمینارها و مجالس ادبی این دانشکده این علاقمندی ما را نشان میدهد بلکه بایک نگاه مختصری به تألیفات و انتشارات این دانشکده نیز میتوان پی برد که استادان و دانشجویان این دانشکده نه تنها در زمینه تحقیق و تدقیق علمی بلکه در زمینه نقد و انتقاد ادبی نیز همیشه اصول جدید تری را بکار برده و با احساس و ادراک کامل رابطه اساسی ادب با زندگی ناظر سیرتکامل زبان و ادب بوده اند۔ این نتیجه همین تربیت ذهنی است که امروز فارغ التحصیلان این دانشکده بعنوان معلم، نویسنده، روزنامه نگار و بعناوین مختلف دیگر درکار احیای ملی بطورشایانی شریک و سهیم اند۔ حالا چون حکومت فعلی در مورد اعطای مقام شایسته‌ای به زبان ملی در مرکز و استانها تصمیم گرفته است ما امیدواریم که با عملی شدن این تصمیم دانشجویان این دانشکده در مورد خدمات به کشور و ملت فرصتهای بیشتری بدست خواهند آورد۔

در این ضمن ما از مسئولیتهای تازه‌ای که در آینده با آنها مواجه خواهیم شد بی اطلاع نیستم، زبان اردو برای از عهده برآمدن مقتضیات حیات ملی امکانات نامحدودی دارد و برای نمایان ساختن و حد اکثر استفاده کردن از امکانات و استعدادهای پنهانی آن تلاش و کوشش منظم و مرتب دستجمعی لازم است وما تصمیم داریم که این تلاش و کوشش دستجمعی را بثمر خواهیم رساند. تاریخ دانشکده شاهد آنست که ما در هر زمان در راه تدریس و تحقیق همیشه با اسلوب های تازه و افکار ابتکاری گام برداشته‌ایم و بخواست خداوند متعال در آینده نیز در امر تجدید کوشش خود را مطابق با اصول مدرن و مقتضیات هرچه تازه زمان ادامه خواهیم داد.

خانمها و آقایان: همین روش استادان و دانشجویان دانشکده خاور شناسی است که به این مؤسسه نه تنها درمیهن عزیز خود بلکه در کشور های خارجی نیز مقام ارجمندی بخشیده است. در هر یک از دانشگاههای جهان این مؤسسه با احترام یاد میشود و کارهای تحقیقی و آموزشی آن بدیدهٔ تقدیر دیده میشوند. امروز جشن صدمین سال تأسیس این دانشکده که در آن نمایندگان نقاط دور دست جهان شریک اند، این امر را باثبات رسانده است که این مؤسسه دارای مقام بین المللی و شهرت جهانی است.

با این کلمات من یکبار دیگر به میهمانان ارجمند و خانمها و آقایان خوش آمد میگویم و خیر مقدم عرض میکنم و برای حضور در این جشن متشکرم.

دکتر عبادت بریلوی
رئیس دانشکده خاور شناسی و
فاکولته مطالعات خاور شناسی و اسلامی و
دبیر عمومی کمیته جشن صدمین سال دانشکده خاور شناسی



ڈاکٹر محمد اجمل (وائس چانسلر)

خطبۂ استقبالیہ

پروفیسر محمد اجمل صاحب

وائس چانسلر، پنجاب یونیورسٹی

محترم مہمان خصوصی، مندوبین کرام، خواتین و حضرات!

آج ہم یہاں اورینٹل کالج، لاہور کی سوویں سالگرہ منانے جمع ہوئے ہیں۔ اس ادارے کی صد سالہ تاریخ کا جائزہ لینا تو مشکل ہے۔ پھر بھی ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اس کالج نے مشرق کے علم و ادب کی گراں بہا خدمت کی ہے اور اس طرح کی ہے کہ اس خدمت کے عمل میں خادم و مخدوم کا فرق مٹ گیا ہے۔ یہاں ڈاکٹر لائٹنر، ڈاکٹر وولنر، حافظ محمود شیرانی، مولانا شاداں بلگرامی، پروفیسر محمد شفیع اور ڈاکٹر محمد اقبال جیسے قابل قدر لوگوں نے طالب علموں کو پڑھایا ہے، ان کے دماغوں میں علم کے چراغ روشن کئے ہیں اور ان کے دلوں کو شوق و ذوق کے موتیوں سے سجایا ہے۔ اسی کالج میں ۱۸۹۹ء میں حکیم الامت علامہ اقبال بھی تھوڑے عرصے کے لئے میکلوڈ ریڈر ان عربک مقرر ہوئے تھے۔ اسی کالج میں سول انجینیرنگ، یونانی طبّ اور آیورویدک کی تربیت بھی ہوتی تھی۔ بعد میں اس ملغوبے کو قابل اطمینان نہ سمجھا گیا اور ان مضامین کی تعلیم دوسرے اداروں میں ہونے لگی۔

اس ادارے کا ماضی بہت شاندار ہے۔ اس میں سو سال سے السنۂ شرقیہ کی تعلیم و تربیت کا سلسلہ جاری ہے۔ ابتدا میں بدیشی حکمرانوں کو یہ جواز بہم پہنچانا تھا کہ مغربی ادب مشرقی ادب سے اور مغربی ثقافت مشرقی ثقافت سے بدرجۂ غایت برتر اور بہتر ہے۔ لیکن استعماری نظام کی جدلیاتی حرکت کو دیکھیے کہ انھی علوم کی بدولت اس خطے کے مسلمانوں میں خود آگہی پیدا ہوئی۔ نو آبادیاتی نظام میں محکوم قوموں کی "انا" کو مجروح کیا جاتا ہے۔ ان کی خودداری کو پامال کیا جاتا ہے۔

مجروح انا کے زخم ہمیشہ تابناک ماضی کی یاد ہی سے مندمل ہوتے ہیں۔ حکمرانوں کے جذبۂ تحقیر کی تسکین تو ہو گئی لیکن اس کا ایک ایجابی پہلو بھی نکل آیا اور وہ یہ کہ محکوموں کی خودی توانا تر اور مستحکم تر ہونے لگی۔

۱۸۸۲ء میں گورنر جنرل کی کونسل میں اس ادارے کے قیام کے بارے میں Sir Charles Aitchison نے کہا:

''جہاں جامعہ کے بلند ترین اعزاز صرف انہی لوگوں کے لیے مخصوص کیے جائیں گے جنہوں نے بلند ترین تعلیم حاصل کی ہے اور یہ امر مسلمہ ہے کہ آج کل یہ وہی لوگ حاصل کر سکتے ہیں جنہوں نے انگریزی زبان پر عبور حاصل کیا ہے، یونیورسٹی ان لوگوں کے علم و فضل کا بھی احترام کرے گی جو انگریزی زبان سے نابلد ہیں۔''

Sir Charles Aitchison نے یہ بات اکانوے سال پہلے کہی تھی یہ ایک حکمران جماعت کے خیالات کا نہایت واضح اظہار ہے۔ ہم نے ان خیالات اور ان مقاصد کے خلاف کہاں تک بغاوت کی ہے؟ انگریزی زبان سیکھنا اور اس میں مہارت حاصل کرنا آج کل کے عالمی حالات میں ہمارے لیے لازمی ہے لیکن کیا ہم آج بھی اسے بلند ترین علم کہہ سکتے ہیں؟ جوں جوں ہم اپنے ماضی سے آگاہی حاصل کرتے جائیں گے اجتماعی ''انا'' میں زیادہ قوت پیدا ہوگی۔ اس ادارے کا ماضی تو شاندار ہے۔ حال بھی تسلی بخش ہے۔ لیکن ابھی تک اس کے مستقبل کا کوئی واضح تصور قائم نہیں کیا گیا۔ جدید زمانے میں جب تک کوئی ادارہ یا کوئی شخص نشو و نما نہ پائے، یا پھلے پھولے نہیں، بقا کا مستحق نہیں بنتا۔ بقا اسی کو ہے جو داخلی تغیر و تبدل پر آمادہ ہو اور نگاہ میں وسعت پیدا کرنے پر راضی ہو۔

آج سے کوئی تیس برس پہلے کی بات ہے کہ میں نے گورنمنٹ کالج، لاہور سے فلسفے کا ایم۔اے کیا اور بیکاری سے تنگ آ کر اورینٹل کالج میں فارسی کے ایم۔اے میں داخل ہو گیا۔ کوئی ایک مہینہ

فارسی پڑھنے کے بعد میں نے اس کالج کو خیر باد کہا ۔ ترک فارسی کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ جس قسم کے فلسفے کا علم میں نے حاصل کیا تھا ، اس میں الفاظ اور تصورات کا تجزیہ اس قدر شدید اور جارحانہ تھا کہ الفاظ اور معانی کے روابط بڑی مشکل سے قائم رہ سکتے تھے ۔ ایم ۔ اے فارسی کی جماعتوں میں الفاظ کا وفور اور بیان کی روانی اتنی تند و تیز تھی کہ عقل اور تجزیہ اس سیلاب میں بہ جاتے تھے ۔ ابہام کے اس بھنور کو میں ایک مہینے سے زیادہ برداشت نہ کر سکا اور چل دیا ۔ اس حادثے کو تیس برس گذر گئے ہیں اور غالباً اسی کے زیر اثر میں اس عظیم ادارے کے مستقبل کے بارے میں چند خیالات پیش کرنا چاہتا ہوں ۔

ہمارے اساتذہ اور طلبا کا اس وقت سب سے بڑا مسئلہ علم و ادب میں معنویت قائم کرنا ہے ۔ طالب علم جو کچھ پڑھتا ہے یا سیکھتا ہے وہ اس کا تعلق روزمرہ کی زندگی سے پیدا کرنا چاہتا ہے ۔ آج کل کوئی علم کا شعبہ علم کے دوسرے شعبوں سے علیحدہ نہیں ہے ۔ مشرقی علم و ادب بھی اسی نقطۂ نظر سے دیکھے جا سکتے ہیں ۔ السنۂ شرقیہ کے ادارے میں یہ لازمی ہے کہ لسانیات (Linguistics) کی تعلیم دی جائے ۔ لسانیات ایک سائنس ہے ۔ لسانیات سے متعلق علم المعانی (Semantics) ہے ۔ اور Noam Chomsky کی راہ نمائی میں علم کا ایک اور شجر نفسیاتی لسانیات (Psycho-linguistics) بھی قد آور ہو رہا ہے ۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ علم کے یہ شعبے اسی ادارے میں جڑ پکڑیں اور یہیں ان کی آبیاری ہو اور نصابوں کی روایتی انداز میں ترتیب دینے والے حضرات نصاب آفرینی کریں اور کچھ اس طرح کریں کہ جو طالب علم گھر میں پنجابی زبان میں بات چیت کرتا ہے وہ فارسی، عربی اور اردو زبانوں کی شکلی اور معنوی خصوصیات سے اپنی بول چال کا تعلق قائم کر سکے ۔

یہی نہیں، ادب کو زندگی کے تمام پہلوؤں پر محیط ہونا پڑے گا، تمام علوم سے رشتے جوڑنے ہوں گے، عوام تک رسائی حاصل کرنا ہوگی اور

عوام کی ترجمانی کرنا ہوگی۔ اس لئے اسے تاریخ، فلسفہ، معاشیات، عمرانیات اور نفسیات کے پس منظر میں بھی دیکھنا ہوگا۔ ادبی تنقید کے نئے سانچے تیار کرنا ہوں گے۔ یہ کہہ دینا تو آسان ہے کہ :

ما قصۂ سکندر و دارا نخواندہ ایم　　　از ما بجز حکایت مہر و وفا مپرس

لیکن بسا اوقات سکندر و دارا کی آویزش سے عام انسان کے جذبۂ مہر و وفا کا خون ہو جاتا ہے۔ سکندر و دارا کے تصادم سے ادب بھی گریز نہیں کر سکتا۔ اگر گریز کرتا بھی ہے تو علامتی حربے استعمال کرتا ہے۔ اس لئے آج میں مہر و وفا کی حکایتیں لکھنے والوں سے یہ استدعا کرتا ہوں کہ وہ عوام کے ان فطری جذبات کو سکندر و دارا کی جنگ کے پس منظر میں دیکھیں۔ اسی طرح نوجوان طالب علموں کو تعلیم کے متعلق شعور معنی ہوگا اور اسی طرح اربابِ تعلیم و تحقیق میں تعلیم اور تحقیق کو زندہ کرنے اور منور کرنے کا حوصلہ پیدا ہو جائے گا۔

۱۸ نومبر ۱۸۸۲ء کو پنجاب یونیورسٹی کی پہلی کانووکیشن پر وائسرائے لارڈ رپن نے اس امر پر مسرت کا اظہار کیا کہ پنجاب کے اکابر نے اس جامعہ کی تأسیس میں دلچسپی لی ہے اور مالی معاونت بھی کی ہے۔ لارڈ رپن نے کہا :

> ”مجھے اس بات سے خوشی ہے کہ جہاں تک ممکن ہو سکے اس تعلیمی ادارے کا نظم و نسق اسی ضلع کے اکابر کے ہاتھوں میں رہے . . . اور اس طرح ہندوستان کی حکومت کے اس عزیز مقصد کی تکمیل میں مدد ہوگی کہ یہاں کے لوگوں کی سیاسی تربیت کی جائے تاکہ وہ اپنے پاؤں پر آپ کھڑے ہو سکیں۔ . . وقت آ گیا ہے کہ برصغیر میں برطانوی حکومت کا ایک اولیں مقصد یہ بھی ہو کہ جہاں تک ایک حکومت جائز حدود کے اندر کر سکتی ہے یہاں کے لوگوں کی ذہنی تربیت اور اجتماعی اور سیاسی نشو و نما کے لئے سہولتیں بہم پہنچائے۔“

”جہاں تک ممکن ہو سکے“ ”جائز حدود کے اندر“ قسم کے ذیلی الفاظ اس زمانے کی حکومت کے سیاسی مقاصد کو واضح کرتے ہیں۔ آج اس ادارے کا مقصد مکمل سیاسی، ثقافتی اور ادبی شعور پیدا کرنا

ہے اور انھی مقاصد کی روشنی میں یہ ادارہ ترقی کی منازل طے کرے گا۔ اس ادارے کو پنجاب کی National Institute of Languages بننا ہے۔ ہماری یہ آرزو ہے کہ حکومتِ پاکستان اسے Centre of Excellence کا درجہ دے دے۔ آخر میں اس عظیم ادارے یعنی اورینٹل کالج، لاہور کو اس کی سوویں سالگرہ پر مبارکباد پیش کرتا ہوں اور تمام مندوبینِ کرام کو تہ دل سے خوش آمدید کہتا ہوں اور اس کے اساتذہ اور طلبا سے یہ کہنے کی جرأت بھی کرتا ہوں کہ سالگرہ کے موقعے پر ماضی کا محاسبہ اور حال کا جائزہ لیا جاتا ہے۔ اپنی کامیابی پر خوشی کا اظہار کیا جاتا ہے لیکن مستقبل کے لئے نئے عزائم اور نئے عہد و پیمان کی تشکیل و ترتیب بھی کی جاتی ہے۔ آئیے آج ہم یہ عہد کریں کہ اس ادارے کی عظمت کو، شعور و آگہی کو، شدید تر اور تیز تر کر کے تابناک کریں گے اور اس عزم کی تکمیل کے راستے میں ہر مشکل پر قابو پائیں گے۔

محمد اجمل

لاہور

۱۲ مارچ ۱۹۷۳ء

مترجم : دکتر آفتاب اصغر

خطابهٔ دکتر محمد اجمل

رئیس دانشگاه پنجاب ـ لاهور

میهمان ممتاز ارجمند، نمایندگان محترم، خانمها و آقایان

ما امروز در اینجا دورهم جمع شده ایم تا صد مین سال تأسیس دانشکدهٔ خاورشناسی دانشگاه (پنجاب) را جشن بگیریم ـ اگرچه ارز یابی کار های بزرگی که این مؤسسه در ظرف صد سال اخیر انجام داده است آسان نیست باوجود آن میتوانیم ادعا کنیم که این دانشکده با روحیهٔ بیغرضانه و صمیمانه خدمات گرانبهائی در زمینهٔ علوم و ادبیات شرقی بجای آورده است ـ دانشمندانی معروف از قبیل دکتر جی، دبلیو ، لائتنر، دکتر آ ـ سی ـ وولنز، حافظ محمود شیرانی، مولانا شادان بلگرامی، پروفسور مولوی محمد شفیع و دکتر محمد اقبال که عهدیدار خدمت تدریس در این مؤسسه بوده اند به شاگردان خود دانش دقیق ابلاغ کردند و آنان را با ابراز عشق و علاقه به علم و دانش تشویق نمودند ـ شاعر متفکر اسلام، علامه محمد اقبال نیز در سال ۱۸۹۹ میلادی برای مدت کوتاهی بعنوان دانشیار مکلڈ عربی (Mc Leod Reador in Arabic) در این مؤسسه خدمت کرد ـ قبلاً در این مؤسسه در رشته های مهندسی کشوری، طب یونانی و آیورودیک نیز تدریس میشد ولی بعدها بعلت نامتجانس و نارضایت بخش بودن تدریس این رشته ها به مؤسسه های دیگر محول گردید ـ

این دانشکده گذشته درخشانی دارد ـ در این دانشکده تدریس در زمینه های گوناگون خاور شناسی از صد سال اخیر ادامه دارد ـ در بدو امر منظور حکمرانان خارجی از تأسیس این مؤسسه این بود که ادعای خود را که مبنی بر احساس تفوق و برتری فرهنگ و ادبیات غرب بر فرهنگ و ادبیات شرق بوده است، باثبات برسانند ولی جای بسی شگفتی است که در نتیجه این منطق

جذبۀ امپریالیستی، مطالعات مربوط به خاور شناسی میان مسلمانان شبه قاره هند و پاکستان احساسات خود شناسی و بیداری را بوجود آورد ـ در سیستم مستعمراتی از طرف حکمرانان سعی میشود که حس خود پرستی محکومان خود را نابود و مناعت نفس آنان را معدوم سازند ـ جراحتهای نفس مجروح فقط با تجدید خاطره گذشته درخشان ،میتواند التیام پذیرد ـ اگرچه با تأسیس این دانشکده حس تحقیر مستعمره نشینان نسبت به اتباع خود قانع شد با این حال از یک جهت تأسیس آن برای ثانی الذکر بمنزلۀ یکنوع نعمت غیر مترقبه ببار آمد زیرا براثر آن ''خودی'' و حس خود پرستی آنان قوی تر گردید ـ

نودو یک سال پیش ، در سال ۱۸۸۲ میلادی ، سر چارلس آیچی سن در مورد تأسیس این مؤسسه در جلسه شورای فرماندارکل ملاحظات خود را چنین اظهار داشت :

''ـ ـ ـ ـ در صورتیکه قرار است عالی ترین امتیازات دانشگاه به کسانی اختصاص یابد که بلند ترین درجات علمی را احراز نمایند و این امر مسلّم است که در حال حاضر فقط کسانی میتوانند باحراز بالا ترین نشانات علمی نایل آیند که در رشته انگلیسی اطلاعات کامل دارند ـ البته دانشگاه شایستگی ادبی و استعداد علمی کسانی را نیز برسمیت خواهد شناخت که با زبان انگلیسی آشنایی ندارند'' ـ

این ملاحظات نشانه روشنی از طرز فکر طبقه حاکمه است ـ ما تا کجا علیه این اهداف و عقاید قیام کرده ایم؟ درشرایط و اوضاع فعلی جهان فرا گرفتن زبان انگلیسی و مسلط بودن برآن برای ما لازم است ولی آیا میتوانیم تسلط برزبان انگلیسی را تسلط بر عالی ترین نوع دانش بنامیم؟ هر اندازه آگاهی بیشتری راجع به سنن گذشته و فرهنگ خود بهم برسانیم همان اندازه بیشتر ''خودی اجتماعی'' ما قوی‌تر میگردد ـ

این دانشکده گذشته درخشانی دارد ـ حالش نیز از گذشته اش کمتر نیست البته تاکنون دربارۀ آینده اش نمیتوانیم پیشگوئی کنیم ـ در عصر حاضر هیچ مؤسسه‌ای یا شخصی استحقاق زنده ماندن را ندارد تاوقتیکه همواره برای روبرو شدن با عمل مداوم نشو و نمای حاضر و آماده نباشد زیرا بقا متکی است بر وسعت نظر و آمادگی برای تطبیق با مقتضیات متحول زمان ـ

من در حدود سی سال پیش از دانشکده دولتی لاهور باخذ درجه فوق لیسانس فلسفه نائل آمدم - بخاطر اینکه شغلی دیگر نداشتم در دانشکده دولتی در فوق لیسانس فارسی ثبت نام کردم ولی تقریبا یک ماه بعد آنرا بوداع گفتم - یکی از علل اینکه من مطالعات مربوط به فارسی را بدرود گفتم این بود که من در دوران تحصیل فلسفه با تجزیه و تحلیل گستاخانه و منتقدانه کلمات و تصورات و نتیجه گیری از طرز بیان افکار عادت کرده بودم و برخلاف آن در زبان فارسی بعلت کثرت الفاظ و قلت معنی دسترسی به این چیزها تقریباً غیر ممکن بود - بنا برین نتوانستم در مقابل فشار گرداب ابهام ایستادگی کنم و مطالعات فارسی را ادامه بدهم و این پیشآمد سی سال پیش اتفاق افتاد و محتملاً تحت تأثیر و نفوذ همان پیش آمد است که من دربارهٔ هیئت آینده این مؤسسه بزرگ عقایدی چند تنظیم کرده ام -

بزرگترین مسئله ای که در حال حاضر استادان و دانشجویان ما با آن روبرو هستند اینست که چطور در ادبیات و زمینه‌های دیگر دانش معنویت و واقعیت بوجود بیاورند - یک نفر دانشجو میخواهد رابطه‌ای بین زندگی روزمره و هر آنچه را که او میخواند یا یاد میگیرد، برقرار سازد - در عصر حاضر هیچ شاخه‌ای از علم و دانش از شاخه‌های دیگر جدا نیست بلکه تمام شاخه‌های علم و دانش با همدیگر پیوند ناگسستنی دارند - دانشهای شرقی را نیز میتوان با این زاویه نظر نگاه کرد - بعقیدهٔ من در مؤسسه زبانهای شرقی تدریس زبانشناسی از بس لازم است - زبانشناسی یکنوع دانش است - علم معانی یکی از شاخه‌های مهم آنست و براهنمائی **Noam Chomsky** یکی دیگر ازشاخه‌های این دانش یعنی زبانشناسی روانی نیز بسرعت دارد رشد میکند - لازم است که اینگونه شاخه‌های دانش نیز در این دانشکده معرفی شوند و مورد تشویق قرار بگیرند تا رو بتکامل بگذارند - استادانی که تاکنون بطور یکنواخت برنامه و مواد درسی را تنظیم و تهیه میکرده اند، حالا باید در آن تحولاتی بوجود بیاورند برای اینکه دانشجوئی که در خانه خود پنجابی صحبت میکند بتواند رابطه ای میان صفات مشخص فارسی، عربی، اردو و زبان مادری خود برقرار سازد -

اما اینهم کافی نیست ـ ادبیات باید تمام حوزه های زندگی را احاطه کند، با سایر شاخه‌های دانش روابط استوار سازد، سعی کند به مردم عادی دسترسی داشته باشد و امیال و آرمانهای آنها را تفسیر کند ـ

بنا برین برای قضاوت دربارهٔ ادبیات دور نمای عقب تاریخ و فلسفه و اقتصاد و جامعه شناسی و روانشناسی را باید در نظر داشت و اصول تازه انتقاد ادبی ساخت ـ خواندن این بیت :

ما قصهٔ سکندر و دارا نخوانده ایم ـ از ما بجز حکایت مهر و وفا مپرس کافی نیست ـ اما زد و خورد میان اسکندر و داریوش احتمالاً احساسات محبت و صداقت مردم عادی را میکشد ـ ادبیات نمیتواند از اثرات برخورد میان اسکندر و داریوش صرفنظر کند. حتی اگر سعی آن هم بکند، باوجود آن نمیتواند از استعمال رموز و علائم مربوط به‌چنین برخورد خودداری کند ـ ازینجهت من از کسانی که داستانهای رمانتیک مربوط به صداقت و محبت مینویسند استدعا میکنم که احساسات طبیعی انسان را درمقابل دور نمای برخورد میان اسکندر و داریوش مشاهده کنند ـ فقط از این طریق است که دانشجویان جوان معنای تحصیلات خود را خواهند فهمید و فرهنگیان و دانشمندان در تعلیمات خود جانی تازه خواهند دمید و به نوشتجات خود نیروئی جدید خواهند بخشید ـ

هنگام برگزاری نخستین جلسه توزیع اسناد و جوائز دانشگاه پنجاب روز هیجدهم نوامبر ۱۸۸۲ میلادی، نائب السلطنه لرد ریپن که سرپرست دانشگاه بود، در مورد اظهار علاقه رهبران پنجاب در امر تأسیس این دانشگاه و کمک مالی آنها اظهار رضایت کرد و در اینمورد چنین گفت :

"این امر برای من موجب مسرت است که قرار است این مؤسسه فرهنگی تا آنجائیکه امکان دارد توسط رجال ممتاز این ناحیه اداره شود و ازینرو آن هدف بزرگ سیاسی را که دولت هندامروزی در نظر دارد و آن عبارت است از تقویت و پیشرفت امر تربیت سیاسی مردم در اداره امور محلی، بسیار تقویت و وسیله پیشرفت زیاد آنرا فراهم خواهد کرد ـ حالا وقت مناسب آن فرا رسیده است که دولت بریتانیهٔ هند تا آنجائیکه دولتی در چهار چوب

حدود مناسب میتواند، در مورد فراهم کردن فرصتهای مناسب برای تربیت ذهنی و پیشترفت اجتماعی و سیاسی مردم را یکی از بزرگترین اهداف و مرامهای خود قرار بدهد''۔

تعبیرات مانند ''تاآنجائیکه امکان دارد'' و ''در چهار چوب حدود مناسب'' اهداف سیاسی دولت آنزمان را منعکس میسازد۔ باوجود این، امروز، هدف این مؤسسه اینست که شعور و آگاهی تام سیاسی و فرهنگی و ادبی را بعمل آورد۔ فقط با در نظر داشتن این اهداف این مؤسسه میتواند مراحل مختلف پیشرفت و تکامل خود را طی کند۔ این مؤسسه قرار است بدرجه ''انستیتوی ملی زبانهای پنجاب'' ارتقاً یابد ۔ آرزوی ما اینست که دولت پاکستان این مؤسسه را درجه ''مرکز فضیلت'' اعطاً کند۔

در پایان من بمناسبت جشن صدمین سال تأسیس به این مرکز بزرگ علمی از صمیم قلب تبریک و به نمایندگان ممتاز خوش آمد میگویم ولی میخواهم بجرأت خاطر نشان کنم که در موقع چنین جشن مرسوم است از گذشته و حال ارزیابی بعمل آید ۔ هنگامیکه دربارهٔ کارهای بزرگ گذشته اظهار رضایت میشود دربارهٔ آینده نیز باید تصمیمهای نو گرفته و روشهای تازه اتخاذ شود ۔ بیائید امروز همه ما تصمیم بگیریم که برشکوه و جلال و حرمت و شهرت این مؤسسه خواهیم افزود و در راه ترویج و تعمیم محصولات فکری و مشاغل فاضلانه آن خواهیم کوشید ونخواهیم گذاشت که موانعی در راه وصول به این اهداف ایجاد گردد۔

لاهور

۱۲ مارس ۱۹۷۳ء



ڈاکٹر جسٹس ایس اے رحمان، صدر مجلس یوم تاسیس اورینٹل کالج

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

خطبۂ صدارت

ڈاکٹر جسٹس ایس - اے رحمٰن

(صدر، جشن صد سالہ کمیٹی)

میرے لیے یہ امر باعث صد شرف و افتخار ہے کہ مجھے ممتاز علماء و فضلاء کے اس تاریخی اجتماع سے خطاب کرنے کا موقع عطا ہوا ہے۔ آج کی محفل میں بعض ایسے اہل علم و حکمت موجود ہیں جو دور دراز کی مسافت طے کر کے یونیورسٹی اورینٹل کالج لاہور کے جشن صدی میں شرکت کے لیے تشریف لائے ہیں - ان کے ورود سے اس تقریب کا وقار اور اس کی رونق دوبالا ہوگئی ہے - مجھے امید ہے کہ لاہور کے تاریخی شہر میں ان کا قیام خوشگواری کا حامل ہوگا۔ میں انہیں یقین دلاتا ہوں کہ ان کی کرم فرمائیوں کی یاد ہمارے ممنون احسان دلوں کے لیے ایک قیمتی سرمایہ کی حیثیت رکھے گی۔

انسانی زندگی کی طبعی مدت کی حد صاحب زبور کے اشارے کے مطابق تین کوڑی اور دس سال ہونی چاہیے - معلوم نہیں کہ اگر کوئی فرد اس حد سے تجاوز کر کے سو کے پیٹے میں آ جائے تو اس کے کیا احساسات ہوں گے - کم از کم میں اس قسم کے کسی ذاتی تجربے کا دعویٰ نہیں کرسکتا - بہر حال آسمانی صحیفوں کے مطابق انسانی زندگی کے لیے غالباً یہ ارذل العمر کا مرحلہ ہوگا - لیکن شاید اداروں کی نسبت اس قسم کی حد بندی ان کی کسر شان کے مترادف ہوگی - قیاس چاہتا ہے کہ ادارہ کی صورت میں قدیم تر اور بہتر میں مساوات ہو کیوں کہ دستبرد زمانہ سے اس کی صیانت ہی اس کی افادیت پر دال ہوگی - اس خیال کی روشنی میں اورینٹل کالج کے جشن صدی کا جواز اور اس کی اہمیت وضاحت طلب نہیں ہے -

پنجاب کا علاقہ ۱۸۴۹ء میں برطانوی عملداری میں آیا - سکھوں کے عہد میں سرکاری زبان فارسی تھی - انگریزوں کی آمد کے بعد سرکار دربار

میں فارسی کی جگہ اردو کو ملی۔ مدارس میں بھی اردو ذریعۂ تعلیم ہوگئی اور اسی زبان میں درسی کتابیں تالیف و ترجمہ ہونے لگیں ۔ پنجاب میں باقاعدہ محکمۂ تعلیم کا آغاز جنوری ۱۸۵۶ء میں ہوا ۔ ۱۸۵۸ء میں کمپنی راج ختم ہوا اور برعظیم براہ راست تاج برطانیہ کے زیر نگیں آ گیا ۔ ۱۸۶۴ء میں گورنمنٹ کالج لاہور کی تاسیس ہوئی ۔ اس ادارہ میں طلبا کو کلکتہ یونیورسٹی کے امتحانات کے لیے تیار کیا جاتا تھا ۔ ڈاکٹر جی ۔ ڈبلیو ۔ لائٹنر کا تقرر بطور پرنسپل گورنمنٹ کالج اسی سال سے ہوگیا ۔ ان کی توجہ اور کوشش سے ۲۱ جنوری ۱۸۶۵ء کو انجمن پنجاب کی داغ بیل لاہور میں ڈالی گئی ۔ اس ادارہ کے مقاصد میں قدیم مشرقی علوم کا احیاء شامل تھا ۔ اگست ۱۸۶۵ء میں انجمن پنجاب کے ایک جلسے میں ڈاکٹر لائٹنر نے اورینٹل یونیورسٹی کا تصور پیش کیا اور اسے پرجوش پذیرائی نصیب ہوئی ۔ ان کا خیال تھا کہ ان کے تخیل کی یونیورسٹی ایسی ہو گی جس میں، ان کے اپنے الفاظ میں ''زبانہائے مشرق، تعلیم کی بنیاد ہوں اور ان زبانوں کے ذریعے سے یورپ کے علوم کی تعلیم ہو'' ۔ اورینٹل یونیورسٹی کی تجویز حکومت کو بھجوائی گئی لیکن اس کی فوری پذیرائی نہ ہوسکی ۔ ۲۷ مئی ۱۸۶۸ء کو گورنمنٹ پنجاب نے ہند سرکار کی خدمت میں، لاہور یونیورسٹی کے قیام کی سفارش کی ۔ کیوں کہ کلکتہ یونیورسٹی کا طریق تعلیم، پنجاب کی تعلیمی ضروریات سے ہم‌آہنگ نہ تھا ۔ مرکزی حکومت کے نام صوبائی حکومت کے ایک مکتوب مورخہ ۱۱ فروری ۱۸۶۹ء میں رائج الوقت انگریزی تعلیم کے بارے میں یہ دلچسپ فقرہ درج ہے کہ ''یہ امر ظاہر ہے کہ جنھوں نے اعلیٰ تعلیم پائی ہے، وہ اس تعلیم کے باعث اپنے ہم وطنوں سے علیحدہ ہو گئے ہیں اور اخلاقی نتیجہ اس تعلیم کا اچھا اور عمدہ نہیں ہوا'' ۔ اورینٹل یونیورسٹی تو قائم نہ ہوئی لیکن ۸ دسمبر ۱۸۶۹ء کو یونیورسٹی کالج لاہور کے اجراء کا اعلان ہوا ۔ بعد میں یہی ادارہ ''پنجاب یونیورسٹی کالج'' کے نام سے موسوم ہوا۔ ڈاکٹر لائٹنر اس کالج کے پہلے رجسٹرار مقرر ہوئے ۔ مشرقی السنہ و علوم کا مسئلہ یونیورسٹی کالج کی سینٹ میں زیر بحث آیا ۔ مئی ۱۸۷۰ء میں سینٹ نے لاہور میں ''مدرسۃ العلوم مشرقی'' کے قیام کا

فیصلہ کیا ۔ مارچ ۱۸۷۲ء تک یہ ادارہ اورینٹل اسکول کہلایا ۔ اس کے بعد اسے اورینٹل کالج کا نام دیا گیا اور سکول کے علاوہ کالج کی جماعتیں بھی جاری کر دی گئیں ۔

اورینٹل کالج کی زندگی عسر و یسر اور نشیب و فراز سے خالی نہیں رہی۔ پہلے پہل تو یہ ادارہ، اندرون شہر کرایہ کی عمارتوں میں مکین رہا ۔ ۱۸۷۴ء میں جب گورنمنٹ کالج لاہور کی عمارت مکمل ہوگئی تو اس کے ایک گوشہ میں اورینٹل کالج کو بھی اقامت ملی ۔ لیکن عمارت میں شریک غالب کی خود افزائی کے طفیل ، اورینٹل کالج کی اقامتی حدود متواتر سمٹتی رہیں۔ ڈاکٹر لائٹنر جو گورنمنٹ کالج کے پرنسپل اور یونیورسٹی کالج کے رجسٹرار کے فرائض بھی انجام دیتے تھے ، اورینٹل کالج کے پہلے پرنسپل نامزد ہوئے ۔ سات برس تک وہ اس عہدہ پر اعزازی حیثیت سے کام کرتے رہے۔ یکم اگست ۱۸۷۷ء سے انہوں نے ۵۰۰ روپے ماہوار کا مشاہرہ لینا قبول کیا۔ انتظامی امور کے علاوہ ، سپرنٹنڈنٹ تحقیق و تصنیف کی ذمہ داریوں کا بار بھی ان کے فراخ کندھوں پر تھا ۔ بعد میں یہ شعبہ اور بزرگوں کے سپرد ہوتا رہا ۔ اورینٹل کالج کے مقاصد میں تدریس علوم و السنہ کے علاوہ تحقیق و تصنیف اور ان کی طباعت و اشاعت کا اہم کام بھی شامل تھا ۔ اس مقصد کے پیش نظر ریسرچ رفقاء (فیلوز) کی اسامیاں تخلیق ہوئیں۔ کالج سے عربی اور سنسکرت کے علمی تحقیقی ماہوار رسالے بھی شائع ہونے لگے۔ عربی کا ماہنامہ ''شفاءالصدور'' مولانا فیض الحسن سہارنپوری کی ادارت میں نکلا اور سنسکرت کے رسالہ ''ودیودای'' کے مدیر پنڈت رکھی کیش شاستری تھے ۔ کالج کی علمی فضا کی اساس بہت حد تک اس کے پہلے پرنسپل کے خلوص اور محنت کی مرہون منت تھی ۔

اورینٹل کالج نے استغنا کا یہ حال تھا کہ اسے حکومت سے کوئی مالی امداد نہ ملتی تھی، سوائے اس کے کہ اسے گورنمنٹ کالج کے سایۂ عاطفت میں اقامت کے لیے چند کمرے میسر تھے ۔ اس فیاضی کا معاوضہ، گورنمنٹ کالج کو بعض مضامین میں تدریسی امداد کی صورت میں ادا کیا جاتا تھا ۔ اورینٹل کالج کے اخراجات، عوام کے عطیوں اور امراء اور روساء کی

امدادی رقوم سے پورے کیے جاتے تھے ۔ ہاں کالج کا الحاق رسمی طور پر پنجاب یونیورسٹی کالج سے تھا جس کی مالی معاونت گورنمنٹ کے ذمہ تھی۔

کالج کے ابتدائی دور میں، جو ۱۸۷۰ء سے ۱۸۸۲ء تک ممتد تھا، اورینٹل کالج میں متعدد مضامین کی تدریس ہوتی رہی ۔ زبانوں میں عربی، فارسی، سنسکرت کے علاوہ، اردو، ہندی، گورمکھی، پشتو، پڑھائی جاتی تھیں ۔ طلبا کو ۲۲ امتحانات کے لیے تیار کیا جاتا تھا۔ ان میں آرٹس کے شعبہ میں، انٹرنس (اردو و ہندی) پرافیشینسی، اعلیٰ پرافیشنسی، آنرز ان آرٹس (السنہ شرقیہ، تاریخ، ریاضی)، مشرقی السنہ و ادبیات کے شعبہ میں، منشی، منشی فاضل، مولوی، مولوی عالم، مولوی فاضل، پراگ، بشارد، شاستری، قانون میں لیگل ٹائٹلز (شرع اسلامی)، لیگل ٹائٹلز (دھرم شاستر) یونانی طب میں حکیم حاذق، عمدۃ الحکماء زبدۃ الحکماء، آیور ویدک میں ویدیہ، بھیکھک، راج ویدیہ، سول انجینرنگ (پہلا امتحان)، ورنیکلر دفاتر (امور سول، فوجداری، مالیات) گورمکھی میں بدیمن، ودوان اور حساب اور خوش نویسی کا امتحان (پبلک ملازمت کے سلسلے میں)، شامل تھے ۔ ان امتحانات کے علاوہ ایف ۔ اے اور بی ۔ اے کے عربی فارسی، سنسکرت کے ان نصابات کی تدریس بھی اورینٹل کالج میں ہوتی تھی، جنھیں کلکتہ اور پنجاب کی یونیورسٹیوں نے تجویز کیا تھا ۔ یہ بات دلچسپی سے خالی نہیں کہ اسی زمانہ میں یعنی ۱۸۷۵ء میں، (بعد کے معروف ادیب و مورخ مولانا شبلی نعمانی لاہور پہنچے اور انہوں نے مولانا فیض الحسن سہارنپوری، صدر شعبہ عربی کی خدمت میں حماسہ پڑھنے کے لیے زانوئے ادب تہ کیا کیونکہ وہ داخلہ کا وقت گذر جانے کے بعد آئے تھے، اس لیے انہیں بطور اضافی (Casual) طالب علم کے، جماعت میں بیٹھنے کی اجازت دی گئی تھی ۔

اورینٹل کالج کا دوسرا دور ۱۸۸۲ء سے شروع ہو کر ۱۹۱۰ء میں اختتام پذیر ہوا ۔ ۱۴ اکتوبر ۱۸۸۲ء کو پنجاب یونیورسٹی کا قیام عمل میں آیا ۔ ڈاکٹر لائٹنر یونیورسٹی کے پہلے رجسٹرار مقرر ہوئے ۔ یونیورسٹی میں ایک باقاعدہ اورینٹل فیکلٹی وجود میں آئی اور اس میں، بی ۔ او ۔ ایل اور ایم ۔ او ۔ ایل کی ڈگریاں جاری کرنے کی منظوری دی گئی ۔ ۱۸ نومبر

کو پنجاب یونیورسٹی کا پہلا کانووکیشن ہوا ، لارڈ رپن وائسرائے ہند بطور سرپرست، اس تقریب میں شریک ہوئے ۔ قابل تذکرہ بات یہ ہے کہ ڈاکٹر لائٹنر نے اس موقع پر یونیورسٹی کی سالانہ رپورٹ کا خلاصہ، اردو میں پڑھا ۔ اس سلسلہ میں اردو کو اپنانے کی اولیت کا سہرا انہی کے سر ہے۔ ان کی خدمات جلیلہ کے اعتراف میں یونیورسٹی کی طرف سے انہیں ڈی او ایل کی اعزازی ڈگری عطا ہوئی - ۱۸۸۴ء میں گورنمنٹ کالج میں عربی اور سنسکرت کے شعبوں کو ختم کر دیا گیا ۔ نتیجہ کے طور پر مشہور ادیب مولانا محمد حسین آزاد (اسسٹنٹ پروفیسر عربی) اور پنڈت بھگوان داس (اسسٹنٹ پروفیسر سنسکرت) گورنمنٹ کالج سے اورینٹل کالج میں منتقل کر دیے گئے ۔ حکیم الامت علامہ ڈاکٹر سر محمد اقبال مرحوم، جو ۱۸۹۹ء میں گورنمنٹ کالج سے ایم اے (فلسفہ) میں کامیاب ہوئے تھے، اسی سال ، اورینٹل کالج سے بطور میکلوڈ پنجاب عربک ریڈر منسلک ہوئے اور چار برس تک اسی ادارہ میں درس و تدریس اور تصنیف و تالیف کے فرائض انجام دیتے رہے۔ واکر کی سیاست مدن کا اردو ترجمہ اور اردو میں علم الاقتصاد پر تالیف ان کے اسی زمانہ کی یادگاریں ہیں

اس دور میں اورینٹل کالج میں دیگر جماعتوں کے علاوہ بی۔او۔ایل، ایم ۔ او ۔ ایل اور بی ۔ اے کی جماعتیں شروع ہوئیں ۔ بی ۔ اے کے طالب علم اورینٹل کالج میں مشرقی زبانوں کی تعلیم پاتے تھے اور انگریزی کے مضمون کے لئے ، گورنمنٹ کالج کی جماعتوں میں شریک ہوتے تھے ۔ تعلیمی لین دین کا یہ سلسلہ، اورینٹل کالج ، میڈیکل اسکول ، ٹریننگ کالج، وٹرنری کالج، کے مابین بڑی کامیابی سے چلتا رہا ۔

اسی زمانہ میں کچھ اہم تبدیلیاں، اورینٹل کالج میں عمل میں آئیں۔ علوم و فنون کی جماعتوں کو بند کر دیا گیا ۔ انجنیئرنگ کی جماعتیں جون ۱۸۸۸ء سے میو سکول آف آرٹس کو سونپ دی گئیں اور بعد میں انہیں گورنمنٹ کالج مغل پورہ کا حصہ بنا دیا گیا ۔ طب کی یونانی اور آیورویدک کی جماعتیں بھی یکم جون ۱۸۸۸ء سے میڈیکل اسکول کو منتقل ہوئیں ۔ کچھ عرصہ وہاں رہنے کے بعد، یہ جماعتیں علی الترتیب، اسلامیہ کالج اور ڈی ۔ اے ۔ کالج لاہور میں بھیج دی گئیں ۔ انجمن حمایت اسلام

لاھور کے طبیہ کالج کی بنیاد یہی جماعتیں ھیں۔ قانون کی جماعتیں کالج میں کچھ عرصہ تک جاری رھیں لیکن یہ سلسلہ بھی ، بعد میں ، گاؤ خورد کے کھاتے میں چلا گیا - ۱۸۸۸-۸۹ء سے عربی اور سنسکرت میں آرٹس کی ایم - اے جماعتوں کا اجراء ھوا - کالج میں آرٹس فیکلٹی کے انٹرنس، ایف - اے اور بی - اے کے ان طلبا کے داخلہ کا سلسلہ بھی منقطع ھو گیا جو یہ امتحانات انگریزی ذریعۂ تعلیم کی معرفت دینا چاھتے تھے - یوں کالج کی ھمہ پہلو حیثیت ، جو اسے عملاً ایک دارالعلوم کا درجہ دیے ھوئے تھی، ختم ھو گئی - بقول ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار ، مرتب ''تاریخ یونیورسٹی اورینٹل کالج لاھور'' اس کے بعد یہ ادارہ '' صرف مشرقی السنہ کی تدریس و تحقیق کا ایسا مرکز بن کر رہ گیا ، جہاں دور جدید کے تقاضوں کی روشنی میں مشرقی و مغربی افکار کے عمومی مطالعے کے ساتھ ساتھ ، مشرقی زبانوں کے علمی ، ادبی ، لسانی اور صوتی پہلوؤں کے خصوصی مطالعے کو زیادہ اھمیت دی جانے لگی''۔ مشہور ماھر آثار قدیمہ ، سر مارک آرل سٹائن، اسی دور میں کچھ عرصہ کالج کے پرنسپل رھے۔ ان کے بعد مشہور فاضل سر ٹی - ڈبلیو - آرنلڈ نے اس عہدہ کو زینت بخشی - سامعین کو یاد ھو گا کہ علامہ اقبال نے اپنے استاد آرنلڈ کی یاد میں ایک نظم بھی لکھی تھی - ۱۹۰۰ء میں عالم فاضل جماعتوں کے فارغ التحصیل طلبا کے لیے یہ ممکن ھو گیا کہ وہ میٹرک، ایف - اے ، بی - اے، بی - او - ایل کی اسناد صرف انگریزی کا امتحان دے کر حاصل کر سکیں .

اورینٹل کالج کا تیسرا دور حیات ۱۹۱۱ء سے ۱۹۱۸ء تک پھیلا ھوا ھے - ۱۹۱۳ء میں یونیورسٹی نے کونونٹ اسکول کی عمارت خرید کر، اورینٹل کالج اور لا کالج کو اس میں متمکن کر دیا - ۱۹۱۰-۱۱ء سے اورینٹل کالج کا سکول کا شعبہ تخفیف کی زد میں آ گیا اور یہی حادثہ بی - او - ایل کی جماعتوں پر بھی گذرا - ۱۹۱۳ء کے بعد بی - اے (آرٹس) کی مشرقی زبانوں کی جماعتیں ختم کر دی گئیں کیونکہ گورنمنٹ کالج نے ان کا اھتمام خود کر لیا - اس دور میں کھیلوں کی طرف بھی کچھ توجہ ھوئی - ۱۹۱۲ء میں کالج کی فٹ بال ٹیم کی تاسیس کا تذکرہ تاریخ میں ملتا ھے۔ اسی دوران میں طلبا کے لیے بیڈ منٹن اور دریائے راوی پر

کشتی رانی کا بھی اہتمام ہوا ۔ م ۱۹۱۳ء میں اورینٹل کالج کا باوقار کتب‌خانہ یونیورسٹی لائبریری کی نذر ہوگیا ۔ یونیورسٹی لائبریری کے حق میں یہ اضافہ گراں مایہ ثابت ہوا ہوگا کیونکہ بیان ہوتا ہے کہ ۱۹۰۳ء تک یونیورسٹی لائبریری کی کل کائنات دو الماریوں تک محدود تھی ۔

کالج کے چوتھے دور کا آغاز ۱۹۱۹ء میں ہوا اور اس کا اختتام اگست ۱۹۴۷ء میں ہوا ، جب پاکستان ایک آزاد مملکت کی حیثیت سے دنیا کے نقشے پر ابھرا ۔ اسی دور میں بی ۔ اے آنرز، آنرز سکول اور ایم۔اے جماعتوں کو السنہ شرقیہ میں تعلیم دینے کا کام بتدریج اورینٹل کالج کے سپرد ہوا اور ان مضامین میں ، لاہور کے تمام کالجوں کے طلبا، اورینٹل کالج کی جماعتوں میں شریک ہونے لگے۔ ایم ۔ اے (فارسی) کی جماعت کی بھی اسی زمانے میں تأسیس ہوئی۔ ڈگری اور ایم ۔ اے کی جماعتوں کے علاوہ، پی ایچ ۔ ڈی اور ڈی لٹ کے لیے اعلیٰ تحقیق کا کام اسی دور میں شروع ہو گیا تھا ۔

یونیورسٹی کے وائس چانسلر ، سر جان مینارڈ کی کوششوں سے، اورینٹل کالج کی عمارت ۱۹۲۰ء میں پایۂ تکمیل تک پہنچی ۔ اسوقت کے پرنسپل ڈاکٹر اے ۔ سی وولز کے قول کے مطابق یہ کالج کے نقل مکانی کی ساتویں نوبت تھی ۔ یہ سال اس لئے بھی کالج کی تاریخ میں ممتاز ہے کہ فروری ۱۹۲۰ء سے اورینٹل کالج میگزین ، پروفیسر مولوی محمد شفیع کی ادارت اعلی میں ، نکلنا شروع ہوا، جس نے جلد ہی علمی دنیا میں اپنا سکہ بٹھا دیا ۔ ۱۹۲۶ء میں لا کالج اور اورینٹل کالج کا مشترکہ ہال تعمیر ہوا، جس کا نام اس کے بانی کے نام پر مینارڈ ہال منظور ہوا ۔ دارالاقامت کی تعمیر کے لیے کالج کو ۱۹۲۹ء تک انتظار کرنا پڑا ۔ عملی طور پر اب کالج پنجاب یونیورسٹی کا بہرۂ علوم شرقیہ بن چکا ہے، جس میں تعلیم اور تحقیق دونوں قسم کی سرگرمیاں جاری تھیں ۔ ۱۹۲۸ء میں کالج کے پرنسپل ڈاکٹر وولنر نے وائس چانسلر کا عہدہ بھی سنبھال لیا ۔ اسی سال ، اردو ہندی اور گورمکھی کے تین لیکچراروں کی آسامیاں کالج میں قائم ہوئیں، جن پر معروف فاضل، حافظ محمد محمود خاں شیرانی، ڈاکٹر بنارسی داس جین

(پنجابی انگریزی ڈکشنری کے مؤلف) اور سردار (بعد میں ڈاکٹر) موھن سنگھ دیوانہ کا تقرر عمل میں آیا ۔ ۳۳-۱۹۳۲ء میں اینڈرسن یونیورسٹی کمیشن نے کالج کے عالم فاضل سلسلے پر کڑی نکتہ چینی کی اور مشرقی السنہ کی جماعتوں کو عام آرٹس سکولوں اور کالجوں میں مدغم کرنے کی سفارش کردی

ڈاکٹر وولنر کی وفات پر ۱۹۳۶ء میں پروفیسر مولوی محمد شفیع پرنسپل بنائے گئے - ۱۹۳۷ء میں کالج میں انجمن عربی و فارسی کی بنیاد رکھی گئی، جس نے اپنا ایک علمی مجلہ بھی شائع کیا۔ جب ۱۹۴۲ء میں مولوی محمد شفیع پرنسپل کے عہدے سے سبکدوش ہوئے تو ڈاکٹر لکشمن سروپ، پروفیسر سنسکرت، نے یہ ذمہ داری سنبھال لی - ۱۹۴۶ء میں وہ آنجہانی ہوگئے تو ڈاکٹر محمد اقبال، پروفیسر فارسی، پرنسپل مقرر ہوئے۔ یہ امر لائق ذکر ھے کہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں سنسکرت، فارسی اور عربی کے مخطوطات کا قیمتی ذخیرہ اورینٹل کالج کے ڈاکٹر وولنر، ڈاکٹر مولوی محمد شفیع اور حافظ محمود خان شیرانی کی علم دوستی کا مرھون منت ھے -

حصول آزادی کے بعد سے اب تک کا زمانہ ، کالج کی زندگی کا پانچواں دور ھے۔ اس کے آغاز میں کالج کے غیر مسلم اساتذہ ترک وطن کر کے بھارت چلے گئے ۔ نتیجہ یہ ھوا کہ کالج میں سنسکرت ھندی اور گورمکھی کے شعبے معطل ھوگئے۔ رفتہ رفتہ حالات سدھرتے گئے ۔ اکتوبر ۱۹۴۸ء سے کالج میں اردو کی ایم - اے کی جماعتوں کا آغاز ھوا - ۱۹۴۹ء میں ادیب فاضل اور ادیب عالم کی جماعتوں کا اضافہ ھوا - کالج میں بعض مشرقی اور مغربی زبانوں کی ڈپلوما اور سرٹیفکیٹ جماعتوں کا بھی اجرا ھوا، جن میں فرانسیسی، جرمن، روسی ، ھسپانوی، ترکی ، عربی، فارسی اور جاپانی زبانیں شامل ھیں۔ پرنسپل ڈاکٹر محمد اقبال ۲۱ مئی ۱۹۴۸ء کو اللہ کو پیارے ھو گئے۔ ان کی جگہ ڈاکٹر برکت علی قریشی پروفیسر عربی کا تقرر عمل میں آیا ۔ وہ کچھ عرصے کے لیے شام ، لبنان اور اردن میں پاکستان کے سفیر بنائے گئے لیکن ۱۰ جون ۱۹۵۱ء کو وہ کالج میں واپس آ گئے اور پرنسپل کا عہدہ پھر سے سنبھال لیا - ۱۹۵۴ء میں ان کی مدت ملازمت

ختم ہوگئی تو ڈاکٹر سید عبداللہ ، صدر شعبہ اردو پرنسپل بنا دیئے گئے ۔ اسی زمانے میں ، محسن اردو، شیخ سر عبدالقادر مرحوم نے بھی اعزازی حیثیت سے ، شعبۂ اردو میں تدریس میں حصہ لیا ۔ اس دور میں ، مصر اور شام کے چند مہمان اساتذہ بھی شعبہ عربی میں کام کرتے رہے ۔ ان میں السید امین المصری ، السید ابراہیم الرحیم ، السید فوزی حسن خلیل کے اسمائے گرامی قابل ذکر ہیں ۔ آج کل کالج میں فارسی زبان و ادب کے شعبہ میں ایران کے ڈاکٹر احمد علی پناھی بھی تدریس میں حصہ لے رہے ہیں ۔

۱۹۵۴ء میں نیا یونیورسٹی ایکٹ نافذ ہوا تو عالم فاضل امتحانات کو یونیورسٹی کی تحویل سے نکال کر ، ثانوی بورڈ کے سپرد کر دیا گیا ۔ یوں کالج کا یہ قدیم ترین سلسلہ تعطل کا شکار ہو گیا ۔ پھر عالم جماعتیں بند کر دی گئیں ۔ البتہ نومبر ۱۹۶۴ء سے فاضل جماعتوں کی تجدید ہوگئی ۔ ۱۹۶۰ء میں عربی زبان و ادبیات میں بی ۔ اے آنرز سکول کی جماعت کا آغاز ہوا ۔ اردو زبان و ادبیات میں بھی ، اسی نوع کی جماعت اکتوبر ۱۹۶۱ء سے جاری ہوئی ۔ جون ۱۹۵۸ء میں لسانیات و صوتیات کا ایک نیا شعبہ ، برٹش کونسل کے تعاون سے قائم ہوا ۔ اس شعبے کے سب پروفیسر اور ریڈر انگلستان اور امریکہ سے تعلق رکھتے ہیں ۔ اس شعبے نے لسانی تحقیق کے علاوہ لسانیات و صوتیات کی سرٹیفکیٹ اور ڈپلوما جماعتوں کا بھی آغاز کر دیا ۔ اس دور میں کالج میں طلبا کی تعداد میں بھی نمایاں اضافہ ہوا ۔ ملایا ، یوگنڈا ، افریقہ ، اٹلی ، جاپان ، امریکہ ، فرانس انگلستان، ترکی اور ایران سے وقتاً فوقتاً طالب علم اس کالج میں تعلیم حاصل کرتے رہے ۔

۱۹۵۰ء میں اردو دائرۃ المعارف اسلامیہ کا عظیم منصوبہ یونیورسٹی نے منظور کیا اور ڈاکٹر مولوی محمد شفیع (سابق پرنسپل) کی خدمات بطور صدر شعبہ و مدیر اعلیٰ، حاصل کی گئیں ۔ ان کی رحلت کے بعد کئی اور فاضل حضرات یکے بعد دیگرے، اس شعبہ کے صدر رہے ۔ موجودہ صدر ، ڈاکٹر سید عبداللہ کالج کے سابق پرنسپل ہیں ۔

اردو کی بڑھتی ہوئی اہمیت کے پیش نظر ، ۱۹۴۸ء میں ڈاکٹر سید عبداللہ کی کوششوں سے اور یونیورسٹی کی سرپرستی میں آل پاکستان اردو کانفرنس کا انعقاد لاہور میں ہوا ۔ دسمبر ۱۹۵۶ء میں لاہور میں پہلی بار پاکستان اورینٹل کانفرنس منعقد ہوئی جس میں غیر ملکی فضلاء بھی شریک ہوئے۔ اس کی تنظیم میں ڈاکٹر سید عبداللہ، ڈاکٹر محمد باقر پروفیسر فارسی، ڈاکٹر شیخ عنایت اللہ پروفیسر عربی اور کالج کے دیگر اساتذہ نے نمایاں خدمات انجام دیں ۔ اسی کانفرنس کے دوران میں ایک اردو اکیڈمی کی بنیاد رکھی گئی ، جس کا مقصد اولیٰ سائنسی علوم کو اردو میں منتقل کرنا قرار پایا ۔ ڈاکٹر بشیر احمد مرحوم وائس چانسلر اور ڈاکٹر رضی الدین صدیقی، علی الترتیب اس کے ڈائریکٹر اور ڈاکٹر سید عبداللہ اس کے جنرل سیکریٹری مقرر ہوئے ۔ اکیڈیمی اب بھی ، زیر نگرانی ڈاکٹر سید عبداللہ سرگرم عمل ہے۔ انہی کی توجہ اور محنت کے طفیل ، ۱۹۵۹ء میں لاہور میں ، مغربی پاکستان اردو کانفرنس کا انعقاد ہوا ۔ جس کی صدارت، بابائے اردو، ڈاکٹر مولوی عبدالحق نے کی ۔ اس کانفرنس میں اردو کو ذریعۂ تعلیم بنانے کے سلسلے میں، اہم اور دور رس تجاویز منظور ہوئیں ان میں سے بعض کو قومی تعلیمی کمیشن ۱۹۶۹ء نے اپنی رپورٹ میں پذیرائی بخشی۔ ۱۹۶۱ء میں اردو تدریس کانفرنس کا انعقاد ڈاکٹر سید عبداللہ اور پروفیسر وقار عظیم کی کوششوں کا مرہون تھا۔ اس زمانے میں یونیورسٹی نے اردو میں غالب پروفیسر کی آسامی ، اورینٹل کالج میں قائم کی ۔ اس پر پروفیسر وقار عظیم کا تقرر ہوا ۔ ڈاکٹر سید عبداللہ کی پرنسپل کے عہدے سے سبکدوشی کے بعد ۱۹۶۵ء میں ، ڈاکٹر محمد باقر پروفیسر فارسی ، پرنسپل بنائے گئے ۔ ان کے سلسلۂ ملازمت کے اختتام پر موجودہ پرنسپل ڈاکٹر عبادت بریلوی، کالج کے سربراہ ہو گئے ۔ پروفیسر وقار عظیم بھی ملازمت سے فارغ ہو چکے تھے اور اردو کی غالب پروفیسری بھی ڈاکٹر عبادت بریلوی کے حصے میں آئی ۔ حال ہی میں کالج میں پنجابی شعبے کا اجرا بھی ہو گیا ہے۔

یہ ہے اورینٹل کالج کی مختصر روئداد زندگی ۔ اس ادارے کی تشکیل و ترقی میں جن قدسی نفس بزرگوں نے مختلف ادوار میں حصہ لیا ، ان میں چند ایک ممتاز نام یہ ہیں : ڈاکٹر جی ڈبلیو لائٹنر،

مولانا فیض الحسن سہارنپوری، شمس العلماء مولانا عبدالحکیم کلانوری، شمس العلماء مفتی مولانا محمد عبداللہ ٹونکی ، شمس العلماء مولانا محمد حسین آزاد، علامہ ڈاکٹر سر محمد اقبال، ڈاکٹر سرمارک آرل اسٹائن ، سرٹامس آرنلڈ، ڈاکٹر اے سی وولنر، ڈاکٹر مولوی محمد شفیع، ڈاکٹر لکشمن سروپ، مولانا عبدالعزیز میمن، سید اولاد حسین شاداں بلگرامی، حافظ محمود خاں شیرانی ، ڈاکٹر موہن سنگھ دیوانہ ، ڈاکٹر بنارسی داس جین ، ڈاکٹر سوریا کانت، ڈاکٹر سید عبداللہ، شیخ سر عبدالقادر، ڈاکٹر محمد باقر، ڈاکٹر شیخ عنایت اللہ اور پروفیسر وقار عظیم۔ کالج کی عنان انصرام اب ڈاکٹر عبادت بریلوی کے ہاتھ میں ہے جو کہ ایک جانے پہچانے نقاد اور ادیب ہیں۔ میں نے طوالت کے خوف سے اور نام نہیں گنوائے ورنہ حق یہ ہے کہ تحقیق، تنقید و تصنیف کی روایت کے دھنی اور بھی ہیں ، جنہوں نے کالج میں کشت علم و فضل کی آبیاری کی ہے۔ ان میں سے بعض اب بھی کالج سے منسلک ہیں ۔ انہی میں ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار بھی شامل ہیں جن کی کالج کی تاریخ سے میں نے اس خطبہ کے سلسلے میں بھرپور استفادہ کیا ہے۔ ان سب اصحاب کی انفرادی اور اجتماعی مساعی سے اورینٹل کالج میں وہ علمی روایات قائم ہوئیں ، جو السنہ و علوم مشرقی کو نہ صرف اس ملک میں عزت و وقار کا مقام دلانے کی ضامن ہیں ، بلکہ بین الاقوامی سطح پر بھی اورینٹل کالج کو ایک احترام کے مستحق علمی اور تحقیقی ادارے کی حیثیت سے متعارف کرانے میں کامیاب رہیں ۔ ہم باری تعالیٰ کے حضور سر تشکر و نیاز خم کرتے ہیں کہ ہمیں آج کا جشن مسرت بیز دیکھنا نصیب ہوا اور دعا کرتے ہیں کہ یہ ادارہ یوں ہی پھلتا پھولتا رہے۔ علم و تحقیق کے موتی بکھیرتا رہے اور اسے آج کے سے صدھا جشن دیکھنے نصیب ہوں ۔ آمین ۔

۱۲ مارچ ۱۹۷۳ء

ایس ۔ اے ۔ رحمن

مترجم : دکتر آفتاب اصغر

خطبهٔ ریاست

دکتر جستس ایس - ای رحمان

بمناسبت

جشن صدمین سال تأسیس دانشکدهٔ خاور شناسی دانشگاه پنجاب، لاهور

این امر برای من موجب نهایت احترام و افتخار است که فرصت خطاب در این مجمع تاریخی ارباب علم و اصحاب فضل نصیبم شده است - در محفل امروز بعضی از ارباب علم و دانش کسانی هستند که برای شرکت در جشن صد سالهٔ دانشکدهٔ خاور شناسی دانشگاه پنجاب راه های دور و درازی را پیموده و با شرکت خود رونق این جشن را دو برابر نموده به اهمیت و حیثیت آن افزوده اند - امیدوارم که مدت اقامت ایشان در شهر تاریخی لاهور دارای خاطرات خوش خواهد ماند و متقابلاً بایشان اطمینان میدهم که خاطرات نوازشهای ایشان برای قلوب سپاسگزار ما نیز بمنزلهٔ سرمایهٔ گرانبهائی خواهد بود -

بنا بگفتهٔ صاحب زبور مدت طبیعی زندگانی یک نفر هفتاد سال میبا شد - معلوم نیست که اگر سن کسی از این حد متجاوز شده تا صد سالگی برسد چه نوع احساسات باو دست میدهد - اقلاً من در اینمورد بنا بر تجربه شخصی، نمیتوانم چیزی بگویم - بهر حال عمر صد ساله، طبق صحایف آسمانی، برای یک نفر، اغلباً ارزل العمر بشمار میرود ولی دربارهٔ مؤسسات نمیشود همچنین قضاوت کرد - قیاس حکم میکند که یک مؤسسه باید هر اندازه قدیم تر باشد همان اندازه بهتر باشد زیرا صیانت آن از دست حوادث روزگار، بجای خود دلیل بارز افادت آن خواهد بود - با در نظر داشتن این عقیده، علت برگزاری جشن صد سالهٔ دانشکدهٔ خاور شناسی، احتیاج به توجیه و توضیح ندارد -

ناحیهٔ پنجاب در سال ۱۸۴۹ میلادی بـه حوزهٔ اقتدار بریتانی در آمد ـ در دورهٔ سیکها زبان رسمی این ناحیه فارسی بود ـ پس از روی کار آمدن انگلیسها اردو جای فارسی را اشغال کرد و زبان رسمی و دولتی گردید ـ در مدارس نیز اردو بعنوان وسیلهٔ آموزش اتخاذ شد و کار تألیف و ترجمه نیز در همین زبان آغاز گردید ـ در پنجاب، ادارهٔ فرهنگ، بطور رسمی، در ژانویهٔ ۱۸۵۶ میلادی آغاز بکار کرد ـ در ۱۸۵۸ میلادی حکومت کمپانی (هند شرقی) پایان یافت و شبه قاره، بطور مستقیم، تحت تسلط تاج بریتانیه در آمد ـ در ۱۸۶۴ میلادی پایه گذاری دانشکدهٔ دولتی لاهور بعمل آمد ـ در این مؤسسه دانشجویان را برای شرکت در امتحانات دانشکده کلکته تربیت میکردند ـ در همین سال ریاست دانشکده دولتی لاهور بعهده دکتر جی ـ دبلیو ـ لائتز گذاشته شد و بر اثر توجه و کوشش او ۲۱ ژانویه ۱۸۶۵ میلادی انجمن پنجاب در لاهور تشکیل شد ـ هدف این مؤسسه احیای علوم قدیم شرق بود ـ در اوت ۱۸۶۵ میلادی ، در یکی از جلسات انجمن پنجاب، دکتر لائتز طرح دانشکدهٔ خاور شناسی را مطرح کرد که با استقبال گرمی روبرو گردید ـ نظرش این بود که دانشگاه مزبور باید دانشگاهی باشد که در آن طبق گفتهٔ خودش ''زبانهای شرقی واسطه تعلیم علوم غربی قرار بگیرند'' پیشنهاد تأسیس دانشگاه خاور شناسی فوری مورد موافقت دولت واقع نشد ـ بالاخره ۲۷ مه ۱۸۶۸ میلادی حکومت پنجاب در مورد تأسیس دانشگاه لاهور به دولت مرکزی هند سفارش کرد برای اینکه روش آموزشی دانشگاه کلکته با مقتضیات آموزشی پنجاب سازگار نبود ـ در طی یکی از نامه های رسمی مورخ ۱۱ فوریه ۱۸۶۹ میلادی که حکومت استانی دربارهٔ تعلیم متداول انگلیسی بنام حکومت مرکزی نوشته است، این جملهٔ جالب مندرج است : این امر روشن است که کسانیکه از تعلیم عالی برخوردار شده اند بر اثر این نوع تعلیم از هم میهنان خود جدا شده اند و از اینگونه تعلیم، از لحاظ اخلاقی، نتیجه خوب و مطلوبی ببار نیامده است'' ـ دانشگاه خاور شناسی که تأسیس نشد ولی ۸ دسامبر ۱۸۶۹ دانشکدهٔ دانشگاه لاهور بوجود آمد ـ بعدها همین مؤسسه باسم ''دانشکدهٔ دانشگاه پنجاب'' موسوم شد و دکتر لائتز نخستین رئیس دفتر این دانشکده تعین گردید ـ مسئله زبانها

و دانشهای شرقی در مجلس سنای دانشکدهٔ دانشگاه مورد بحث قرار گرفت و در سال ۱۸۷۰ مجلس سنای دانشگاه در مورد تأسیس ''مدرسهٔ علوم شرقی'' تصمیم گرفت ـ تا مارس ۱۸۷۲ء میلادی این مؤسسه ''مدرسهٔ خاور شناسی'' نامیده میشد ولی بعدها باسم ''دانشکدهٔ خاور شناسی'' موسوم شد و در آن علاوه بر کلاسهای مدرسه، کلاسهای دانشکده نیز دائر گردید ـ

زندگانی دانشکدهٔ خاور شناسی از عسر و یسر و فراز و نشیب عاری نبوده است ـ در بدو امر ، این مؤسسه در ساختمان‌های کرایه‌ای در داخل شهر واقع بود بعدا در سال ۱۸۷۶ء، وقتی ساختمان دانشکدهٔ دولتی لاهور باتمام رسید، دانشکدهٔ خاور شناسی نیز در یکی از گوشه‌های آن جائی پیدا کرد ولی هر اندازه که شریک غالب یعنی دانشکده دولتی به حدود خود افزایش میداد همان اندازه حدود دانشکدهٔ خاور شناسی بطور پیوسته رو به کاهش می نهاد ـ دکتر لائتنز که علاوه بر ریاست دانشکده دولتی بعنوان رئیس دفتر دانشکدهٔ دانشگاه نیز ادای وظیفه مینمود، بعنوان نخستین رئیس ، ریاست دانشکدهٔ خاور شناسی را نیز بعهده گرفت و تا هفت سال تمام بعنوان رئیس افتحاری این دانشکده کار خود را ادامه داد ـ البته از یکم اوت ۱۸۷۷ میلادی باقبول پانصد روپیه بعنوان حقوق موافقت نمود ـ او باضافه امور اداری مسئولیتای ناظر تحقیق و تصنیف را نیز بدوش فراخ خود میکشید ـ بعد ها این قسمت تحت نظارت بزرگان دیگر کار خود را ادامه داد ـ یکی از اهداف و مرامهای عمدهٔ دانشکده خاور شناسی علاوه برتدریس علوم و زبانهای شرقی، انجام دادن کار مهم تحقیق و تألیف و چاپ و نشر آن نیز بوده است ـ بهمین منظور سمتهائی برای دانش پژوهان حقوق بگیر بوجود آمدند و از طرف دانشکده مجله‌های علمی و تحقیقی ماهیانه نیز منتشر شدند ـ مجلهٔ عربی ''شفا الصدور'' تحت مدیریت مولانا فیض الحسن سهارنپوری اجرا گردید و سر دبیر مجلهٔ سانسکریت ''ودیووای'' پاندیت رکهی کیش شاستری بود ـ ایجاد محیط علمی در دانشکده بیشتر مدیون صمیمیت و مجاهدت نخستین رئیس آن بود ـ

فقر و استغنای دانشکدهٔ خاور شناسی بحدی بود که حتی کوچکترین اعانهٔ ملی از طرف دولت عاید آن نمیشد ـ فقط چند اطاق در محوطهٔ

دانشکدهٔ دولتی در اختیار آن گذاشته شده بود و بس و آنهم مشروط برآن بود که دانشکدهٔ خاور شناسی بپاداش آن در تدریس بعضی از دروس به دانشکدهٔ دولتی کمک کند ـ مخارج دانشکدهٔ خاور شناسی از عطابای مردم و کمکهای مالی اصحاب مکنت تأمین میشد البته این دانشکده بطور رسمی پیوسته به دانشکدهٔ دانشگاه پنجاب بود که کمک مالی آن بعهدهٔ دولت بود ـ

در دورهٔ ابتدائی دانشکدهٔ که از ۱۸۷۰ تا ۱۸۸۲ میلادی ادامه داشت، درسهای متعددی و از میان زبانها علاوه برزبانهای عربی، فارسی و سانسکریت، زبانهای اردو، هندی، گورمکی و پشتو در دانشکده خاور شناسی تدریس میشد ـ دانشجویان این دانشکده را برای شرکت در ۲۶ نوع امتحان تربیت میکردند که عبارت بودند از: امتحان نهائی دبیرستان (اردو و هندی)، امتحانات پروفیشنسی، پروفیشنسی عالی و آنرز در آرتس (زبانهای شرقی، تاریخ و ریاضیات) در رشته ادبیات، امتحانات منشی، منشی عالم، منشی فاضل، مولوی، مولوی عالم، مولوی فاضل، پراگ، بشارد و شاستری در رشته زبانهای شرقی و ادبیات، امتحانات فقه اسلامی و دهرم شاستر (فقه هندی) در رشته حقوق، امتحانات حکیم حاذق، عمدة الحکماء و زبدة الحکماء در رشتهٔ طب یونانی، امتحانات و یدیه، بهیکهک و راج ویدیه در رشتهٔ طب ایورودک، امتحانات مهندسی کشوری (امتحان اول)، امتحانات ادارات محلی (امور کشوری، لشکری و مالی)، امتحانات بدهی مان و ودوان و امتحانات ریاضی و حسن خط (برای حصول شغلی مربوط به‌کارهای مردم عامه)ـ باضافه این امتحانات کار تدریس مواد درسی امتحانات دیپلم و لیسانس عربی، فارسی وسانسکریت نیز که از طرف دانشگاه های کلکته و پنجاب بتصویب رسیده بود، در دانشکدهٔ خاور شناسی انجام میگرفت. در اینجا این امر خیلی جالب توجه است که در همین اوان یعنی در سال ۱۸۷۵ میلادی مولانا شبلی نعمانی (که بعدها نویسنده و مورخ معروفی ببار آمد) به لاهور آمد و از مولانا فیض الحسن سهارنپوری، رئیس قسمت عربی، در درس حماسه کسب فیض نمود چون او بعد از انقراض مهلت برای ثبت نام رسیده بود باو بعنوان شاگرد غیر رسمی اجازهٔ استفاده از درس داده شد.

دورهٔ دوم دانشکدهٔ خاور شناسی از ۱۸۸۲ میلادی آغاز گردید و در ۱۹۱۰ میلادی پایان یافت ـ روز چهاردهم اکتبر ۱۸۸۲ میلادی تأسیس دانشگاه پنجاب بعمل آمد و دکتر لائتز نخستین رئیس دبیرخانهٔ دانشگاه تعیین شد و در دانشگاه فاکولتهٔ رسمی خاور شناسی پایه گذاری شد که بآن اختیار اعطای دانشنامه های بی ـ او ـ ال (لیسانس زبانهای شرقی) و ام ـ او ـ ال (فوق لیسانس زبانهای شرقی) داده شد ـ ۱۸ نوامبر نخستین جلسهٔ پایان سال تحصیلی دانشگاه پنجاب تشکیل گردید که در آن لرد ریپون، نائب السلطنهٔ هند، بعنوان سرپرست دانشگاه شرکت کرد ـ در اینجا این امر شایستهٔ تذکره است که در این هنگام دکتر لائتز خلاصهٔ گزارش سالیانه دانشگاه را بزبان اردو قرأت نمود و میتوان گفت که در اینمورد نخستین کسی که اردو را اتخاذ نمود، همو بود ـ باعتراف خدمات شایسته از طرف دانشگاه درجهٔ دی ـ او ـ ال (دکترای ادبیات) باو اعطأ گردید ـ در ۱۸۸۴ میلادی بساط رشته های عربی و سانسکریت در دانشکدهٔ دولتی بر چیده شد و در نتیجه آن ادیب شهیر مولانا محمد حسین آزاد (پروفسور معاون عربی) و پاندیت بهگوان داس (پروفسور معاون سانسکریت) از دانشکده دولتی به دانشکده خاور شناسی منتقل شدند ـ حکیم الامت علامه دکتر سر محمد اقبال مرحوم نیز که در سال ۱۸۹۹ میلادی از دانشکدهٔ دولتی باحراز درجهٔ فوق لیسانس در رشتهٔ فلسفه نائل آمده بود، در همان سال بعنوان دانشیار عربی مکلود پنجاب به دانشکدهٔ خاور شناسی پیوست و تا چهار سال در همین مؤسسه در زمینهٔ تدریس و تصنیف و تألیف ادای وظیفه نمود ـ ترجمه اردوی ''سیاست مدن'' از واکر و کتابی بنام ''علم الاقتصاد'' از یادگارهای همین دورهٔ زندگانی اوست ـ

دراین‌دوره علاوه بر کلاسهای دیگر کلاسهای بی ـ او ـ ال (لیسانس زبانهای شرقی)، ام ـ او ـ ال (فوق لیسانس زبانهای شرقی) و بی ـ ای (لیسانس ادبیات) نیز در دانشکدهٔ خاور شناسی دائر گردید ـ دانشجویان بی ـ ای (لیسانس ادبیات) زبانهای شرقی در دانشکدهٔ خاور شناسی یاد میگرفتند و برای تحصیل در در رشته انگلیسی در کلاسهای دانشکدهٔ دولتی شرکت میکردند ـ این نوع مبادلهٔ فرهنگی میان دانشکدهٔ خاور شناسی، دانشکدهٔ دولتی، مدرسه پزشکی، دانش‌سرای عالی و دانشکدهٔ دامپزشکی با موفقیت تمام ادامه داشت ـ

در همین ایام بعضی از تغیرات مهم در دانشکدهٔ خاور شناسی رخ داد مثلاً کلا سهای علوم و فنون تعطیل گردید، کلاسهای مهندسی از ژوئن ۱۸۸۸ میلادی در ابتدا بعهدهٔ مدرسهٔ فنی میو گذاشته و بعداً بصورت قسمتی از دانشکدهٔ دولتی مغل پوره در آمدمشد، کلاسهای طب یونانی و طب ایورودک نیز از یکم ژوئن سال مزبور اول به مدرسهٔ پزشکی و بعد از مدتی بترتیب به دانشکدهٔ اسلامیه و دانشکدهٔ دی ـ ای ـ وی منتقل گردید تأسیس دانشکدهٔ پزشکی انجمن حمائت اسلام، روی اساس همین کلاسها بعمل آمد، کلاسهای حقوق نا مدت کوتاهی در دانشکده خاور شناسی ادامه داشت ولی بالاخره این کلاسها نیز پایان یافت ـ از سال ۸۹ - ۱۸۸۸ میلادی کلاسهای فوق لیسانس عربی و سانسکریت در این دانشکده دائر گردید ـ از پذیرش دانشجویان دوره نهائی و بیرستان، دیپلم و لیسانس فاکولتهٔ ادبیات نیز که میخواستند بوسیلهٔ انگلسیی امتحان بد هند، خودداری بعمل آمد و در نتیجه حیثیت متنوع و جامعی که در واقع این دانشکده را بصورت یک دانشگاه در آورده بود، از بین رفت ـ بنا بگفتهٔ دکتر غلام حسین ذوالفقار مؤلف تاریخ دانشکده خاور شناسی دانشگاه لاهور "بعد ازان این مؤسسه بصورت مرکزی درآمد که صرفاً با تدریس و تحقیق زبانهای شرقی اختصاص داشت و در آنجا طبق مقتضیات جدید زمان همزمان با مطالعه عمومی افکار و نظریات شرقی و غربی مطالعه خصوصی جنبه های علمی، ادبی، زبانی و صوتی، زبانهای شرقی بیشتر مورد اهمیت قرار گرفت" ـ باستان شناسی معروف، سرمارک آرل ستائن در همین دوره برای مدت کوتاهی عهدیدار ریاست این دانشکده ماند ـ بعد از او دانشمند معروف سر، تی ـ دبلیو ـ آرنولد زینت بخش این منصب عالی گردید ـ مستمعین محترم حتماً بیاد دارند که علامه اقبال بیاد استاد خود آرنولد منظومه‌ای نیز سروده است ـ در ۱۹۰۰ میلادی برای فارغ التحصیلان کلاسهای عالم و فاضل ممکن گشت که فقط با قبول شدن در امتحان انگلیسی بتوانند اسناد و مدارک میترک (دوره نهائی دبیرستان)، دیپلم لیسانس و لیسانس زبانهای شرقی را بدست بیاورند ـ

سومین دوره زندگانی دانشکدهٔ خاورشناسی از سال ۱۹۱۱ میلادی تا ۱۹۱۸ میلادی امتداد دارد ـ در سال ۱۹۱۳ میلادی دانشگاه ساختمان

مدرسه کونونت را خریداری کرد و دانشکدهٔ خاور شناسی و دانشکدهٔ حقوق را در آن جای داد در ۱۹۱۰ میلادی قسمت مدرسهٔ دانشکده خاور شناسی دستخوش تخفیف و بعدها کلاسهای بی - او - ال (لیسانس زبانهای شرقی) نیز بهمین سرنوشت دوچار گردید - بعد از ۱۹۱۳ میلادی کلاسهای زبانهای شرقی بی - ای (ادبیات) نیز تعطیل شد برای اینکه دانشکدهٔ دولتی این کلاسها را تحت نظارت مستقیم خود دائر کرد - در ایندوره ورزشهای تفریحی نیز طرف توجه دانشکدهٔ خاور شناسی قرار گرفت - در ۱۹۱۲ میلادی ذکر تشکیل تیم فتبال در تاریخ دانشکدهٔ بچشم میخورد - در همین دوره برای دانشجویان وسایل مربوط به بازی بدمنتون و اسباب قایق رانی در رودخانه راوی نیز فراهم گردید - درسال ۱۹۱۳ - ۱۴ میلادی کتابخانهٔ با شکوه دانشکدهٔ خاور شناسی به کتابخانه مرکزی دانشگاه محول گردید - امید است که کتابهای گرانبهای دانشکده خاور شناسی، ارزش و اهمیت کتابخانهٔ دانشگاهٔ را بمراتب بالا برده باشد زیر گفته میشود که تا ۱۹۰۳ میلادی مجموع کتابهای کتابخانه دانشگاه شامل فقط دو قسمه بود -

دوره چهارم دانشکدهٔ در ۱۹۱۹ میلادی آغاز گردید و در ۱۹۴۷ میلادی موقعی اختتام پذیرفت که پاکستان بعنوان یک کشور مستقل روی نقشه جهان نقش بست - در همین دوره بود که کار تدریس زبانهای شرقی به کلاسهای بی - ای آنرز، آنرز اسکول و ام - ای بطور انحصاری متدرجاً به دانشکدهٔ خاورشناسی محول و در این کلاسها شرکت دانشجویان تمام دانشکدهٔ های لاهور آغاز گردید - کلاس فوق لیسانس فارسی نیز در همین زمان دائر گردید- علاوه بر کلاسهای لیسانس و فوق لیسانس کار تحقیقی درجه یک برای احراز درجه دکتری و دکترای ادبیات نیز در همین دوره شروع شده بود -

در نتیجه فعالیتهای سرجان مینارد، معاون رئیس دانشگاه، ساختمان دانشکدهٔ خاورشناسی در ۱۹۲۵ میلادی باتمام رسید - بنا بگفته رئیس آنوقت این هفتمین بار بود که این دانشکده نقل مکان کرد - این سال از اینجهت نیز در تاریخ دانشکدهٔ ممتاز است که از فوریه ۱۹۲۵ میلادی تحت مدیریت پروفسور مولوی محمد شفیع کار انتشار مجله دانشکدهٔ خاورشناسی آغاز گردید

در همین ایام بعضی از تغیرات مهم در دانشکدهٔ خاور شناسی رخ داد مثلاً کلاسهای علوم و فنون تعطیل گردید، کلاسهای مهندسی از ژوئن ۱۸۸۸ میلادی در ابتدا بعهدهٔ مدرسهٔ فنی میو گذاشته و بعداً بصورت قسمتی از دانشکدهٔ دولتی مغل پوره در آمده شد، کلاسهای طب یونانی و طب ایوروید ک نیز از یکم ژوئن سال مزبور اول به مدرسهٔ پزشکی و بعد از مدتی بترتیب به دانشکدهٔ اسلامیه و دانشکدهٔ دی ـ ای ـ وی منتقل گردید تأسیس دانشکدهٔ پزشکی انجمن حمائت اسلام، روی اساس همین کلاسها بعمل آمد، کلاسهای حقوق تا مدت کوتاهی در دانشکده خاور شناسی ادامه داشت ولی بالاخره این کلاسها نیز پایان یافت ـ از سال ۸۹ - ۱۸۸۸ میلادی کلاسهای فوق لیسانس عربی و سانسکریت در این دانشکده دائر گردید. از پذیرش دانشجویان دوره نهائی و بیرستان، دیپلم و لیسانس فاکولتهٔ ادبیات نیز که میخواستند بوسیلهٔ انگلسیی امتحان بد هند، خودداری بعمل آمد و در نتیجه حیثیت متنوع و جامعی که در واقع این دانشکده را بصورت یک دانشگاه در آورده بود، از بین رفت ـ بنا بگفتهٔ دکتر غلام حسین ذوالفقار مؤلف تاریخ دانشکده خاور شناسی دانشگاه لاهور "بعد ازان این مؤسسه بصورت مرکزی درامد که صرفاً با تدریس و تحقیق زبانهای شرقی اختصاص داشت و در آنجا طبق مقتضیات جدید زمان همزمان با مطالعه عمومی افکار و نظریات شرقی و غربی مطالعه خصوصی جنبه های علمی، ادبی، زبانی و صوتی، زبانهای شرقی بیشتر مورد اهمیت قرار گرفت" ـ باستان شناسی معروف، سرمارک آرل ستائن در همین دوره برای مدت کوتاهی عهدیدار ریاست این دانشکده ماند ـ بعد از او دانشمند معروف سر، تی ـ دبلیو ـ آرنولد زینت بخش این منصب عالی گردید ـ مستمعین محترم حتماً بیاد دارند که علامه اقبال بیاد استاد خود آرنولد منظومه‌ای نیز سروده است ـ در ۱۹۰۰ میلادی برای فارغ التحصیلان کلاسهای عالم و فاضل ممکن گشت که فقط با قبول شدن در امتحان انگلیسی بتوانند اسناد و مدارک میترک (دوره نهائی دبیرستان)، دیپلم لیسانس و لیسانس زبانهای شرقی را بدست بیاورند ـ

سومین دوره زندگانی دانشکدهٔ خاور شناسی از سال ۱۹۱۱ میلادی تا ۱۹۱۸ میلادی امتداد دارد ـ در سال ۱۹۱۳ میلادی دانشگاه ساختمان

مدرسه کونونت را خریداری کرد و دانشکدهٔ خاور شناسی و دانشکدهٔ حقوق را در آن جای داد در ۱۹۱۰ میلادی قسمت مدرسهٔ دانشکده خاور شناسی دستخوش تخفیف و بعدها کلاسهای بی ـ او ـ ال (لیسانس زبانهای شرقی) نیز بهمین سرنوشت دوچار گردید ـ بعد از ۱۹۱۳ میلادی کلاسهای زبانهای شرقی بی ـ ای (ادبیات) نیز تعطیل شد برای اینکه دانشکدهٔ دولتی این کلاسها را تحت نظارت مستقیم خود دائر کرد ـ در ایندوره ورزشهای تفریحی نیز طرف توجه دانشکدهٔ خاور شناسی قرار گرفت ـ در ۱۹۱۲ میلادی ذکر تشکیل تیم فتبال در تاریخ دانشکدهٔ بچشم میخورد ـ در همین دوره برای دانشجویان وسایل مربوط به بازی بدمنتون و اسباب قایق رانی در رودخانه راوی نیز فراهم گردید ـ در سال ۱۴ - ۱۹۱۳ میلادی کتابخانهٔ با شکوه دانشکدهٔ خاور شناسی به کتابخانه مرکزی دانشگاه محول گردید ـ امید است که کتابهای گرانبهای دانشکده خاور شناسی، ارزش و اهمیت کتابخانهٔ دانشگاهٔ را بمراتب بالا برده باشد زیر گفته میشود که تا ۱۹۰۳ میلادی مجموع کتابهای کتابخانه دانشگاه شامل فقط دو قفسه بود ـ

دوره چهارم دانشکدهٔ در ۱۹۱۹ میلادی آغاز گردید و در ۱۹۴۷ میلادی موقعی اختتام پذیرفت که پاکستان بعنوان یک کشور مستقل روی نقشه جهان نقش بست ـ در همین دوره بود که کار تدریس زبانهای شرقی به کلاسهای بی ـ ای آنرز، آنرز اسکول و ام ـ ای بطور انحصاری متدرجاً به دانشکدهٔ خاور شناسی محول و در این کلاسها شرکت دانشجویان تمام دانشکدهٔ های لاهور آغاز گردید ـ کلاس فوق لیسانس فارسی نیز در همین زمان دائر گردید. علاوه بر کلاسهای لیسانس و فوق لیسانس کار تحقیقی درجه یک برای احراز درجه دکتری و دکترای ادبیات نیز در همین دوره شروع شده بود ـ

در نتیجه فعالیتهای سرجان مینارد، معاون رئیس دانشگاه، ساختمان دانشکدهٔ خاور شناسی در ۱۹۲۵ میلادی باتمام رسید ـ بنا بگفته رئیس آنوقت این هفتمین بار بود که این دانشکده نقل مکان کرد ـ این سال از اینجهت نیز در تاریخ دانشکدهٔ ممتاز است که از فوریه ۱۹۲۵ میلادی تحت مدیریت پروفسور مولوی محمد شفیع کار انتشار مجله دانشکدهٔ خاور شناسی آغاز گردید

که درمدت کوتاهی در سراسر محافل علمی جهان بعنوان مجله وزین علمی و تحقیقی برسمیت شناخته شد ـ در ۱۹۲۶ میلادی تالار مشترک دانشکده حقوق و دانشکدهٔ خاور شناسی تأسیس و باسم مؤسس خود ''تالار مینارد'' موسوم گردید و اما برای تأسیس باشگاه این دانشکده ناچار بود تا ۱۹۲۹ انتظار بکشد ـ حالا در واقع این دانشکدهٔ بصورت یک ناکولتهٔ علوم شرقی دانشگاه پنجاب درآمده بود که در آن فعالیتهای گوناگون هم در زمینه تدریس و هم در زمینهٔ تحقیق ادامه داشت ـ در ۱۹۲۸ میلادی رئیس دانشکدهٔ خاورشناسی دکتر وولنر معاونت رئیس دانشگاه را نیز بعهده گرفت ـ همدرین سال سه کرسی برای مدرسین اردو، هندی و گورمکی در دانشکده خاور شناسی بوجود آمد که برای آنها انتصاب دانشمندانی معروف و برجسته مثل حافظ محمد محمود خان شیرانی، دکتر بنارسی داس جین (مؤلف فرهنگ پنجابی به انگلیسی، و سردار (بعد ها دکتر) موهن سینگ دیوانه بعمل آمد ـ در ۳۳ - ۱۹۳۲ میلادی کمیسیون دانشگاهی آندرسن، کلاسهای عالم و فاضل دانشکدهٔ را بشدت مورد انتقاد قرار داد و برای ادغام کلاسهای زبانهای شرقی به مدارس و دانشکدهٔ های عمومی سفارش کرد ـ

پس از درگذشت دکتر وولنر در سال ۱۹۳۶ میلادی پروفسور مولوی محمد شفیع ترفیع رتبه‌یافته رئیس دانشکدهٔ شد ـ در ۱۹۳۷ میلادی در دانشکده انجمنی بنام انجمن عربی و فارسی تشکیل شد که مجله‌ای علمی و تحقیقی نیز انتشار داد ـ وقتی در ۱۹۴۲ میلادی پروفسور مولوی محمد شفیع از منصب ریاست باز نشسته شد، دکتر لکشمن سروپ، پروفسور سانسکریت، این مسئولیت را بعهده گرفت و وقتی او، در ۱۹۴۶ میلادی ''آنجهانی'' شد، دکتر محمد اقبال، پروفسور فارسی، بمنصب ریاست منصوب گردید ـ این امر شایستهٔ تذکراست که گنجینهٔ گرانبهای نسخ خطی سانسکریت، فارسی وعربی کتابخانهٔ دانشگاه پنجاب مدیون دانش دوستی استادان دانشکدهٔ خاور شناسی مثل دکتر وولنر، دکتر مولوی محمد شفیع، دکتر محمد اقبال و حافظ محمد محمود شیرانی میباشد ـ

دورهٔ بعد از استقلال تاکنون پنجمین دورهٔ زندگانی این دانشکده است ـ درآغاز ایندوره استادان غیر مسلمان دانشکده ترک وطن نموده به

بهارات مهاجرت کردند ـ در نتیجه رشته های سانسکریت، هندی و گورمکهی تعطیل شدند ولی بعدها اوضاع متدرجاً رو به بهبود نهاد ـ از اکتبر ۱۹۴۸ میلادی در دانشکده کلاس فوق لیسانس اردو دائر شد و در ۱۹۴۹ میلادی کلاسهای ادیب فاضل و ادیب عالم برآن اضافه گردید ـ علاوه برآن کلاسهای دیپلم و گواهی نامهٔ بعضی از زبانهای شرقی و غربی از قبیل فرانسه، آلمانی، شوروی، اسپانیولی، ترکی، عربی، فارسی و ژاپونی نیز اجرا گردید ـ

دکتر محمد اقبال ۲ اپریل ۱۹۴۸ میلادی فوت شد و بجای او دکتر برکت علی قریشی، پروفسور عربی، بریاست دانشکده منصوب گردید ـ او برای مدت کوتاهی بعنوان سفیر پاکستان در سوریه، لبنان و اردن ادای وظیفه نمود ولی دهم ژوئن ۱۹۵۱ میلادی باز گشت و ریاست دانشکده را از سرِ نو ست گرفت ـ وقتی در ۱۹۵۳ میلادی او باز نشسته شد، دکتر سید عبدالله، رئیس قسمت اردو، بعنوان رئیس دانشکده جای او را گرفت ـ در همین دوره محسن اردو شیخ سر عبد القادر، رحوم نیز بعنوان استاد افتخاری در قسمت اردو تدریس نمود ـ در ایندوره بعضی از استادان میهمان مصر و سوریه نیز در قسمت عربی در امر تدریس اشتغال داشته اند ـ از این قبیل استادان گرامی اسامی السید امین المصری، السید ابراهیم الرحیم و السید فوزی حسن خلیل شایسته تذکراند ـ در این روزها در قسمت فارسی دانشکده یکنفر استاد ایرانی دکتر احمد علی پناهی در تدریس فارسی مشغول همکاری است ـ

وقتي در سال ۱۹۵۴ میلادی قانون جدید دانشگاه بنفاذ پیوست، نظارت امتحانهای عالم و فاضل از دانشگاه تحویل گرفته به هیئت فرهنگی دبیرستانها و مدارس متوسطه محول گردید و بالنتیجه قدیمترین سلسله امتحانات دانشکده خاتمه یافت ـ بعدها کلاسهای عالم تعطیل گردید البته از نوامبر ۱۹۶۴ میلادی کلاسهای فاضل از نوشروع شد ـ در ۱۹۶۰ میلادی در قسمت زبان و ادبیات عربی و همینطور از اکتبر ۱۹۶۱ در قسمت زبان و ادبیات اردو نیز کلاس بی ـ ای آنرز اسکول دائر گردید ـ در ژوئن ۱۹۵۸ میلادی بهمکاری انجمن بریتانی شعبهٔ جدیدی مربوط به زبانشناسی و صوت شناسی در دانشکده افتتاح شد ـ همه استادان و دانشیاران این شعبه

متعلق به انگلستان و آمریکا بودند ـ این شعبه علاوه بر تحقیق در رشتهٔ زبانشناسی کلاسهای دیپلم و گواهی نامهٔ زبانشناسی و صوت شناسی را نیز آغاز کرد ـ در این دوره تعداد دانشجویان در این دانشکده بطور محسوسی رو به افزایش نهاد ـ در دوره‌های مختلف دانشجویان مالزی، یوگاندا، افریقا، ایتالیا، ژاپون، آمریکا، فرانسه، انگلستان، ترکی و ایران در این دانشکده مشغول تحصیل بوده اند ـ

در سال ۱۹۵۰ میلادی پروژه عظیم اینسائیکلو پیدی اسلام اردو بتصویب دانشگاه رسید و نظارت و مدیریت این شعبه بعهده دکتر مولوی محمد شفیع (رئیس سابق) گذاشته شد ـ پس از رحلت او دانشمندان متعددی یکی پس از دیگری عهدیدار ریاست این شعبه بوده اند ـ رئیس فعلی این شعبه، دکتر سید عبد الله، رئیس سابق این دانشکده میباشد ـ

با در نظر داشتن اهمیت روز افزون اردو، در سال ۱۹۴۸ میلادی در نتیجه تلاشهای دکتر سید عبدالله تحت سرپرستی دانشگاه یک کنفرانس اردو برسطح کشور در لاهور منعقد گردید ـ در ۱۹۵۶ میلادی نخستین بار در لاهور کنفرانس خاورشناسی پاکستان برپا شد که در آن دانشمندان خارجی نیز شرکت نمودند در انعقاد این کنفرانس، دکتر سید عبدالله، دکتر محمد باقر، پروفسور فارسی، دکتر شیخ عنایت الله پروفسور عربی و استادان دیگر دانشکده خدمات برجسته انجام دادند ـ در دوران همین کنفرانس اکادمی اردو را بنای نهادند که هدف اصلی آن انتقال علوم به اردو قرار گرفت ـ دکتر بشیر احمد مرحوم معاون رئیس دانشگاه و دکتر رضی الدین صدیقی بترتیب مدیر عامل و دکتر سید عبد الله دبیر عمومی تعین شدند ـ این اکادمی تاکنون تحت نظارت دکتر سید عبدالله مشغول فعالیت است ـ در نتیجه توجه و تلاش او در سال ۱۹۶۹ میلادی در لاهور کنفرانس اردوی پاکستان غربی بریاست بابای اردو دکتر مولوی عبد الحق منعقد گردید ـ در این کنفرانس در مورد اتخاذ اردو بعنوان وسیلهٔ فرهنگ، بعضی از پیشنهادهای مهم و مؤثر بتصویب رسید و بعدها بعضی از این پیشنهادها در گزارش کمیسیون فرهنگی ملی ۱۹۶۹ میلادی نیز جای گرفت ـ انعقاد کنفرانس تدریس اردو در سال ۱۹۶۱ میلادی مدیون کوششهای دکتر سید عبدالله و پروفسور وقار عظیم بود ـ در آن زمان دانشگاه

منصب استاد غالب شناسی را در دانشکده خاور شناسی بوجود آورد و پروفسور وقار عظیم باین منصب منصوب گردید. پس از باز نشستگی دکتر سید عبدالله در ۱۹۶۰ میلادی، ریاست دانشکده به دکتر محمد باقر، پروفسور فارسی، رسید و پس از باز نشستگی وی رئیس فعلی دکتر عبادت بریلوی رئیس دانشکده گردید ـ چون در این مدت پروفسور وقار عظیم باز نشسته شده بود منصب استادی غالب شناسی نیز به دکتر عبادت بریلوی تعلق گرفت ـ در همین اواخر در دانشکده احیای شعبه پنجابی نبز بعمل آمده است ـ

این هست شرح مختصری از زندگانی دانشکده خاور شناسی ـ بزرگان محترمی که در ادوار مختلف در تشکیل و ترقی این مؤسسه شریک و سهیم بوده اند اسامی بعضی از ممتاز ترین آنها بدینقرار است : دکتر جی، دبیلو لائتنر، مولانا فیض الحسن سهارنپوری، شمس العلماء مولوی محمد حسین آزاد، علامه دکتر سر محمد اقبال، دکتر سر مارک آرل استائین، سر توماس آرنولد، دکتر ای ـ سی وولنر، دکتر مولوی محمد شفیع، دکتر لکشمن سروپ، مولانا عبدالعزیز میمن ، سید اولاد حسین شادان بلگرامی، حافظ محمد محمود خان شیرانی، دکتر موهن سینگ دیوانه، دکتر بنارسی داس جین ، دکتر سوریا کانت، دکتر سید عبدالله، دکتر محمد باقر، شیخ سر عبد القادر، دکتر شیخ عنایت الله و پروفسور وقار عظیم ـ در حال حاضر زمام امور دانشکده در دست دکتر عبادت بریلوی است که یک منتقد و نویسنده معروف است ـ من بخاطر اجتناب از تطویل زیاد اسم نبرده ام و الا حق اینست که کسانی دیگر نیز در این دانشکده وجود دارند که پاسدار سنت دیرینه تحقیق و تنقید و تصنیف و تألیف هستند و دارند کشت علم و فضل را سیراب میکنند و از آنجمله یکی دکتر غلام حسین ذوالفقار است که من از تاریخ دانشکدهٔ او در این خطابه استفادهٔ سرشار برده ام ـ در نتیجهٔ کوششهای فردی و اجتماعی این همه اصحاب است که در دانشکدهٔ خاور شناسی سنن و روایات علمی بوجود آمده اند که نه تنها متضمن عزت و توقیر آن در خود این کشور اند بلکه بر سطح بین المللی نیز باعث شناخته شدن این دانشکدهٔ بعنوان یک مؤسسه شایستهٔ احترام علمی و تحقیقی هستند ـ در پایان من بدرگاه ایزد متعال سر تشکر و امتنان خودم را خم میکنم که مرا توفیق نظارت همچنین جشن پر

مسرت ارزانی فرمود و دعا میکنم که این مؤسسه همیشه همینطور راه پیشرفت و ترقی را بپیماید و درهای علم و تحقیق بیافشاند و صدها جشن مثل جشن امروزی نصیبش گرداند ـ آمین ـ

۱۲ ـ مارس ۱۹۷۳ میلادی ـ

اس ـ ای ـ رحمان

دوسرا اجلاس

اورینٹل کالج کی ادبی خدمات

خطبات و مقالات

ڈاکٹر عبادت بریلوی

پروفیسر حمید احمد خاں

فیض احمد فیض

ڈاکٹر محمد حمید اللہ

ڈاکٹر عبدالحمید

ڈاکٹر محمد باقر

پروفیسر سید وقار عظیم

ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار

ابتدائی تقریر

ڈاکٹر عبادت بریلوی

خواتین و حضرات !

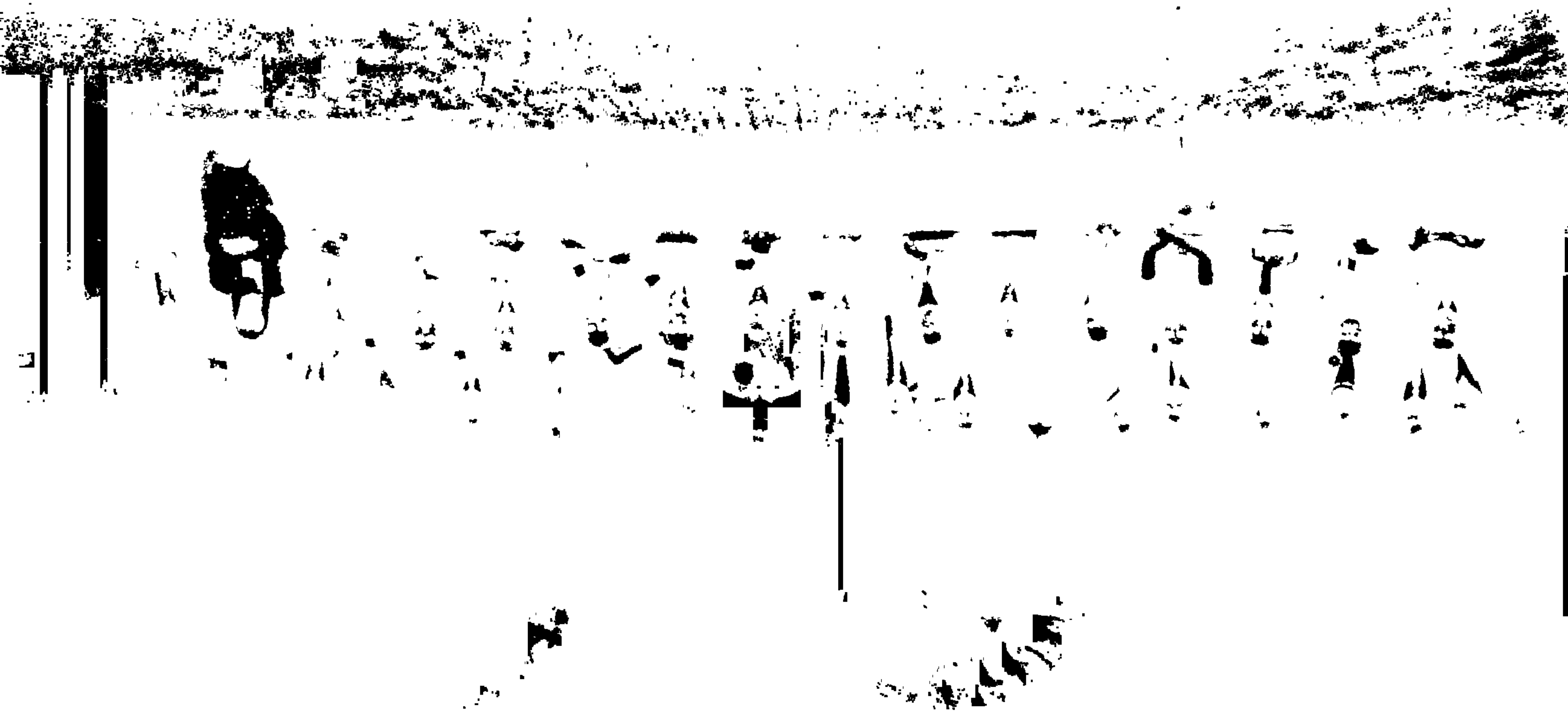
اورینٹل کالج کی ادبی خدمات کے اس اجلاس کی صدارت اردو کے مشہور و معروف ادیب اور نقاد اور پنجاب یونیورسٹی کے سابق وائس چانسلر جناب پروفیسر حمید احمد خاں صاحب فرما رہے ہیں۔ میں ان کا بےحد ممنون ہوں کہ وہ اپنی مصروفیتوں میں سے تھوڑا سا وقت نکال کر یہاں تشریف لائے اور اس اجلاس کو رونق بخشی ۔ جناب فیض احمد فیض صاحب خاص طور پر اسلام آباد سے اورینٹل کالج کی ادبی خدمات کے دوسرے اجلاس کی صدارت کے لیے تشریف لائے ہیں۔ انہوں نے باوجود مصروفیتوں کے میری درخواست کو قبول فرمایا اور اس اجلاس کی دوسری نشست کی صدارت کے لیے تشریف لائے۔

خواتین و حضرات ! اورینٹل کالج کے جشن صد سالہ کی تقریبات کے سلسلے میں یہ اجلاس جن میں اورینٹل کالج کی ادبی خدمات پر مقالے پڑھے جائیں گے، اور مذاکرہ بھی ہوگا، خاص طور پر اہمیت رکھتا ہے۔ کیوں کہ ان سب سے اورینٹل کالج کے علمی کام کی تفصیل ہمارے سامنے آئے گی اور گذشتہ سو سال میں جو ماحول اس کالج میں رہا ہے اس کا جائزہ لیا جائے گا۔ مجھے بے حد مسرت ہے کہ مشرقی علوم کی اہم شخصیتوں نے اورینٹل کالج کو خراج تحسین پیش کیا ہے اور ان میں سے بیشتر اس وقت آپ کے سامنے موجود ہیں ۔ آپ خود ان کی زبانی اورینٹل کالج کی ادبی خدمات کی داستانیں سنیں گے ۔ میں ان سب بزرگوں اور دوستوں کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ انہوں نے اورینٹل کالج کے ساتھ تعاون فرمایا، یہاں تشریف لائے اور اب آپ کے سامنے اپنے مقالات اور تاثرات پیش کریں گے ۔

معزز خواتین و حضرات! اورینٹل کالج، جیسا کہ آپ سب جانتے ہیں ، صرف ایک تدریسی ادارہ ہی نہیں رہا ہے، اس نے علم و ادب کے میدانوں میں تحقیق و تنقید کی عظیم روایات قائم کی ہیں ۔ ہم اپنے ان بزرگوں پر بجا طور پر فخر کر سکتے ہیں جو اس کالج سے منسلک رہے اور جنہوں نے پروفیسروں، پرنسپلوں اور استادوں کی حیثیت سے نہ صرف تدریس کی ایک عظیم روایت قائم کی بلکہ علمی، تحقیقی اور ادبی تنقید کے میدانوں میں بھی کارہائے نمایاں انجام دیے ۔ انہوں نے ایک ایسا ماحول پیدا کیا جس نے اورینٹل کالج کو برعظیم پاکستان و ہند کے تعلیمی اداروں میں ایک منفرد حیثیت دی ۔ یہ سب انہی کی کوششوں اور کاوشوں کا نتیجہ ہے کہ آج اورینٹل کالج کا نام امریکہ ، کینیڈا، روس، چین ، انگلستان، جرمنی، فرانس، بلجیئم، ہالینڈ، اٹلی، ترکی، ایران اور افغانستان کی یونیورسٹیوں میں بڑے احترام سے لیا جاتا ہے۔ ان ممالک کی یونیورسٹیوں کے بڑے بڑے اساتذہ، عالم اور محقق اپنی تحریروں میں اورینٹل کالج کے اساتذہ کی تحقیقات کے حوالے دیتے ہیں اور مشرقی علوم کے اداروں میں اسی وجہ سے اورینٹل کالج کا نام سرفہرست نظر آتا ہے ۔

ڈاکٹر لائٹنر، ڈاکٹر سرمارک آرل اسٹائن، ڈاکٹر اے۔ ڈبلیو اسٹریٹن، ڈاکٹر وولنر، ڈاکٹر سرٹامس آرنلڈ، مولانا محمد حسین آزاد، علامہ اقبالؒ مولانا فیض الحسن سہارنپوری، جناب شادان بلگرامی، مولانا مفتی محمد عبداللہ ٹونکی ، ڈاکٹر عظیم الدین احمد، ڈاکٹر مولوی محمد شفیع، ڈاکٹر محمد اقبال ، حافظ محمود خان شیرانی ، چند ایسے نام ہیں جن کو مشرقی علوم سے دلچسپی لینے والے کبھی فراموش نہیں کر سکتے ۔ ان بزرگوں نے ایسے عظیم کارنامے انجام دئیے ہیں جن کا جائزہ لینا آسان نہیں۔ جدید دور میں جو اساتذہ اور محققین کالج میں کارہائے نمایاں انجام دیتے رہے ہیں ان کے کارنامے بھی انہی بزرگوں کے فیض کا نتیجہ ہیں۔ اورینٹل کالج اس بات کی کوشش جاری رکھے گا کہ ان کی قائم کی ہوئی روایات مضبوط سے مضبوط تر ہوں اور آئندہ بھی ایسے کارنامے انجام پائیں جن کو تحقیق اور علوم کی دنیا میں اہمیت حاصل ہو۔

جشن صد سالہ کی یہ تقریب، اس کے مختلف اجلاس اور خصوصیت کے ساتھ یہ اجلاس جو اورینٹل کالج کی علمی خدمات کے موضوع پر ہے اسی مقصد سے ترتیب دیا گیا ہے ۔



دکتر عبادت بریلوی
ترجمه : وزیر الحسن عابدی

نطق آغاز

خانمها و آقایان!

ریاست این اجلاس را که مختص است به موضوع خدمات ادبی اورئینتل کالج جناب پرفسور حمید احمد خان رئیس اسبق دانشگاه پنجاب که از معاریف ادباء و منتقدین ادبی ما میباشند بر عهده دارند. از معظم له بسیار ممنونم که برای خاطر ما صرف وقت فرموده تشریف آوردند و این جلسه‌گاه را زینت بخشیدند. جناب آقای فیض احمد فیض مخصوصاً برای دومین جلسه که با همین موضوع اختصاص دارد از اسلام آباد تشریف آورده اند و ریاست جلسه را بر عهده خواهندداشت. ایشان باوجود گرفتاریهای مهم خودشان درخواست بنده را پذیرفته و برای ریاست دومین جلسه این مجلس مارا مفتخر فرموده اند.

خانمها و آقایان! جزو مراسم جشن صدمین سال تأسیس اورئینتل کالج این مجلس کنگره که سر جلسات آن مقاله هائی راجع به خدمات ادبی اورئینتل کالج قراءت میگردد و یک مذاکره ای نیز ضمن آن خواهیم داشت اهمیت خاصی را دارد، برای اینکه این صحبت‌ها برای ما فعالیت علمی اورئینتل کالج را مفصلاً شرح داده محیطی را که در این کالج در صد سال گذشته وجود داشته است مورد بررسی قرار میدهد. برای من بسیار اسباب مسرت است که رجال مهم خاورشناسی از خدمات اورئینتل کالج بزرگداشت فرموده اند و اغلب این دانشمندان درین موقع سر این جلسه حضور دارند. حضار محترم از زبان خود این رجال دانش سرگذشت خدمات ادبی اورئینتل کالج را استماع میفرمایند. من از همهٔ بزرگان و دوستان تشکر میکنم که با اورئینتل کالج همکاری فرمودند و به اینجا تشریف آوردند و اینک مقاله‌های خودشان را برای شنوندگان گرامی قراءت میفرمایند و خاطرات خودشان را شرح میدهند.

خانمها و آقایان محترم ، اورئینتل کالج همانطور که قبلاً میدانید تنها یک مؤسسه تدریس نبوده بلکه در زمینه های ادب و دانش سنن با عظمت تتبع و تحقیق و انتقاد علمی را بیادگار گذاشته است. ما حق داریم به خدمات بزرگان خود مان که با این مؤسسه بستگی داشته اند افتخار و مباهات کنیم ،

بزرگانیکه از حیث داشتن کرسی استادی و سمت ریاست کالج یا در ردیف معلمین آن بوده سنت ارزشمندی را نه تنها درکار تدریس بوجود آوردند بلکه در صحنه‌های تتبع و تحقیق علمی و انتقاد ادبی نیز خدمات برجسته ای را انجام دادند و محیطی را ایجاد کردند که بواسطه آن اورئینتل کالج بین مؤسسه های فرهنگی و تدریسی شبه قاره پاکستان و هند مقام شامخی را احراز نمود که بی سابقه و بی عدیل است. ثمره کار و کوشش و کاوش های علمی همین بزرگان بوده است که امروز در دانشگاه های آمریکا و کانادا و شوروی و چین و انگلیس و آلمان و فرانسه و بلژیک و هلاند و ایتالیا و ترکیه و ایران و افغانستان اورئینتل کالج را با احترام اسم میبرند، در دانشگاه‌های این کشورها استادان و دانشمندان و محققان عالیمقام در نوشته های خود شان از تحقیق استادان اورئینتل کالج یاد آور میشوند و برای همین است که بین مؤسسه های علوم شرقی اورئینتل کالج اسمش سر فهرست است. دکتر لایتنر، دکتر سر مارک آرل استاین، دکتر اے دبلیو استریتین ، دکتر وولنر، دکتر سر تامس آرنولد، مولانا محمد حسین آزاد، حضرت علامه اقبال، مولانا فیض الحسن سهارنپوری، جناب شادان بلگرامی، مولانا مفتی محمد عبدالله تونکی، دکتر عظیم‌الدین احمد، دکتر مولوی محمد شفیع، دکتر محمد اقبال، حافظ محمود خان شیرانی، اینها اسامی درخشانی است که علاقمندان با علوم شرقی هیچوقت نیمتوانند فراموش کنند. این بزرگان کارهای مهم با عظمتی را انجام داده اند که کار ساده ای نیست بتوانیم از آنها اندازه گیری کنیم. در دوره کنونی استادانی و محققانی که در این مؤسسه کار های برجسته ای را بعمل آورده اند در حقیقت کار آنهانیز از فیوض همین بزرگان سرچشمه گرفته است، اورئینتل کالج به مساعی خودش ادامه خواهد داد تا سنتی را که این بزرگان بیادگار گذاشته اند بیش از پیش استوار گردد و در آتیه نیز خدماتی انجام داده شود که درجهان دانش و دانش پژوهی حایز اهمیتی باشد.

این مراسم جشن صدمین سال تأسیس و جلسات مختلف آن و مخصوصاً این جلسه که به موضوع خدمات ادبی اورئینتل کالج اختصاص دارد برای همین مرام و مقصود است.



پروفیسر حمید احمد خاں

پروفیسر حمید احمد خان

خطبۂ صدارت

خواتین و حضرات! میں بہت عرصہ کے بعد اس یونیورسٹی میں حاضر ہوا ہوں ۔ گذشتہ چند سال ایسے گذرے کہ میں یونیورسٹی کی کسی تقریب میں شرکت نہ کر سکا ۔ اورینٹل کالج کے جشن صد سالہ کی تقریبات کا جب مجھے علم ہوا تو میں نے یہ فیصلہ کیا کہ مجھے اس میں شرکت کرنی چاہیئے چنانچہ میں اس وقت یہاں آپ کے سامنے موجود ہوں ۔

اورینٹل کالج ایک عظیم علمی، تعلیمی اور تدریسی ادارہ رہا ہے جس کی عمر اب سو سال سے زیادہ ہو چکی ہے ۔ گذشتہ سو سال میں اس کالج نے اردو زبان و ادب، عربی، فارسی، سنسکرت اور اسلامی علوم کی گرانقدر خدمات انجام دی ہیں ۔ برعظیم ہند و پاکستان میں یہ واحد ادارہ تھا جو اپنے تدریسی و تحقیقی کام کی اہمیت کے پیش نظر وقعت کی نظروں سے دیکھا جاتا تھا اور آج بھی اس کی قدر و منزلت کسی طرح کم نہیں ہوئی ہے ۔ کیونکہ موجودہ دور کے اساتذہ نے بھی اپنے علمی کارناموں سے اس عظیم ادارے کا نام روشن رکھا ہے اور آج بھی ساری دنیا میں پنجاب یونیورسٹی سے زیادہ اورینٹل کالج کو لوگ جانتے ہیں اور اس کا نام عزت و احترام کے ساتھ لیتے ہیں ۔

اورینٹل کالج کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے اردو زبان کی اہمیت کو محسوس کیا اور علمی تحقیق کے لیے اس زبان کو وسیلہ بنایا ۔ اورینٹل کالج کی تاریخ اس بات کی شاہد ہے کہ گذشتہ سو سال میں سائنس، حساب اور انسانی علوم کی تعلیم بھی اس ادارے میں اردو زبان کے ذریعہ ہوتی تھی ۔ اور عربی، فارسی اور اردو زبان و ادب پر جو تحقیق کا کام اس کالج کے نامور اساتذہ نے کیا ہے وہ بھی اردو زبان کے کے ذریعہ لوگوں تک پہنچا ہے ۔ اس اعتبار سے دیکھا جائے تو اس

ادارے کی حیثیت قومی اور ملی ہے۔ قیام پاکستان سے قبل برعظیم ہند و پاکستان کے دور دراز علاقوں سے مسلمان یہاں عربی، فارسی اور اسلامی علوم کی تعلیم حاصل کرنے کے لیے آیا کرتے تھے اور فارغ التحصیل ہو کر تدریسی و تحقیق کا کام جاری رکھتے تھے۔ بعض ان میں سے بڑے نامور ادیب اور محقق ہوئے ہیں۔ ان میں ڈاکٹر عندلیب شادانی، پروفیسر فارسی و اردو ڈھاکہ یونیورسٹی اور جناب امتیاز علی خان صاحب عرشی ناظم کتب خانہ ریاست رام پور کے نام سر فہرست ہیں۔ جن عالموں نے کالج میں رہ کر اس زبان کے ذریعہ تحقیق کا کام جاری رکھا ان میں ڈاکٹر مولوی محمد شفیع مرحوم، ڈاکٹر محمد اقبال، حافظ محمود خان شیرانی، ڈاکٹر سید محمد عبداللہ اور ڈاکٹر محمد باقر کے نام سر فہرست ہیں۔

اردو زبان کو اورینٹل کالج میں جو اہمیت حاصل ہوئی اور اس کو جس طرح علمی تحقیق کے لیے استعمال کیا گیا اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کالج کی بنیاد ہی مشرقی زبانوں خصوصاً اردو کے فروغ کے لیے ڈالی گئی تھی۔ خود ڈاکٹر لائٹنر، جو خود اس کالج کے پہلے پرنسپل تھے، اردو کے بڑے حامی تھے اور ان کا خیال یہ تھا کہ تمام علوم کی تعلیم انگریزی کی بجائے اس زبان میں ہونی چاہیئے۔ چنانچہ انجمن پنجاب اور اورینٹل کالج دونوں کے پلیٹ فارم سے انہوں نے اپنے ان خیالات کا اظہار کیا اور ایک ایسی بنیاد ڈالی جس پر اردو زبان اور مشرقی علوم کے مطالعہ کی خوبصورت عمارت تعمیر ہوئی۔

اورینٹل کالج کا ایک بہت بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے غریب اور نادار طلبہ پر تعلیم کے دروازے کھول دئیے۔ وہ لوگ جو انگریزی نظام تعلیم کے اخراجات کو برداشت نہیں کر سکتے تھے وہ بھی اورینٹل کالج میں داخل ہو کر اپنی تعلیم مکمل کر لیتے تھے۔ ایک زمانہ تھا جب اورینٹل کالج میں تعلیم مفت ہوتی تھی۔ پھر آٹھ آنے فیس لی جانے لگی۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ طالب علموں کے رہنے اور کھانے کا بھی انتظام کیا جاتا تھا۔ یہ ایک ایسی روایت تھی جس نے بہت سے نوجوانوں کو تعلیمی اور علمی کام پر آمادہ کیا اور ان میں سے بہت سے طالب علم

اورینٹل کالج سے نکل کر علمی اور تعلیمی میدانوں میں کام کرنے لگے۔ اس کے ساتھ ہی اورینٹل کالج میں علمی اور ادبی تحقیق کا ماحول پیدا ہوا اور اس کالج کے نامور پرنسپلوں اور پروفیسروں اور دوسرے استادوں نے اپنے اپنے مخصوص میدانوں میں اعلیٰ درجے کی تدریس کے ساتھ ساتھ بلند پایہ تحقیق کی روایت بھی قائم کی اور سارے برعظیم ہند و پاکستان میں ان کی تحقیق کی وجہ سے اورینٹیل کالج کا نام روشن ہوا۔

خواتین و حضرات، ایک عام خیال یہ ہے کہ اورینٹل کالج کے اساتذہ صرف تدریسی اور تحقیقی کام کے میدانوں ہی کے مرد تھے۔ لیکن ایسا نہیں ہے۔ اورینٹل کالج کی تاریخ میں ایسی شخصیتیں بھی نظر آتی ہیں جنھوں نے انتظامی امور میں بھی کارہائے نمایاں انجام دئیے ہیں۔ خود ڈاکٹر لائٹنر، جو ایک بہت بڑے عالم تھے، تعلیمی اداروں کی تنظیم کا گہرا تجربہ رکھتے تھے اور انہوں نے اپنے فکر و عمل سے پنجاب میں ایسے کام کئے جو ہمیشہ یاد گار رہیں گے۔ اورینٹل کالج کی تنظیم ان کا ایک بہت بڑا کارنامہ ہے اور اس کو چلانے کے لیے انہوں نے جو نظام قائم کیا وہ ہمیشہ قدر کی نظروں سے دیکھا جائیگا۔ ڈاکٹر وولنر جو عرصہ دراز تک اورینٹل کالج کے پرنسپل اور سنسکرت کے پروفیسر رہے، وہ بھی انتظامی امور میں ایک نمایاں شخصیت ہیں۔ ان کی پرنسپلی کے زمانے میں اورینٹل کالج نے بڑی ترقی کی اور ان کی انتظامی صلاحیتوں کا اعتراف اس طرح کیا گیا کہ وہ ایک زمانے تک اورینٹل کالج کے پرنسپل رہنے کے ساتھ ساتھ پنجاب یونیورسٹی کے وائس چانسلر اور رجسٹرار بھی رہے۔ یونیورسٹی کی تاریخ میں یہ واحد مثال ہے کہ ایک پروفیسر نے پرنسپلی اور وائس چانسلری کی آسامیوں پر بیک وقت کام کیا۔ ڈاکٹر وولنر کے بعد پروفیسر مولوی محمد شفیع صاحب کا نام ایسا ہے کہ وہ ہمیشہ سنہرے حروف میں لکھا جائے گا۔ انہوں نے اپنی پروفیسری اور پرنسپلی کے دوران نہ صرف علمی اعتبار سے اس کالج کا وقار بڑھایا بلکہ انتظامی لحاظ سے بھی اس کو بلند مقام دیا۔

خواتین و حضرات، قیام پاکستان کے بعد اورینٹل کالج اردو زبان و ادب کا ایک بہت بڑا مرکز بن گیا اور آج اس کے موجودہ اساتذہ کا

نام دنیا کی مختلف یونیورسٹیوں میں عزت و احترام کے ساتھ لیا جاتا ہے۔ عربی، فارسی اور اردو تینوں شعبوں میں قیام پاکستان کے بعد اعلی درجے کا علمی اور ادبی کام ہوا اور تحقیق کے ساتھ ساتھ اعلی پایہ کی تنقید کی ایک روایت بھی قائم ہوئی۔ اردو کے بعض اہم نقاد اس کالج میں کام کرتے رہے اور اس وقت بھی کر رہے ہیں۔ انہوں نے تحقیق کے ساتھ تنقید کو بھی آگے بڑھایا اور یہ انہی کے کام کا نتیجہ ہے کہ اورینٹل کالج موجودہ اردو ادب میں ایک دبستان کی حیثیت سے اہمیت رکھتا ہے۔

میں اورینٹل کالج کے جشن صد سالہ کی تقریبات کی کامیابی کے لئے دعا کرتا ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ ان تقریبات میں جو گرانقدر مقالے پڑھے جائیں گے ان سے مشرقی علوم کے بعض نئے پہلو سامنے آئیں گے اور ان تقریبات کی وجہ سے اورینٹل کالج کا نام دور دور تک پہنچے گا اور اس کے کارناموں کی اہمیت کو محسوس کیا جائیگا۔

جناب فیض احمد فیض

فیض احمد فیض

خطبۂ صدارت

خواتین و حضرات !

میں شکر گذار ہوں کہ مجھے اورینٹنل کالج کے جشن صد سالہ کی تقریبات میں ہونے والے اس اجلاس کی صدارت کرنے کا موقع دیا گیا۔ اگرچہ میں اسلام آباد میں بعض کاموں میں مصروف تھا لیکن جب عبادت صاحب نے مجھے یہ لکھا کہ اورینٹل کالج، یعنی میرے اپنے کالج کے، جشن صد سالہ کی تقریبات ہو رہی ہیں اور اس سلسلے میں ماہرین علوم مشرقی کی ایک بین الاقوامی کانفرنس بڑی ترتیب دی گئی ہے، تو میرے پاس کوئی چارہ سوائے اس کے نہیں رہا، کہ میں اس میں شرکت کے لیے چند گھنٹوں ہی کے لیے سہی ، لاہور پہنچوں اور اورینٹل کالج کی ادبی خدمات کے سلسلے میں جو اجلاس ترتیب دیا گیا ہے، اس میں شرکت کروں اور آپ کے سامنے اس ادارے کے بارے میں اپنے خیالات پیش کروں۔

اورینٹل کالج سے میرا تعلق بہت قدیم ہے۔ میں کئی حیثیتوں سے اس کالج کے ساتھ ایک رشتے میں منسلک رہا ہوں۔ سب سے پہلے تو یہ کہ کالج کے ایک طالب علم کی حیثیت سے میں نے یہاں ایم۔ اے عربی کی تعلیم حاصل کی اور اس مضمون میں ایم۔ اے کیا۔ دوسرے اس وجہ سے کہ اورینٹل کالج پورے پنجاب، پاکستان، بلکہ سارے برعظیم میں ایک ایسا تعلیمی ادارہ رہا ہے جس نے غریب اور نادار طلبہ کے لیے تعلیم کے مواقع فراہم کیے۔ تیسرے اس وجہ سے کہ اورینٹل کالج میں علمی تدریس، ادبی تحقیق اور تنقید کی عظیم روایات قائم رہی ہیں اور مجھے ان روایات سے دلچسپی ہے۔ میں نے اورینٹل کالج سے بہت کچھ حاصل کیا ہے اور میرے ذہن میں اس ادارے کی جو تصویر ہے، وہ نہ صرف علمی اعتبار

سے متاثر کرنے والی ہے بلکہ جذباتی اعتبار سے دل میں اترنے والی بھی ہے ۔ اس کالج کے ساتھ میری بہت سی خوبصورت یادیں وابستہ ہیں اور ان کو میں اپنی زندگی کا ایک اہم سرمایہ تصور کرتا ہوں ۔

جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں، میں اورینٹل کالج کا باقاعدہ طالب علم رہا ہوں ۔ میں نے یہاں عربی زبان اور ادب کی تعلیم حاصل کی اور اس مضمون میں ایم ۔ اے کیا ۔ اگر میں داخلے کی تفصیلات آپ کے سامنے پیش کروں تو آپ کو حیرت ہوگی ۔ اس زمانے میں اورینٹل کالج ہی ایک ایسا تعلیمی ادارہ تھا جہاں فیس بہت کم، بلکہ یہ کہنا چاہیے، کہ برائے نام تھی ۔ میں نے جب گورنمنٹ کالج سے انگریزی میں ایم ۔ اے کر لیا تو میرے دل میں یہ خواہش پیدا ہوئی کہ انگریزی ادب کا مطالعہ اس وقت تک مکمل نہیں ہو سکتا جب تک کہ مشرقی ادبیات کا مطالعہ نہ کیا جائے ۔ چنانچہ میں نے یہ سوچا کہ میں اورینٹل کالج میں عربی کے شعبہ میں داخلہ لے لوں ۔ اس زمانے میں ملازمت ملتی نہیں تھی ۔ کسی اور کالج میں ایم ۔ اے کے مضمون میں داخلہ لینے کا مطلب یہ تھا کہ خاصی فیس دی جائے ۔ اتنی فیس میں نہیں دے سکتا تھا ۔ اس لیے میں نے یہ سوچا کہ اورینٹل کالج چلنا چاہیے ۔ عربی ادب کی تعلیم حاصل کرنے کا موقع بھی ملے گا اور فیس بھی کم ہوگی ۔ چنانچہ میں اورینٹل کالج آیا ۔ اس زمانے میں پروفیسر مولوی محمد شفیع صاحب کالج کے پرنسپل تھے ۔ ان کی خدمت میں داخلے کے لیے پیش ہوا ۔ انہوں نے چند باتیں کیں اور آخر میں یہ کہا کہ محنت کرنی ہوگی اور عربی کے ایم ۔ اے کے لیے خاصا کام کرنا پڑے گا ۔ میں نے عرض کیا کہ میں اسی مقصد سے حاضر ہوا ہوں اور مجھے انگریزی ادب کے ساتھ ساتھ عربی ادب سے بھی دلچسپی ہے ۔ انشا اللہ آپ کی نگرانی میں میری صحیح ادبی تربیت ہوگی اور میں عربی ادب میں ایم ۔ اے کے لیے محنت سے کام کروں گا ۔ پروفیسر مولوی محمد شفیع نے مجھے ایم ۔ اے عربی میں داخل کر لیا اور دو سال تک اس ادارہ میں رہ کر میں نے ایم ۔ اے عربی کا امتحان پاس کیا ۔

خواتین و حضرات !

آپ کو یہ سن کر حیرت ہوگی کہ ایم ۔ اے کے طالب علم کی حیثیت سے میں صرف آٹھ آنے فیس دیا کرتا تھا ۔ برعظیم ہند و پاکستان میں اس وقت کوئی ایسا ادارہ نہیں ہوگا جس میں تعلیم اس طرح مفت ہو ۔ یہ بہت بڑی بات تھی اور اس سے نہ صرف مجھے ایک طالب علم کی حیثیت سے بلکہ برعظیم ہند و پاکستان کے بہت سے طالب علموں کو مشرقی علوم کی تعلیم حاصل کرنے کا موقع ملا ۔ ہندوستان کے دور دراز علاقوں سے اورینٹل کالج میں تعلیم حاصل کرنے کے لیے طلبہ آتے تھے اور فارغ التحصیل ہو کر اپنے اپنے علاقوں کو واپس جاتے تھے۔ بعض ان میں سے ایسے بھی تھے جو لاہور کے علمی اور ادبی مرکز میں ہمیشہ کے لیے اقامت اختیار کر لیتے تھے اور پھر اس شہر کو کبھی نہیں چھوڑتے تھے ۔ اس اعتبار سے دیکھا جائے تو اورینٹل کالج نے برعظیم ہند و پاکستان کے لوگوں کی گراں بہا خدمات انجام دیں ۔ اس نے نوجوانوں کے لیے اعلیٰ تعلیم کے مواقع فراہم کیے ۔ مغربی نظام تعلیم ہمارے نوجوانوں کی زندگیوں میں جو زہر گھول رہا تھا، اس کو خاصی حد تک ختم کیا اور مشرقی علوم کے مطالعہ کی ایک فضا قائم کی ۔ اور نہ صرف یہ کہ طالب علموں نے یہ کام کر کے صرف ڈگریاں حاصل کیں ، بلکہ اورینٹل کالج کو مخصوص علمی فضا میں رہ کر انہوں نے اپنا مزاج علمی بنا لیا ۔ اور یہ چسکا ان کو ایسا لگا کہ بعض تو ساری زندگی مشرقی علوم، خاص طور پر عربی، فارسی، سنسکرت اردو اور ہندی زبانوں میں تحقیقی اور تنقیدی کام کرتے رہے ۔ شاید برعظیم ہند و پاکستان کے کسی کسی ادارے کو اس مخصوص فضا کے پیدا کرنے کا موقع نہیں ملا ۔ جیسا کہ اورینٹل کالج کو ملا ۔

اورینٹل کالج کے ساتھ گذشتہ سو سال میں بڑے بڑے علماء وابستہ رہے ۔ ڈاکٹر لائٹنر سے یہ سلسلہ شروع ہوتا ہے اور پھر سر ٹامس آرنلڈ، پروفیسر سٹراٹن ۔ سرمارک، آرل اسٹائین، مولانا محمد حسین آزاد، علامہ اقبال، پروفیسر وولنر، مولوی محمد شفیع اور پروفیسر محمود شیرانی وغیرہ کے نام سر فہرست ہیں۔ ان بزرگوں نے کالج کے پرنسپلوں اور پروفیسروں

کی حیثیت سے نہ صرف یہ کہ تدریس کی ایک صحیح فضا قائم کی بلکہ اپنی علمی کاوشوں سے ایسے تحقیقی کارنامے انجام دیے کہ ان کا نام برعظیم ہند و پاکستان سے باہر نکل کر دنیا کے تمام ملکوں میں پہنچا اور ماہرین علوم مشرقی ان کے ان کارناموں سے اتنے متاثر ہوئے کہ انہوں نے اپنی تحقیقات میں ان کے حوالے دیے ۔ یہ بڑے فخر و افتخار کی بات ہے ۔ کسی تدریسی ادارے کو اتنی اھمیت حاصل نہیں ھوئی ۔ لیکن جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ھوں اورینٹل کالج ایک تدریسی ادارہ ھی نہیں تھا ۔ اس کی حیثیت مشرقی زبانوں کے ایک ادارے، اکیڈیمی یا اسکول کی بھی تھی اور جو اساتذہ اس کے ساتھ وابستہ تھے انہیں صرف استاد ھی تصور نہیں کیا جاتا تھا۔ وہ اپنے علمی کارناموں کی وجہ سے عالم اور محقق کی حیثیت سے جانے پہچانے جاتے تھے ۔

خواتین و حضرات! اورینٹل کالج کے علمی اور تحقیقی کام کا ایک بہت بڑا ثبوت اورینٹل کالج میگزین کی صورت میں ھمارے سامنے موجود ہے ۔ گذشتہ نصف صدی سے یہ میگزین مشرقی علوم کی گراں قدر خدمت انجام دے رہا ہے ۔ جب سے اس میگزین کا آغاز ھوا اس وقت سے لے کر موجودہ دور تک اس نے اپنے اعلی تحقیقی معیار کو برقرار رکھا ہے ۔ پروفیسر مولوی محمد شفیع صاحب مرحوم کا نام اس میگزین کو شروع کرنے اور عرصہ دراز تک اس کو مرتب کرنے کے سلسلہ میں ھمیشہ یادگار رہے گا ۔ انہوں نے اس میگزین میں خود بھی اعلی پائے کے مقالات لکھے اور دوسروں سے بھی لکھوائے اور نتیجہ یہ ھوا کہ اردو، فارسی، ھندی پنجابی زبانوں کے مختلف پہلوؤں پر جس اعلی پائے کے مقالات اس میگزین میں شائع ھوئے ھیں شاید ھی کسی دوسرے میگزین میں شائع ھوئے ھوں ۔ یہ میگزین دنیا کی تمام یونیورسٹیوں میں قدر کی نگاھوں سے دیکھا جاتا رہا ہے ۔ اس لیے کہ اس نے مشرقی علوم کی ایسی خدمات انجام دی ھیں جو اپنی جگہ بہت اھمیت رکھتی ہے ۔ اورینٹل کالج میگزین میں لسانیات، ادبی تحقیق اور تنقید کے موضوع پر بےشمار مقالے شائع ھوئے ھیں اور نادر و نایاب قلمی نسخوں کے متن بھی اس میں بڑی محنت سے شائع کیے گئے ھیں ۔ مجھے اس پر بے حد خوشی ہے کہ

اوریئنٹل کالج میگزین کا معیار آج بھی برقرار ہے اور اس دور میں بھی اس نے اس تحقیقی روایات کو پوری طرح برقرار رکھا ہے جو گذشتہ نصف صدی میں پروان چڑھی ۔ البتہ ایک اضافہ اس میگزین میں نظر آتا ہے وہ یہ کہ جدید علوم اور خصوصیت کے ساتھ جدید تنقید کی طرف بھی اس دور میں توجہ کی گئی ہے اور ان موضوعات پر بھی نہایت گراں قدر مقالے قیام پاکستان کے بعد اس میں شائع ہوئے ۔ اور ان کو دیکھ کر یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اوریئنٹل کالج کے اساتذہ اور محققین قدیم ادب کے ساتھ ساتھ جدید ادب سے بھی گہری دلچسپی لے رہے ہیں اور جدید ادب کے مختلف پہلوؤں پر بھی نئے انداز کی تنقیدیں اب اوریئنٹل کالج میگزین میں شائع ہو رہی ہیں۔ دنیا کی مختلف یونیورسٹیوں سے مختلف طرح کے میگزین شائع ہوتے ہیں۔ لیکن جو انفرادیت اوریئنٹل کالج میگزین کی ہے شاید کسی کو نصیب نہیں ہو سکتی ۔ یہ صرف میرا ہی تاثر نہیں ہے ۔ بلکہ دنیا کے مشہور مستشرقین نے بھی اس کو تسلیم کیا ہے ۔ حقیقت یہ ہے کہ بغیر اوریئنٹل کالج میگزین کی فائلوں کے مشرقی علوم کی کوئی لائبریری مکمل نہیں ہو سکتی اور اس کے حوالے دیے بغیر ان علوم پر تحقیق بھی پوری طرح مکمل صورت میں سامنے نہیں آ سکتی ۔ یہی وجہ ہے کہ مشہور و معروف مستشرقین نے بھی اوریئنٹل کالج میگزین میں شائع ہونے والے مقالات کے حوالے اپنی تحقیقات میں دیے ہیں اور اس طرح اس میگزین کی اہمیت کو تسلیم کیا ہے ۔

میں ان لوگوں میں سے نہیں ہوں جو صرف ماضی کے پرستار ہوتے ہیں۔ میں جدید دور کے محققین اور لکھنے والوں کو بڑی اہمیت دیتا ہوں اور میرا خیال یہ ہے کہ انہوں نے بھی تحقیقی اور تنقیدی اعتبار سے بہت اضافہ کیا ہے ۔ اوریئنٹل کالج نے بھی جدید دور کے رجحانات کا ساتھ دیا ہے اور قیام پاکستان کے بعد ایسے محققین اور نقاد پیدا کیے ہیں جن کے کاموں کو کبھی بھلایا نہیں جا سکتا ۔ معاصرین کے بارے میں کچھ کہنا مشکل ہوتا ہے ۔ اس لیے ابھی تک ان کارناموں کا جائزہ نہیں لیا گیا جو قیام پاکستان کے بعد اوریئنٹل کالج کے اساتذہ نے انجام دیے ہیں۔ میں اس عہد کے اساتذہ کے نام نہیں لینا چاہتا، لیکن جو

اساتذہ بھی اوریئنٹل کالج سے منسلک رہے ہیں انہوں نے اپنے اپنے میدانوں میں اعلیٰ درجے کا تحقیقی اور تنقیدی کام کیا ہے اور ان کی تحریروں نے اوریئنٹل کالج کو جدید دور کا ایک اہم ادبی مرکز بنا دیا ہے۔ ذرا غور کیجئے کہ اردو کے قدیم شعراء اصناف ادب، جدید دور کے رجحانات، نئی تحقیق، نئے علمی نسخوں کی دریافت اور جدید تحریکوں کا تجزیہ ان سب پر اوریئنٹل کالج کے نئے دور کے اساتذہ نے کتنا کچھ لکھا ہے۔ ایک ایک مصنف کے ساتھ سینکڑوں مضامین اور درجنوں کتابیں نظر آتی ہیں۔ میرے خیال میں اوریئنٹل کالج عہد جدید کے نئے رجحانات کا بھی علمبردار ہے اور اس کے جدید کارناموں کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

خواتین و حضرات! اوریئنٹل کالج کی حیثیت ہماری ثقافتی تاریخ میں ایک عظیم روایت کی ہے۔ اس کے علمی اور ادبی کارناموں کو لوگ صدیوں تک یاد کرتے رہیں گے۔ اس کی وجہ سے نہ صرف پنجاب یونیورسٹی بلکہ پاکستان کا نام روشن ہوا ہے اور دنیا کے مختلف ملکوں میں اس نے اپنی جو ساکھ بنائی ہے وہ قومی اور ملی اعتبار سے بھی اہمیت رکھتی ہے۔ اس عظیم روایت کو برقرار رکھنا ہم سب کا قومی اور ملی فریضہ ہے۔ میرے خیال میں پنجاب یونیورسٹی، حکومت پنجاب اور حکومت پاکستان کو اس ادارے کا خاص خیال رکھنا چاہیے اور اسے ایک سنٹر آف ایکسیلنس بنانا چاہیے۔

مترجم : سید سجاد باقر رضوی

اورینٹل کالج ـــ زندہ باد

ڈاکٹر محمد حمید اللہ ، (پیرس)

تدبیر کند بندہ ، تقدیر زند خندہ ـــ ایک شہرہ آفاق مثل ہے جو اسی مفہوم میں عربی، انگریزی، ترکی، روسی، فرانسیسی ، جرمن ، اور دیگر زبانوں میں بھی موجود ہے۔ مجھے یہ مثل یونیورسٹی اورینٹل کالج کے جشن صد سالہ کے سلسلے میں یاد آئی ہے ۔

انگریز کسی نہ کسی طور پر مغلیہ سلطنت کی قوت کو ختم کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ تاہم اس عمالیائی برعظیم میں مغل حکمرانوں کی تخلیقات کو دیکھ کر وہ ہمیشہ احساس کمتری میں مبتلا رہے۔ اگر یہ نوادر سیاسی طور پر مسلمانوں کے بارے میں مشکوک تھے تو یہ بات بالکل فطری تھی۔ کون سا ایسا فاتح ہے جو مفتوح کے بارے میں ایسا رویہ نہیں رکھتا ؟ ۔ لیکن فکری اور تہذیبی و ثقافتی اعتبار سے بھی انگریز احساس کمتری کا شکار تھے ۔ انہوں نے اس کے خلاف حتی المقدور کوششیں کیں مگر ـــ تدبیر کند بندہ، تقدیر زند خندہ ۔

انہوں نے یہ دیکھا کہ شیریں زبان فارسی، نہ صرف یہ کہ دنیا میں کثرت سے بولی جاتی ہے بلکہ یہ بھی کہ وہ مذہب اسلام کی مخزن بھی ہے، جس نے ہر اس جگہ جہاں وہ گیا، عیسائیت کو ماند کر دیا ۔ پس فارسی کو ملک بدر کرنے کا پہلا قدم اٹھایا گیا ۔ جنگ پلاسی کے بعد ”اردو“ کو لوگوں پر ٹھونس دیا گیا ۔ مقصد یہ تھا کہ ایسی زبان جس میں اسلامی ادب نہ ہو ، بہ آسانی اسلام کی یاد مسلمانوں کے دلوں سے ختم کر سکتی ہے۔ اور یوں انہیں صلیب پرستی کی طرف مائل کیا جاسکتا ہے۔

جب مسلمان مفکروں کو مقدر کے فیصلے کا سامنا کرنا پڑا تو وہ فوری طور پر بروئے کار آئے اور جلد ہی اردو اسلامی روایات کی ایک گرانمایہ زبان بن گئی، جس میں ان دیکھے امکانات مضمر تھے ۔

بعد میں لارڈ میکالے برطانوی ہند کو انگریزیت کے رنگ میں رنگنے کا خطرناک منصوبہ لے کر آئے، اور جیسا کہ خود انہوں نے تسلیم کیا، ان کا مدعا یہ تھا کہ ملکی باشندے جسمانی اعتبار سے دیسی اور روحانی اعتبار سے بدیسی یا انگریز ہو جائیں۔ تاہم بھی بیرونی تعلیم تھی جس نے علامہ اقبال، قائد اعظم محمد علی جناح اور مہاتما گاندھی کو پیدا کیا، جنہوں نے برطانوی بد روح کو زمین دوز کر کے ملک کو دشمنوں سے آزاد کرا لیا۔

میکالے کے منصوبے کی بنیاد پر قائم شدہ نظام تعلیم کی محض یہ غرض نہ تھی کہ ایک بیرونی زبان کو وسیلہ تعلیم کے طور پر نافذ کیا جائے جس میں وہ تمام قباحتیں مضمر ہوتی ہیں جن کے باعث قوت اختراع قتل ہو جاتی ہے اور ذہن پر بوجھ بڑھ جاتا ہے۔ بلکہ یہ غرض بھی شامل تھی کہ تعلیم عیسائیت کے رنگ میں رنگ جائے۔ یہ طریق کار زیادہ لطیف تھا۔ بظاہر تعلیم غیر مذہبی تھی، لیکن ایک جانب تو کرسچین کالج، جو خود رو پودوں کی طرح ہر چہار طرف پھیل گئے تھے، بہترین گورنمنٹ کالجوں سے زیادہ پرکشش نظر آنے لگے اور دوسری طرف انگریزی ادبیات کے بھیس میں ہر قسم کی مشنری کتابیں شامل نصاب کر دی گئیں، خواہ نظم کی صورت میں گولڈن ٹریژری ہو یا نثر کی شکل میں پلگرمس پروگریس۔ اسلامی مدارس کے متعلق وقف غیر انسانی طور پر ضبط کر لیے گئے۔ نجی مذہبی مدرسوں کے پنپنے کے مواقع مفقود تھے، اس کے باوجود برطانوی ہند میں اسلام مر نہیں سکا۔

محض اس پر اکتفا نہ کی گئی۔ یونیورسٹیوں میں عربی اور فارسی، اپنے ان اصل ادبی خزینوں سے منقطع کر کے، جن میں روحانی وراثت محفوظ تھی محض زبان کے طور پر پڑھائی جانے لگی۔ یہ قصابیت ہی کافی نہ سمجھی گئی۔ ان پاکیزہ زبانوں کے استاد بھی برطانوی یا یورپی ہی مقرر کیے جاتے تھے۔ مگر انگریزوں کی بدقسمتی سے اس کا نتیجہ خلاف توقع نکلا۔ ایسے دیسی مستشرقین پیدا ہوئے جو سیاسی ذہن رکھنے والے متعصب مصنفین کی غلط بیانیوں سے بھی واقف تھے اور اس طریق کار سے بھی کہ کس طرح مخالفین اسلام کی تحریروں کو بارود کے ذریعے اڑایا جا سکتا ہے۔ انگریز دیوبند اور سہارن پور کے مولاناؤں کے مقابلے میں، جن کی

تحریریں بہر حال اندرون ملک ہی رہتی تھیں اور انگریز قارئین تک نہ پہنچتی تھیں ، عبداللہ یوسف علی اور مولوی محمد شفیع سے زیادہ خائف تھے۔

اور اب جب کہ یہ سب کچھ ماضی کی تاریخ کا حصہ ہے، ہمارا فرض ہے کہ مقامی اور بیرونی تجربوں کے پیش نظر پرانی غلطیوں کا ازالہ کریں اور بہتر مستقبل کی تدبیر نکالیں ۔

بعض مشورے :

یہ کہنے کی چنداں ضرورت نہیں کہ اسلامی ورثے کی بنیاد قرآن ، حدیث، تصوف اور بہ حیثیت مجموعی عربی فارسی ادب پر ہے۔ ان موضوعات پر ہمارے بزرگوں کی خدمات ایسی ہیں جن پر ہر قوم فخر کر سکتی ہے۔ تاہم جیسا کہ ہر انسانی ادارے میں ممکن ہے کچھ نہ کچھ کرنے کے لیے، کسی نئی بات کے لیے ، ہمیشہ راہ کھلی ہونی ہے ۔

علم قرآن کے سلسلے میں میونخ یونیورسٹی کے تحقیقات قرآنی کے ادارے کے متعلق ہمارے نوجوان کی معلومات بہت مبہم ہوں گی۔ آج سے تین نسلیں پہلے اس ادارے کی بنیاد دو مخصوص کاموں کے لیے رکھی گئی تھی (۱) ساری دنیا سے قرآن کے نسخے جمع کیے جائیں اور ان کا تقابل کیا جائے تا کہ قرآن میں اختلافات کا پتہ چل سکے ۔ (۲) ہر عہد اور ہر ملک کی تفاسیر کا آیت بہ آیت انڈکس تیار کیا جائے تا کہ کتاب مقدس کی تفہیم کے ارتقا کا پتہ چل سکے ۔

تیسری نسل کے ڈائریکٹر پروفیسر پرٹزل (Prof. Pretzl) نے مجھے ۱۹۳۰-۳۳ میں یہ بتایا تھا کہ قرآن کے تقریباً بیالس ہزار نسخے مکمل اور نامکمل صورتوں میں اس ادارے میں جمع ہو چکے ہیں جو پہلی صدی ہجری سے لے کر جدید عہد تک کی مدت پر پھیلے ہوئے ہیں۔ ان نسخوں کا تقابلی مطالعہ کیا جا رہا ہے مگر اب تک کوئی حیرت انگیز بات معلوم نہ ہو سکی۔ کتابت کی چند اغلاط کا علم ہوا ہے مگر وہ محض کتابت کی غلطیاں ہیں۔ ان سے نسخوں کا اختلاف ظاہر نہیں ہوتا ، کہ ایک غلط لفظ کسی اور نسخے میں کبھی نہیں ملا ۔ تجوید اور اختلاف المصاحف کے

کام میں بعض اختلافات پائے گئے ھیں لیکن وہ تفسیر کے اختلافات ھیں جن سے کسی آیت کا مفہوم مطلق نہیں بدلتا۔ ـــ عدو شود سبب خیر گر خدا خواھد ـــ قرآن کے مختلف نسخوں کے تقابل کا کام اس نیت سے کیا گیا تھا کہ موجودہ قرآن کی صحت کو جھٹلایا جا سکے ۔ لیکن اس کوشش سے اس کی صحت زیادہ مستحکم طور پر پایۂ ثبوت کو پہنچی ـــ تدبیر کند بندہ، تقدیر زند خندہ ۔

جہاں تک تفاسیر کے انڈکس بنانے کا تعلق ھے یہ کام زیادہ عقل مندی سے کیا گیا تھا ۔ اس لیے کہ قرآن میں چھ ہزار مختلف آیات ھیں اور اتنے ھی خانے ایک بڑے شیلف میں تیار کیے گئے تھے ۔ ھر خانے میں مختلف مفسروں کی تفسیریں تاریخ وار رکھی گئی تھیں ۔ پس ایک نظر میں یہ معلوم کیا جا سکتا تھا کہ مختلف ممالک اور مختلف ادوار کے مسلمانوں میں کسی لفظ یا کسی آیت کا کیا مفہوم سمجھا جاتا تھا ۔ تاھم یہ سلسلہ محض عربی تفسیروں تک محدود تھا ۔

دوسری جنگ عظیم میں اس ادارے پر امریکی بم گرے اور یہ ادارہ لائبریری ، کارکن، اور ڈائریکٹر سب کے سب ھمیشہ کے لیے مفقود ھو گئے ۔

میں نہایت عجز کے ساتھ یہ مشورہ دیتا ھوں کہ تفاسیر کے انڈکس تیار کرنے کا کام لاھور میں دوبارہ شروع کیا جائے ۔ تفاسیر کے حدود کو زیادہ وسیع کیا جا سکتا ھے اور عربی ، فارسی، ترکی، اردو اور دیگر پاکستانی زبانوں کو اس زمرے میں شامل کیا جا سکتا ھے۔ میری یہ رائے بھی ھے کہ ایک مخصوص شعبہ قرآنی لغت کا کھولا جائے جس میں قرآن کا ھر لفظ دنیا کی تمام زبانوں میں ظاھر ھو۔ فرض کیجیے قرآن کا انگریزی ترجمہ ۸۰ افراد نے کیا ھے تو اس صورت میں لفظ ''رحمٰن'' یہ ظاھر کرے گا کہ کس مترجم نے اس لفظ کے لیے کونسا مرادف استعمال کیا ھے ۔ اور یہ کام دنیا کی تمام زبانوں کے لیے کیا جائے ۔ البتہ یہ کہ اس کی ابتدا دنیا کی زیادہ اھم زبانوں سے ھو۔ اس مواد سے مستقبل کے تراجم میں فائدہ ھو گا۔ ظاھر ھے کہ کسی لفظ کا مفہوم بدیسی زبان میں زیادہ بہتر طور پر ادا کیا جا سکتا

ہے۔ کسی عرب کے لیے لفظ رحم محض رحم ہی رہے گا۔ وہ اسے اچھی طرح سمجھتا تو ہے مگر اس کی تشریح دوسرے لفظوں میں بہ آسانی نہیں کر سکتا مثال کے طور پر اگر ہم لفظ Mercy یا Pity یا اس قسم کا کوئی اور لفظ استعمال کریں تو اس کا مفہوم زیادہ بہتر طور پر ادا ہو گا۔

حدیث :

کسی حدیث کا سراغ لگانے کے لیے قدیم زمانے سے ہی خصوصی الفاظ کے انڈکس بنتے رہے ہیں ۔ اس میں شبہ نہیں کہ زیادہ جدید اور زیادہ کارآمد المعجم المفہرس کی لائیڈن اشاعت ہے۔ اشخاص اور مقامات کے ناموں سے قطع نظر اس کی باقی جلدیں شائع ہو چکی ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ بہت کارآمد چیز ہے مگر اس موضوع پر اس کی حیثیت حرف آخر کی نہیں ہے ۔ مثال کے طور پر چند دن پہلے میں اس حدیث کی تلاش کر رہا تھا جس میں کہا گیا ہے پیغمبرؐ نے فرمایا کہ دجال آئے گا تو وہ محض چالیس روز قیام کرے گا ۔ جس میں سے پہلا دن تقریباً ایک سال کے برابر ہوگا ۔ دوسرا ایک ماہ کے برابر ، تیسرا ایک ہفتے کے برابر اور باقی سینتیس (۳۷) دن عام دنوں کے برابر ہوں گے ۔ آنجہانی پروفیسر ونسنک Wensinck کے لائیڈن انڈکس میں حدیث کی مختلف کتابوں مثلاً ابو داؤد وغیرہ کے حوالے تو موجود تھے مگر امام مسلم کی صحیح کا کوئی حوالہ نہ تھا۔ گو اس کا شمار پیغمبرؐ کی احادیث کے متعلق اسناد میں ہوتا ہے ۔ مراد یہ ہے کہ لائیڈن کا کام مکمل نہیں ہے ۔ علاوہ ازیں اس میں صحاح ستہ اور احادیث کے علاوہ چار دیگر کتابوں مثلاً ابن سعد وغیرہ کا انڈکس موجود ہے ۔ لیکن حدیثوں سے متعلق دور اول کے اہم کام بھی ہیں جو بخاری اور مسلم اور ان کے بعد کے محدثوں مثلاً ہمام ابن منبہ، معمر ابن راشد، عبدالرزاق ابن ہمام، حمیدی، سعید ابن منصور، ابن ابی شوبۃ وغیرہ کے اساتذہ کی کاوشوں کا نتیجہ ہیں ۔ ان کے علاوہ البیہقی، طبرانی ، دیلمی بزاز اور دیگر محدثوں کی تصانیف بھی شائع شدہ یا قلمی نسخوں کی صورت میں موجود ہیں۔ ان سے قطع نظر بہت سی حدیثیں ، تفاسیر، فقہ اور تصوف کی کتابوں میں بھی ایسی ملتی ہیں جو بسا اوقات احادیث کی کتابوں میں

نظر نہیں آتیں ۔ اب اس بات کی ضرورت ہے کہ ان کا ایک تفصیلی انڈکس تیار کیا جائے جن میں مکمل وضاحتی حوالے درج ہوں اور یہ کام ہماری نئی نسل فوٹو عکس اور کلپنگ (Clipping) کے جدید طریق کار کے باعث آسانی سے کر سکتی ہے۔ ہاتھ سے نقل کرنے کی صورت میں جن غلطیوں کا امکان ہوتا ہے وہ اس طرح ممکن نہیں ۔

عربی ادب کے سلسلے میں بھی ، جس کا میں ماہر نہیں ہوں ، مجھے عربی کی تمام ابیات کے شعری انڈکس کی ضرورت کا ہمیشہ احساس رہتا ہے لغت لسان العرب کے لیے اورینٹل کالج نے ایک ایسا ہی کارآمد انڈکس تیار کیا ہے ۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ تمام عرب شعرا کے دواوین کا انڈکس تیار کیا جائے جس میں ہر بیت کا اول اور آخری لفظ درج ہو۔ البتہ انڈکس شیلف میں سارے شعر محفوظ ہوں ۔ لسان العرب انڈکس کی طرح انہیں بہ اعتبار بحور ترتیب نہ دیا جائے بلکہ حروف تحجی کے اعتبار سے مرتب کیا جائے ۔ اس لیے کہ مسودوں کی تصحیح کے وقت اگر کوئی بیت غلط ہو تو اس کی بحر کا بھی پتہ نہیں ہوتا ۔ اس سلسلے میں بھی دواوین کے فوٹو عکس مہیا ہو سکتے ہیں اور ابیات کو مختلف کارڈوں پر چپکایا جا سکتا ہے اور ان پر تاریخ ، صفحہ نمبر ، قصیدے یا بیت کا نمبر درج کیا جا سکتا ہے ۔

ایسا کام محض تفریحی سطح کا نہیں ہوگا بلکہ اس کا منافع بھی ملے گا ۔ اگر قرآن ، حدیث، تصوف اور عربی شعر کے انڈکس کا کام وسیع پیمانے پر ہو جائے ، گو ابھی مکمل نہ ہو تو بھی بیرونی محققین مختلف معلومات حاصل کرنا چاہیں گے اور ایسی صورت میں انڈکس انسٹی ٹیوٹ انہیں بعوض رقم اطلاعات فراہم کر سکتا ہے۔ زر مبادلہ کمانے کا یہ بھی ایک ذریعہ ہے۔

یہ ہیں بعض معمولی خیالات، جنھیں آپ چاہیں تو خواب کہہ لیں مگر اس کی عملی تعبیر ناممکن نہیں ہے۔ زندہ دلان پنجاب یہ کام کر سکتے ہیں، اپنے لیے بھی اور ساری علمی دنیا کے لیے بھی ۔

زندہ باد اورینٹل کالج ـــــ زندہ باد کارپردازان اورینٹل کالج !

ڈاکٹر عبدالحمید

اورینٹل کالج ، پنجاب یونیورسٹی

مختصر تاریخ

۱۸۶۵ء میں پنجاب کی مشہور علمی تحریک کے نتیجے میں اورینٹل کالج قائم ہوا ۔ اس تحریک کے قائدوں بالخصوص ڈاکٹر لائٹنر کی آرزو تھی کہ برصغیر کے دوسرے حصوں کی طرح یہاں بھی مغربی علوم سکھائے جائیں ۔ لیکن ان میں مشرقی تہذیب و تمدن اور اردو زبان کو نمایاں حیثیت حاصل رہے ۔ چنانچہ ۱۸۷۲ء میں اورینٹل کالج قائم ہوا اس ادارے نے بہت سے نشیب و فراز دیکھے اور اس کے مضامین کی نوعیت بھی بدلتی اور گھٹتی بڑھتی رہی ۔ ایک زمانہ ایسا بھی گذرا کہ اس کی حیثیت کم ہوتے ہوتے یہاں تک گر گئی کہ اسے مشرقی تہذیب و علوم کی خانقاہ سمجھا جانے لگا ۔ بعض اوقات حکام کی تنگ نظری کے سبب اس کا وجود خطرے میں پڑ گیا لیکن ہر حالت میں اس کالج نے اشاعت علوم اور تحقیق کی روایت کو قائم رکھا ۔ ابتدائی زمانے میں اسے ڈاکٹر لائٹنر، آرل اسٹائن ٹامس آرنلڈ کی اور آخر میں وولنر جیسے مستشرقین کی سرپرستی نصیب ہوئی ۔ اسی دور میں محمد حسین آزاد ، فیض الحسن سہارنپوری اور مفتی محمد عبداللہ ٹونکی جیسے عالم فاضل اس کالج کے اساتذہ رہے ۔ مشہور انجنئیر اور فلاح کار سر گنگا رام اسی کالج میں انجینئیری کی تعلیم دیتے تھے اور یہیں علامہ اقبال نے درس و تدریس کے چار سال گذارے ۔

مناسب ہو گا کہ کالج کی سرگذشت بیان کرنے سے پہلے پچھلی صدی کا سیاسی نقشہ پیش کر دیا جائے ۔ انگریزوں نے ۱۸۴۹ء میں پنجاب پر قبضہ کیا ۔ ۱۸۵۶ء میں محکمہ تعلیم قائم ہوا ۔ ۱۸۶۴ء میں انگریزی علوم کے عظیم مرکز یعنی گورنمنٹ کالج کا قیام ہوا ۔ ڈاکٹر لائٹنر جو کنگس کالج لندن یونیورسٹی میں فقہ اسلامی کے صدر تھے، گورنمنٹ کالج کے پرنسپل منتخب ہوئے ۔ ان دنوں اس کالج کا الحاق کلکتہ یونیورسٹی سے تھا جو مغربی

روایات کا گہوارہ ہونے کی وجہ سے طالب علموں کو مشرقی اقدار سے بیگانہ کرنی تھی۔ ڈاکٹر لائٹنر کا مقولہ یہ تھا کہ اہل ہند کو اردو کے بجائے انگریزی زبان میں علوم کی تعلیم دینا بالکل بے معنی ہے۔ انہوں نے اپنے منصوبے کو تکمیل تک پہنچانے کے لیے پنجاب کے زندہ دل عوام اور مقامی رؤسا کی تائید حاصل کی اور یہ فیصلہ کیا کہ پنجاب کو کلکتہ یونیورسٹی کی تعلیمی بالادستی سے نجات دلائی جائے۔ انہوں نے ممتاز اشخاص اور افسروں کی مدد سے ۱۸۶۵ء میں انجمن پنجاب قائم کی اور پنجاب میں اورینٹل یونیورسٹی کے قیام کا مطالبہ کیا۔ مطمع نظر یہ تھا کہ مغربی علوم اور سائنس کی تعلیم اردو زبان میں دی جائے اور سنسکرت، عربی اور فارسی ادبیات کو فروغ حاصل ہو۔ پورے صوبے نے اس منصوبے کی حمایت کی اور پنجاب کی مختلف ریاستوں کے راجاؤں اور نوابوں نے دل کھول کر چندہ دیا۔

چوں کہ مرکزی حکومت کی منظوری کے بغیر اورینٹل یونیورسٹی کا قیام ممکن نہ تھا اس لیے اس سلسلے میں حکومت ہند سے رجوع کیا گیا۔ لیکن انتہائی کوششوں کے باوجود صرف پنجاب یونیورسٹی کالج کے قیام کی منظوری حاصل ہوئی۔ ڈاکٹر لائٹنر اس کالج کے پرنسپل اور تجویز شدہ یونیورسٹی کے رجسٹرار مقرر ہوئے۔ گورنمنٹ کالج کی پرنسپلی کے فرائض بدستور ان کے ذمے تھے۔

مغربیت کے اس طوفان میں اورینٹل یونیورسٹی تو کیا قائم ہوتی، البتہ اتنا ہوا کہ نوابوں اور اکابر کے چندوں سے ایک اورینٹل اسکول قائم کیا گیا جسے ۱۸۷۲ء میں اورینٹل کالج کے نام سے سرفراز کیا گیا۔ یہ اورینٹل کالج شہر کے مختلف حصوں اور انارکلی میں تھوڑے تھوڑے عرصے رونق افروز رہا۔ پھر ۱۸۷۵ء میں اسے گورنمنٹ کالج کے ایک گوشے میں جگہ دی گئی۔ اشاعت علوم اور تحقیق کے لیے اس کالج کے واسطے نو وظیفوں کی منظوری ہوئی۔ ایک رسالہ عربی اور ایک رسالہ سنسکرت میں بھی نکلنے لگا۔

ڈاکٹر لائٹنر نظم و ضبط کے معاملے میں سخت گیر لیکن درس و تدریس میں شفیق تھے۔ انہوں نے استادوں کو یہ نکتہ سمجھایا کہ تاریخی اور سماجی پس منظر سمجھے بغیر کسی زبان کا مطالعہ ممکن نہیں۔ نیز یہ

کہ ترجموں پر ادھار کھانے کے بجائے تخلیقی کاموں اور تصانیف پر توجہ دینا چاہیئے۔ ان دنوں اورینٹل کالج نقط مشرقی علوم ہی کا گہوارہ نہ تھا بلکہ اس میں قانون، انجینئری، فوٹوگرافی، مساحت، ریاضی، تاریخ، جغرافیہ، تاریخ فلسفہ اخلاق، خطابت و بلاغت، فقہ اسلامی، فقہ ہنود، عمرانیات، منطق، طبقات الارض وغیرہ وغیرہ کی تعلیم دی جاتی تھی اور لطف یہ کہ اردو زبان میں یہ علوم پڑھائے جاتے تھے۔ پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں اس زمانے کی درسی کتابیں آج بھی محفوظ ہیں۔ داخلے کی شرائط نہایت نرم تھیں۔ میٹرک کی سند داخلے کے لیے کافی تھی لیکن جن کے پاس یہ سند بھی نہ تھی وہ بھی استعداد و لیاقت کا ثبوت دے کر مختلف کورس پڑھنے لگتے تھے۔ پنجاب کے علاوہ کابل، تبت اور وسط ایشیا کے طالب علم یہاں پڑھتے تھے۔ استادوں کو پروفیسر کے بجائے سپرنٹنڈنٹ کہا جاتا تھا۔

۱۸۸۲ء میں پنجاب یونیورسٹی قائم ہوئی اور اگرچہ اس پر بھی مغربی طرز تعلیم کی چھاپ لگی ہوئی تھی تاہم اورینٹل کالج نے اپنی انفرادی حیثیت قائم رکھی۔ یونیورسٹی کا پہلا کانووکیشن ۱۸ نومبر ۱۸۸۲ء کو منعقد ہوا۔ ڈاکٹر لائٹنر نے بحیثیت رجسٹرار یونیورسٹی کی تعلیمی رپورٹ اردو زبان میں سنائی۔ ۱۸۸۴ء میں گورنمنٹ کالج نے عربی اور فارسی کی تعلیم کو اپنے شعبوں سے نکال کر اورینٹل کالج کے حوالے کیا بلکہ ان دونوں زبانوں کے پروفیسروں کو بھی منتقل کر دیا۔ اس طرح عربی اور فارسی کے طالب علم اورینٹل کالج میں چلے آئے۔ اور یہاں کے انگریزی پڑھنے والے طلبا گورنمنٹ کالج کے پروفیسروں سے پڑھنے لگے۔ ڈاکٹری اور بیطاری کے طلبا طب یونانی سیکھنے کے لیے بدستور اورینٹل کالج میں آتے رہے لیکن افسوس کہ علوم کی یہ کامن ویلتھ زیادہ عرصہ قائم نہ رہی یعنی ۱۸۸۴ء میں جب کہ ڈاکٹر لائٹنر عارضی طور پر لاہور سے باہر گئے ہوئے تھے ایک تحقیقاتی کمیٹی قائم ہوئی جس کا مقصد بظاہر یہ تھا کہ اورینٹل کالج کو ترقی دی جائے اس کمیٹی نے ترقی معکوس کے معنی سمجھانے کے لیے یہ کیا کہ انجینئری کی جماعت کو نیشنل کالج آف آرٹس میں میں منتقل کر دیا اور ڈاکٹری کے طلبا کو یہاں سے نکال کر میڈیکل کالج

کا راستہ بتایا ۔ بی ۔ اے کا داخلہ بند ہو گیا اور یہ کالج جو دس سال سے علوم و فنون کا گہوارا تھا بے رونق ہو کر رہ گیا ۔ ترقیاتی کمیٹی نے اپنی کارگذاری کا یہ شاندار ثبوت دیا ۔

۱۹۰۰ء میں کالج کے تن مردہ میں پھر جان آئی یعنی مشرقی علوم کے سند یافتہ طلبا (منشی، عالم، فاضل) کو قانوناً یہ اجازت دی گئی کہ وہ صرف انگریزی زبان کے پرچے دے کر میٹرک، ایف اے اور بی ۔ اے کی سندیں حاصل کر سکتے ہیں ۔ اس قانون سے ان طلبا کو خاص فائدہ پہنچا جو مشرقی زبانوں کی سند لے کر فقط انگریزی میں امتحان دے سکتے اور سند حاصل کر سکتے تھے ۔ ۱۹۱۱ء میں پنجاب یونیورسٹی نے فیصلہ کیا کہ پروفیسری کا عہدہ صرف ان اشخاص کو دیا جائے جو تحقیق کے جدید طریقوں سے باخبر ہوں ۔

۱۹۱۹ء سے ۱۹۴۷ء تک کا زمانہ اورینٹل کالج کا عہد زرین ہے کیوں کہ اسی مدت میں مولوی محمد شفیع ، ڈاکٹر سوریہ کانت ، ڈاکٹر محمد اقبال اور حافظ محمود خان شیرانی جیسے فاضلوں کا تقرر ہوا ، نصاب میں بھی ادبیات کے علاوہ تاریخ اور معلومات عامہ کا اضافہ کیا گیا ، تعلیم و تدریس کے پرانے فرسودہ طریقے میں بھی جدید نظریات کارفرما ہونے لگے ۔ تاریخ اسلام جسے یونیورسٹی کے شعبہ تاریخ نے نظر انداز کر رکھا تھا ، اس کالج کے نصاب میں شامل ہوئی ۔ ۱۹۲۵ء میں اورینٹل کالج میگزین کا اجرا ہوا جس میں عربی اور فارسی نیز اردو کے مختلف موضوعات پر نہایت پر مغز مقالے چھپنے لگے ۔ یورپ اور امریکہ کی اہم یونیورسٹیوں میں یہ میگزین ہاتھوں ہاتھ لیا گیا ۔ کالج کے اساتذہ نے دور و نزدیک سے نایاب اور بیش قیمت عربی و فارسی مخطوطات خرید کر یونیورسٹی لائبریری میں داخل کیے ۔ اس سے وہ تعصب اور حق تلفی بالکل ختم ہو گئی جو مسلمانوں کے علوم کو تباہ کرنے کے درپے تھی ۔ غیر مسلموں نے اس کے خلاف کمیٹی میں آواز اٹھائی ۔ لیکن علامہ عبداللہ یوسف علی نے جو کمیٹی کے رکن تھے اکثریت کے خلاف آواز بلند کی ۔

ڈاکٹر اے ۔ سی ۔ وولنر ۱۹۰۳ء سے ۱۹۳۶ء تک اس کالج کے پرنسپل اور یونیورسٹی کے رجسٹرار رہے ۔ آٹھ سال تک وائس چانسلر بھی

رہے۔ ان کے تقرر سے کالج کے وقار میں بڑا اضافہ ہوا۔ اس فاضل زمانہ کو خود بھی بہت عزت نصیب ہوئی۔ آزادی کے بعد جب انگریزوں کے تمام مجسمے سڑکوں پر سے ہٹا دیئے گئے تب بھی اس فاضل زمانہ کی مورتی کو کسی نے چھیڑنا پسند نہ کیا چنانچہ اس کا مجسمہ آج تک اسی طرح قائم ہے۔

۱۹۴۷ء میں ملک آزاد ہوا۔ ہندو پروفیسر ہجرت کر کے ہندوستان چلے گئے لہذا ہندی، گورمکھی اور سنسکرت کے شعبے بند کر دیئے گئے۔ اس کی تلافی کے لیے ۱۹۴۱ء میں عظیم پیمانے پر اردو کانفرنس منعقد ہوئی تاکہ قومی زبان کو اس کا صحیح مقام دیا جائے۔ رسم الخط کی اصلاح، اردو اکاڈیمی کا قیام اور اردو انسائیکلوپیڈیا کا افتتاح کیا گیا۔ ایم۔ اے اردو کی جماعتیں کھولی گئیں۔ فرانسیسی، جرمنی، ھسپانوی اور ترکی زبانوں کی تعلیم شروع ہوئی۔ ۱۹۵۸ء میں برٹش کونسل کے تعاون سے انگریزی زبان، فنی نکات اور صوتیات کا منصوبہ بنا۔ جو چند سال بعد ختم ہو گیا۔ ایشیا، امریکہ اور یورپ کے طلبہ مشرقی علوم سیکھنے کے لیے داخل ہوئے جس سے کالج کی فضا میں رنگین تنوع پیدا ہوا۔ طالبات کی تعداد طلبہ کے مقابلے میں زیادہ رہنے لگی۔ طلبہ کی یونین بھی قائم ہوئی۔

۱۹۵۹ء کے تعلیمی کمیشن کی رپورٹ نے اردو کی اھمیت کو قانونی استحکام بخشا۔ ایف۔ اے تک اردو کی تعلیم لازمی ہوگئی۔ ایم اے اردو میں طلبہ کی تعداد کثیر داخل ہوئی۔ کیوں کہ اسکولوں اور کالجوں سے اردو کے اساتذہ کی مانگ بڑھ گئی تھی۔ اب تک ایم۔ اے اردو کی جماعتوں کی رونق دیدنی ہے۔ ۱۹۶۷ء میں یونیورسٹی نے مرزا غالب کی تمام تصانیف کو شائع کرنے کا بیڑا اٹھایا تاکہ دو سال بعد غالب کی صد سالہ برسی منائی جائے۔ اورینٹل کالج کے اساتذہ نے اس کار خیر میں نمایاں حصہ لیا۔
۱۹۷۱ء میں پنجابی کا شعبہ قائم ہوا۔

یہ اس کالج کی مختصر سرگذشت ہے۔ یقین ہے کہ اپنے تابناک ماضی و حال کے سہارے یہ ادارہ مستقبل میں بھی اپنی شاندار روایات کا امین رہے گا۔

پروفیسر ڈاکٹر محمد باقر

حافظ محمود خان شیرانی

تحقیق کا طریق کار اور معیار

بعض آدمی یہ کہتے سنے گئے ہیں، کہ شبلیؒ کی شعرالعجم، زندۂ جاوید کتاب ہے اور شیرانی کی تنقید شعر العجم کے باوجود تا ابد زندہ رہے گی لیکن تنقید شعرالعجم، کی عمر کوئی لمبی نہیں ہے۔ راقم ایک طالب علم کی حیثیت سے یہ عرض کرنا چاہتا ہے کہ یہ دونوں معروضات کاملاً درست نہیں ہیں۔ جو لوگ فارسی شاعری کی ادبی چاشنی سے لذت اندوز ہونا چاہیں گے اور سرسری طور پر اس کے تاریخی پس منظر سے شناسائی چاہیں گے وہ ہمیشہ شعرالعجم سے استفادہ کرتے رہیں گے، لیکن جو طالب علم صدق و حقائق کی تلاش میں نکلیں گے۔ وہ تنقید شعرالعجم سے ضرور صحیح راہ تلاش کریں گے۔ اس حیثیت سے یہ دونوں آثار فارسی علم و ادب کے میدان میں معرکۃ الآراء تخلیقات ہیں غالباً۔ یہی وجہ ہے جہاں ایران میں شعرالعجم کا فارسی ترجمہ شائع کیا گیا ہے، وہاں تنقید شعرالعجم کو بھی فارسی لبادہ اڑھایا گیا ہے اور شیرانی کے کسی دعوے کو آج تک جھٹلایا نہیں جا سکا۔

استاد گرامی حافظ محمود خان، محمود شیرانی اپنے دور کے غالباً سب سے بڑے محقق تھے جنہوں نے پاک و ہند اور ایران سے متعلق فارسی میں محفوظ علم و ادب اور تاریخ اور اردو زبان پر اس تحقیقی قطعیت کے ساتھ قلم اٹھایا کہ اس کی مثال نادر کالشاذ ہے۔ اردو کے شعراء اور ادباء تاریخ ادب اردو کی تدوین میں ایک عرصے سے مشغول ہیں، انہوں نے تنقید و تبصرہ کے میدان میں بعض دفعہ عمدہ کام کیا ہے۔ لیکن لسانی تحقیق میں بہت کم کام ہوا ہے۔ اس سنگلاخ وادی میں غالباً سب سے پہلے شیرانی صاحب اترے ہیں اور انہوں نے غیر پنجابی ہونے کے باوجود

پنجاب سے اردو کے قدیم رشتوں کو تلاش کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے یہ کام بڑا کٹھن تھا، کیونکہ عام تجربہ یہ ہے کہ تحقیق کرنے والے معروف اہل زبان چونکہ زبان کی پیدائش کے علاقے ہپتہ هیندو کو نہیں پہچانتے، جس کے ایک حصے کا نام دو تین صدیاں پہلے پنجاب پڑ گیا تھا، اس لیے وہ لسانی اعتبار سے تحقیقی کام کرنے کی استعداد اور اهلیت بھی پیدا نہ کر سکے۔ لیکن مرحوم شیرانی نے ان پیدائشی **Drawbacks** کے باوجود بڑی پامردی سے اس میدان میں قدم رکھا اور اردو پر لسانی تحقیقات کرنے والوں کو کئی نئی راهیں سمجھائیں۔

آج کی صحبت میں، میں اس میدان میں کام کرنے والوں کے لیے اپنے استاد شیرانی مرحوم کے طریق کار کو پیش کرنا چاھتا هوں، تا کہ همارے معاصرین اور هم سے بعد میں آنے والے حضرات کو معلوم هو سکے، کہ وہ اتنے اعلی معیار کی تحقیق کس طرح کیا کرتے تھے۔

شیرانی صاحب در اصل وکالت کی تعلیم حاصل کرنے کے لیے انگلستان تشریف لے گئے تھے، اس زمانے میں میٹرک پاس طلباء کو بیرسٹری میں داخلہ مل جاتا تھا۔ حافظ صاحب مرحوم کی یہی تعلیم تھی۔ اس کے علاوہ انہوں نے منشی فاضل کا امتحان پاس کیا هوا تھا، بدقسمتی سے اپنے والد کی وفات کی وجہ سے وہ انگلستان میں اپنی تعلیم جاری نہ رکھ سکے اور اپنے علمی ذوق کی تسکین کے لیے انہوں نے فارسی عربی کا مطالعہ شروع کیا، یہ روشن نہیں کو مجوزہ تعلیم کا منصوبہ ترک کرنے کے بعد کن لوگوں سے ان کے روابط استوار هوئے، لیکن ایک بات واضح ہے کہ معیاری تحقیق کا جذبہ اسی وقت بیدار هوا۔

وطن واپس پہنچے تو سر شیخ عبدالقادر کی سفارش پر انہیں اسلامیہ کالج لاهور میں استاد کی حیثیت سے کام ملا، لیکن تدریس کی بجائے ان کا تمایل تحقیق کی طرف زیادہ تھا۔ اور وہ سوچنے لگے تھے کہ اردو کی پیدائش کیسے اور کہاں هوئی؟ ان کا اولین معیار تحقیق یہ تھا کہ جب تک قوی شواهد موجود نہ هوں اس وقت تک بات قیاسی رہ جاتی ہے اور پایۂ ثبوت کو نہیں پہنچتی۔

پھر شواھد کی تلاش میں وہ کوئی کسر اٹھا نہ رکھتے اور اس کے لیے وہ بساط بھر صرف مال و جان کرتے رہے ، مثلاً ایک سکے کے سوا اکبر کے سکوں کا پورا سلسلہ ان کے پاس موجود تھا، یہ بات میں بعد میں بیان کروں گا ، کہ شہنشاھوں کے سکوں کے کامل سلسلے بہم پہنچانے میں ان کے ملحوظ خاطر کیا ھدف تھا، اور اس سلسلے میں انہوں نے اپنے شاگردوں کی تربیت کیسے کی، فی الحال صرف یہ کہنا چاھتا ھوں۔ کہ انہوں نے ایک دن مجھے اس صورت حال سے آگہ کیا، اور اپنے ساتھ گجرات چلنے کے لیے کہا۔ میں اس وقت (۱۹۳۳ء) میں ان کا طالب علم تھا اور اس سے پہلے گورنمنٹ کالج گجرات میں زیر تدریس رھنے کی وجہ سے شہر گجرات کے جغرافیہ اور اشخاص سے مانوس تھا، گجرات میں اس وقت ایک پادری مارٹن صاحب سکے جمع کر کے بیچا کرتے تھے۔ ھم ریلوے سٹیشن سے تانگہ لے کر مارٹن کے گھر پہنچے، پادری بڑی تواضع سے پیش آیا اور حافظ صاحب نے مطلوبہ سکے کا مطالبہ کیا تو وہ فوراً اندرون خانہ سے سکہ لے آیا، شیرانی صاحب نے اس چمکتے ھوئے سکے کو ایک نظر دیکھا تو چارپائی سے اٹھ کھڑے ھوئے۔ مارٹن مول تول کرنے کی تجاویز کر رھا تھا ، لیکن شیرانی صاحب اس کی کسی بات کو درخور اعتناء نہیں سمجھتے تھے، واپسی پر راستے میں انہوں نے بتایا کہ اس آدمی کے پاس اکبر کا اصلی سکہ یا موجود ھے یا اس کی دسترس میں ھے ، لیکن یہ اس کی مجعول تیار کر کے بیچ رھا ھے اور جب تک یہ کافی جعلی سکے فروخت نہ کر لے گا ، اس وقت تک یہ اصلی سکے کی نشاندھی یا فروخت کے لیے تیار نہ ھوگا، اس لیے اس سے اس وقت سودا کرنا بے کار ھے۔ ھم مارٹن کے مکان سے صرافہ بازار میں پہنچے وھاں شیرانی صاحب نے مختلف زرگروں سے استفسار کیا اور پھر ایک سنار کی دکان پر دھرنا مار کر بیٹھ گئے، اس نے ایک چیتھڑے میں بندھے ھوئے تانبے اور چاندی کے سکے ڈھیر کر دیے ــــ شیرانی صاحب نے ان کو ایک نظر الٹ پلٹ کر دیکھا اور سنار سے سودا کرنے کے بعد یہ طے پایا کہ چاندی کے تمام سکے چاندی کے بھاؤ تول کر لیئے جائیں گے اور تانبے کے چار آنے فی سکہ کے حساب سے زرگر نے سکے تول دیے اور شیرانی صاحب نے قیمت ادا کر دی۔

دوپہر کا کھانا میرے مکان پر گجرات میں تھا، وہاں آپ نے پھر چیتھڑے کو کھولا۔ اور ایک سکہ نکال کر اسے غور سے دیکھنا شروع کیا پھر مسکراتے ہوئے اسے میرے ہاتھ پر رکھدیا ـــــ ساتھ ہی فرمایا : تم نے سنا، مارٹن صاحب اسی زرگر کا ذکر کر رہے تھے اور غالباً اسی زرگر سے اکبر کے اس سکے کی نقلیں بنوا رہے تھے، پھر نقل کی قیمت دس گنا مانگ رہے تھے میں نے اصل سکہ چاندی کے وزن کے حساب سے خرید لیا ہے، وہ اپنی کامیابی پر بہت خوش نظر آتے تھے۔

سکوں اور خطی نسخوں کی تلاش کے وقت شیرانی صاحب نے متعدد مرتبہ مجھے ہمرکابی کا شرف بخشا، انہیں جب معلوم ہو جاتا، کہ ہندوستان کے فلاں شہر میں فلاں شخص کے پاس ایک نادر نسخہ یا سکہ ہے تو وہ ہر قیمت پر اسے حاصل کرنے کی کوشش کرتے اور یہ بات عام طور پر معلوم ہے کہ ان کے پاس خطی نسخوں کا ایک نادر ذخیرہ موجود تھا اور مغل شہنشاہوں کے سکوں کے سونے اور چاندی کے کامل سلسلے بھی تھے۔

شواہد اور ثبوت کے متعلق بھی شیرانی صاحب کا معیار نہایت عالمانہ تھا، وہ یہ صحیح طور پر سوچتے تھے، کہ تاریخی واقعات کی صحت جانچنے اور پرکھنے کے لیے یہ نہایت ضروری ہے کہ

معاصر تاریخوں سے ثبوت اور دلیل مہیا کی جائے۔ بعد کی تواریخ کتنی بھی مقبول کیوں نہ ہوں اس تاریخ کے برابر نہیں ہوسکتیں جو معاصرین نے مرتب کی ہے، کیونکہ ہر مورخ جب سنی سنائی یا اپنے سے پہلے لوگوں سے تاریخی واقعات نقل کرتا ہے تو اس کا امکان موجود رہتا ہے کہ اس شک اور ظن کی بدولت حقیقت مسخ ہو جائے۔

شیرانی صاحب اس مطمح نظر کو پیش نظر رکھ کر کتابوں کے معاصر خطی نسخے اور سکے جمع کیا کرتے تھے تاکہ واقعات کی چھان بین کے لیے صحیح طور پر استناد ہو سکے۔ ایک مثال عرض کروں گا۔

امیر خسرو کی بے حد کمیاب مثنوی تغلق نامہ مجلس مخطوطات فارسی حیدرآباد (دکن) کی طرف سے ۱۹۳۳ء میں شائع ہوئی، یہ مثنوی مولوی

رشید احمد مرحوم نے کتاب خانۂ حبیب گنج کے ایک قلمی نسخہ سے نقل کی تھی، مرحوم کی بے وقت موت کے بعد یہ مثنوی سید ہاشمی فرید آبادی نے ایک دیباچے اور خلاصۂ مثنوی کے اضافے کے ساتھ شائع کی۔ اس دیباچے اور مقدمے پر سید مقبول احمد صمدانی نے ہندوستان اکیڈیمی کے تماہی رسالہ ـــ (اشاعت جولائی ۱۹۳۴ء) میں تنقید و تبصرہ کیا ۔ شیرانی صاحب کو اس تنقید سے اختلاف تھا انہوں نے مجھ سے اس کی تردید لکھنے کے لیے کہا، میں اس وقت تک ان سے تربیت حاصل کر کے پنجاب یونیورسٹی کے شعبۂ تاریخ میں ریسرچ اسسٹنٹ کی حیثیت سے کام کر رہا تھا، ہاشمی صاحب نے تغلق نامہ کی تاریخی اہمیت بیان کرتے ہوئے لکھا تھا کہ ـــ اس مثنوی سے بہت سے تاریخی واقعات کی تفاصیل بہم پہنچتی ہیں اور کئی ایک مؤرخین کے غلط بیانات کی تصحیح ہوتی ہے۔ اس سلسلے میں آپ نے قطب الدین مبارک کے قتل کی تاریخ جمادی الاخری ۷۲۰ھ کی چاند رات امیر خسرو کے ذیل کے اشعار سے اخذ کی :

چو تاریخ عرب شد هفصد و بیست
ثبات قطب شد کم جانب زیست

جماد دومین را شد پدیدار
هلال تیره و تاریک دیدار

شد آن مه بر همه گیهان مبارک
مگر بر طالع سلطان مبارک

اور پھر غازی ملک تغلق کی تخت نشینی کی تاریخ پہلی شعبان ۷۲۰ھ ذیل کے شعر سے نکالی :

چو صبح غرهٔ شعبان فرخ
نمود از تخت گه آسمان رخ

سید مقبول احمد اس پر معترض تھے، اور مشہور مستشرق بیل (Beale) اوریئنٹل بیاگریفکل ڈکشنری کے مصنف اور معروف مؤرخ فرشتہ کے حوالے سے اس پر مصر تھے کہ خلجی سلطان قطب الدین مبارک کا قتل اور غازی ملک تغلق کی تخت نشینی ۷۲۰ھ میں نہیں بلکہ ۷۲۱ھ میں ہوئی

تھی، شیرانی صاحب نے میری راہ نمائی کرتے ہوئے کہا کہ یہ نظریہ بالکل غلط ہے۔ فرشتہ اور بیل دونوں قطب الدین مبارک سے بہت بعد کے آدمی ہیں ان کی بات بدون تامل نہیں مانی جا سکتی، تاریخ فیروز شاہی کا مصنف برنی اس عہد کے قریب اور معاصر ہونے کی وجہ سے زیادہ قابل اعتماد ہے چنانچہ میں نے برنی کو دیکھا تو اس نے حروف میں تغلق شاہ کا سنہ جلوس ۷۲۰ھ بیان کیا ہے۔

اور جیسا کہ میں نے عرض کیا ہے ایسے مواقع پر شیرانی مرحوم سکوں سے بھی مدد لیا کرتے تھے اور سکے جمع کرنے کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ تاریخی واقعات کی جانچ پرکھ کے لیے انہیں استعمال کیا جائے، چنانچہ راقم نے بھی ان دونوں بادشاہوں کے سکے تلاش کرنے شروع کیے۔

ہندوستان میں سلاطین دھلی کے جو سکے اس وقت موجود تھے، ان کی مفصل فہرستیں شائع ہو چکی ہیں ۔ ان میں قطب الدین مبارک کے سونے، چاندی اور تانبے کے دستیاب ہونے والے سکوں کی جو تفصیل درج ہے وہ سب کے سب ۷۱۷ھ اور ۷۲۰ھ کے بین بین مسکوک ہوئے ہیں، ۷۲۱ھ کا کوئی سکہ نہیں ملتا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ قطب الدین مبارک کا عہد ۷۲۱ھ سے پہلے ختم ہو چکا تھا اور وہ ۷۲۱ھ میں زندہ نہیں تھا ۔ لیکن یہ بھی ممکن تھا کہ ۷۲۱ھ کے سکے دستیاب نہ ہوئے ہوں۔

اس کے بعد مجھے ناصرالدین خسرو خان کے سکے تلاش کرنے پڑے، یہ غدار وزیر اور قطب الدین مبارک کا غلام اپنے آقا کو قتل کر کے تخت دھلی پر متمکن ہو گیا تھا، دھلی کی ٹکسال کا ایک سکہ دستیاب ہوا، جو خسرو خان نے بنوایا تھا اور اس کے حاشیے پر ۷۲۰ھ کا سال حروف میں درج تھا، ظاہر ہے کہ خسرو خان اپنے بادشاہ کی موجودگی میں اپنے نام کا سکہ نہیں چلا سکتا تھا اور اس وقت مبارک کا قتل ہو چکا تھا، راقم نے پھر غیاث الدین تغلق شاہ کے سکے تلاش کئے تو اس کے بھی ۷۲۰ھ کے متعدد سکے مل گئے، ان سے بھی ثابت ہوا کہ خسرو خان کے بعد تغلق شاہ بھی ۷۲۰ھ میں تخت پر بیٹھ گیا تھا میری یہ ساری تحقیق معارف (اعظم گڑھ) میں شائع ہوئی اور شیرانی صاحب اسے دیکھ کر بہت مطمئن ہوئے۔

شیرانی مرحوم کا تحقیقی معیار یہ بھی تھا کہ وہ سند کے بغیر کسی دعوے کو قبول کرنے کے لیے آمادہ نہ ہوتے تھے۔ مولوی عبدالحق مرحوم نے جب ان سے شعرالعجم لکھوائی تو شعرالعجم کی جا بجا تصحیح کے لئے انہوں نے صرف ایک ہی طریقہ اختیار کیا، کہ شعرا کے اپنے کلام اور معاصر تواریخ سے شواهد اور دلائل فراہم کئے۔ انہوں نے مولوی شبلی نعمانی کی علمیت اور فضیلت کو تسیلم کرتے ہوئے تحقیق کے میدان میں ان کے روایتی قد کاٹھ کو وقعت نہ دی اور مستند حوالوں سے انہیں جو کچھ دستیاب ہوا، اس کے بل پر شبلی کی تصحیح کی۔

مختصراً شیرانی مرحوم کا طریق کار یہ تھا کہ موضوع زیر بحث پر تحقیق کرنے کے لیے سب سے پہلے مستند مواد جمع کیا جائے، تاریخی لسانی اور ادبی مواد میں وہ صحیح معاصر خطی نسخوں ، سکوں، فرامین، اور تاریخ دار ظروف، کتبوں، پارچات اور چوبی شواہد وغیرہ کو اولیت کا درجہ دیتے تھے۔ پھر اگر روایت کے تواتر کے شواهد هاتھ آتے تو وہ انہیں ثانوی حیثیت سے سنین کے قریب و بعید کے مطابق درجہ دے کر استعمال کرتے۔ اس سلسلے میں انہوں نے تجربے کی کثرت اور تاریخ کے عمیق مطالعہ میں اتنی مہارت پیدا کرلی تھی، کہ وہ اصل اور نقل میں آسانی سے تمیز کر لیتے تھے اور بسا اوقات کاغذ دیکھ کر خطی نسخے کی عمر معین کر لیتے تھے، انہیں معلوم تھا کہ مغل شہنشاهوں کے دور میں شاھجہان کا زمانۂ کثرت ثروت کے اعتبار سے سب سے زیادہ اھم اور عمدہ وقت ھے۔ لہذا اسی دور میں ھندوستان میں کاغذ بھی عمدہ بننا شروع ھو گیا تھا۔ اس طرح سے شاھجہان کے زمانے میں جب ھندوستان میں قالین بافی شروع ھوئی تو ھندوستان کے بنے ھوئے قالین ایرانی قالینوں سے زیادہ قیمت پر بکنے لگے۔ شیرانی مرحوم کا خیال تھا کہ ھندی مسلمانوں نے جہاں کتابت، مصوری اور معماری میں عدیم المثال اور نادر نمونے پیش کیے ھیں، وھاں پارچہ بافی اور قالین بافی میں بھی اپنے نبوغ ھنر کی حسین و جمیل نمائش کی ھے اور ثروت اور وسائل کی تکثیر و تقایل کے ساتھ ھنر کاری مفید اور تزئینی ھنروں کا معیار بدلتا رہا ھے۔ انہوں نے خود بڑے خوبصورت اور حسین کھیس جمع کر رکھے تھے اور قدیم کپڑوں کی عمر

بھی وہ ھنر کے معیار کو جانچ کر مقرر کر سکتے تھے ۔ یعنی ان کے مطالعہ اور تحقیق کا عملی اور مثبت پہلو یہ تھا، کہ وہ اپنے علم سے ماضی کے دریچوں میں بوثوق جھانک سکتے تھے ۔ افسوس ہے کہ شیرانی کی روایت بہت دور اور بہت دیر تک نہ چلی ۔ استقلال پاکستان سے ذرا پہلے ان کا قیمتی کتاب خانہ تو پنجاب یونیورسٹی کے قبضے میں آ گیا، لیکن پاکستان کی ہیئات مقتدرہ کی عدم توجہی کی وجہ سے ان کے سکے تول کر ایک ھندو مارواڑی ھندوستان لے گیا ۔ ان کے دام غالباً ۲۰ ھزار پڑے، وزن کے حساب سے بھی یہ اب ۲۰ لاکھ کے ھوں گے ۔ لیکن قدر کے اعتبار سے شاید انمول ھیں، اتلاف کا یہ سلسلہ جاری ہے ۔ پاکستان کی تاریخ اور ثقافت سے متعلق پرزے اغیار خرید کر اپنے ملک میں لے جا رہے ھیں، اور یہاں جن لوگوں کے پاس پڑے ھیں وہ ضائع ھو رہے ھیں؛ کیونکہ یہاں تحقیق کرنے والے جاندار انسانوں کا کوئی پرسان حال نہیں، بےجان کتابوں، سکوں، فرامین اور دیگر وثائق کو کوئی کیا کرے۔ نتیجہ یہ ہے کہ یہاں بہت سے شیرانی پیدا ھونے بھی ختم ھو گئے ھیں۔

پروفیسر سید وقار عظیم

اورینٹل کالج کے

طلبہ کا تحقیقی کام

برصغیر کے جن تعلیمی اداروں نے انیسویں صدی کی آخری تین دھائیوں سے اس وقت تک مشرقی علوم میں تفتیش و تحقیق کی بڑی وقیع روایت قائم کی اور برقرار رکھی ان میں یونیورسٹی اورینٹل کالج لاہور کا نام بلاشبہ سب سے نمایاں ہے۔ سنسکرت، ہندی اور پنجابی پر کام کرنے والوں میں بی۔ ڈبلیو۔ لائٹنر، آرل اسٹین، اے۔ سی۔ وولنر، اے۔ ڈبلیو۔ اسٹراٹن، لکشمن سروپ، سوربا کانت، پنڈت سیوادت، پنڈت گروو پرشاد، بنارسی داس جین اور موہن سنگھ دیوانہ کے نام اور عربی، فارسی اور اردو کے موضوعات پر تحقیقی کام کرنے والوں میں ٹی۔ ڈبلیو۔ آرنلڈ، محمد حسین آزاد، مولوی محمد شفیع، حافظ محمود شیرانی، عبدالعزیز میمنی، ڈاکٹر عنایت اللہ، پروفیسر محمد اقبال، عباس شوشتری، مولانا فیض الحسن، سید اولاد حسین شاداں بلگرامی اور ڈاکٹر سید عبد اللہ کا تحقیقی کام ایسا ہے کہ اس کی اہمیت بین الاقوامی دنیا میں تسلیم کی گئی ہے۔ چنانچہ ۱۹۵۰ء کے شروع میں جب مجھے اس کالج کے شعبۂ اردو سے وابستہ ہونے کا شرف حاصل ہوا تو اسے میں نے زندگی کا ایک اہم واقعہ سمجھا، اور بلاشبہ یہ واقعہ آگے چل کر کئی حیثیتوں سے اہم ثابت ہوا۔ فروری ۱۹۵۰ء سے اپنی سبک دوشی کے وقت (ستمبر ۱۹۷۰ء) تک کی تقریباً اکیس سال کی مدت میرے لیے اس لحاظ سے بڑی اہم ہے کہ اس مدت کا ایک ایک لمحہ کاموں میں مصروف رہنے اور دوسروں کو کاموں میں مصروف رکھنے کی مسرت و سرخوشی میں بسر ہوا۔ میں نے جب ۴ فروری کو کالج میں قدم رکھا تو میرے حصے کا کام میرا منتظر تھا۔ اسی دن پتہ چل گیا کہ ایم۔ اے کی جماعتوں میں افسانوی ادب اور اقبال کے پرچوں کی تدریس میرے ذمے ہے۔ جماعتوں سے ابتدائی تعارف کا مرحلہ بڑی تیزی سے طے ہوا اور میں نے پہلے ہی دن طلبہ

اور طالبات سے ابتدائی گفتگو کی اور کل سے جو کام کرنا تھا، طلبہ کے مشورے سے اس کا ابتدائی خاکہ مرتب کیا۔

کام شروع ہوا تو ایم۔ اے کی تدریس کی مختلف رخ سامنے آئے۔ ایم۔ اے کے طلبہ کو سات پرچوں میں امتحان دینا ہوتا تھا۔ ان میں سے آخری پرچہ مضمون نگاری کا تھا۔ طلبہ کو اختیار تھا کہ اس پرچے کے بجائے وہ کسی منظور شدہ موضوع پر مقالہ لکھیں۔ چنانچہ اس سال (یعنی ۱۹۵۰ء میں) جن طلبہ اور طالبات کو ایم۔ اے کے امتحان میں شریک ہونا تھا ان میں سے تقریباً آدھے مقالہ لکھ رہے تھے۔ بعض مقالات کی نگرانی میرے سپرد ہوئی۔ مقالات کے خاکے اور طلبہ کی کارکردگی دیکھ کر اندازہ ہوا کہ انہیں کام کا شوق تو ہے لیکن مقالے کی ترتیب، تدوین اور تسوید کے مختلف مراحل جس توجہ، انہماک، تن دہی اور دماغ سوزی کی طلب اور تقاضا کرتے ہیں، اس کا احساس انہیں ابھی نہیں۔ ایم۔ اے کے طلبہ پہلی مرتبہ ایم۔ اے (اردو) کے امتحان میں بیٹھ رہے تھے اس لیے مقالہ نگاری کا تجربہ ان کی زندگی کا پہلا تجربہ تھا اور عام مضمون نگاری اور مقالہ نگاری میں جو فرق ہے اس سے اب تک وہ واقف نہیں تھے۔

یہ بات پہلے سال کی ہے۔ اس کے بعد آنے والے ہر دور میں سال بسال جو مقالات لکھے گئے ان کی ترتیب و تحریر کے معیار میں بتدریج ترقی ہوئی اور بالآخر یہ صورت پیدا ہوئی کہ ایم۔ اے کے امتحان کے لیے لکھے ہوئے مقالوں میں سے بعض ایسے ہوتے تھے کہ بڑی آسانی سے انہیں پی۔ ایچ۔ ڈی کے مقالوں کے مقابلے میں رکھا جا سکتا تھا۔ ایم۔ اے کے لیے لکھے ہوئے مقالوں کی ایک فہرست اس وقت میرے پیش نظر ہے۔ یہ فہرست ڈھائی سو سے زیادہ مقالوں کی ہے اور ان کے موضوعات اتنے متنوع ہیں کہ اردو ادب و شعر کا شاید ہی کوئی ایسا رخ ہو جو اس فہرست میں موجود نہ ہو۔ موضوعات کے تنوع اور کام کی نوعیت کا اندازہ تو مکمل فہرست دیکھ کر ہی ہوسکتا ہے، لیکن میں اپنی بات کی وضاحت کے لیے صرف ان مقالات کا ذکر کرنا چاہتا ہوں جو افسانوی ادب کے مختلف پہلوؤں پر لکھے

گئے، اور اس میں داستان، ناول، اور افسانے کے علاوہ ڈرامے سے تعلق رکھنے والے موضوعات بھی شامل ہیں۔ پہلے مقالات کے عنوانات پر ایک نظر ڈال لیجئے :

داستانیں :

۱- باغ و بہار کے کردار
۲- رجب علی بیگ سرور کی قصہ گوئی
۳- باغ و بہار کے نسوانی کردار
۴- باغ و بہار کا اخلاقی پہلو
۵- فسانۂ عجائب کا تنقیدی مطالعہ
۶- باغ و بہار اور فسانۂ عجائب کا تقابلی مطالعہ
۷- رجب علی بیگ کا تہذیبی شعور

ناول :

۱- اردو ناول بیسویں صدی میں
۲- پریم چند کے ناول
۳- راشد الخیری بحیثیت ناول نگار
۴- منشی سجاد حسین کے ناول
۵- اردو کی ناول نگار خواتین
۶- اردو کے ناولوں کے اہم کردار
۷- مرزا محمد سعید کی ناول نگاری
۸- نذیر احمد کے ناولوں کے کردار
۹- امراؤ جان ادا کے کردار
۱۰- عزیز احمد بحیثیت ناول نگار
۱۱- تاریخی ناول تقسیم کے بعد
۱۲- پریم چند کا نظریۂ حیات و نظریۂ فن
۱۳- پریم چند کے ناولوں میں عورت کا تصور
۱۴- فسادات اور اردو ناول
۱۵- مولانا شرر کے ناول ادبی تنقید کی روشنی میں

۱۶- اردو کے مزاحیہ ناول
۱۷- اردو کے انعام یافتہ ناولوں کا فکری و فنی تجزیہ
۱۸- چوگان ہستی کا تنقیدی مطالعہ
۱۹- پریم چند کے ناولوں میں رومانی عناصر
۲۰- اردو کے ناولوں میں دیہاتی معاشرت کی عکاسی
۲۱- فسانۂ آزاد کے کردار
۲۲- فسانۂ آزاد کا فنی مطالعہ

مختصر افسانہ :

۱- سجاد حیدر یلدرم ــــ شخصیت اور فن
۲- پریم چند بحیثیت افسانہ نگار
۳- سلطان حیدر جوش (افسانہ نگار)
۴- نیاز فتح پوری (افسانہ نگار)
۵- ل ۔ احمد ۔ اکبر آبادی (افسانہ نگار)
۶- مجنوں گورکھ پوری (افسانہ نگار)
۷- سدرشن کی افسانہ نگاری
۸- تقسیم کے بعد اردو افسانہ
۹- اردو افسانہ اور فسادات
۱۰- کرشن چندر کی افسانہ نگاری
۱۱- علی عباس حسینی کی افسانہ نگاری
۱۲- اردو افسانوں میں پنجاب کے دیہات
۱۳- جدید اردو افسانہ اور نفسیات
۱۴- منٹو کے افسانے
۱۵- حجاب امتیاز علی کے افسانے
۱۶- ہاجرہ مسرور کے افسانے
۱۷- خدیجہ مستور کے افسانے
۱۹- راجندر سنگھ بیدی کے افسانے
۲۰- زادراہ کا فکری و فنی جائزہ

۲۱- پریم چند کے افسانوں میں حقیقت نگاری
۲۲- اردو میں طویل مختصر افسانہ
۲۳- اردو افسانہ اور معاشرتی مسائل

ڈراما :

۱- آغا حشر کی ڈراما نگاری
۲- اردو کے یک بابی ڈرامے
۳- ڈراما نگاری کا فن

فہرست کو دیکھ کر اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ تحقیق کے لیے جن موضوعات کا انتخاب کیا گیا وہ عموماً سیدھے سادے ہیں اور کسی ایک ادیب کی زندگی اور کارناموں سے تعلق رکھتے ہیں، لیکن ان موضوعات میں سے کچھ ایسے بھی ہیں جن کا میلان پھیلاؤ کے بجائے تحدید کی طرف ہے اور مقالہ نگار کے لیے ضروری ہے کہ وہ موضوع کی گہرائی میں جا کر دقت نظر سے اس کا مطالعہ کرے اور اس کی تحقیق کے نتائج ایسے ہوں جن میں عمومیت کے بجائے تخصص اور انفرادیت ہو۔ ذیل کے چند موضوعات کی نوعیت یہی ہے :

باغ و بہار کا اخلاقی پہلو، رجب علی بیگ کا تہذیبی شعور، پریم چند کے ناولوں میں عورت کا تصور، پریم چند کے ناولوں میں رومانی عناصر، ناولوں میں دیہاتی معاشرت کی عکاسی، جدید اردو افسانہ اور نفسیات، اردو افسانہ اور معاشرتی مسائل ۔

یہ سب موضوعات ایسے ہیں جو مقالہ نگار سے وسعت مطالعہ کے علاوہ دقت نظر کا مطالبہ بھی کرتے ہیں اور ان کی ذہنی تربیت کا وسیلہ بھی بنتے ہیں۔ اس طرح سے موضوعات پر کام کرنے والوں کو مواد کی فراہمی کے لیے جو کاوش کرنی پڑتی ہے وہ اس ذہنی تربیت کا ایک رخ ہے اور فراہم کیے ہوئے مواد کو رد و قبول کے مراحل میں سے گزار کر اسے حسن اور سلیقے سے ترتیب دینا اس اہم ترتیت کا دوسرا رخ ۔

افسانوی ادب سے تعلق رکھنے والے موضوعات کے علاوہ طلبہ نے جن موضوعات پر مقالے لکھے ان میں ہر دور کے شعرا کے علاوہ، اردو

شاعری کے مختلف اصناف، اس کے مختلف ادوار، اور ان ادوار میں ظاہر ہونے والے رجحانات کا جائزہ شامل ہے۔ شاعروں کی فہرست میں ولی، میر، سودا، درد، انشا، مصحفی (جرأت)، آتش، ناسخ، وزیر، امیر، داغ، جلال، اسیر، منیر شکوہ آبادی، اند، محسن کاکوروی، نظیر اکبر آبادی، شاہ نصیر، ظفر، ذوق، مومن، غالب، شیفتہ، ظہیر دہلوی، آزاد، شبلی، اسمعیل میرٹھی، احسن مارہروی، سیماب اکبرآبادی اکبر، چکبست، حسرت، حالی، جگر، اصغر، یگانہ، انیس، دبیر، تلوک چند محروم، نفیس، شوق قدوائی، بینظیر شاہ، بیخود دہلوی، سائل دہلوی، ریاض خیر آبادی، میراجی، ن۔ م۔ راشد، حوشی محمد ناظر، خواجہ دل محمد، محمد علی جوہر، ظفر علی خاں، آرزو لکھنوی، صفی لکھنوی، ثاقب لکھنوی نواب مرزا شوق، عظمت اللہ، جوش ملیح آبادی، حفیظ جالندھری، ظریف لکھنوی وغیرہ شامل ہیں۔ اقبال کے فکر و فن کے مختلف پہلوؤں اور ان کے کلام کے مختلف مجموعوں پر دو درجن کے قریب جو مضامین لکھے گئے وہ ان کے علاوہ ہیں۔ اصناف اور ادوار سے تعلق رکھنے والے موضوعات کی تعداد بھی خاصی ہے۔ پھر بہت سے موضوعات ایسے ہیں جن میں معروف نثر نگاروں کی خدمات کا جائزہ لیا گیا ہے اور ان میں نقاد، انشا پرداز، مزاح نگار، مورخ اور محقق ہر طرح کے لکھنے والے شامل ہیں۔ نقادوں میں حالی، شبلی اور آزاد سے لے کر عبدالحق، سلیمان ندوی، عبدالسلام ندوی، سلیم پانی پتی، عبدالقادر، پیارے لال آشوب، کلیم الدین احمد، ڈاکٹر زور، مسعود حسن رضوی، محمود شیرانی، صلاح الدین احمد، ابوالکلام آزاد، آل احمد سرور اور احتشام حسین وغیرہ کے نام ہیں، دوسرے نثاروں میں غالب، مہدی افادی، سجاد الغاری، چراغ حسن حسرت، رشید احمد صدیقی، پطرس فرحت اللہ بیگ، عظیم بیگ چغتائی، شوکت تھانوی اور کنہیا لال کپور پر مقالات لکھے گئے۔

مقالات کے دو اور سلسلے بھی ایسے ہیں جن کا ذکر ضروری ہے، ایک انگریزی کی تنقیدی کتابوں کے ترجمے اور دوسرے رسالوں کی وضاحتی فہرستیں۔ طلبہ سے اردو کے جن مشہور رسالوں کی وضاحتی فہرستیں مرتب کروائی گئیں ان میں اورینٹل کالج میگزین، اردو، زمانہ، ہمایوں، معارف،

جامعہ، ہندوستانی اور برہان قابل ذکر ہیں۔ انگریزی کے جن مقالوں، رسالوں اور کتابوں کے ترجمے ہوئے ان کی فہرست بڑی خاصی طویل ہے :

1. Theory of Literature—*Austin Warren and Rene Wellek*
2. Laocoon—*G. A. Lessing.*
3. The Study of Drama—*Brander Matthews.*
4. A History of Urdu Literature—*T. Graham Bailey.*
5. Space, Time and Gravitation—*A. S. E. Eddington.*
6. The Principles of Aesthetics—*D. W. H. Parker.*
7. An Introduction to the Study of Literature—*W. H. Hudson.*
8. The Making of Literature—*R A. Scott James*
9. Utopia—*Sir Thomas More*
10. Urdu Literature in 19th Century—*Abdul Qadir.*
11. (i) The Philosophy of Composition; (ii) The Poetic Principle—*Edgar Allan Poe.*
12. Aspects of the Novel—*E. M. Forster.*
13. Principles of Literary Criticism—*Lascells Abercrombei.*
14. On the Subline—*Longinus.*
15. Ancient Art and Ritual—*Ellen Harrison.*
16. Critical Approaches to Literature—*David Daiches.*
17. The Novel and the People—*Ralph Fox.*
18. A Defence of Poetry—*Shelley.*
19. What is Art—*Tolstoy.*
20. Prefaces and Essays on Poetry—*Wordsworth.*
21. Essays in Criticism—*Matthew Arnold.*

ایم ۔ اے اردو کے طلبہ اور طالبات نے کالج کی تحقیقی سرگرمی میں جو حصہ لیا میں نے اس کا ایک مجمل خاکہ پیش کیا ہے۔ اس

خاکے کے مطالعے سے یہ بات تو واضح طور پر سامنے آ جاتی ہے کہ طلبہ کی تنقیدی اور تحقیقی صلاحیتوں کو ابھارنے اور اس مخصوص عملی کام کا ذوق پیدا کرنے کے لیے تنقید و تحقیق کے دائرے کو جس حد تک وسعت دی جا سکتی تھی دی گئی ۔ اس کا نتیجہ ہے کہ پچھلے بیس برس کے دوران میں شعبۂ اردو سے تعلق رکھنے والے طلبہ اور اساتذہ نے بیس سے زیادہ مقالے لکھ کر پی ۔ ایچ ۔ ڈی کی ڈگریاں حاصل کیں۔ تحقیقی کام کا یہ رخ ایسا ہے جس پر علیحدہ بحث کی ضرورت ہے ۔ البتہ ایم ۔ اے کے مقالات کے متعلق چند باتیں اور کہنے کی ہیں۔ ان میں سے پہلی بات تو یہ ہے کہ طلبہ نے ایم ۔ اے کی سطح پر جو مقالے لکھے ان میں سے کئی ایسے ہیں جنھیں ناشروں نے کتابی صورت میں شائع کیا ہے ، اور لکھے ہوئے مقالات میں سے خاصی تعداد ایسے مقالوں کی ہے، جو کتابی صورت میں شائع ہونے کے قابل ہیں۔

ان مقالات کے متعلق کہنے کی ایک اور بات ان کا حجم ہے ۔ ان مقالات میں سے تین تو ایسے ہیں جن کی ضخامت علی الترتیب ۶۵۳، ۶۷۴ اور ۶۸۲ ہے ۔ دو مقالات چار سو اور پانچ سو صفحات کے درمیان ہیں ۔ جو مقالات ۳۰۰ سے لے کر ۴۰۰ صفحات تک کے ہیں ان کی تعداد گیارہ ہے - ۶۳ سے ۹۹ صفحات تک کے مقالات کی تعداد ۱۳ ہے اور تقریباً ۲۰۰ مقالات میں سے آدھے ایسے ہیں جن کا حجم ۲۰۱ اور ۳۰۰ کے درمیان اور آدھے ایسے جن کی ضخامت ۱۰۰ اور ۲۰۰ کے درمیان ہے ۔ مقالات میں سے بعض کی ضخامت کا بہت کم اور بعض کا بہت زیادہ ہونا عموماً موضوع کی نوعیت کے فرق کی وجہ سے ہے ، لیکن ان میں سے اکثر کی ضخامت میں اعتدال کی روش کے نمایاں ہونے کی وجہ وہ ذہنی تربیت ہے جو بیس سال کی روایت کی بدولت طلبہ کو حاصل ہوئی ہے اور اسی ذہنی تربیت کو میں شعبۂ اردو کے طلبہ و طالبات کی تحقیقی کاوشوں کا سب سے بڑا انعام سمجھتا ہوں ۔

ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار

اوریئنٹل کالج کی تصنیفی روایت کے تین دور

اوریئنٹل کالج کا قیام ایک ایسے زمانے میں ہوا جب بر صغیر میں مشرق اور مغرب اس انداز میں مل رہے تھے کہ مشرق اپنی محکومی کے تصور سے شرمسار اور مغرب اپنی فتحمندی کے نشے میں سرشار تھا۔ رڈیارڈ کپلنگ کا یہ مقولہ اسی ماحول کی یادگار ہے کہ مشرق مشرق ہے اور مغرب مغرب، یہ دونوں نہ کبھی ملے ہیں اور نہ مل سکتے ہیں۔ انیسویں صدی کا یہ قول اس زمانے میں کچھ بے جا بھی نہ تھا۔ کیونکہ حاکم و محکوم کے ذہن و فکر الگ الگ تھے، ان کی بستیاں الگ الگ تھیں، ان کے طریق بود و ماند جدا جدا تھے۔ اس صورت میں ملاپ کی صورت کیا ہو سکتی تھی سوائے اس کے کہ مشرق اپنی اصلیت کو چھوڑ دے اور مغرب کی تقلید اختیار کر لے۔ محکومی کے زمانے میں اکثر ایسا ہوا ہی کرتا ہے کہ صاحب اقبال قوم کی ہر بات اچھی سمجھی جاتی ہے اور اسے قابل تقلید خیال کیا جاتا ہے۔ مفتوح اقوام جب سیاسی شکست کے بعد تہذیبی شکست بھی قبول کر لیتی ہیں تو وہ اپنی قومی ہستی سے بیگانہ ہو جاتی ہیں۔ اس خود کشی کے بعد قوم کی اپنی نظروں میں بھی کوئی وقعت نہیں رہتی اور غیر تو اسے کسی عزت کا اہل سمجھتے ہی نہیں۔ بر صغیر کے باشندے انیسویں صدی میں اس خطرناک صورت حال سے دو چار تھے۔

اس عالم میں پنجاب سے انجمن پنجاب کی تعلیمی تحریک کا آغاز ہوا، اور مشرق و مغرب میں ہم آہنگی کے لیے مشرق کے تہذیبی و علمی ورثے کو اساس قرار دے کر اس کی ترویج و ترقی کے ساتھ ساتھ مغربی علم و ادب سے استفادے کا نظریہ پیش کیا گیا۔ یہ بات اس زمانے میں انوکھی ضرور تھی لیکن خود اعتمادی کے جذبے سے معمور تھی۔ اور

(بحوالہ رپورٹ بابت ۱۸۶۸ء — ۱۸۶۹ء)

یہ عجیب بات ہے کہ اس جذبے کی رہنمائی ایک ایسا شخص کر رہا تھا جو اس ملک کا باشندہ بھی نہیں تھا۔ وہ بوڈا پسٹ (ہنگری) میں پیدا ہوا تھا اور بعد میں اس نے برطانوی قومیت اختیار کی۔ ڈاکٹر لائٹنر ایک مستشرق تھا لیکن عام مستشرقین یورپ کے برخلاف وہ استعماری ذہن کی الجھنوں میں گرفتار نہیں تھا۔ اس نے صحیح معنوں میں یہاں کے باشندوں میں خود اعتمادی کا احساس پیدا کرکے انہیں اپنے تہذیبی سرمائے اور علمی ورثے کی حفاظت کے ساتھ ساتھ جدید علوم کی تحصیل پر آمادہ کیا اور اس طرح رڈیارڈ کپلنگ کے قول کی عملاً تردید کرتے ہوئے مشرق و مغرب کے امتزاج کی پرخلوص کوشش کی۔ شاید یہی وجہ تھی کہ اسے اکثر سامراجی ذہنیت کے حامل انگریز افسروں سے، جو حاکم و محکوم کے فاصلے کو قائم رکھنا برطانوی شہنشاہیت کی بقا کے لیے ضروری سمجھتے تھے، بر سر پیکار رہنا پڑا۔ لائٹنر نے یورپین ہونے ہوئے دیسی باشندوں کے حقوق کی خاطر جدوجہد کی۔ اورینٹل یونیورسٹی کی تحریک میں لائٹنر پوری طرح کامیاب تو نہ ہو سکا، تاہم اورینٹل کالج کے قیام سے وہ اپنے مقاصد میں ایک حد تک کامیاب رہا۔ اس کا خیال تھا کہ اورینٹل کالج میں علوم و السنہ کی تعلیم کے علاوہ تحقیق و تصنیف کا کام جدید طرز پر ہونا چاہیے اور علمی تحقیق کے اس ماحصل کی طباعت و اشاعت کا انتظام بھی ہونا چاہئیے۔ اس مقصد کے تحت اورینٹل کالج کے ساتھ ریسرچ فیلوز منسلک کیے گئے جن کی کفالت دیسی امرا کے عطیات سے ہوتی تھی۔ کالج کے اساتذہ بھی درس و تدریس کے علاوہ تحقیق و تصنیف کا کام کرتے تھے۔ اگرچہ ڈاکٹر لائٹنر جس معیار پر انہیں لے جانا چاہتے تھے، وہ اس تک نہیں پہنچتے تھے جس کے وہ اکثر شاکی رہے، تاہم جس کام کا انہوں نے آغاز کیا تھا، وقت کے ساتھ ساتھ اس میں ترقی ہوتی گئی۔ ڈاکٹر لائٹنر نے مشرقی زبانوں کی تعلیم کے پرانے طریقوں میں یہ تبدیلی کی کہ زبان کے مطالعے کی بنیاد لسانی اصولوں پر رکھی اور ادبیات کے مطالعے کے لیے سیاسی اور سماجی پس منظر پر زور دیا۔ انہوں نے تحقیق و تصنیف میں مواد سازی اور اوریجنل تصنیف و تالیف کو تراجم کے مقابلے میں زیادہ اہمیت دی

کیونکہ ان کا خیال تھا کہ ترجمہ بیکار چیز ہے جس میں اصل تصنیف کا حلیہ بگڑ جاتا ہے۔ڈاکٹر لائٹنر کو یقین تھا کہ اگر اورینٹل کالج ان مقاصد کے تحت تعلیم و تحقیق کے میدان میں گامزن سفر رہا تو یہ ادارہ بہت جلد ایشیا کا ایک عظیم الشان تہذیبی مرکز بن جائے گا اور دنیا بھر کے محققین کے لیے علوم مشرقی کی تحقیق کےایک فعال مرکز کی حیثیت حاصل کر لے گا۔

اورینٹل کالج کے اولین دور میں دیسی زبانوں (اردو و ہندی) میں جدید سائنس و آرٹس کی علمی کتب کی تالیف کے علاوہ عربی اور سنسکرت کے ماہوار علمی رسائل جاری تھے۔ عربی کا رسالہ ''شفاء الصدور'' مولوی فیض الحسن سہارنپوری کی ادارت میں اور سنسکرت کا رسالہ ودیودئی (Vidyodai) پنڈت رکھی کیش شاستری کی ادارت میں نکلتا رہا۔ زبان و ادب کے علاوہ انجنئیرنگ، طب، ریاضی، تاریخ، جغرافیہ، طبیعیات، جیالوجی، کیمیا، علم الاقتصاد، قانون، فلسفہ و منطق کے علوم کی یہاں تعلیم دی جاتی تھی اور ان مضامین میں تصنیف و تالیف کا سلسلہ بھی جاری تھا۔ اس اعتبار سے اورینٹل کالج انیسویں صدی میں صحیح طور پر بیت‌العلوم (یونیورسٹی) کہلاتا تھا۔لیکن یہ صورت حال انگریز حکام کو پسند نہ تھی۔ ۱۸۸۶ء میں لائٹنر سبکدوش ہوا اور دو سال بعد ۱۸۸۸ء میں علوم و فنون کی جماعتیں بند کر دی گئیں۔ علمی جماعتیں بند ہونے کے بعد علمی سلسلے کا تصنیفی کام بھی بتدریج ختم ہوگیا۔رفتہ رفتہ ریسرچ فیلوز یونیورسٹی کے دوسرے علمی شعبوں کو منتقل ہو گئے۔ بیسویں صدی کے آغاز تک اورینٹل کالج صرف مشرقی السنہ کی تدریس و تحقیق کا مرکز رہ گیا تھا۔ کئی سال تک یہاں تصنیف و تالیف کی سرگرمیاں بھی ماند پڑی رہیں۔حتی کہ اورینٹل کالج کی تنظیم نو کے بعد یہاں ایم۔اے کلاسوں کا اجراء ہوا، اور یونیورسٹی پروفیسروں کا تقرر ہوا جن کی رہنمائی میں ڈی۔لٹ اور پی ایچ۔ڈی کے لیے تحقیقی کام کا آغاز ہوا۔ جدید تحقیق کے لیے یونیورسٹی لائبریری کو وسعت دی گئی اور نادر مخطوطات کی فراہمی کا بندوبست

کیا گیا۔ ۱۹۲۰ء میں اورینٹل کالج میگزین کا اجراء ہوا جس نے بہت جلد بین الاقوامی حلقوں میں ایک خاص مقام پیدا کر لیا۔

اورینٹل کالج کی تصنیفی روایت کا یہ دوسرا دور پہلی جنگ عظیم کے بعد شروع ہوا، اور قیام پاکستان تک جاری رہا۔ اس دور میں عربی، فارسی اور سنسکرت کے شعبوں کے علاوہ اردو، ہندی اور پنجابی کے باقاعدہ شعبے قائم ہوئے اور ان زبانوں کے لسانی، ادبی اور تہذیبی پہلوؤں کے مطالعے کو سائنٹیفک بنیادوں پر استوار کیا گیا۔ مواد سازی یعنی ایڈیٹنگ اور فہرست (انڈکس) سازی جیسے خشک لیکن تحقیقی لحاظ سے مفید کاموں کو خاص اہمیت دی گئی جس کی وجہ سے اس دور کے مصنفین کو شہرت عام تو نصیب نہ ہو سکی لیکن علمی دنیا میں انہیں بقائے دوام کی سند ضرور ملی۔ اس دور کی ایک اور خصوصیت یہ بھی ہے کہ مغرب سے علمی استفادے کے باوجود مصنفین میں خود اعتمادی کا ایسا احساس کار فرما تھا جس نے ان کے تحقیقی و تصنیفی سرمائے کو مغرب کی ذہنی محکومی سے آزاد کروا کے ملک میں خود شناسی کا جذبہ پیدا کیا۔

قیام پاکستان کے بعد اورینٹل کالج کے اس تصنیفی رجحان میں قدرے ضعف پیدا ہو گیا۔ سنسکرت، ہندی اور پنجابی کے شعبے بند ہو گئے۔ اردو کے شعبے میں توسیع ہوئی اور چند برس کے بعد جو نیا تصنیفی رجحان ابھرا، اور اب تک جاری ہے، اس میں تحقیق سے زیادہ تنقید اور ترجموں کی طرف میلان پایا جاتا ہے۔ یہ ترجمے بھی پہلے دور کی طرح کسی علمی منصوبے کے تحت نہیں ہو رہے بلکہ متفرق موضوعات پر قلمی مزدوری کے طور پر کیے جاتے ہیں۔ تنقید بھی بعض اوقات سطحی اور سرسری ہو کر صحافتی انداز اختیار کر جاتی ہے اور یہ سلسلہ یہاں تک آ جاتا ہے کہ تاثراتی اخباری مضامین کو بھی تصنیفی کارکردگی میں شمار کیا جانے لگتا ہے۔ ایک صحت مند علمی روایت کے لیے تحقیق اور تنقید دونوں میں ہم آہنگی کا ہونا از بس ضروری ہے۔ خشک تحقیق اپنی جگہ اہم ہونے کے باوجود اس وقت تک کسی منطقی نتیجے تک نہیں پہنچتی جب تک پیش کردہ تحقیقی مواد کا تنقیدی جائزہ لے کر اس کی تہذیبی اور عمرانی قدر و قیمت متعین نہ کی جائے۔ لیکن تحقیق سے بے

اعتنا تنقید تو بالکل ھی بے سر و پا ھوتی ھے۔ اگرچہ شہرت عام کے حصول کا سستا نسخہ یہی ھے۔ لیکن بقائے دوام کی راھیں اس طرح مسدود ھو جاتی ھیں۔ موجودہ دور میں اورینٹل کالج کی تصنیفی روایت اسی پل صراط پر سے گزر رھی ھے۔ ایک طرف شہرت عام کی ترغیب ھے۔ ملک میں بعض نجی اور نیم سرکاری ادارے تحریص کے جال بھی بچھائے ھوئے ھیں۔ ضرورت اور احتیاج عام انسانی کمزوری ھے۔ اس حالت میں خشک تحقیق اور مواد سازی کا کام کر کے محض بقائے دوام کے وعدۂ فردا کی کون سوچ سکتا ھے۔ تاھم اورینٹل کالج کے کچھ مصنفین اس ترغیب و تحریص کے درمیان اپنی گزشتہ روایت سے کسی نہ کسی حد تک نباہ کرتے چلے جا رھے ھیں ا۔

یہ ھے مجمل سی سرگزشت اورینٹل کالج کی تصنیفی روایت کی جسے راقم نے سہولت کی خاطر تین ادوار میں تقسیم کر دیا ھے۔ یہ تقسیم شاید پوری طرح صحیح نہ ھو، لیکن ھر دور کے کچھ نمایاں خط و خال بھی ھیں جو اس تقسیم کو بہت حد تک حق بجانب قرار دیتے ھیں۔ اس تصنیفی روایت کی ایک نمائش بھی جشن صد سالہ کے موقع پر ھوئی جو اس امر پر روشنی ڈالتی تھی۔ اساتذہ کے تصنیفی کام کی ایک تفصیلی رپورٹ (مرتبہ ڈاکٹر وحید قریشی) اس موقع پر طبع ھوئی جس میں تصانیف کے علاوہ مقالات و مضامین کی فہارس بھی شامل ھیں۔ ذیل میں پہلے اور دوسرے ادوار کی تصانیف کی فہرست پیش کی جاتی ھے تاکہ اس سے بیان کردہ خصوصیات قدرے واضح ھو جائیں۔ پہلے دور کی علمی تالیفات و تراجم کی فہرست تفصیل سے پیش کی جا رھی ھے کیونکہ ڈاکٹر وحید قریشی صاحب کی مرتبہ رپورٹ میں یہ حصہ مجمل ھے۔ دوسرے دور کی صرف چند منتخب تالیفات درج کی گئی ھیں اور تیسرے دور کی تصانیف کو دو وجوہ سے یہاں شامل نہیں کیا گیا کہ (۱) معاصر رفقاء کے کام پر راقم کسی قسم کے انتخابی طریق سے اجتناب کرنا ھی بہتر سمجھتا ھے (۲) ڈاکٹر وحید قریشی نے اپنی مطبوعہ رپورٹ میں تفصیلی فہرست پیش کر دی ھے۔ لہٰذا جو صاحبان دوسرے اور تیسرے ادوار کی تفصیلات دیکھنا چاھیں انہیں ''تحقیقی، ادبی اور درسی سرمایہ''

از ڈاکٹر وحید قریشی ملاحظہ فرمانا چاہیے۔ پہلے دور کے بارے میں یہ وضاحت بھی ضروری معلوم ہوتی ہے کہ اس میں ۱۸۷۶ء سے ۱۸۸۸ء تک کی تصانیف شامل ہیں۔ ۱۸۷۶ء میں ڈاکٹر لائٹنر نے طویل رخصت کے بعد یورپ سے واپس آکر کالج کا انصرام سنبھالا۔ اس وقت کالج کی علمی، تعلیمی اور تنظیمی حالت بہت مخدوش تھی۔ ۱۸۸۶ء میں لائٹنر سبکدوش ہوئے اور دو سال کے بعد علمی جماعتیں بند کر دی گئیں، طب کے طلبہ میڈیکل کالج میں اور انجنیئرنگ کے طلبہ انجنیئرنگ کالج میں بھیج دئیے گئے۔ تصنیفی کام کو بھی بہت ضعف پہنچا اور یہ سلسلہ خاصی مدت تک تقریباً معطل رہا۔ پہلے دور میں تصانیف کا دائرہ بہت وسیع تھا اس لیے یہاں اسے موضوع وار تقسیم کر دیا گیا ہے۔ باقی ادوار کی یہ صورت نہیں ہے۔

پہلا دور (۱۸۷۶ء - ۱۸۸۸ء)

نیچرل سائنس و ریاضی :		مصنف، مرتب یا مترجم
۱۔ سکون سیالات (حصہ اول، اردو ترجمہ)	Besant's Hydrostatics.	پیرزادہ محمد حسین
۲۔ " (حصہ دوم)	"	شیخ انعام علی
۳۔ علم ہئیت (اردو ترجمہ)	Mainc's Astronomy.	پیرزادہ محمد حسین ایم۔ اے
۴۔ علم النفس والقوی (اردو ترجمہ)	Hamilton's Lectures on Psychology.	شیخ انعام علی
۵۔ علم سکون (اردو ترجمہ)	Todhunter's Statics	لالہ آیا رام
۶۔ طبیعی جغرافیہ (اردو ترجمہ)	Balanford's Physical Geography.	"
۷۔ سکون سیالات "	"	"
۸۔ درشتی ودیا (ہندی ترجمہ)	Parkinson's Optics.	بھائی گورمکھ سنگھ

نوٹ: یہ کتب درسی ضروریات کی خاطر بالعموم اردو اور ہندی دونوں میں تیار ہوئی تھیں۔

۹ ۔ طبیعی جغرافیہ (ہندی ترجمہ)	Page's Physical Geography.	"
۱۰ ۔ علم حرکت (اردو)	Elementary Dynamics.	بابو ششی بھوشن مکرجی
۱۱ ۔ گیتی وگیان (ہندی)	"	"
۱۲ ۔ برقی مقناطیس (اردو)		رگھو ناتھ داس
۱۳ ۔ جغرافیہ (ہندی)	Clarke's Geography.	پنچنن مکرجی
۱۴ ۔ بھوتتوا ودیا (ہندی)	Kook's Geology.	پنڈت گنگابشن شاستری
۱۵ ۔ علم کیمیا (اردو)	Roscoe's Chemistry.	ڈاکٹر امیر شاہ اسسٹنٹ سرجن
۱۶ ۔ تدریسات علم طبیعی (اردو)		"
۱۷ ۔ " (ہندی)		---
۱۸ ۔ علم طبیعی (اردو)	Balfour Stewart's Physics.	ڈاکٹر امیر شاہ
۱۹ ۔ علم طبقات الارض (اردو)	Page's Geology.	سید دلاور علی شاہ
۲۰ ۔ طبیعی جغرافیہ (اردو)	Page's Geography.	"
۲۱ ۔ مسائل و امثال ریاضی (اردو)	Wrigley's Examples.	"
۲۲ ۔ حل ٹرگنومیٹری (اردو)		غلام مصطفیٰ
۲۳ ۔ الجبرا (اردو)		"
۲۴ ۔ حل جبر و مقابلہ (اردو؛ ہندی)		۔ یوگی شو ناتھ
۲۵ ۔ بیج گنیت (الجبرا) ہندی		۔ یوگی شو ناتھ

انجنیرنگ :

۱ ۔ نرمان ودیا (پانچ حصے) ہندی میں سول انجنیئرنگ (سکون ، حرکت ، تعمیرات عامہ، سڑکیں، پل، انہار)		نوین چندر رائے
۲ ۔ علم المساحت (اردو)	Todhunter's Mensuration.	لالہ گنگا رام
۳ ۔ مان تتوا (ہندی)	"	پنچنن مکرجی

۴ - مسالہ تعمیرات (اردو) Lang's Building Materials. لالہ گنگا رام

۵ - جرثقیل کا استعمال(اردو) Applied Mechanics by Major Brandreth. ،،

طب :

۱ - امراض الهبلا و الميلاد (اردو) .Midwifery ڈاکٹر رحیم خاں میڈیکل فیلو
۲ - امراض الصابیّن ،، ،،
۳ - امراض النسوان ،، ،،
۴ - میڈیکل جورس پروڈنس ،، ،،
۵ - ارجوزہ صنایہ در علم طب ،، مولوی غلام قادر
۶ - رسالہ تشریح طب ،، مولوی غلام مصطفیٰ
۷ - ادویات مفردات یونانی ،، ،،
۸ - آوشادوالی (سنسکرت، ہندی اردو، انگریزی) پنڈت جندون
۹ - امرت ساگر (سنسکرت) پنڈت دیا رام

قانون :

۱ - .Elements of Jurisprudence انگریزی و اردو (ترجمہ) بابو ششی بھوشن مکرجی ایم-اے، بی ایل
۲ - .Constitutional History of India (اردو ترجمہ) سید امیر شاہ
۳ - قدوری (عربی سے اردو ترجمہ) مسلم قانون مولوی غلام قادر
۴ - پراسر سمرتی (ہندی) ہندو قانون پنڈت گورو پرشاد
۵ - کل مدھاوا ہندو قانون پنڈت گورو پرشاد
۶ - دتاک چندریکا ہندو قانون رکھی کیش شاشتری
۷ - گوتما سمرتی ہندو قانون پنڈت دیا رام
۸ - متاکشارا (.Mitakshara) ہندو قانون پنڈت گورو پرشاد
۹ - دیابھاگ (متاکشارا کا انتخاب) پنڈت گورو پرشاد

منطق و فلسفہ :

۱ ۔ مخزن الحکمت (اردو)		شیخ انعام علی
۲ ۔ سُلّم (عربی سے اردو)		مولوی غلام قادر
۳ ۔ نیائے بودھنی (سنسکرت سے ہندی)		پنڈت سکھ دیال شاستری
۴ ۔ سوتر وریتی (گوتما) "		"
۵ ۔ لاکشانوالی "		"
۶ ۔ یجر وید "		"
۷ ۔ آتما تتوا شاستر (ہندی)	Bain's Mental Science.	پنڈت کمل دت
۸ ۔ مابعدالطبیعیات (اردو ترجمہ)	Hamilton's Metaphysics.	مولوی محمد الدین
۹ ۔ " (ہندی)		بھائی گورمکھ سنگھ
۱۰ ۔ منطق استقراری (اردو)	Fowler's Inductive Logic.	پیرزادہ محمد حسین
۱۱ ۔ منطق	Jovon's Logic.	شیخ انعام علی
۱۲ ۔ منطق قیاسی	Fowler's Deductive Logic.	لالہ آیا رام
۱۳ ۔ " (ہندی)		پنڈت ہرکشن داس
۱۴ ۔ منطق (اردو)	Fowler's Logic.	مدن گوپال

تاریخ و تذکرہ :

۱ ۔ تاریخ معجم (فارسی)		مولوی عبدالحکیم
۲ ۔ انتخاب درہ نادرہ "		"
۳ ۔ ناسخ التواریخ "		"
۴ ۔ مختصر تاریخ کشمیر "		مولوی محمد الدین
۵ ۔ روضۃ الابرار " (مشاہیر کشمیر کا تذکرہ)		"
۶ ۔ سنین اسلام (دو حصے) اردو (مولوی فیض الحسن، کریم الدین، محمد حسین آزاد کی مدد سے)		ڈاکٹر جی۔ڈبلیو لائٹنر
۷ ۔ تاریخ کلاں انگلستان (اردو)	Green's Larger History of England.	نوبین چندر رائے
۸ ۔ " (ہندی)		"

۹ ۔ تاریخ تیموری مؤلفہ عرب شاہ (اردو ترجمہ) مولوی غلام قادر

۱۰ ۔ ہندوستان کا اتہاس (ہندی) Elphinston's History of India. بھائی گورمکھ سنگھ

۱۱ ۔ تاریخ متقدمین (اردو) Taylor's Ancient History. مولوی غلام مصطفی بہ اشترک لالہ بشن داس

۱۲ ۔ پراچین اتہاس (ہندی) " بھائی گورمکھ سنگھ

۱۳ ۔ ہندوستان قدیم وجدید India Past and Present. پنچنن مکرجی

۱۴ ۔ تاریخ انگلستان (اردو) Lethbridge's History of England. مولوی محمد غضنفر

۱۵ ۔ تاریخ عرب "

۱۶ ۔ ایام الاسلام "

۱۷ ۔ تاریخ پنجاب (پنجابی) پنڈت بھان دت

۱۸ ۔ تاریخ جہان (اردو) Dr. Stulpnagel's Universal History. شیخ عمر بخش

۱۹ ۔ خلاصہ تواریخ انگلستان (اردو) Hallam's. Constitutional History of England. "

علم الاقتصاد :

۱ ۔ علم الاقتصاد یا سیاست مدن (اردو) Mrs Fawcett's Political Economy. پیرزادہ محمد حسین

۲ ۔ تاریخ علم سیاست مدن (اردو) " شیخ انعام علی

۳ ۔ علم انتظام مدن (اردو) " پنڈت ہرکشن داس ایم ۔ اے

۴ ۔ اصول سیاست مدن (اردو) پنڈت دھرم نرائن

لسانیات :

۱ ۔ مقدمات الصرف (عربی صرف و نحو) (انگریزی و اردو میں) ڈاکٹر جی۔ڈبلیو لائٹنر

۲ ۔ The Languages and Races of Dardistan, 1877. "

۳ - Bashgeli Kafirs and their Languages, 1880.	"
۴ - Appendix to "Changars" And Linguistic Fragments, 1882.	"
۵ - سدھانت کمودی (پانینی کی قواعد زبان کا ہندی ترجمہ)	پنڈت گورو پرشاد
۶ - کوی دیپک بھاشا	"
۷ - بھاشا وبارش	"
۸ - پراکرت ویا کرن	رکھی کیش
۹ - مبہمات قرآن	مولوی عبدالحکیم
۱۰ - صنائع بدائع	مولوی عبدالحکیم
۱۱ - مخزن الفوائد (فارسی گرائمر)	مولوی محمد الدین
۱۲ - لغات اصطلاحات فنی Dictionary of Technical Terms.	شیخ انعام علی
۱۳ - کوش (پنجابی ڈکشنری)	بھائی ہرسانگھ
۱۴ - زبان کی حقیقت Origin of Language.	پنچنن مکر جی
۱۵ - حدائق البلاغت	سید شاہ چراغ
۱۶ - فیض المغی والبیان (اردو)	حافظ عمر دراز
۱۷ - نجم الامثال	ایم نجم الدین

ادبیات (عربی) :

۱ - سبعہ معلقہ (عربی، فارسی، اردو میں شرح)	مولوی فیض الحسن
۲ - رشیدیہ (اصول مناظرہ)	"
۳ - دیوان حماسہ (شرح فیضی)	"
۴ - فیضیہ (علم مناظرہ)	"
۵ - دیوان حسان	"
۶ - کنز الادب	مولوی عبدالحکیم
۷ - قلائد الذھب	مولوی محمد الدین
۸ - روضۃ الادبا (اردو) عرب شعرا و ادبا کا تذکرہ، عربی مآخذ سے	"

۹ - تبیین الصنایه ,,

۱۰ - اطباق الذهب (عبدالمومن اصفهانی کی عربی تصنیف کا اردو ترجمه مع حواشی) ,,

۱۱ - سبعه معلقه (اردو ترجمه) — محمد حسین

ادبیات (فارسی) :

۱۲ - قواعد فارسی — مولوی عبدالحکیم

۱۳ - هدایت العامله ,,

۱۴ - منتخبات اخلاق ناصری — مولوی محمد الدین

۱۵ - اخلاق جلالی (اردو ترجمه و تلخیص) ,,

۱۶ - هدیهٔ رشیدیه (اردو ترجمه)

۱۷ - رساله عبدالواسع ,, — ,,

ادبیات (سنسکرت، هندی، پنجابی)

۱۸ - سنسکرت ودیا کا اتهاس — پنڈت گورو پرشاد

۱۹ - للتا چار ,,

۲۰ - کمار سمبهاوا (ناٹک) — پنڈت سکھ دیال

۲۱ - بهوگول — پنڈت رکھی کیش

۲۲ - امرت ساگر — پنڈت دیا رام

۲۳ - بال سکھیا (پنجابی) — بهائی هرسا سنگھ

۲۴ - استری ,, — ,,

۲۵ - هنومان ناٹک ,, — یوگی شو ناتھ

۲۶ - ویدانت سر (هندی) ,,

۲۷ - یگیه واک ,, — ,,

دوسرا دور ۱۹۲۵ء - ۱۹۳۷ء

ڈاکٹر مولوی محمد شفیع :

۱ - ”عقدالفرید“ تالیف احمد بن محمد کا تحلیلی اشاریه(بزبان انگریزی، دو جلدوں میں) طبع کلکته ۳۰-۱۹۳۷ء

۲ ـ تتمه صوان الحکمة لعلی بن زید البیهقی (متن عربی مع حواشی و فہارس) پنجاب یونیورسٹی ۱۹۳۵ء

۳ ـ تتمه صوان الحکمة (ترجمه فارسی) پنجاب یونیورسٹی ۱۹۳۵ء

۴ ـ مطلع السعدین ـ تالیف کمال الدین عبدالرزاق سمر قندی (متن مع حواشی ۱۰۰۸ صفحات)

۵ ـ مکاتبات رشیدی تالیف رشید الدین فضل الله طبیب (متن مع حواشی)

۶ ـ میخانه عبدالنبی فخرالزمان قزوینی (تذکره شعرا متن مع حواشی و فہارس تحلیلی)

ڈاکٹر لکشمن سروپ :

۱ ـ نروکتا (ترتیب، فہارس و حواشی بزبان انگریزی)

۲ ـ کلیان سوگندھیکا، تالیف نیل کانتھ (ترتیب متن مع حواشی)

ڈاکٹر شیخ محمد اقبال :

۱ ـ اخبار الدولة السلجوقیه (متن فارسی مع حواشی)

۲ ـ راحة الصدور (متن فارسی مع حواشی)

۳ ـ ایران بعہد ساسانیاں (فرانسیسی سے اردو ترجمه)

۴ ـ تاریخ وصاف (متن)

مولانا عبدالعزیز المیمنی[۱] :

۱ ـ ابن رشیق

۲ ـ ابوالعلا و ماالیه

۳ ـ السمط اللآلی للبکری (دو حصے) فہارس

۴ ـ اکلید الخزانه

حافظ محمود خان شیرانی[۲] :

۱ ـ پرتھی راج راسا

۲ ـ مجموعه نغز (تذکره میر قدرت الله قاسم)[۳]

۳ ـ تنقید شعرالعجم

۴ ـ فردوسی پر چہار مقالہ
۵ ـ حفظ اللسان معروف بہ خالق باری از ضیا الدین خسرو

ڈاکٹر سید عبداللہ :

۱ ـ نوادر الالفاظ تالیف خان آرزو (متن مع مقدمہ و حواشی)
۲ ـ نل دمن ـ احمد سراوی ایضاً
۳ ـ لطائف نامہ فخری ایضاً
۴ ـ مردم دیدہ (حاکم لاہور) ایضاً
۵ ـ فارسی ادبیات میں ہندوں کا حصہ
۶ ـ شعرائے اردو کے تذکرے اور تذکرہ نگاری کا فن
۷ ـ اردو ادب جنگ عظیم کے بعد

8. Urdu Prose Urdu the influence of Sir Syed.
9. Descriptive Catalogue of Persian Manuscripts in the Punjab University Library (2 parts).

پروفیسر عبدالقیوم :

۱ ـ فہارس لسان العرب : (فہرست اول) اسماء شعراء (۱۹۳۸ء)
(حصہ دوم) فہرست قوافی (۱۹۳۸ء)

تیسرا دور ۱۹۴۷ء - ۱۹۷۰ء

دیکھیے "یونیورسٹی اورینٹل کالج کے اساتذہ کا تحقیقی، ادبی اور درسی سرمایہ مرتبہ ڈاکٹر وحید قریشی، طبع لاہور ۱۹۷۰ء، نیز پنجاب یونیورسٹی کی سالانہ رپورٹیں۔

تیسرا اجلاس

اسلامی علوم اور عربی زبان و ادب

خطبات و مقالات

ڈاکٹر رانا احسان الٰہی

ڈاکٹر محمد وحید مرزا

محمد بن ناصر العبودی

ڈاکٹر میر ولی خاں

الآنسہ اسما رشید

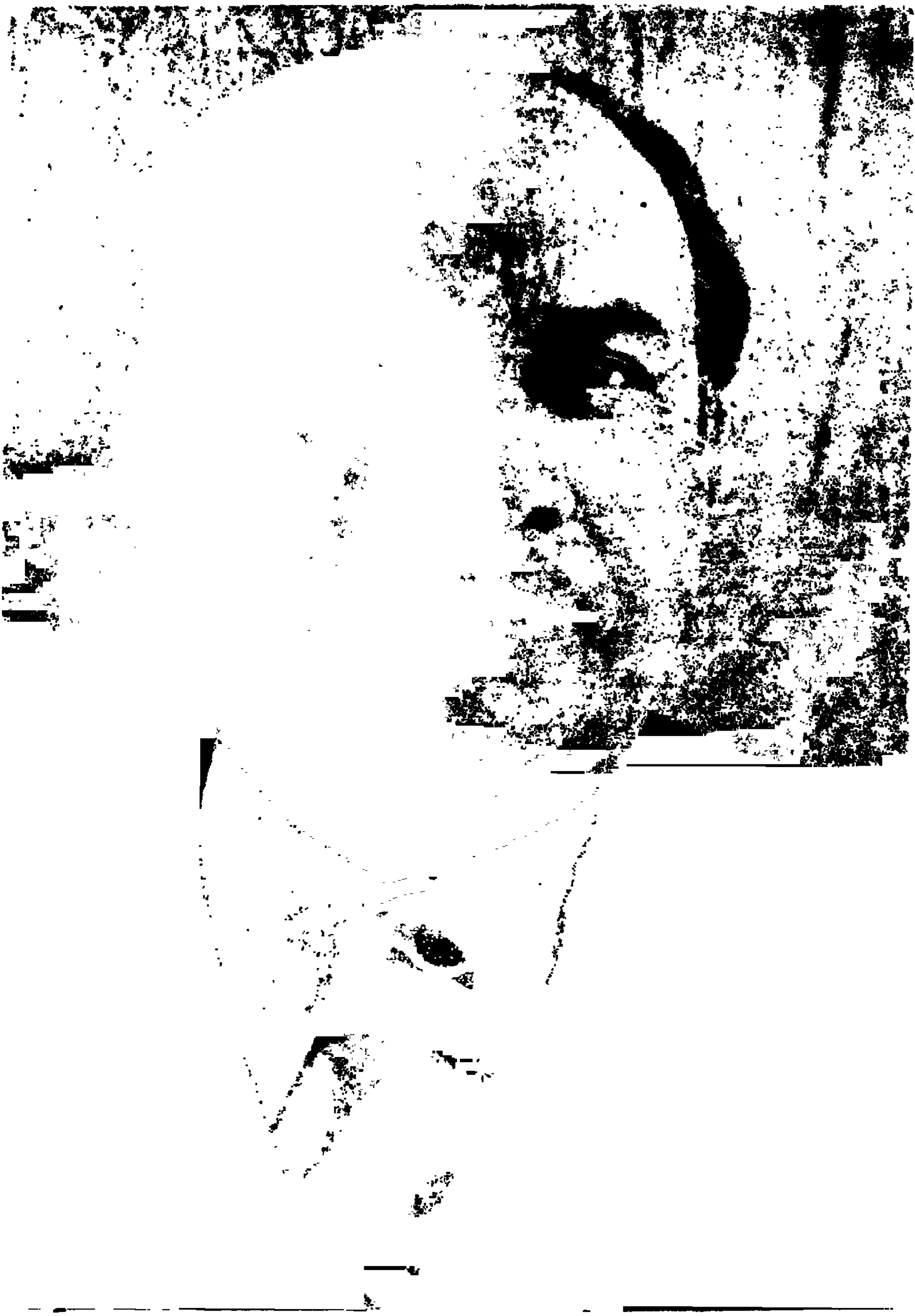
مولانا محمد عبد القدوس

احمد فاروق

محمد طفیل

الشیخ محمد بن ناصر العبودی

ڈاکٹر محمد مسعود زینی



ڈاکٹر رانا احسان الہٰی ۔ صدر شعبۂ عربی

ڈاکٹر رانا م۔ن۔ احسان الٰہی المجددی

بسم اللہ الرّحمٰن الرّحیم

افتتاحی تقریر

الحمد للہ ربّ العالمین، وأحسن التحیّات والسلام علی خاتم النبیین و رحمة للعالمین سیّدنا محمّد و علی آلہ و صحبہ أجمعین، أمّابعد

معزز خواتین و حضرات۔ آپ ہم سے یقیناً اتفاق کرینگے کہ اورینٹل کالج لاہور کے بارے میں اگر کوئی شخص اپنے تأثرات بیان کرنا چاہے یا اس کالج کے قدیم اساتذہ اور مؤسسین کی محنت، عمل پیہم اور ان کی مخلصانہ کوششوں کے ثمرات سے کماحقہ لطف اندوز ہونے کی تمنا کرے تو ضرور ہے کہ وہ پہلے اس قدیم علمی مرکز کے قدیم طلبہ کی صف میں شامل ہو، اور ضرور ہے کہ وہ مدتوں سے اس کالج کے درودیوار کو تقدس کی نگاہ سے دیکھتا رہا ہو، اور ضرور ہے کہ وہ اس ادارے کی قدیم تأریخ اور قدیم روایات سے اس طرح شناسا ہو گویا اس نے اپنا بچپن بھی یہیں گزارا ہو اور اس عظیم درسگاہ کی تعمیر و ترقی کے ساتھ ساتھ اس نے خود بھی ذہنی طور پر یہیں پرورش پائی ہو۔

مگر ہمیں یہ اعتراف کرنے میں کوئی باک نہیں کہ یہ سعادت ہم میں سے کسی فرد کو نصیب نہیں ہوئی، ہم میں سے کسی نے اتنی لمبی عمر نہیں پائی اور نہ ہم میں سے کسی کو اپنے بزرگوں جیسی محنت، بصیرت اور علمی کاوش رکھنے کا کبھی فخر ہو سکتا ہے۔ البتہ ہم ایک بات وثوق سے کہ سکتے ہیں کہ عصر حاضر میں یہ بہت مشکل ہے یا بالکل نا ممکن ہے کہ ہم اورینٹل کالج یا اس کے مؤسسین کے بارے میں ایسی آراء پیش کر سکیں اور اسے اس نگاہ سے دیکھ سکیں جس نگاہ سے اس ادارے کو اس کے مؤسسین اور قدیم طلبہ نے کبھی دیکھا تھا۔ البتہ مکافات کے طور پر ایک نیا زاویۂ نگاہ ہمارے سامنے

ابھرتا ہے جس سے ہمارے دلوں میں بہت سے نیک اور بلند جذبات بیدار ہوتے ہیں ۔

اورینٹل کالج کو یہ مایۂ ناز اور تاریخ ساز شرف ضرور حاصل ہے کہ تاریخ ہند کے اس دور میں جب عامۃ الناس کو ایک مؤثر ذریعۂ ابلاغ کی اشد ضرورت تھی تو یہاں عربی، فارسی اور اسلامی فقہ کی تدریس کے ساتھ ساتھ اردو زبان و ادب کی تعلیم کا بھی ایک وسیع پیمانے پر انتظام موجود تھا ۔ چنانچہ جہاں اس ادارے سے منسلک رہنے والی نامور ہستیاں مثلاً ڈاکٹر لائٹنر، سر آرل شٹائن ، اے سی وولنر، سر محمد اقبالؒ مولوی محمد شفیع، محمود شیرانی، ڈاکٹر اقبال، لچھمن سروپ اور سیمنی خدمت خلق اور امن عالم کے لیے کوشاں رہیں وہاں ان دانشوروں کے افکار و نظریات نے اس صدی کے چوتھے دھائے ہی میں ایک ایسی روش اختیار کی اور ایسا تأثر پیدا کیا کہ برصغیر ہند و پاک کے مسلمانوں کے ذہن میں نظریۂ ''پاکستان'' چٹکیاں لینے لگا ۔ اس لیے ہم جب اس نقطۂ نظر سے دیکھتے ہیں تو ہم اورینٹل کالج لاہور کے بارے میں بآسانی کہ سکتے ہیں کہ اللہ تعالے نے اپنی قدرت کا ایک کرشمہ دکھایا اور یہاں کے اساتذہ اور معلمین ، شعراء اور مفکرین نے اس درسگاہ میں عربی، فارسی، فقہ اسلامی اور اردو کی تعلیم و تدریس کا اہتمام کر کے قیام پاکستان کی راہ ہموار کی ۔

یہ ایک ایسی حقیقت ہے جسے ہم نہ نظر انداز کر سکتے ہیں نہ فراموش کر سکتے ہیں ۔ جب ہم اس تاریخ ساز واقعہ کے اسباب تلاش کرینگے تو ہم ہر چند اس نظریے کو اپنی جگہ وقیع پائینگے ۔

آج ایک اورینٹل کانفرنس کی وساطت سے ہم اپنے اورینٹل کالج کے جشن صد سالہ کو ـــــ جو بعض ظروف قاہرہ کی بناء پر دو تین سال سے ملتوی ہوتا رہا ہے ـــــ منانے کے لیے، اور اس عظیم ادارے کے قدیم اکابر کے شاندار کارناموں کی یاد تازہ کرنے کے لیے اور اس درسگاہ کے اساتذہ کرام اور مؤسسین عظام کو خراج عقیدت پیش کرنے کے لیے یہاں جمع ہوئے ہیں ۔ یہ ہمارے لیے باعث صد افتخار ہے کہ افغانستان، عرب ممالک، انگلستان ، جرمنی ، ایران ، ہالینڈ ، روس، ترکیا اور امریکہ وغیرہ

سے عربی، فارسی اور علوم اسلامیہ کے ماہرین کی ایک بہت بڑی جماعت شرکت کے لیے اور اپنے علمی مقالات پیش کرنے کے لیے یہاں پہنچی ہے۔ اور اس کانفرنس کی رونق کو دوگنا کر دیا ہے۔ ہم ان تمام معزز علماء کی تشریف آوری پر ان کے بےحد ممنون ہیں۔ ہم اپنے ان احباب اور رفقائے کرام کے بھی شکر گزار ہیں جو پاکستان کی مختلف یونیورسٹیوں اور تحقیقی اداروں سے تشریف لائے ہیں اور اپنے فاضلانہ مقالات پیش کر کے انھوں نے اس کانفرنس کو کامیاب بنایا ہے۔

آج کانفرنس کے اس اجلاس کی صدارت کے لیے (جو عربی اور علوم اسلامیہ سے مختص ہے) ہم نے اوریئنٹل کالج کی ایک عظیم ہستی۔ مرحوم ڈاکٹر مولوی محمد شفیع ——— کے شاگرد بزرگ پروفیسر ڈاکٹر محمد وحید مرزا کو تکلیف دی ہے۔ ہم ان کے بےحد ممنون ہیں کہ انھوں نے ہماری عاجزانہ درخواست کو شرف قبول بخشا، اور ہمیں انتہائی مسرت ہے کہ وہ اس وقت ہمارے درمیان تشریف فرما ہیں۔ ہمیں یقیناً ڈاکٹر وحید مرزا پر بہت ناز ہے۔

اب میں ادب سے سر جھکائے خاموش کھڑا رہونگا تاآنکہ جناب پروفیسر ڈاکٹر محمد وحید مرزا از راہ نوازش ڈائس پر تشریف لا کر کرسیء صدارت کو زینت بخشیں۔



پروفیسر ڈاکٹر وحید مرزا

ڈاکٹر محمد وحید مرزا

معزز خواتین و حضرات :

میرے لیے یہ بڑی مسرت کا مقام ہے کہ مجھے مستشرقین کی اس بین الاقوامی کانفرنس میں جو اورینٹل کالج لاہور کے جشن صد سالہ کے موقع پر منعقد ہو رہی ہے، عربی و علوم اسلامیہ کے سیکشن کے جلسے کی صدارت کے لیے مدعو کیا گیا ہے۔ میں اس قدردانی اور ہمت افزائی کے لیے بانیان جلسہ بالخصوص ڈاکٹر احسان الٰہی رانا کا بےحد ممنون ہوں اور تہ دل سے ان کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔

اورینٹل کالج سے میرے تعلق کا آغاز ۱۹۱۹ تا ۱۹۲۱ء میں ہوا جب میں لاہور گورنمنٹ کالج میں عربی ایم۔ اے کلاس کا طالب علم تھا اور اس زمانے کے قواعد کی رو سے مجھے اور میرے ساتھیوں کو علاوہ اپنے کالج کے اورینٹل کالج اور اسلامیہ کالج میں بھی پڑھنے کے لیے جانا پڑتا تھا، چنانچہ اورینٹل کالج میں ہمیں پروفیسر محمد شفیع صاحب سے ابن قتیبہ کی کتاب الشعر و الشعراء اور تاریخ ادب عربی، مولوی نجم الدین صاحب سے التفتازانی کی مختصر المعانی اور اسلامیہ کالج میں مولوی اصغر علی روحی سے البیضاوی کی تفسیر سورۂ بقرہ پڑھنے کا شرف حاصل ہوا۔ نصاب کی باقی کتابیں ہمارے اپنے کالج کے پروفیسر ڈاکٹر صدو الدین صاحب پڑھاتے تھے۔ ۱۹۲۱ء میں ایم۔ اے پاس کرنے کے بعد مجھے میکلوڈ اور بہاول پور اسٹیٹ ریسرچ اسکالر شپ مل گئے اور میں کم و بیش دو سال تک پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں اپنا کام کرتا رہا اور اپنے فاضل اساتذہ کی ہدایت و رہنمائی سے مستفید ہوتا رہا۔

جب میں ۱۹۲۵ء میں لکھنؤ یونیورسٹی میں ملازم ہو گیا تو لاہور اور اورینٹل کالج لاہور سے میرے باقاعدہ روابط بڑی حد تک منقطع ہو گئے۔ لیکن اپنے سابق اساتذہ، خصوصاً پروفیسر محمد شفیع صاحب سے خط و کتابت کا سلسلہ جاری رہا اور ان کی فرمایش پر میں کبھی کبھی لاہور اورینٹل کالج کے لیے جو ان کی ادارت میں ایک اعلیٰ پایے کا ادبی رسالہ

بن گیا تھا، مضامین بھی لکھتا رہا ۔ اس کے علاوہ دو ایک دفعہ مجھے پنجاب یونیورسٹی کے عربی ممتحنین کی میٹنگ میں شرکت کے لیے لاہور آنے کا اتفاق ہوا، اور پروفیسر محمد شفیع صاحب اور فارسی کے پروفیسر ڈاکٹر محمد اقبال صاحب ایک سے زائد مرتبہ لکھنئو یونیورسٹی کی مجالس نصاب میں شرکت کی غرض سے لکھنئو آئے اور ان سے اورینٹل کالج کے احوال و کوائف معلوم ہوئے ۔

آخر میں ۱۹۶۲ء میں میرا تقرر پنجاب یونیورسٹی کے شعبۂ دائرہ معارف اسلامیہ میں ایڈیٹر کی حیثیت سے ہو گیا اور اس طرح ۳۷ سال کی طویل غیر حاضری کے بعد میں پھر لاہور آ گیا ۔ یہاں آ کر اپنے پرانے دوستوں اور دیرینہ کرم فرماؤں سے تجدید ملاقات کا موقع ملا اور اورینٹل کالج کے کئی نئے اساتذہ مثلاً ڈاکٹر سید محمد عبداللہ، ڈاکٹر سید محمد باقر، ڈاکٹر عبادت بریلوی اور ڈاکٹر احسان الہی رانا وغیرہ سے بھی ملاقات ہوتی رہی ۔ مجھے اس طرح اورینٹل کالج کے نشو و ارتقا کو قریب سے دیکھنے کا ایک بار پھر موقع ملا ۔ لہٰذا میرے لیے اور ان سب لوگوں کے لیے جن کا مشرقی علوم کی اس قدیم اور بلند پایہ درسگاہ سے پرانا تعلق رہا ہے یہ بڑی خوشی و انبساط کی بات ہے کہ یہ کالج آج اپنی انتہائی مفید و کارآمد زندگی کے ایک سو سال پورے کر کے یہ جشن منا رہا ہے ۔ دعا ہے کہ خدا اسے تا دیر سلامت رکھے اور وہ آگے چل کر اپنے کئی اور صد سالہ جشن مناتا رہے، آمین ۔

اس جشن کی کامیابی کا سہرا کالج کے موجودہ پرنسپل عبادت بریلوی کے علاوہ کانفرنس کے قابل و مستعد سکرٹری ڈاکٹر رانا اور ان کے نوجوان ساتھیوں کے سر ہے اور میں انھیں ان کی مساعی جمیلہ پر ہدیۂ تبریک پیش کرتا ہوں ۔ آج کے اس جلسے میں پاکستانی علماء کے علاوہ کئی غیر ملکی مستشرقین بھی تشریف فرما ہیں اور اپنے فاضلانہ مقالات آپ کے سامنے پیش کرینگے جنھیں سننے کے آپ سب یقیناً بے چینی سے منتظر ہونگے، اس لیے میں آپ کا مزید وقت لیے بغیر ڈاکٹر رانا صاحب سے درخواست کرونگا کہ وہ جلسے کی کارروائی شروع کریں ۔ شکریہ!

محمد بن ناصر العبودى
الامين العام للجامعة الاسلامية فى
المدينة المنورة

تطور الامثال فى جزيرة العرب على مدى أربعة عشر قرناً

ان أهمية الأمثال بالنسبة لدراسة أحوال الشعوب أصبحت معروفة للباحثين لا تحتاج الا للتذكير بها .

فهى مهمة للباحث الاجتماعي و للباحث اللغوى، وحتى المؤرخ قد يجد فيها ما يعينه على عمله.

ولذلک قال بعضهم بحق : ان الأمثال مرآة الشعوب .

لذلک لاغرابة أن عنى العلماء بتدوين الأمثال العربية و تسجيلها، بل وتبويبها وترتيبها، و كانت الأمثال العربية القديمة من أول فنون الأدب تسجيلا وتدوينا، و بين أيدينا شاهد على ذلک فى كتاب مطبوع لعلم من أعلام الأدب العربي هو المفضل بن محمد الضبى، و هو كتاب ''أمثال العرب'' الذى طبع أول ما طبع في مطبعة الجوائب بالقسطنطينية عام ١٣٠٠هـ .

و معلوم أن المفضل بن محمد الضبى عاش النصف الاول من القرن الثاني الهجرى، و أختلف فى عام وفاته على أقوال لعل أصحها أنه عام ١٦٨هـ.

ثم بعد ذلک أخذ العلماء فى تدوين الأمثال و حفظها و تضمينها كتب الأمالى التى تطورت بعد ذلک فأصبحت تسمى كتب المحاضرات .

حتى حفلت بها كتب الأدب العربى مطولها ومختصرها واختصت بها معاجم خاصة أحفل ما وصل الينا وأجمعه منها كتاب ''مجمع الأمثال'' لأبى الفضل أحمد بن محمد الميدانى الذى ذكر أنه أخذ كتابه من قرابة خمسين مؤلفا فى الأمثال، وكان كتاب الميدانى من أوائل الكتب التى

طبعت بالحروف العربية وطبع عام ١٨٣٨ م واشتمل على أكثر من ستة آلاف مثل وان كان بعضها من أمثال المولدين .

وكتاب المستقصى فى الأمثال للعلامة الشهير جار الله الزمخشرى هو كتاب جامع عظيم و لكنه حوى عدداً أقل من تلك الأمثال اذ اشتمل على — ٣٣٦١ — حسبما جاء فى النسخة المطبوعة فى حيدرآباد عام ١٣٨١ ه .

على أن كتاب الميدانى وكتاب الزمخشرى لم يشتملا الا على أمثال دونها من قبلهم من العلماء و الأدباء، و كان عملهما مقتصراً على الجمع، والترتيب وايراد الشواهد، و ذلك حسبما صرح به الميدانى و حسب ظاهر صنيع الزمخشرى .

و لا غرو فى ذلك اذ أننا نعرف أن عهد الارتحال الى البادية العربية، والأخذ عن الاعراب الفصحاء كان قد انقضى قبل زمنهما ، و كان من أبرز من سجل ما سمعه عن العرب مشافهة من المتأخرين الامام أبو منصور الأزهرى، و ضمن ذلك كتابه العظيم "تهذيب اللغة" .

و كان اغفال الأخذ المباشر عن أهل البادية في جزيرة العرب راجعاً لسببين رئيسين :

أولهما : شيوع اللحن في لغة أولئك الأعراب الفصحاء نتيجة لاختلاطهم بغيرهم من أرباب الثقافات المختلفة، و ذوى اللغات المتعددة، ولعامل التطور و التغير الزمنى الذى يصيب كل اللغات على مر العصور .

وثانيهما : التراخى العلمى الذى أصاب العلماء و الادباء عندما مضى عهد الابتكار الثقافى، وأخذ العلماء يكتفون بما لديهم مما سجلوه يشرحونه، و يبوبونه ويرتبونه، ويعيدون فيه و يبدون .

لذلك تركوا البادية العربية و شأنها وأهملوا الاعراب ولغتهم التى شاع فيها اللحن و أصبح نطقها يختلف عن نطق اللغة الفصحى، لغة القرآن الكريم، و الحديث الشريف، و الشعر الفصيح .

و على مر العصور على بادية تلك الجزيرة أخذت عوامل التغير تفعل فعلها فى لغتها بجميع فنونها من شعر وأمثال وأسجاع .

و لا شك أننا جميعاً نرغب في أن نعرف ما حدث للغة العربية في جزيرة العرب طيلة القرون التي امتدت من شيوع اللحن فيها أو قل بين ختام القرن الرابع الهجرى و حتى الآن ــ أى على مدى الف عام من الأعوام .

و لكن البحث في هذا الموضوع وسيع، و المجال فسيح، ولا يمكن اعطاء فكرة عامة عنه في بحث أو بحثين أو تلخيصه في ساعة أو ساعتين، وكل فرع من فروع اللغة يحتاج إلى جهد خاص من علماء ذوى اختصاص، وملكات علمية، وأوقات يملكون التصرف فيها و وقفها لذلك العمل، وناهيك بدراسة تطور الشعر في جزيرة العرب على سبيل المثال وعبر مدة تزيد على أربعة عشر قرنا .

و لكننا اذ لا نملك أن نتكلم عن ذلك كله فانه لايفوتنا أن نبحث في ناحية معينة، تلك هي تطور الأمثال العربية في جزيرة العرب على مدى تلك القرون .

اننا لانستطيع ــ مع مزيد أسفنا الشديد ــ أن نتتبع المراحل التي مر بها المثل وهو يتقلب في الأطوار سائراً عبر القرون حتى أصبح على ما هو عليه الآن .

و لكننا نستطيع ــ لحسن الحظ ــ أن نرى الصورة التي كان عليها كما دونه القدماء، و الصورة التى أصبح عليها الآن كما تنطق به العامة .

و لا يمكن لنا أن نأتي بجميع تلك الأمثال التى دونها القدماء ، و التي لا تزال معروفة ومستعملة في الجزيرة العربية بصورة ما في الوقت الحاضر لأنها كثيرة و متنوعة، ولكننا نذكر نماذج منها نعتقد أن فيها كفاية وغنى لإعطاء فكرة واضحة سليمة عن جزء يستدل به على كل .

هناك مثل عربى قديم لفظه : (لأرينك الكواكب ظهراً)١ و هو

١- وراجع لهذا المثل كامل المبرد ج ١ ص ٣٠٢ ط التجارية ، وج ٢ ص ٦٥٣ ط الحلبي . و العقد الفريد ج ٣ ص ١٢٠ ، و المعاني الكبير ص ٩١٤ و ص ٩٤٣ ، و مجمع الأمثال ج ١ ص ٥٠٦ و ج ١ ص ٣١٣ و ج ١ ص ٣٠٦ و ج ٢ ص ٢٢٦ ، و جمهرة الامثال ص ٥٣ (بومبئ) و المستقصى ج ٢ ص ٩٢ ، و ثمار القلوب ص ٢٣٩ ، و شرح الحماسة للمرزوقي ص ١٥٩٨ و الفاخر ص ٩٢ و فصل المقال ص ٣٦٤، و كنايات الجرجاني ص ١٠٥ .

مثل شائع عند العرب القدماء في الجاهلية وصدر الاسلام ضمنه عدد من الشعراء أشعارهم، منهم طرفة بن العبد قال٢ :

ان تنوله فقد تمنعه　　　و نريه النجم يجرى بالظهر

و قال النابغة الجعدى٣ :

أرحنا معداً من شراحيل بعد ما
أراهم مع الصبح الكواكب مظهرا

و قال الفرزدق لخالد بن عبدالله القسرى٤ :

لعمرى لقد سار ابن شيبة سيرة
أرتك نجوم الليل مظهرة تجرى

و قال أيضاً٥ :

أراها نجوم الليل و الشمس حية
زجام بنات الحارث بن عباد

و قال النابغة الذبيانى٦ :

تبدو كواكبه، و الشمس طالعة
لا النور نور ولا الإظلام إظلام

قال ابن قتيبة : يريد أن اليوم من ظلمته تبدو كواكبه، و قال فى قول الحصين ابن الحمام المرى :

و لما رأيت الود ليس بنافعى
و ان كان يوماً ذا كواكب مظلما

انه مثل قول النابغة : تبد و كواكبه، الى آخر البيت السابق٧ .

٢- ديوانه ص　و المعانى الكبير ص ٩١٧ -
٣- شعر النابغة الجعدى ص ٥٦ ، و العقد الفريد ج ٣ ص ٣٨٠ و المستقصى ج ٢ ص ٩٢ -
٤- ديوانه ج ١ ص ٣٧٣ -
٥- ديوانه ج ١ ص ١٥٩ -
٦- المعانى الكبير ج ٢ ص ٩١٧ -
٧- أيضا　ج ٢ ص ٩٧٣ -

و قال الحارث بن كلدة الثقفى٨ :

تبغ ابن عم الصدق حيث وجدته
فان ابن عم السوء أوعر جانبه

تبتغيه حتى اذا ما وجدته
أرانى نهار الصيف تجرى كواكبه

و قال أدهم بن مرداس التيمي من بني تيم اللات بن ثعلبة٩ :

و لكن أصابتهم خطوب وأخطأت
رجالا أرونى بالنهار كواكبى

و هكذا كان المثل مشهوراً عند العرب القدماء مذكوراً فى أشعارهم و آثارهم.

فلنلق نظرة عليه كما أصبح الآن .

ان العامة تقول فيه الآن : (ورآه نجوم الظهر) أى أن مر القرون لم يغير منه الا الهمزة التى أصبحت عند العامة واواً.

و قد يلفظون به هكذا : (ورآه النجوم بالقايلة) فيضيفون الى التغيير فى الواو اسكان النون المشددة فى كلمة ــ النجوم ــ ، و اتخاذ كلمة ــ القايلة ــ بديلة من كلمة ــ الظهر ــ و كلا هما بمعنى اذ القائلة فى الفصحى هى شدة الحرفى وسط النهار .

هذا الى تسهيل الهمزة فى القايلة و ذلک شانهم فى الهمزة فى جميع كلامهم العامى، اذ يسهلونها اذا وقعت فى وسط الكلمة أو آخرها، ولا يحققون النطق بالهمزة الا اذا كانت فى أول الكلمة .
المثل الثانى : ذكره الزمخشرى بلفظ : (ان الدليل أثر الفوارس)١٠.

٨- الوحشيات لابى تمام ص ١٢٠ و له فى الصداقة والصديق ص ٢٤٠ (بدون نسبة) .
٩- المؤتلف و المختلف ص ٣٢ .
١٠- المستقصى ج ١ ص ٣٠٣ .

قال الزمخشري في أصله: سقط قيس زهير على أثر الحنفاء[١١]: فرس حمل ــ بن بدر ــ حين قص أثره، فقال: ان هذا أثر الحنفاء فأتبعوه (ان الدليل أثر الفوارس) فأرسلها مثلا يضرب فيما يستدل به على الشيء.

وقد تطور النطق بالمثل في جزيرة العرب حتى أصبح يستعمل بلفظ: (خير الدلايل جرة الفرسان). كانما جعلت القرون التي مرت عليه أهل جزيرة العرب يتأكدون من صحته أكثر من الجاهليين فقالوا: خير الدلايل، بدلا، ان الدليل، وغيروا كلمة ــ أثر ــ بكلمة ــ جرة ــ و معناها: جرة، أي أثر أقدام المشي التي تنطبع على الأرض.

أما كلمة ــ الفوارس ــ فهي لم تبعد كثيراً إذ حلت محلها كلمة الفرسان.

المثل الثالث:

(عش ولا تغتر)[١٣] قيل في أصله ــ كما ذكره المبرد و العسكري و الميداني ــ: أن رجلا أراد أن يقطع المغازة بابله ليلا متكلا على عشب يجده، فقيل له: عش ولا تغتر بما لست منه على يقين.

و روى أن رجلا أتى ابن عمر وابن عباس وابن الزبير رضي الله عنهم فقال: كما لا ينفع مع الشرك عمل، كذلك لايضر مع الايمان ذنب، قالوا: عش ولا تغتر، يقولون: لا تفرط في أعمال الخير، و خذ في ذلك بأوثق الامور، فان كان الشأن على ما ترجو في الرخصة و السعة، كان ما كسبت زيادة في الخير، وان كان على ما تخاف، كنت قد احتطت لنفسك[١٤].

١١- كذافيه، و المشهوران الحنفاء هي فرس اخيه حذيفة بن بدر كما قال ابو فراس الحمداني كما في مجموعة المعاني ص ١٥٢:

فقد جرت الحنفاء حتف حذيفة
و كان يراها عدة للشدائد

١٣- كامل المبرد ج ١ ص ٢٠٠، و جمهرة الامثال ص ١٣١، و المستقصى ج ٢ ص ١٦٢، و العقد الفريد ج ٣ ص ١١١، و البخلاء للجاحظ ص ١٤٣، و الميداني ج ١ ص ٤٧٦، و محاضرات الراغب ج ١ ص ٩ و ص ٢٣٨، و كشف الخفاء ج ٢ ص ٤٣—٤٥-

١٤- النهاية لابن الاثير ج ٣ ص ٩٩-

هذا هو اللفظ الفصيح القديم للمثل، و هو ــ كما نرى ــ لا يفهم لا بتفسير .

أما العامة في الوقت الحاضر فانهم يستعملونه بلفظ أبسط وأوضح اذ يقولون : (الى ذكر لك معشى فعش من دونه) .

و تفسير كلماته كما يلي :

الى : معناها إذا، و قد استعاضوا بها عن كلمة إذا في جميع كلا مهم العامي، و معشي : هو المكان الذى تعشي فيه ابلك، أي : المكان الذى تتركها ترعى فيه عشاءها، و عش : أمر ــ كما في المثل الفصيح .

و معنى المثل : اذا ذكر لك مكان لترعى فيه ابلك عشاءها، وأنت في مكان فيه مرعى تظن أنه دون المكان الذى ذكر لك، فلا تترك المكان الذى أنت فيه اعتماداً على ما قيل لك عن الآخر الذى قد تذهب اليه، فربما يكون ما ذكر لك عنه غير صحيح، فتكون قد تركت ما عندك، ولم تحصل على أفضل منه .

المثل الرابع : (لا يضر الحوار ما وطئته أمه) ١٥ :

قال الفرزدق :

وانى وسعد كالحوار وأمه
اذا وطئته لم يضره اعتمادها ١٦

فقد أصبح المثل عند العامة في الوقت الحاضر أوضح لنا نحن الذين اعتمدنا على سماع اللغة الفصحى التي تطورت من لغة قريش، اذ يقولون : (الحوار ما يضره و طى أمه) قال الز مخشرى : يضرب للمشفق الذى لا يؤذيك و ان هم بك .

و هذا هو مضربه الذى لم تغيره القرون.

١٥- العقد الفريد ج ٣ ص ١٠١، و مجمع الامثال ج ٢ ص ١٤٠، و المستقصى ج ٢ ص ٢٤١، و التمثيل و المحاضرة ص ٣٣٣-

١٦- المستقصى عند ذكر المثل-

المثل الخامس : (بئس العوض من جمل قيده)١٧ قال الميدانى : أصله أن راعياً أهلك جملا لمولاه، فأتاه بقيده فقال ذلک، يضرب لمن اعتاض عن الشیء الخطير ما لا خطر له .

وقد أصبح المثل عند العامة فی الوقت الحاضر بلفظ : (عوضک من جمل قيده) جاءوا به على صيغة الخبر الذی معناه التهكم ولم يروا حاجة للابقاء على أفعل التفضيل إذ لا معنى للتفضيل بين الجمل و قيده .

المدينة المنورة :

١٧- مجمع الامثال ج ١ ص ١٠٣ ، و المستقصى ج ٢ ص ٢ -

نبذة من حياة الدكتور محمد شفيع

ولد محمد شفيع فى الثامن من شهر اغسطس عام ١٨٨٣ م فى بلدة قصور من مضافات لاهور (باكستان) و توفى فى الثالث عشرة من شهر مارس عام ١٩٦٣ م فى مدينة لاهور و دفن بها .

نشأته و تربيته :

قرأ على والده الحافظ وهاب الدين فى مراحل التعليم الابتدائية وحصل على الشهادة العالية (M.A.) فى اللغة الانجليزية من جامعة البنجاب عام ١٩٠٥ م كما نال الشهادة العالية (M.A.) فى اللغة العربية من نفس الجامعة عام ١٩١٣ م ثم فاز على الشهاده العالية (M.A.) من جامعة كمبرج .

توليته مناصب عدة :

بقى يعمل فى وزارة التربية والتعليم فى اقليم البنجاب من عام ١٩٠٦م الى ١٩١٥م ثم فاز على منحة مكلود المختصة بالدراسية العربية بجامعة البنجاب من عام ١٩١٣م الى ١٩١٦م كما فاز على منحة من قبل الحكومة الهندية للدراسات العليا فى جامعة كمبرج من عام ١٩١٥ الى ١٩١٩م و قد قام بتدريس اللغة الاردية بجامعة كمبرج من عام ١٩١٨ الى ١٩١٩م .

و عين استاذا لتدريس اللغة العربية بجامعة بنجاب من عام ١٩١٩ الى ١٩٤٢ م و قام ايضا بتدريس تاريخ الدراسات الاسلامية . لقد قرأ عليه عدد كبير من طلاب العلم و عين جل تلاميذه اساتذة للتدريس اللغة العربية فى الكليات منهم فى اقليم البنجاب ، و منهم فى الاقليم الشمالى الغربى و فى مختلف الاقاليم الاخر كما نجد بضعة من تلاميذه يحملون شهادات الدكتوراه الى جانب هذا قد عين الاستاذ شفيع وكيلا للكلية الشرقية بلاهور من عام ١٩٢١م الى ١٩٣٦ م كما عين عميدا للكلية المذكورة من عام ١٩٣٦ الى آ ١٩٤٢ م — بقي عضوا للمجلس الاعلى بجامعة البنجاب من عام ١٩١٩ الى

١٩٤٤م، ١٩٥٠ — ١٩٥٤، ١٩٥٨ — ١٩٦٢م وبقى ايضا عضوا فى اللجنة المكونة من مديرى الجامعات من عام ١٩٥٤ — ١٩٥٨ م و بقى رئيسا عاما للدراسات الشرقية من عام ١٩٣٣ الى ١٩٤٤م، ١٩٥٠ — ١٩٥٤م و قد رأس اللجان فى الدراسات العربية و الفارسية و البشتو و الاردية من عام ١٩١٩ الى ١٩٤٢م، ١٩٥٨ — ١٩٦١م كما رأس لجنة الدراسات الاسلامية بجامعة البنجاب ١٩٥٠ — ١٩٥٤ م و قد رأس لجنة مكتبة جامعة البنجاب من عام ١٩٣٧ الى ١٩٤٤م . و بقى رئيسا للجنة التى كونتها جامعة البنجاب للتصرف فى المنحة التى قدمها ملك ايران لجامعة بنجاب من عام ١٩٥٠ — ١٩٦٣م.

و قد زاول عمل الاستاذ و السكرتير بدون عوض فى دارالعلوم الاسلامية للبنات كخدمة للغة العربية من عام ١٩٤٦ — ١٩٥٠ م وعين مرة أخرى كرئيس لدار المعارف الاسلامية فى اللغة الاردية من عام ١٩٥٠ — ١٩٦٣م . و قد كان له شغف كبير بجمع المخطوطات النادرة و الكتب القيمة.

الالقاب و شهادات الشرف :

فاز الاستاذ شفيع بلقب شرف "خان بهادر" عام ١٩٤٢ م كما فاز بلقب شرف الدكتوراه فى الدراسات الشرقية عام ١٩٥٢ م من قبل جامعة بنجاب و نال ايضا لقب شرف العلمى بدرجة الامتياز من قبل مملكة ايران فى عام ١٩٥٣ م . و قد فاز بنجمة الشرف من قبل حكومة باكستان فى ١٩٥٩ م واهدى اليه اعضاء مجلس ارمغان علمى كتاب "ارمغان علمى" فى عام ١٩٥٥ م ؟ خدماته العلمية و الادبية :

أ ـ بقى الاستاذ شفيع عضوا فى نهج الدراسات الثانوية فى البنجاب.

ب ـ و بقى عضوا فى حلقة اقبال الادبية منذ ١٩٥٠ م.

ج ـ و بقى عضوا فى اللجنة المنعقدة للنظر فى الامور العلمية لكلية دارالعلوم الاسلامية من عام ١٩١٩ م .

د ـ و بقى عضوا فى اللجنة التنفيذية فى دائرة المعارف الاسلامية

هـ ـ رأس اللجنة التى اسست للتعاون العالمى فى الامور الاسلامية و العلوم الشتى فى استانبول .

و- اسس مجلة الكلية الشرقية لاهور و قام بادارتها من عام ١٩٢٥ الى ١٩٤٢ م .

ز- اسس جمعية اللغة العربية و اللغة الفارسية بجامعة البنجاب و بقى رئيس تحرير ملحق المجلة بالكلية الشرقية بجامعة البنجاب لاهور باكستان .

شغفه بالعلم و التحقيق :

كان الدكتور محمد شفيع المرحوم امام العلماء و الادباء فى العصر الحديث انه قد صرف حياته فى التحقيق و بذل مجهوده فى احياء العلوم الشرقية عامة و العلوم العربية و الفارسية خاصة، و قد اعترف المستشرقون بعلمه وادبه كما اعترف بفضله و خدمته العلمية العلماء و الادباء فى شبه القارة الهندية المنقسمة حالا الى باكستان و الهند .

لقد تولى الدكتور محمد شفيع كبار المناصب و قام باعمالها بكفاءة تامة و رأس الوفود فى مؤتمرات عالمية و نال امتيازات الشرف العلمية فى داخل الدولة وخارجها ولكن الصفة الحميدة التى امتاز بها الأستاذ شفيع و التى وضعته فى قمة رجال العلم و الادب ليست تلك المناصب العليا اوناك الرئاسة للوفود فى المؤتمرات العالمية بل هو ان هذه الصفة المحمودة التى جعلت الاستاذ شفيع ذا شهرة عالمية و ميزته عن بقية رجال العلم والادب هى خدماته الجليلة للعلم و الأدب و مجهوداته الجبارة فى النقد و التحقيق العلمى و العناية على المخطوطات النادرة التى كانت فى طريقها الى الضياع و اكل الديدان و قد سن سنة حسنة و هى المواظبة فى العمل ودقته فى التحقيق وامانته فى البحث . قد سبق فى هذا الميدان جميع معاصريه فى باكستان بل قد أنشأ مكتب فكر خاص يمتاز بالفحص الدقيق والتمحيص العميق كما نفث فى تلاميذه و اصدقائه من العلماء روح التحقيق فى البحوث و النقد الصحيح و حبب اليهم سرد الحوادث و الحقائق بعبارات سهلة واضحة جلية المعانى خالية بقدر الامكان عن التشبيهات و الاستعارات والمجازات و غيرها من الوان البيان و البديع بعيدة عن زخرف الالفاظ و تنميق الجمل كما هى العادة عند اغلب الادباء العلماء فى الشرق خاصة .

طريقته فی التحقیق و التدریس :

لذلک نجد طریقته سوا ً اکانت فی التحقیق او التدریس طریقة علمیة بحتة لا تنحرف عن اصل الموضوع و هی فی نفس الوقت خالیة عن نقص مخل بالموضوع و زیادة مملة . لذلک یمکن القول بان الاستاذ محمد شفیع کان شخصیة فذة ذات شهرة عالمیة فی میدان العلم و الادب و له خدمات جلیلة وجدت شهرة فائقة فی الشرق و الغرب علی السوا ً .

و اما طریقته فی التدریس و القا ً المحاضرات فکانت ذات مزایا عدة تفصیل ذلک انه کان استاذا کبیرا ذا قدرة فائقة فی شرح ای موضوع کان یتصر له . فما کان یترک المجال للشک البتة ذلک انه قد جمع فی نفسه طبیعة النقد الصحیح و الدقة التی تختص، بها الغربییون الی جانب ذلک انه کان له مطالعة واسعة و کان له براعة فی العلوم و الفنون التی تختص بها الشرقیون . انه کان یثیر فی نفوس تلامیذه غریزة النقد و الدقة فی المسائل و کانت محاضراته جامعة تشمل الموضوع کله . و فی نفس الوقت کانت موجزة لا تمل السامعین .

و فی تدریس اللغة العربیة کانت له طریقة خاصة وهی انه کان یستعین فی ذلک بالتاریخ الاسلامی و سرد الحوادث التاریخیة الاسلامیة للوصول الی اصل الموضوع ـ و کان هدفه من ذلک انه یدرس التلامیذ الادب العربی فی البیئة التی نشأ فیها هذا الادب و ان یعطی فکرة صحیحة للتلامیذ عن الاحداث التی اثرت فی هذا الادب العربی و کان هدفه الاصلی من دراسة الادب و اللغة هو تهذیب الخلق و الاطلاع علی التاریخ الاسلامی و تطور اللغة و الادب العربی فی عصورها المختلفة و فی نفس الوقت کان یرشد الطلاب الی المراجع و امهات الکتب حتی لایقید الطلاب انفسهم فی الکاتب المقررة فقط و کان یشجعهم دائما بالرجوع الی الاصول کان یتوسعوا فی معلوماتهم ویطالعوا کتبا غیر المقررة فی المنهج لذلک الاستاذ محمد شفیع قد افاد طلابه فائدة جمة و انار قلوبهم بنور العلم و توسع فی معلوماتهم الی حد ممکن بعلوم و فنون شتی .

ان الاستاذ محمد شفیع کان استاذا بمعنی الکلمة سبق اقرانه فی التدریس لذلک کان محببا الی تلامیذه ذا قدر جلیل فی اعینهم ذلک انه لم یکن

يبدأ حتى يحل مشاكلهم العلمية و الادبية و قد سبق فى ميدان العلم و الادب اقرانه حتى اعترف بعلمه و ادبه رجال العلم و الادب من المستشرقين ايضا و لم يكن فضله فى العلم و مهارته فى الادب و التاريخ محصورا على تلاميذه فى الدراسات العليا فقط بل كان فضله و توجيهه يعم و يشمل الى الطلاب الذين كانوا يقومون فى البحوث و اعداد رسالات التى كانت تقدم لنيل شهادات الدكتوراه و كان من عادة الاستاذ محمد شفيع انه ما كان يرشح كل حامل الشهادة العالية لدراسات الدكتوراه بل كان ينتخب لهذا الغرض طالبا ذا مقدرة فائقة و همة عالية يتفرس فيه المواظبة فى الدراسة . الى جانب هذا كان يقوم باختباره العلمى و يطلع على مستواه الادبى و مقدرته فى الموضوع الذى كان الطالب يختاره لدراسة الدكتوراه . لذلک كان المستوى العلمى لدراسة الدكتوراه فى نظر الاستاذ شفيع املا بعيد المنال لا يفوز به الا ذو مقدرة كافية و صاحب مجهود جبار و عزيمة صارمة و همة عالية فى مواظبة العمل لدراسة الدكتوراه .

منهجه فى البحث و التحقيق :

و كان له منهج خاص فى القيام بالبحث و التحقيق و هو انه رأى ان التدرج لازم لكل طالب يريد ان يقوم بالتحقيق ـ لذلک كان يأمر الطلاب فى بداية البحث بدراسة جميع الكتب التى لها صلة بالبحث و ينصح الطلاب بدراسة امهات الكتب و فهمها فهما صحيحا و يوجههم بجمع المعلومات المتعلقة بالبحث من الكتب و المقالات التى كتبت بهذا الصدد و هذه المرحلة كانت مرحلة تدريب للطالب و مرحلة اعداده للقيام بدراسات الدكتوراه . كما كان الاستاذ شفيع يامر الطالب فى بداية الامر بكتابة موضوعات سهلة كترتيب الفهارس للموضوع الذى يختاره فى ما بعد لدراسة الدكتوراه تنقيح الكتب و مقارنة المخطوطات المختلفة و غيرها من الموضوعات السهلة و كانت مرحلة مقالات قيمة و موضوعات عويصة ذا اهمية كبرى يأتى بعد التدريب المذكور و كانت نظرة الاستاذ شفيع الى اختيار الموضوعات لدراسة الدكتوراه تختلف عن كثير من العلماء ذلک انه ما كان يحب فى موضوعات دراسات الدكتوراه ان يقدم الى العلماء و الادباء شيئا جديدا فقط بل كان

يجب ان تكون تلك الموضوعات قبل كل شيء ذات اهمية بالنسبة للبدء الذى ينتمى اليها الطالب الذى يقوم بالبحث و كان يهدف بهذا الى امرين اولا هو خدمة الطالب لبلده و ثانيا ان هذا الطالب يعرف جيدا طبيعة هذا الموضوع الذى يتعلق ببلده اكثر من غيره كما قيل فى المثل "صاحب البيت ادرى بما فيه" و يمكن لنا القول بان الاستاذ محمد شفيع قد انشاء مكتب فكر خاص فى الكلية الشرقية الذى فر اعضاءه على نفسه ان يوجهوا جميع جهودهم قبل كل شيء الى الحقائق التاريخية و الحوادث التى ظهرت في العالم الاسلامى فى عصورها المختلفة ثم ان يتناولوا العلوم و الفنون و الاداب فى ضؤ تلك الظروف المحيطة بها لذلك نجد ان هذا المكتب الفكرى يشبه فى تحقيقة وبحثه شبها تاما بالعلما المستشرقين من حيث عمق النظر و الدقة فى التحقيق الذى نجده عند علماء المغرب و خاصة فى العصر الحاضر — و فى نفس الوقت نجد عندهم السعة فى العلم و الالمام بالعلوم كلها التى هو من خواص علماء الاسلام عامة و علماء ماوراء النهر خاصة و تفصيل ذلك انهم لا يركزون تفكيرهم على الجمال الفنى من زخرف الالفاظ و المعانى و تنميق الجمل بألوان البديع من التشبيهات و الاستعارات و المجازات بل انهم يبذلون جل مجهوداتهم فى الوصول الى الحقائق الثابتة فى ضوء التاريخ الصحيح و ليس الجمال الفنى الادبى غايتهم المنشودة ذلك انهم يبحثون عن الادب و تطوره فى العصور المختلفة و لكنهم لا يهتمون بل لايصرفون وقتهم القيم فى البديع و البيان . و انما يتتبعون التطورات الادبية فى عصورها المختلفة و يسردون الظروف المحيطة به في اطوارها المختلفة مستعنين فى ذلك بالتاريخ الاسلامى و العوامل التى اثرت فى طبيعة الادب خاصة و العلوم عامة و لم يعتن اعضاء مكتب هذا الفكر فى وقت من الاوقات بالاسلوب البيانى و انما همه الاول و الاخر هو ان يوفروا المواد الصحيحة و المعلومات الحقة للذين يقومون بالبحوث او الدراسات العليا سواء اكانت فى اللغة العربية او الفارسية او الاردية او غير ها من اللغات و ميدان سبقهم فى هذا المضمار هو الابداع و الاستكشاف عن الكتب و المخطوطات النادرة التى لو لم يكن هذا المكتب الجديد الذى أنشاه استاذنا الكبير محمد شفيع لما ظهرت هذه الكتب و تلك المخطوطات فى المكاتب العامة و لما استفاد منها العلماء والادباء و عامة

الناس ـــ هذا المكتب الجديد يحاول بقدر المستطاع ان يبرز القضية فى لباسها الاصلى بدون النقص و الزيادة و قوام بحوثهم اقتباسات طويلة من امهات الكتب واخذ كل عبارة فى كتبهم مذيل باقوال الرواة يؤيدون بها الرأى الذى ارتاه صاحب مكتب هذا الفكر الى جانب انهم يسجلون كل مسألة بالسنة التى وقعت فيها و يبينون كل حادثة بوضاحة تامة انهم لا يتركون جزئياتها التافهة ايضا ـ و خلاصة القول ان جد هذه الامتيازات و تلك الخواص تجدها واضحة جلية فى اغلب مؤلفات مكتب هذا الفكر الذى اسسه الدكتور محمد شفيع فى الكلية الشرقية .

تشجيعه الطلاب على قرأة الادب القديم :

و للاستاذ محمد شفيع مزية اخرى و هى انه اوجد فى تلاميذه حب الأدب القديم حتى اكبوا على قراءته و شجع اصدقائه من العلماء و الأدباء ان يدرسوا الكتب القديمة و ان يكشفوا الستار عن فحول الشعر القديم و اصحاب البيان فى النثر الفنى القديم و يرجع الفضل الكبير فى ذلك الى الاستاذ شفيع و الى المكتب الفكرى الذى هو موسسه و الذى له يدفعالة فى طبع الكتب وتنقيح المخطوطات التى بقيت حقبة من الزمن مخفية عن نظر عامة الناس حتى أنه لو لم تكن مجهودات هذه الجماعة لما ظهرت هذه المخطوطات النادرة و تلك الكتب القيمة و لما جاءت الى منصة الشهود حتى اصبحت فى متناول كل واحد من القارئ و الباحث ـ و بذلك يمكن القول بان الاستاذ شفيع لم يخدم الادب العربى و العلوم الشرقية وحدها بل انه بعث فى الباحثين فى الدراسات الشرقية روح التحمس و الجد فى الازدياد من من مناهل تلك العلوم و التى فى الطلاب شوقا و ذوقا لتلك العلوم و الاداب الشرقيه كانت فكرة اصلية لانشاء الكلية الشرقية ـــ انه أيقظ فى الطلاب غريزة النقد الصحيح و حبب اليهم مطالعة العلوم و الاداب الشرقية و رفع بهم عن الموضوعات التافهة و جعلهم يهتمون بموضوعات كيانها التراث الاسلامى والتهذيب الشرقى فاصبح طلابه و اصدقائه يطوفون كالنحل على ازهار العلوم و الاداب كلها سواء اكانت هذه العلوم و تلك الاداب تتعلق بالعربى او الفارسى او الاردو او اللغة السنسكرتية او غيرها من اللغات و قد قطع فى هذا

النضمار الاستاذ محمد شفيع شوطا كبيرا حيث خدم العلوم و الاداب الشرقية في شبه القارة الهندية بدرجة قلما نجد لها نظيرا .

توجيه الطلاب الى دراسة العلوم و الاداب الشرقية :

ان فكرة التوجه الى دراسات العلوم و الاداب الشرقية قد نجدها في بداية امرها عند المستشرقين امثل الدكتور "لائتنر" سر "ارل شتائن ميكدانلد"، الدكتور "وولنر" وغيرهم ــ و لكن فضل تنفيذ هذه الفكرة لاحياء العلوم و الاداب الشرقية و حركة الجهد المستمر و الدقة في التحقيق و التعمق في البحوث العلمية كل هذا وذلك يمكن القول بان الروح الفعال لهذه المحركات العلمية و تلك العوامل التي شجعت الطلاب في التحقيق و النقد هو الاستاذ الكبير الدكتور محمد شفيع .

حبه لوطنه الاصلي :

ان البحوث العلمية التي قام بها الدكتور محمد شفيع كثيرة و يمكن الاطلاع على الموضوعات المهمة منها في كتاب "ارمغان علمي" ذلك انه درس دراسة واسعة الثقافة الايرانية و الهندية و قد برع في التاريخ و التطورات العلمية و الادبية التي ظهرت في عهدى المغولي و التيموريين و قد خص بالدراسة من العهد التيموري عهد سلطان بابر ــ اذ انه درس النشاط العلمي والادبي والفني الرائج، في هذا العهد دراسة عميقة و اكب على تتبع الخطوات التي اخذت في سبيل رقي فن الخط في ذلك الزمني و ازاح الستار عن حياة فرقة "نور بخش" و احوالها التي بقيت مجهولة عن نظر العامة واعطى فكرة صحيحة عن نشاط هذه الفرقة و وجهة نظرها با سلوب أدبي علمي و بذلك اضاف الى تراثنا الديني و الادبي ثروة قيمة و عرفنا بتاريخنا الزاهر في العصور السالفة و كان للاستاذ شفيع فضل كبير في تاريخ الهند عامة و تاريخ لاهور خاصة و تلاحظ هذه الفكرة في جمع المخطوطات المتعلقة بالبنجاب و بالاخص بلاهور و قد كتب بنفسه عدة مقالات بهذا الخصوص و صرف نظر تلاميذه و اصدقائه من العلماء و الادباء الى هذه الناحية ــ لذلك يمكن القول بانه كان البلد الذى عاش فيه أحب اليه اكثر من غيره اذ انه اكشف عن الخدمات العلمية و الثقافية و التاريخية التي قام بها علماء الهند

عامة و علماء البنجاب خاصة و اتى بهذا التراث العلمى الى منصة الشهود بل ان فكرة اللغة الاردية التى اثارها الاستاذ شيرانى من يدرى الى اى حد كان للدكتور شفيع يد فعالة فى تكميل هذه الفكرة و تنفيذها الى معرض الوجود حتى ان الاستاذ شيرانى يعترف بنفسه انه لو ما كان الاستاذ شفيع و تحمسه للغة الاردية لكان من الممكن جدا ان يحول هو وجهة نظره الى حية اخرى.

و لما كان الدكتور محمد شفيع ينتمى الى بلدة قصور (البنجاب) فقد جعلها هدفه الاول للتحقيق و ركز تفكيره اكثر فى احياء تاريخ هذه البلدة و قد طبعت له مقالات قيمة فى المجلة الثقافية الاسلامية و مجلة الكلية الشرقية التى تناول فيها تاريخ الافغانين القاطنين فى هذه البلدة .

شغفه بفن الخط و تطوره :

الى جانب هذا كان للاستاذ شفيع المام خاص و شغف كبير فى الخط الاسلامى و تطوره فى العصور المختلفة ـ و قد بين بالتفصيل تطور الخط كما عرفنا بحياة الكتاب الخطاطين متعرضا للعوامل التى نفثت فى صدورهم روح فن الخط و الرقى به الى ابعد حد ممكن وقد اتى بمعلومات جديدية لم تكن معروفة لدى عامة الادباء من قبل، على ان الاستاذ شفيع كان شغوفا جدا فى الابداع و الابتكار و الكشف عن الكتب النادرة كما نجد هذا واضحا جليا فى فهرس كتاب ''ارمغان علمى'' و لم يكن علم الاستاذ شفيع محصورا فى التاريخ و الادب و الكشف عن الكتب و المخطوطات النا درة، و انما هو كان اماما فى معرفة العملة القديمة و قراءة الكلمات المكتوبة على تلك السكك و فهم العبارات الاثرية ـ لذلك كان دائما مرجع المتخصصين فى الاثار القديمة و قراءة المكتوبات على السكك العتيقة و فهم العبارات المبهمة التى كان يصعب على علماء الاثار قراءتها و فهمها ـــ و لم يكن الاستاذ شفيع ملجاء العلماء فى المسائل العويصة فحسب بل كان العلماء من الغرب و الشرق يستعينون به فى المسائل المعضلة و الامور الخفية من الاثار القديمة .

طريقته فى التحقيق :

اما طريقته فى التحقيق فتختلف عن بعض المحققين بانه يتعرض الى سرد الحوادث فى صورها الاصلية فاذا اراد ان يكتب تاريخ اى عصر من

العصور فهو قبل كل شئى يتناول بالبحث الحوادث التى ظهرت فى ذلك العصر و يحدد ذلك الزمن و المكان اللذين حدثت فيه هذه الحادثة و هو لا يسأم ابدا من بيان الاسباب التى كانت مسببا للحادثة و يسجل لكل حادثة بقدر الامكان اليوم و الشهر و السنة التى وقعت فيها هذه الحادثة و لا يهمه التعمق الفلسفى كما انه لا يقيم الرأى على التخمين و القياس لان غايته المنشودة هى الواقعة نفسها بأى شكل كانت لذلك قلما تجد للخيال و انقياس مجالا فى انتاجه العلمى و الادبى ـ و الاستاذ شيرانى كان مورخا بالطبيعة مثل الاستاذ محمد شفيع و لكننا نرى ان تحقيقه لايخلو من التخييل و القياس مع ان هذا التخييل و القياس لم يدخل فى طبيعته الاصلية ـ اما الاستاذ شفيع فكان يؤمن ايمانا كاملا بان التاريخ لايصلح بحال من الاحوال الا ان يكون قوامه الصدق و الحقيقة الثابتة بعيدا عن التخمين و القياس لذلك ما كان يتعدى قدر حبة الى خارج الموضوع لذلك لايوجد فى مولفات الاستاذ شفيع تلك الالوان التى لاتأتى الا عن طريق الخيال و القياس بل الحق ان مقالاته و مولفاته تحتوى على بحوث علمية صرفة كالعلوم الرياضية التى لا تعطى الا نتائج صحيحة و امور قطعية و الشئ الغريب فى مولفات الاستاذ شفيع انها علمية صرفة ولكن مع هذا لا يمل القارئ من دراساتها و ذلك انه البس الواقعات صورا جذابة يجد الدارس النفسه فيها متعة علمية و التسلل من سرد الحوادث والترتيب المنسق على الاصول المنطقية يجعل القارى مندفعا الى الازدياد منها، و بذلك اظن ان الاستاذ شفيع قد ادى حق العلم اذا العالم المحقق يميل بطبيعة الحال دائما الى الحقائق الثابتة و يراعى فى بحوثه الامانة الكاملة .

مقارنة بين الاستاذ محمد شفيع و سر سيد احمد خان :

ان الدارس يجد شبها قويا بين الاستاذ محمد شفيع و بين الاستاذ سر سيد احمد خان فى بعض الاسلوب البيانى كالترتيب الفنى فى جمع المعلومات و الطريقة المنطقية فى ترتيب الافكار و الآراء فى المقالات و البحوث غير ان هدف الاستاذ شفيع كان اولا و آخرا هو العلم فقط و الجهد المستمر الذى لا يعرف السأم او التهاون فى الامور او التساهل فى البحوث ، بينما توجد فى مولفات سرسيد احمد خان سمة التبليغ و التقليد اللذين يمتاز بها

علماء التبليغ و رجال السياسة فی بعض الاحاديين و بالجملة يمكن القول بان القصد الاعلی و الغاية المنشودة فی مولفات شفيع كان اولا و آخرا هو خدمة العلم فقط و الجهد المستمر فی اظهار الواقعة بجبرأة كاملة فی لباسها الاصلی غير خاضع للظروف الخارجية، و هی الميزة التی قلما نجدها فی عالم من علماء الشرق عامة او مورخ من مورخی المسلمين خاصة فی العصر الحاضر و من اهم الخدمات العامية و الادبية للاستاذ شفيع هو اصدار مجلة الكلية الشرقية التی نشرت تحت اشرافه من عام ١٩٢٥ م الی عام ١٩٤٢ .

و اما المنحق لهذه المجلة فانه قد بقی تحت اشرافه حتی آخر ايامه و من امتيازات هذه المجلة انها لا تعنی بالمقالات السطحية او المقالات الانشائية و انما هی تنشر مقالات تقوم بالبحوث القيمة و فحص دقيق و ابراز الافكار الجديدة بطريقة فنية ـ لذلک وجدت تلک المجلة اقبالا شديدا من العلماء و الادباء و يرجی الفضل فی حفظ المستوی العالی هذه المجلة فی قبولها بين عامة الناس مديرها الاستاذ محمد شفيع الذی مون هذه المجلة الی جانب بنظرته النافذة و نقده الصائب و فحصه العميق بالمواد النادرة و مقامات قيمة كما حلاها بالوقائع و الحوادث التاريخية راعيا فيها الامانة التامة حتی وجدت شهرة عالمية و اقبالا عاما حتی من المستشرقين ايضا و بقی الاستاذ محمد شفيع رئيس الجمعية العربية و الفارسية فی الكلية الشرقية بجامعة بنجاب الی آخر ايامه عام ١٩٦٢ م .

جمعه للكتب و المخطوطات النادرة :

و من خدمات الاستاذ محمد شفيع هو انه امد مكتبة الكلية الشرقية خلال عمله كاستاذ فی تلک الكلية بالمخطوطات النادرة فی اللغة العربية و الفارسية و قد اصبحت هذه المكتبة بفضله و بمجهوداته و مساعيه المضنية فی الحصول علی المخطوطات النادرة تنافس الان اغنی مكاتب الدنيا فی الوقت الحاضر .

و لا ينس خدمة الاستاذ شفيع القومی التی قام بها فی جامعة البنجاب نحو العلوم الشرقية و خاصة العلوم العربية و الفارسية وغيرهما اذ اعطی بمجهوده الجبارة المقام اللائق بهذه العلوم و لم تبق تلک العلوم الشرقية فی

الصفوف الاخيرة كما ترى حالها فى بعض الجامعات الاخرى فى باكستان مع ان الظروف في ذلك الوقت لم تكن مواطئة لرقى تلك العلوم و لكن الاستاذ محمد شفيع بخصوصه التام و تدبره الصائب قد رفع رأية هذه العلوم الشرقية فى ذلك الزمن الاستعمارى و هى نتيجة مجهوداته التى نرى لتلك العلوم الشرقية درجة مرموقة فى جامعة بنجاب فى الوقت الحاضر ايضا .

قيامه بالواجب و اخلاصه فى العمل :

اما قيامه باداء الواجب و خلوصه في العمل و مواظبته فى الامور الدراسية و الادارية فهو ضرب المثل فى جامعة بنجاب و ادنى مثل لاخلاصه فى العمل هو انه لم يطلب اجازة يوم واحد خلال مدة عمله فى الكلية خمس و عشرين عاما ــ و اقل مثل لاحساسه بالمسؤلية الرسمية انه لم يغب عن اجتماعات المجلس الاعلى للجامعة الذى بقى له عضوا لمدة اربع و عشرين سنة ــ هذا غير ما سمعت عن اهله و اولاده انه لم يكن يصرف وقته فى بيته غير المطالعة و الدراسة حتى اثناء تناوله الطعام و اذا سئل بخصوص مسالة كان يطلب الكتاب من مكتبته الخاصة و يتصفح الصفحات بدون ان يتم الاكل حتى يطفئ غلة السائل ــ و لذلك نقدر ان نقول ان الدكتور محمد شفيع كان من العلماء الذين وقفوا انفسم لخدمة الادب و انارة النفوس العاطشة للعلم و المعرفة و البحوث القيمة .

محاسبة فى العمل و الواجب :

هذا هو السبب فى ان الدكتور محمد شفيع كان يطالب الذين عملوا تحته نفس الاخلاص فى العمل الذى اختاره لنفسه و ينبئهم بالشدة الى المسئولية الواجبة عليهم بل كان يحاسبهم حسابا دقيقا لارأفة فيه فى تكميل العمل و القيام بالواجب و يونبئهم اذا تاخروا فى اداء الواجب و تكميل العمل اللازم عليهم ــ لذلك كان الذين عملوا تحته يخافونه و يصمونه احيانا بانه شديد البطش فى المطالبة باداء العمل و التعنف فى الامور الادارية واجبة الاداء ــ و هذه العادة هى فى الحقيقة صفة حميدة و لكن نحن الشرقييون دائما نتوقع التساهل فى الامور و الواجبات لذلك كان الذين عملوا تحت ادارته و قاموا بالبحوث تحت اشرافه احسوا منه الجفاف و القسوة فى بعض

الاحاديين و لكن الدكتور محمد شفيع لم يكن يبال بمدح طلاب التساهل و حمد القاصرين فى اداء الواجب ـ اننا نجد شبها كبيرا بين المستشرق "لين" مولف قاموس العربى و الانجليزى الذى قضى ثلاثين عاما فى القاهرة يدرس ثمانية عشرة ساعة يوميا عدا يوم الجمعة و بين الدكتور محمد شفيع الذى وقف نفسه للدراسة و المطالعة سواء اكان فى الكلية ام فى البيت طول السنة الدراسية حتى اثناء اجازة الصيف انه ما كان يبعد الكتاب عن يده على مائدة الطعام .

دقته فى العمل و التحقيق :

و كان الاستاذ شفيع يكره جدا الموضوعات التافهة و الاعمال الناقصة و لم يكن فى كتاب حياة مجالا للتسامح فى الاخطاء و التساهل من اى نوع كانت بل انه ما كان يتغاضى عن الشولات و الشرطات و النقط و ادنى مثل لذلك هو انه عند ما ذهبت الى مكتبه فى ادارة البحوث الاسلامية عام ١٩٦٣ م للاستشارة فى موضوع دراسات الدكتوراه و قد املى على قبله بيوم فى بيته النقط الاساسية التى كانت لها صلة متينة بصلب الموضوع بل كانت بمثابة الحجر الاساسى لدراسة الدكتوراه فاعطى الاستاذ شفيع تلك السطور التى كتبناها فى اليوم السابق باللغة الانجليزية للكاتب الذى كان يعمل عنده و طلب اليه ان يطبعها بالآلة الكاتبة فاضطر هذا الكاتب المسكين الى ان يطبع تلك السطور ثلاث مرات لانه كان يترك احيانا الشولة فى المكان المطلوب او الشرطة المطلوبة او النقطة الضرورية او غيرها من الاخطاء التافهة التى لا تنظر اليها عامة الرؤساء حتى اغلب العلماء و خاصة فى طلبات عادية كهذه لذلك نستطيع ان نعرف دقته فى التحقيق و عمق نظره فى البحوث و اخلاصه فى العمل سواء اكان هذا العمل خاصا به او بغيره و قدر حبه للامانة فى التحقيق و البحث و مساعدته لطالب العلم .

ولما كان الدكتور شفيع امينا فى بحوثه و كان يرى كثيرا من الباحثين التساهل و التغاضى فى امور التحقيق فالزم على نفسه ان يراجع كل بحث له علاقة به من قريب او بعيد ـ لذلك نجده يراجع جميع الموضوعات التى كتبت بمناسبة ذكرى ـ ل ا ـ ى ـ سى و التى قررت الكلية طبعها وقت ان كان الدكتور شفيع رئيسا لها نجده يراجع جميع الموضوعات

بنفسه حتى الموضوع الذى كتبت باللغة السنسكريتية ومع انه لم يكن يعرف تلك اللغة فانه قد ادخل فيه بعض الاصلاحات مستعينا فى ذلك بمقارنة الاشكال و الحروف مع اصل النسخة .

و بذلک نقدر ان نقول ان الدكتور محمد شفيع كان عالما فذا و محققا موفقا و اديبا كبيرا يجدر للشرق عامة و لباكستان خاصة ان يفتخر بعلمه وادبه و خدماته الجليلة التى قام بها طول حياته .

الانسه اسماء رشید
(ایم ۔ اے ۔ سیاسات)

مقبوضہ فلسطین کا ادب مقاومت

چوبیس برس گزرے ۔ جب دنیائے اسلام اس المیہ سے دوچار ہوئی جس نے فلسطینی عوام کو ان کی سر زمین سے جہاں وہ دو ہزار سال سے رہتے چلے آئے تھے، بیدخل کر دیا تاکہ وہاں ایک غیر ملکی خالصتاً یوروپی استعماری ریاست کا قیام عمل میں لایا جائے جس کی بنیاد نسلی برتری کے اصول پر ہے ، اسرائیلی افواج اور دہشت پسندوں نے فلسطین کی بیشتر عرب آبادی کو انتہائی کس مپرسی کے عالم میں اپنی زمینوں اور گھروں کو چھوڑنے پر مجبور کیا، جبکہ باقی ماندہ عرب آبادی نے آنا فاناً اپنے کو ایک ایک معزز و صاحب جائیداد اکثریت سے ایک محروم مظلوم اقلیت میں تبدیل ہوتے اور اپنے ہی وطن میں غریب الوطن ہوتے پایا ۔

یہ تین لاکھ محکوم عرب جو کل آبادی کا تقریباً ۱۲ فیصد ہیں برسوں سے اسرائیلی فوجی حکومت کی ناروا سختیوں کا شکار رہے ہیں، جس نے انہیں ان کے بنیادی انسانی حقوق سے محروم کر رکھا ہے ، عرصہ تک اسرائیلی پراپیگنڈے اور سنسر شپ نے ان مظلوم عربوں کی حالت زار کو دنیا کی نظروں سے پوشیدہ رکھا، لیکن آہستہ آہستہ وہ لاوا جو اندر ہی اندر پک رہا تھا، اسرائیل کی آہنی دیواروں میں سے رس نکلا، جولائی ۱۹۶۴ء میں فلسطینی 'تنظیم الارض' (جسے اسرائیل میں ممنوع قرار دیا جا چکا تھا) ایک عرضداشت اقوام متحدہ کے سیکرٹری جنرل تک پہنچانے میں کامیاب ہو گئی جس میں عرب اقلیت کے ساتھ اسرائیلی حکومت کے انسانیت سوز سلوک کا حال بیان کیا گیا تھا ، بعد ازاں وقتاً فوقتاً ان عربوں کی آواز سنائی دیتی رہی یہاں تک کہ عرب دنیا جون ۱۹۶۷ء کے عظیم سانحہ سے دوچار ہوئی، قسمت کی ستم ظریفی دیکھیے کہ اس سانحہ نے جہاں اسرائیلی سلطنت کی حدود کو مغربی اردن، غزہ، سیناء اور جولان تک وسیع کر دیا،

وهاں اس نے ان آهنی دیواروں کو بهی منهدم کر دیا جنهوں نے گذشته ۲۰ برس سے اسرئیل میں مقید عربوں کو سرحد پار ان کے عرب بهائیوں سے جدا کر رکها تها، اور جن سے انهیں اب پہلی مرتبه بالمشافهه ملاقات اور تبادلۂ خیال کا موقع ملا اور اس طرح عرب دنیا پر اس زبردست قومی تحریک مقاومت کا انکشاف هوا، جس نے ان طویل برسوں کی اندهیری تنہائی و عزلت میں آنکھ کهولی اور پرورش پائی تهی۔

یہاں عربوں کے خلاف اسرائیلی حکومت کی منظم سیاسی، اقتصادی اور تعلیمی پالیسی کی تفصیل بیان کرنے کی گنجائش نہیں تاهم فلسطینی ادب مقاومت کے محرکات اور پس منظر کو سمجهنے کے لیے اس وحشیانه حکمت عملی کا مختصر تذکره ضروری هے: جس کے تحت عربوں کو سیاسی و اقتصادی طور پر محکوم رکهنے، انهیں تعلیم اور سائنس سے نابلد رکهنے، اور ان کی زبان اور ثقافت کی تخریب اور بیخ کنی کے لیے هر جائز و ناجائز وسیله اختیار کیا گیا، تاکه نه قومی و معنوی وجود، بلکه ان کے جسمانی وجود کا بهی صفایا کیا جا سکے، اسرائیلی حکومت کے ان شرمناک ارادوں کا اندازه همیں ایک سرکاری کمیٹی کی روئداد سے ملتا هے جو عرب اقلیت کے مسئلے پر غور کرنے کے لیے بنائی گئی تهی:

''همارا قومی مفاد اخلاقی اقدار پر فوقیت رکهتا هے، اسرائیل میں عرب اقلیت کی موجودگی اسرائیلی قومی وجود کے لیے سب سے بڑا خطره هے اس خطرے کے مقابلے کے لیے همیں هر ممکن قدم اٹهانا چاهیے۔ بہتر هوگا که هم اپنے ان اقدامات کو خوبصورت و ملائم الفاظ کا لباده اوڑها دیں، تاکه عالمی رائے عامه کے احتجاج سے بچ سکیں۔ لیکن اگر ضرورت پڑی تو هم اس رائے عامه کو نظر انداز بهی کر سکتے هیں۔

''یه همارا فرض هے که هر وقت ان کے پیچهے پڑے رهیں، اور ان کی زمینوں پر قبضه کر لیں، اگر کوئی عرب ثانوی یا یونیورسٹی تعلیم ختم کرنے میں کامیاب بهی هو جائے تو همیں اسے کوئی ملازمت نه دینی چاهیے، تاکه تین، چار یا پانچ سال تک روزگار ڈهونڈنے کے بعد وه بالکل ناامید هو جائے اور اسے یه یقین هو جائے که اس ملک میں اس کے لیے کوئی جگه نہیں۔ یه همارا فرض هے که عربوں کو یه ذهن نشین کروا

دیں کہ انہیں عرب ریڈیو نہیں سننے چاہئیں، یہ ضروری ہے کہ انہیں اپنی عرب ثقافت سے رشتہ توڑنے پر مجبور کیا جائے اور یہودی ثقافت کے زیر اثر لایا جائے۔

"—لیکن اگر وہ مصر کا ریڈیو سننے پر اصرار کریں، اور ان کے لیے اشارہ کافی نہ ہو؟

"—انہیں جلد سمجھ آ جائے گا اور وہ ملک ترک کر دیں گے۔

"—لیکن اگر وہ اپنی قومی ثقافت سے دستبردار ہونے اور ملک بدر ہونے سے انکار کر دیں؟

"—نہیں وہ سمجھ جائیں گے۔

"—تمہیں جری ہونا چاہیے اور واضح طور پر یہ اعلان کرنا چاہیے کہ اس صورت میں ہمارا فرض ہوگا کہ ان کے لیے اویشفتز۱ کا انتظام کیا جائے۔"

'ھذا العالم' العدد ۳۸ (ایار ۱۹۶۷ء) منقول از
غسان کنفانی : الادب الفلسطینی المقاوم
تحت الاحتلال

یہ بحث محض نظریاتی حدود تک محدود نہیں بلکہ اس کا عملی مظاہرہ اس تشدد و بربریت میں ملتا ہے جو مقبوضہ فلسطین کے عربوں کی روز مرہ زندگی کا ایک لازمی جزء بنا ہوا ہے، اور جس نے ان کے ہر شعبہ زندگی کو اثر انداز کیا ہے۔ اسرائیلی فوجی حکومت کی تلوار کے سائے میں اور دہشت و عذاب کی اس گھٹی فضا میں مقاومت کی سیاسی تحریک کے ساتھ ساتھ ادبی تحریک نے جنم لیا، بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ ثقافی تحریک مدافعت نے ہی وہ زمین تیار کی جس سے فلسطینی سیاسی و مسلح کشمکش ابھری۔ ہمیں اس ادب مقاومت کی جڑیں فلسطین کی سرزمین کی گہرائیوں میں پیوستہ ملتی ہیں۔ جبکہ اس کی شاخیں در و بام سے تجاوز کر کے آسمان کو پہنچتی ہیں، جب ایک نو آموز اس ادب پر نظر ڈالتا

۱- یہاں دوسری جنگ عظیم کے دوران نازیوں نے یہودیوں کو ختم کر کے Concentration کیمپ بنایا تھا۔

ہے تو وہ ایک طرف اس کی گہرائی اور دوسری طرف اس کی بعید الآفاق وسعت دیکھ کر انگشت بدندان رہ جاتا ہے ۔ مقبوضہ فلسطین کے شعراء اور ادباء نے نہ صرف عرب دنیا میں ایک اچھوتے اور زندہ و جاوید ادب کی تخلیق کی ہے بلکہ اپنے ابعاد و مواقف کی گہرائی اور وسعت کے لحاظ سے یہ ادب غالباً دنیائے عالم کے انقلابی ادب پر نمایاں فوقیت رکھتا ہے ۔

جس طرح فلسطین کی سیاسی کشمکش کو ایک عرصہ اپنے مقاصد اور راستہ کی تلاش میں لگا اسی طرح فلسطین کے اھل قلم کو اسرائیلی قبضے کے صدمہ سے بحال ہونے، اس کی اصل نوعیت کو سمجھنے، اور اپنا صحیح کردار متعین کرنے میں وقت لگا ۔ اس یاس و ھراس اور تذبذب و شکوک کی فضا سے، جسے اسرائیلی پراپیگنڈے نے اور غیر یقینی بنا رکھا تھا، مقبوضہ فلسطین کے ادب نے جس طرح رھائی حاصل کی اس کی تصویر مقبوضہ فلسطین کے نامور ادیب توفیق زیاد نے اپنے ڈراما ۱ 'بیت الجنون' میں نہایت مؤثر پیرائے میں کھینچی ہے ۔

سامی، توفیق زیاد کے اس ڈراما کا بطل واحد ہے ، وہ اس ڈراؤنے خواب کے متعلق بڑابڑا رہا ہے جس نے اسے عرصہ سے اپنی گرفت میں لے رکھا ہے ، اچانک وہ رک جاتا ہے اور مشتبہ نظروں سے حاضرین کو بغور دیکھتا ہے ، دفعتاً وہ تعجب سے جمہور کی جانب اشارہ کر کے کہتا ہے :

”ھیں یہ کیا؟ تم؟ تم یہاں شیطان کے نام پر کیا کر رہے ہو ؟ آہ! وائے حماقت! کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ میں یہ گھر تمہارے لیے چھوڑ دوں گا؟ کیا تمہاری دیدہ دلیری کی کوئی انتہا بھی ہے؟ میں تو یہ بھول ھی گیا تھا کہ تم یہیں ھو، میں تو اسے بالکل ھی بھول گیا تھا لیکن لازم ہے کہ اب میں اس امر سے مطلق غافل نہ ھوں، تم میرے گھر پر قبضہ کر رہے ھو، تم میری آزادی پر ڈاکہ ڈال رہے ھو، بغیر کسی قانونی جواز کے ، اور قانون تمہیں ایسا کرنے سے باز نہیں رکھتا ۔ نہیں، نہیں ، میں اب ھرگز نہیں بھولونگا میں تم سے عہد کرتا ھوں، یہ تمہاری بدقسمتی ہے لیکن میں اپنا وعدہ پورا کروں گا ۔ ۔ ۔“

۱- ۱۸۲ غسان کنفانی - الادب الفلسطینی المقاوم تحت الاحتلال -

سامی تاریخ و ادب کا استاد ہے جسے اس کے عہدے سے معزول کر دیا گیا ہے وہ ایک اندھیری کوٹھڑی میں ایک بھیانک خواب کا شکار ہے اور اس کی دماغی و نفسیاتی الجھنوں اور باطنی کشمکش نے ہذیانی کیفیت اختیار کر لی ہے ، لیکن جب وہ حاضرین کا سامنا کرتا ہے ، تو گویا جادو سے تمام امور اس کی آنکھوں کے سامنے روشن ہو کر آ جاتے ہیں ، اور جب اسے یقین ہو جاتا ہے کہ وہ ایسے لوگوں میں گھرا ہوا ہے جو اسے بلا سبب پکڑنے آئے ہیں تو وہ اپنے موقف کا اعلان ان الفاظ میں کرتا ہے :

''تم یہاں ؟ کیا تم سن رہے ہو ؟ میں تم سے نہیں ڈرتا ، میں تم سب کا مقابلہ کروں گا ۔ تنہا اور تم سب پر غالب آ جاؤں گا ۔۔۔ میں تنہا ۔۔۔۔۔''

دراصل سامی مقاومت کا ایک کلمہ ہے اور بیت الجنون اس کا ہی قصہ ہے ۔ وہ ایک ایسا شخص ہے جسے معزول زندگی بسر کرنے اور اپنی مدافعت و مقاومت پر مجبور کیا گیا ہے ، وہ ہر طرف سے گھرا ہوا ہے ، اس کے ساتھ دھوکہ کیا گیا ہے ، اور شکوک و شبہات اور یاس و تذبذب نے اسے پاگل کر دیا ہے ، لیکن آخر معرکہ وہ تنہا لڑتا ہے ، بلا خوف وہ عہد کرتا ہے کہ وہ کبھی نہیں بھولے گا ، اور اس کا ہذیان یکایک واضح اور غیر مبہم خوابوں کی شکل اختیار کر لیتا ہے اور اس کے قدم اپنی حقیقی زمین دریافت کر لیتے ہیں :

''تم بھی سچے ہو ، یہ قدرتی امر ہے کہ ایک مجرم اپنے جرم کے آثار سے خائف ہو ، اور وہ اور جرائم کرنے پر مجبور ہو جائے تا کہ ہر اس چیز کو فنا کیا جا سکے جو اس کے پہلے جرم کی یاد دلاتی ہو ۔۔۔۔''

وہ یہ سمجھتا ہے اور آگے چل کر کہتا ہے :

''یہ میرا مسئلہ ہے اور میں تمہیں پریشان نہیں کرنا چاہتا مگر مجھے نہیں معلوم ، شاید یہ تم سے بھی تعلق رکھتا ہو ، نہیں بلکہ مجھے اس کا یقین ہے کہ یہ تم سے بھی تعلق رکھتا ہے ، مگر میں نے تو تمہیں گھر دینے نہیں بلایا تھا ۔۔۔''

یہ انسان تنہا اندر اور باہر کے چیلنج کا مقابلہ کرتا ہے اور معرکہ کی انتہا تک لڑنے کے عزم کا اعلان کرتا ہے، اب وہ ادھورے یا پریشان خوابوں کا قیدی نہیں بلکہ اس پر اپنی کشمکش کے تمام پہلو روشن ہو جاتے ہیں، اور وہ نہایت خوش اسلوبی سے اپنے مسئلہ کی مقامی، عربی، عالمی و اجتماعی حدود کی طرف اشارہ کرتا ہے ۔

خوابوں کی یہ گہرائی، وسعت اور وضاحت ہی مقبوضہ فلسطین کے ادب کا امتیازی نشان ہے ۔ اور یہی وجہ ہے کہ ہمیں یہ ادب معرکہ کے تمام محاذوں پر برسرپیکار نظر آتا ہے ، غسان کنفانی کے الفاظ میں مقبوضہ فلسطین کے ادباء و شعراء نے عرصہ ہوا اپنے اشعار، قصوں اور ڈراموں میں اپنے مسئلہ کے ان بنیادی پہلوؤں کی نشاندھی کی، جس کا انکشاف عرب دنیا کے ادباء نے جون ۱۹٦۷ء کی شکست کے بعد کیا، یا وہ اب کر رہے ہیں ۔

جس طرح 'بیت الجنون' کا ہیرو تنہا مختلف محاذوں پر جنگ کرتا ہے لیکن ان سب کا محور ایک ہے۔ یعنی اسرائیلی حملہ کا بلا واسطہ مقابلہ، اسی طرح فلسطینی ادب مقاومت کے مختلف پہلو یا ابعاد بھی ہمیں اسی مقناطیسی محور کے گرد گردش کرتے دکھائی دیتے ہیں ۔ مقبوضہ فلسطین کی قومی کشمکش اور اس کے اهل قلم کے مابین جو قریبی رشتہ پایا جاتا جاتا ہے اسکی ایک وجہ یہ ہے کہ یہ تمام شعراء اور ادباء قومی تحریک سے کسی نہ کسی شکل میں عملاً وابستہ رہے ہیں، اور اسکی راہ میں انہوں نے بڑی قربانیاں دی ہیں مثلاً محمود درویش، سمیح قاسم فوزی اسمر، توفیق زیاد ، توفیق فیاض، حنا ابو حنا اور کئی متعدد دوسرے شعراء اور ادیب برسوں اسرائیلی قید و بند اور تشدد کا شکار رہے ہیں، لیکن یہ تلخ تجربہ منفی ثابت نہ ہوا ، بلکہ اس نے اور شعراء کے کلام کو ایک نئی جلا بخشی ، محمود درویش اور سمیح قاسم کے اشعار نے نہ صرف زندان میں نمایاں پختگی اور وسعت نظری حاصل کی بلکہ ادائیگی کے لحاظ سے بھی ایک اچھوتے فنی اور فکری انداز کی تخلیق کی۔

ابتدا میں جب فلسطین کا المیہ ابھی تازہ تھا ، اور صدمہ نے تو جوانوں کی قوت فکر اور قوت ارادی کو مفلوج کر دیا تھا، تو انکے غم

و غصے نے ایک جزئی راہ اختیار کی۔ اور اسکا اظہار فرسودہ معاشرتی و خاندانی قیود اور رسومات کے خلاف بغاوت کی صورت میں ہوا ، لیکن بندریج تجربہ اور آزمائش کے ذریعے ان پر اپنی کشمکش کے تمام پہلو منکشف ہوتے چلے گئے اور اجتماعی بے انصافی کے خلاف احتجاج اس قومی کشمکش کا ایک جزء بن گیا، جسکا محور اسرائیلی قبضے کے خلاف جہاد تھا۔ مثلاً شروع میں محمود درویش نے اجتماعی بے انصافی کو مجرد حیثیت سے پیش کیا ہے لیکن بعد ازاں ہم انکے اشعار میں اجتماعی پہلو کو قومی زاویہ نظر سے اجاگر ہوتے دیکھتے ہیں اور یہ اجتماعی اور قومی کشمکش کا ایک جزء لا ینفک بن جاتا ہے۔

محمود درویش کے شروع کے اشعار ہیں :

کیا یہ صحیح ہے کہ موت زندگی میں پھلتی ہے۔	أصحیح یثمر الموت حیاة ؟
کیا میں بھی بار آور ہونگا	هل سأثمر؟
بھوکے کے ہاتھ میں روٹی بن کر یا بچے کے منہ میں شکر	فی ید الجائع خبزاً فی فم الاطفال سکر؟

جلد ان کی یہ ندا وسیع شکل اختیار کر لیتی ہے۔

اپنی گیہوں کی بالوں کو طوفان سے بچاؤ	فاحموا سنابلکم من الاعصار
اور اپنے قدم زمین میں پیوست کر لو	بالقدم المسمر
اپنے سینوں سے ان کے گرد حصار باندھ دو	ھاتوا السیاج من الصدور
اپنے سینوں سے،	من الصدور
اسے کس طرح توڑا جا سکتا ہے ؟	فکیف یکسر؟
سنبل کی بالوں کو گردن سے پکڑ لو	اقبض علی عنق السنابل
جس طرح خنجر پکڑا جاتا ہے	مثلما عانقت خنجر!
زمین ، کسان اور اصرار	الارض و الفلاح والاصرار
مجھے بتا ان پر کون غالب آ سکتا ہے	قل لی کیف تقهر ؟
مجھے بتا : ان تینوں کو کون ہرا سکتا ہے۔	هذا الاقانیم الثلاثة۱ کیف تقهر؟

۱- الفتح : ۱۱ ابار ۱۹۷۰ : العدوان السادس والخمسون ۔

سمیح قاسم اپنے مخصوص انداز میں اسی موضوع پر اپنے طویل قصیدے ''ارم'' میں لکھتے ہیں :

ہمیشہ اسی راستے پر	أبداً علی ھذا الطریق
ہمارے جھنڈے اندھوں کے لیے بصارت ہیں	رایاتنا بصر الضریر،
اور ہماری آواز ڈوبتوں کا سہارا ہے ۔	و صوتنا امل الغریق۔
ہمارے دشمنوں کے لیے سدا دوزخ	أبداً جحیم عدونا،
اور دوستوں کے لیے سدا نعمت	ابداً نعیم للصدیق
اپنے شہیدوں کی ہڈیوں سے ہم اس ویران	لضلوع موتانا نثیر
زمین میں زرخیزی پیدا کریں گے	الخصب فی الارض الیباب

اور اپنے خون سے مٹی میں جان ڈال دیں گے[۱] . . .

بدمائنا نسقی جنیناً فی التراب . . .

اگرچہ ہم نے مقاومت کے ادب کے بعد اجتماعی کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے جیسا کہ غسان کنفانی نے ذکر کیا ہے ، فلسطینی ادب کے مختلف پہلو یا ابعاد، اجتماعی، عربی و عالمی اس طرح باھمی طور پر مربوط ہیں کہ عملاً ان کو ایک دوسرے سے جدا کرنا ناممکن ہے ، تاہم اس ادب کی نظریاتی اساس کی وضاحت کی خاطر ان تینوں کو علیحدہ علیحدہ پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے ۔

یہاں یہ بھی قابل ذکر ہے کہ مقبوضہ فلسطین کے ادیب نے خود اپنا کردار متعین کیا ہے کہ مقاومت کے ان شعراء کے نزدیک شعر ایک ہتھیار ہے جس کی کارکردگی کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ وہ اپنی ذمہ داری کو کس حد تک پیش کرتا ہے، اور دراصل قومی قضیہ سے متعلق ذمہ داری کا یہ قوی احساس ہے جس نے فلسطینی ادب کے قدموں کی رہنمائی کی ہے ۔ فلسطینی شعراء قومی کشمکش کے خونریز معرکہ میں الفاظ کی اہمیت اور دور کو پہنچانتے اور مقدس گردانتے ہیں ۔

حنا ابوحنا رملہ کے قید خانے سے اپنے ساتھیوں کے نام پیغام میں کہتے ہیں :

۱۔ ص ۵۲ : غسان کنفانی : ادب الفلسطینی المقاوم تحت الاحتلال ۔

وہ ناکام ہو گئے۔۔	خسئوا، فما حبسوا نشيدى
انھوں نے میرے نغموں کو مقید نہیں کیا	
بلکہ انہیں اور آگ لگا دی	بل الهبوا نار القصيد
آگ جو جابروں کے لیے دوزخ ہے	نار جحيم للطغاة ـ ـ ـ
میرے اشعار کے لیے یہ شرف ہے	شرف لشعرى ان يقض
کہ اس نے اپنے جانی دشمنوں کی نیند	مضاجع الخصم اللدود
حرام کر دی	
یا عجب کہ شعر نے فولادی قلعوں میں	فاعجب لشعر يستثير الرعب فى
دہشت پھیلا دی۔	مهج الحديد ـ ـ ـ ـ ـ
ایک اور شاعر لکھتا ہے :	
انھوں نے میری کتابیں جلا دیں	شدوا وثاقى وامنعوا عنى الدفاتر
اور میرے منہ کو مٹی سے بھر دیا ۔۔۔	والسجائر وضعوا التراب على فمى
لیکن شعر دل کا خون ہے	فالشعر دم القلب
اور روٹی کا نمک	ملح الخبز
اور آنکھ کا نور	ماء العين
اسے ناخن لکھیں گے	يكتب بالاظافر
اور پتھر	و المحاجر
اور خنجر	و الخناجر
میں اسے کہونگا	سأقولها :
عذاب کے کمرے میں	فى غرفة التوقيف
حمام میں	فى الحمام
اصطبل میں	فى الاصطبل
کوڑے کے نیچے	تحت السوط!
زندان کے اندر	تحت القيد
زنجیروں کی سختی میں :	فى عنف السلاسل :
میرے دل کی شاخوں پر	مليون عصفور
لاکھوں چڑیاں	على اغصان قلبى
مجاہد کے نغمے کی تخلیق کریں گی	تخلق اللحن المقاتل!

۱۔ ص ۵۷ اور ۵۸ : غسان کنفانی ۔

سمیح قاسم اور محمود درویش بھی الفاظ کی ذمہ داری اور اس کے تقدس پر زور دیتے ھیں ۔ محمود درویش ایک نئے انداز میں اپنے خیالات کا اظہار کرتے ھیں :

---کاش کہ یہ اشعار	لو کانت هذی الاشعار
محنت کش کے ھاتھ میں ھتوڑا بن جائیں	ازمیلاً فی قبضة کادح
اور مجاھد کی مٹھی میں بم	قنبلة فی کف مکافح
کاش یہ کلمات	لو کانت هذی الکلمات
کاشتکار کے ھاتھ میں درانتی بن جائیں	محراثاً بین یدی فلاح
یا قمیص، یا دروازہ یا کلید!	و قمیصاً، أو باباً، أو مفتاح!!

جس طرح اجتماعی بعد مقاومت کی تحریک کا ایک جزء لاینفک ھے اسی طرح فلسطینی شاعر دنیائے عرب سے اپنی اٹوٹ اور گہرے روابط کا پورا احساس رکھتے ھیں، اور دنیائے عرب میں کوئی سیاسی یا اجتماعی انقلابی تحریک نہیں ابھری جس کی گونج ھمیں ان کے اشعار میں نہ سنائی دیتی ہو، جس امید و بیم اور غم و حسرت، لیکن عزم و اعتماد سے انہوں نے عرب دنیا کے مد و جزر کا مقابلہ کیا ھے، وہ نہایت ھی دلپذیر اور دلگداز ھے ۔ انقلاب مصر اور مصر کے خلاف ۱۹۵۶ء کی جارحیت فلسطینی شاعری کے ارتقاء میں سنگ میل کی حیثیت رکھتے ھیں، اسی طرح الجزائر کے انقلاب نے اسے گہرا تاثر بخشا، اسی طرح انقلاب یمن، اسوان بند کی تعمیر، غرض عرب دنیا کی ھر انقلابی تحریک ھمیں مقبوضہ فلسطین کے ادب میں منعکس نظر آتی ھے، یہاں بھی ھم دیکھتے ھیں کہ عرب سیاسی و اجتماعی کشمکش کو ایک متحد اکائی کی صورت میں پیش کیا گیا ھے۔

مثلاً اپنے قصیدہ 'بطاقه الی الاسطی سید' میں اسوان بند کا خیر مقدم کرتے ہوئے محمود درویش نے جو اشعار کہے ھیں، انہیں پڑھ کر قاری یہ سوچتا رہ جاتا ھے کہ سد عالی کس کے لیے بنائی گئی ھے؟ آیا ان غلاموں کی خدمت میں نذرانہ ھے جو اھرام کے معماروں کی بھینٹ چڑھے، یا پھر اسے پیاسی زمین کو سیراب کرنے کے لیے تعمیر کیا گیا ھے، یا یہ مقبوضہ فلسطین کی اسیر امت کے لیے پیغام امید ھے---

جیسا کہ ذکر کیا گیا ہے الجزائر کا انقلاب فلسطینی شعراء کی خاص توجہ کا مرکز رہا ہے اور کئی شعراء مثلاً راشد حسین، محمود دسوقی، فوزی اسمر، جمال قمواز اور حنا ابو حنا نے اس انقلاب کے اجتماعی، سیاسی اور عربی پہلو کو مؤثر پیرائے میں اجاگر کیا ہے۔ حنا ابو حنا اپنے طویل قصیدے ''الجزائری مجاھد کا خط بیٹے کے نام'' کو اس طرح شروع کرتے ہیں :

میرے بیٹے! تیری خاطر میں نے ھتھیار اٹھائے ہیں۔
اور میرا انقلاب اور میری جد و جہد تیری خوشحالی ہی کے لیے ہے۔
(و لدی! لاجلک قد حملت سلاحی۔ ولاجل رغدک ثورتی و کفاحی)۔

حبیب تھوجی جنھوں نے سب سے پہلے انقلاب مصر کو لبیک کہا تھا، الجزائر پر اپنے قصیدے کے دوران عراق کے عوام کو مخاطب کر کے کہتے ہیں : (فیا شعب العراق، الام نوم ---) یعنی اے شعب عراق یہ نیند کب تک، کیا تو نے الجزائر کی طرف نہیں دیکھا، کہ کس طرح انھوں نے ظلم و جارحیت کے لشکر کو روند ڈالا ہے ---

یہ اشعار انقلاب عراق سے کچھ ہی پہلے لکھے گئے اور اس وقت شاعر خود اپنی سر زمین پر 'الارض' کی تنظیم میں مقاومت کا عملی کردار ادا کر رہا تھا۔

محمود درویش جون ۱۹٦۷ء کی شکست پر عربوں کا متحد موقف اس طرح پیش کرتے ہیں :

ہم جلد اپنے کیمپوں سے باہر نکلیں گے	سنخرج من معسکرنا
اور اپنی جلا وطنی سے	و منفانا
ہم اپنی کمینگاہوں سے نکلیں گے	سنخرج و من مخابینا
اور ہمارے دشمن ہم پر آوازے کستے ہیں :	و یشتمنا اعادینا :
یہ عرب ہیں، اجڈ اور وحشی،	''ھلا! ھمج ھم، عرب!''
ہاں سن لو ہم عرب ہیں	نعم! عرب
اور ہم عار نہیں سمجھتے،	و لا نخجل

ہم جانتے ہیں کہ درانتی کا دستہ کس طرح پکڑا جاتا ہے	ونعرف کیف یمسک قبضة المنجل
اور کس طرح ظلم کا مقابلہ کیا جاتا ہے	و کیف یقاوم الاعزل
ہم جدید کارخانے بنانا جانتے ہیں اور گھر،	ونعرف کیف نبنی المصنع العصری و المنزل،
اور شفا خانے، مدرسہ اور بم اور راکٹ.	و مستشفی، و مدرسة و قنبلة، و صار و خاً ـ ـ ـ
اور موسیقی	و موسیقی
اور ہم خوبصورت اشعار لکھتے ہیں	و نکتب اجمل الاشعار۱

مقبوضہ فلسطین کے شعراء کا بعد نظر مقامی، عربی سطح سے تجاوز کر کے اپنی مقاومت کے عالمی بعد کو جا لیتا ہے، اور جب ہم ان کے قصائد میں عالمی کشمکش آزادی کے ہر موڑ اور ہر منزل کا پتا پاتے ہیں، تو ان کے ادراک کی وسعت و گہرائی پر انگشت بدنداں رہ جاتے ہیں، انقلاب کیوبا اور کانگو کی جنگ آزادی سے لے کر امریکی حبشیوں کی کشمکش اور ویت نام کی آزادی کی جد و جہد تک ہم ہر انقلابی تحریک کو ان کے اشعار میں ڈھلا پاتے ہیں، لیکن اختصار کی خاطر ہم اس ضمن میں محمود درویش کا قصیدہ 'اناشید کوبا' پیش کرنے پر اکتفا کریں گے:

میں نے کبھی گنوں	أنا لم ألمس قصب السكر
اور اس سبز زمین کو نہیں چھوا،	و الارض الخضراء
میں کبھی کاریبی کے سمندر میں مچھیرے کی کشتی میں نہیں بیٹھا	لم ارکب قارب صیاد فی البحر الکاریبی
میں نے اس پانی کے قطرہ کو بھی نہیں چھوا	لم اضرب قطرة ماء
میں اجنبی سیاحوں کے ہوٹل میں کبھی نہیں اترا۔	لم انزل فندق سیاح غرباء

۱- 'نشیدالرجال' ص ۱۱۲ غسان کنفانی۔

میں نے ھاوانا میں غریبوں کے پسینے کے جام نہیں چڑھائے،	لم اسکر فی ھافانا من عرق الفقراء
میں نے اپنا قلم قلاش بدنصیبوں کے زخم میں نہیں ڈبویا،	لم أغمس قلمی فی جرح البؤساء المحرومین
میں نے کوبا کے شعرا کا کلام نہیں پڑھا	لم أقرأ أدب الشعراء الکوبیین
لیکن مجھے کیوبا کے متعلق باتیں معلوم ہیں	لکن عندی عن کوبا أشیاء و اشیاء
کیونکہ انقلاب کا کلام ایک نور ہے	فکلام الثورة نور
جو تمام انسانی زبانوں میں پڑھا جا سکتا ہے	یقرأ فی کل لغات الناس
اور انقلاب کی آنکھیں وہ سورج ہیں	و عیون الثورة شمس تمطر فی کل
جس کی روشنی ہر غار میں پہنچتی ہے	الاعراس
اور انقلاب کے نغمے کی لے سے تمام گھنٹیاں واقف ہیں	ونشید الثورة لحن تعرفه کل الاجراس
اور کیوبا میں جو جھنڈا بلند ہوا وہی	و الرایة فی کوبا یرفعها نفس
اور اس کے پہاڑوں پر لہرایا	الثائر فی الأوراس
اور انقلاب کی جڑیں چاہے اس کی شاخیں کہیں تک پھیلیں	و جذور الثورة مهما مدت أغصاناً
ایک ہی مٹی سے پھوٹتی ہیں	تنبت من نفس المتراس
اور نیلا، سرخ اور سبز شعلہ ایک ہی	و اللهب الازرق والاحمر والاخضر
غضب سے بلند ہوا ہے تاکہ گرمی پہنچائے،	یبدأ من غضب واحد فتدفأ ـ ـ ـ
پس تو بھی ایک شعلہ روشن کر	واضع لهباً آخر
میری قوم جو سردی سے ٹھٹھر رہی ہے	یا شعباً یشعر بالبرد[1]

فلسطینی مقاومت کے ادباء عالمی انقلاب کا نظارہ محض تماشائی کی حیثیت سے نہیں کرتے، بلکہ وہ اسے اپنی مقاومت کا لازمی جزء اور پس منظر

۱- ص ۹۳ غسان کنفانی۔

متصور کرتے ہیں اور اس سے ایک نیا عزم اور نئی امید حاصل کرتے ہیں، وہ دوسروں کی کشمکش اور فتوحات پر خوش ہوتے اور فخر کرتے ہیں، لیکن یہ انہیں رشک یا احساس پیدا نہیں کرتا بلکہ اس سے ان کا اپنے وطن اور عوام میں ایمان اور زیادہ ہو جاتا ہے :

مجھ سے نہ کہہ :	لا تقل لی :
کاش کہ میں الجزائر میں روٹی بیچتا	لیتنی بائع خبز فی الجزائر
تاکہ مجاہدوں کے ساتھ نغمہ ریز ہوتا،	لا غنی مع ثائر
مجھ سے نہ کہہ :	لا تقل لی :
کاش میں یمن میں بھیڑوں کا چرواہا ہوتا	لیتنی راعی مواش فی الیمن
تاکہ زمانہ کے انقلاب کے گانے گاتا	لاغنی لانتفاضات الزمن
مجھ سے نہ کہہ :	لا تقل لی :
کاش میں ہوانا کے قہوہ خانے میں مزدوری کرتا	لیتنی عامل مقهی فی هفانا
تاکہ ان کی فتح کے ترانے گاتا	لاغنی لانتصارات الحزانی
مجھ سے نہ کہہ :	لا تقل لی :
کاش میں اسوان میں بوجھ ڈھونے والا ہوتا،	لیتنی أعمل فی أسوان حمالا صغیر
تاکہ چٹانوں کے گیت گاتا	لاغنی للصخور
اے میرے دوست!	یا صدیقی!
ہماری زمین بھی بانجھ نہیں ہے	أرضنا لیست بعاقر
ہر ایک زمین کے میلاد کی ایک گھڑی ہے	کل أرض، ولها میلادها
ہر صبح ایک انقلاب کا وعدہ ہے	کل فجر، وله موعد ثائر[۱] !

مندرجہ بالا جائزے سے معلوم ہوتا ہے کہ فلسطینی ادب مقاومت ایک طرف اجتماعی احساس رکھتا ہے اور غسان کنفانی کے الفاظ میں محنت کش طبقے سے اپنی وفاداری کا اعلان کرتا ہے جس کے کندھوں پر

۱- ص ٦٦ : غسان کنفانی -

مسلح کشمکش کی ذمہ داری عائد ہوتی ہے ۔ (یہ قابل ذکر ہے کہ مقبوضہ فلسطین کے ۳ لاکھ عربوں کی اکثریت فلاحین کی ہے، اور فلسطینی شعراء خود ان سے ہی تعلق رکھتے ہیں، یہ فلاحین ہی ہیں جنہوں نے شروع سے کشمکش وطنی کی ذمہ داروں کا بوجھ اٹھایا اور اس کے سنگین نتائج کو برداشت کیا) ۔ اس کے ساتھ ہی ہم نے مقاومت کے عربی بعد کا جائزہ لیا، اور آخر میں اس رشتہ پر روشنی ڈالی، جو ادب مقاومت کو عالمی تحریک آزادی سے وابستہ کرتا ہے ۔

اور یہ تمام روابط و ابعاد اس مقدس ذمہ داری کے ضمن میں آتے ہیں جو فلسطینی شعراء نے اپنے لیے خود منتخب کی ہے اور یہ تمام ابعاد و مواقف غاصب دشمن سے براہ راست مقابلہ کے واحد محور کے گرد گردش کرتے ہیں، جو مدت سے فلسطینی عوام کی روز مرہ کی زندگی کا ایک جزء لازم بن گیا ہے۔

اس روزمرہ کی خونی کشمکش میں ذاتی یا اجتماعی سطح پر فلسطینی عوام کو جو عذاب سہنے پڑے ہیں انہیں فلسطینی شعراء نے خون اور آنسوؤں سے رقم کیا ہے ، لیکن ہم ان کے اشعار میں ان خون اور آنسوؤں کو ایک نئے ثبات و عزم اور امید میں تحویل ہوتا دیکھتے ہیں ۔

مثلاً محمود درویش نے قید خانے سے یہ پیغام حنا ابو حنا کو بھیجا :

صلیب درد پر چڑھے شاعر کا زخم	المغنّی علی صلیب الالم
تارے کی طرح روشن ہے ،	جرحه ساطع کنجم
اس نے اپنے گرد جمع لوگوں سے کہا	قال للناس حوله :
ہر ایک چیز سوائے ندامت کے۔۔۔	کل شیء، سوی الندم ۔۔۔
اور اس طرح اس نے کھڑے ہوئے جان دے دی	هکذا مت واقفاً
وہ کھڑے ہوئے مر گیا، درخت کی طرح	واقفاً مت کالشجر!

اور سمیح قاسم کا یہ قصیدہ، ”قید خانے سے خط“ :

ماں، مجھے بہت دکھ ہوا ماں	اماہ! کم یؤلمنی
کہ تم رو دیں	انک تجهشین بالبکاء

جب میرے دوست تم سے میرا پتا پوچھنے آئے۔ — اذا أتى يسألكم عنى أصدقاء
لیکن ماں، مجھے یقین ہے۔ — لكننى أومن يا أماه
میرا ایمان ہے ماں — أومن
کہ زندگی کی رونق — أن روعة الحياة
میرے زندان میں جنم لگی — تولد فى معتقلى
میرا ایمان ہے کہ میرا آخری ملاقاتی، — أومن ان زائرى الاخير لن يكون
رات کی اندھی چمگادڑ نہ ہوگی، — خفاش كيل
بلکہ مجھ سے ملنے دن کا اجالا آئے گا ماں، — مد لجآ، بلا عيون
ضرور دن کا اجالا میری ملاقات کو آئے گا — لا بد ان يزورنى النهار۔۔۔[۱]

یہی درد و الم لیکن ثبات و امید ہمیں ان قصائد میں نظر آتا ہے جو اس ظلم و ستم کا نقشہ کھینچتے ہیں، جو قومی سطح پر فلسطین کی اسیر امت پر توڑے گئے، دیر یاسین اور کفر قاسم کا قتل عام، اسرائیلی فوجی حکومت کا تشدد، فلسطینی عوام کو زمینوں پر غاصبانہ قبضہ، فلاحین اور مزدوروں کی حالت زار اور عرب دیہاتوں اور شہروں کی مسماری، ان تمام پر ہمیں لاتعداد قصائد ملتے ہیں۔

مقاومت کی شاعری کے اس مختصر جائزے سے معلوم ہوگا کہ یہ ادب طبعاً رجائیت پسند ہے، یہ رجائیت کسی جواری کا واہمہ یا خوش فہمی نہیں، اور نہ ہی یہ حقیقت سے گریز کہلایا جا سکتا ہے، بلکہ اس کا منبع قومی جدو جہد کے ابعاد و مواقف کا عمیق ادراک اور ادب اور عوام کا وہ باہمی رشتہ ہے جس کا ذکر آ چکا ہے، ان کی بدولت ہی فلسطینی مقاومت کا ادب مضمون، معنی اور شکل کے اعتبار سے جدید عرب ثقافی تحریک میں ایک منفرد اور رہنما حیثیت رکھتا ہے، اس میں ہمیں سطحی جذبات یا ہسٹیریا اور ماتم و نوحہ خوانی یا ذمہ داری سے فرار دکھائی نہیں دیتا، نہ ہی یہ ادب ہمیں طنز و مزاح یا سستے نعروں کی آڑ لیتا نظر آئے گا،

۱- دیکھو ص ۸۰ غسانی کنفانی: الادب الفلسطينى المقاوم تحت الاحتلال اور ص ۲۱: *They Claim There is No Resistance* -

فلسطینی مقاومت کا ادب کوئی ذھنی عیاشی نہیں بلکہ یہ ایک ذمہ دار اور بامقصد ادب ہے جسے اپنے مقدس فریضے کا سختی سے احساس ہے ۔

یہی سبب ہے کہ جون ۱۹۶۷ء کے زبردست سانحہ کا جس طرح فلسطینی شعراء و ادباء نے مقابلہ کیا، اس کی نظیر نہیں اور عرب ادب میں نظر نہیں آئے گی ۔ مثلاً توفیق زیاد کا یہ طویل قصیدہ غم و اندوہ سے لبریز ہے ، لیکن یہ غم ایک مثبت و زندہ غم ہے ، یہ جانگداز ھی نہیں بلکہ ایمان افروز بھی ہے :

اے میرے وطن! ہم کل دو چلو پانی میں نہ تیرے تھے	یا بلادی! امس لم نطف علی حفنة ماء
اور آج ہم چلو بھر پانی میں نہ ڈوبیں گے	و لذا لن نغرق الساعة فی حفنة ماء
مجھ سے نہ کہو ہم نے فتح حاصل کی	لا تقولوا لی : انتصرنا
یہ فتح شکست سے بدتر ہے	ان ھذا النصر شر من ھزیمة
ہم سطح پر نظر نہیں رکھتے بلکہ جرم کی گہرائیوں کو دیکھتے ہیں	نحن لا ننظر للسطح و لکنا الجریمة نری عمق الجریمة ۔۔۔
تم بیس برس سے	انکم تحیون من عشرین عاماً
پر رونق بہار کے خوابوں میں رہ رہے ہو	حلم صیف ذا رواء
اور آنسوؤں اور خون کے سمندر میں	و تصیدون لامر الغیر
شکار کھیل رہے ہو	فی بحر دموع و دماء
تم آج کے لیے تعمیر کرتے ہو اور ہم	انکم تبنون للیوم و انا
کل کے لیے بنیادیں رکھ رہے ہیں	لغد نعلی البناء
ہم سمندر سے زیادہ گہرے اور آسمانوں کے چراغوں سے اونچے ۔۔۔	انا أعمق من بحر ، و اعلی من مصابیح السماء ۔۔۔
کس ماں نے تمہیں ورثہ میں نصف نہر کا مالک بنایا ہے	ای ام اورثتکم ، یا تری نصف القتال
کس ماں نے تمہیں اردن کا کنار	ای ام اورثتکم ضفة الاردن
اور سیناء اور یہ پہاڑ دیے ہیں ؟	سیناء ، و ھاتیک الجبال؟
جو آج جبر سے دوسرے کا حق چھینتا ہے	ان من یسلب حقاً بالقتال

وہ اپنے حق کی اس دن کیسے حفاظت کرے گا	کیف یحمی حقه، یوماً
جب میزان دوسری طرف جھکیگا ــــ	اذا المیزان مال؟ ــــ
کل تمھیں کون بچائیے گا؟	ما الذی خبأتموہ لغد؟
اے وہ جنھوں نے میرا خون بہایا ہے	یا من سفکتم لی دمی
اور میری آنکھوں کی روشنی چھینی ہے	وأخذتم صنوٴ عینی
اور میرا قلم توڑ دیا ہے،	و صلبتم قلمی
اورایک پرامن عوام کا حق غصب کیا ہے	واغصبتم حق شعب امن
جس کا کوئی جرم نہ تھا ــــ	لم یجرم ــــــ
کل کون تمھیں بچائیے گا	ماالذی خباتموہ لغد
اے وہ جنھوں نے میرے جھنڈے کی توہین کی ہے ،	یا من أھنتم علمی
اور میرے زخموں میں ایک اور زخم کھول دیا ہے	و فتحتم فی جراحاتی جراحا
	و طعنتم حلمی
	ما الذی خبأتموہ لغد
	ان غداً لم یھزم! ــــ
اس کے بعد کیا ہوگا؟ میں نہیں جانتا،	ثم ــــ ما ذا بعد؟ لا ادری، و لکن
لیکن مجھے اتنا معلوم ہے کہ زمین اور برس حاصل امید میں	کل ما ادریه أن الارض حبلی والسنین
کہ حق کبھی فنا نہیں ہوتا، اور	کل ما ادریه أن الحق لا یفنی
اور غاصب اس پر غالب نہیں آئیں گے	ولا یقوی علیه غاصبون
اور میری اس زمین میں ہرگز فاتح پھول پھل نہ سکیں گے ۔	و علی ارضی ھذی لم یعمر فاتحون!

اور یہی عزم و ثبات اور امید ہمیں محمود درویش کے ان خوبصورت اشعار میں فروزاں نظر آتا ہے ، جو اسی موقعہ پر کہے گئے ۔

۱- ص ۱۳۵ : غسان کنفانی ۔

اے میرے وطن ۔	وطني !
میری زنجیروں نے مجھے	يعلمني حديد سلاسلي
عقاب کی سختی	عنف النسور
اور رجائی کی نرمی سکھائی،	و رقة المتفائل ـ ـ ـ ـ
میں نہیں جانتا تھا کہ ہماری کھالوں کے نیچے	ما كنت اعرف أن تحت جلودنا
طوفان جنم لیں گے	ميلاد عاصفة
اور دریاؤں کا وصل ہوگا	وعرس جداول!
انھوں نے مجھے ایک کوٹھڑی میں بند کر دیا	سدوا علي النور في زنزانة
لیکن میرے دل نے اس میں مشعلیں	فتوهجت في القلب
فروزاں کر دیں	شمس مشاعل
انھوں نے دیواروں پر میرا نمبر لکھا	كتبوا على الجدران رقم بطاقتي
لیکن دیواریں مرغزار ہو گئیں۔	فنما على الجدران
انھوں نے میرے جلاد کی تصویر بنائی	مرج سنابل
روشن زلفوں نے اس کی ڈراونی صورت کو چھپا دیا	و حفرت بالاسنان رسمک داميا
میں نے شکست کو اٹھا کر اندھیروں	و كتبت اغنيه الظلام الراحل
میں پٹک دیا ۔	اغمدت في لحم الظلام هزيمتي
اور اپنی انگلیاں روشنی میں ڈبو دیں	و غرزت في شعر الضياء اناملي
اور فاتحین نے کچھ بھی فتح نہ کیا	و الفاتحون على سطوح منازلي
انھوں نے تو صرف زلزلوں کو جگا دیا	لم يفتحوا الا وعود زلازلي
انھوں نے کچھ بھی تو نہیں دیکھا سوائے میری جبین کی روشنی کے،	لن يبصروا الا توهج جبهتي
انھوں نے کچھ نہیں سنا سوائے میری زنجیروں کے شور کے،	لن يسمعوا الا صرير سلاسلي
اور اگر میں نے اپنی عبادت کے لیے جان دے دی،	فاذا احترقت على صليب عبادتي

میں ایک قدیس بن جاؤں گا — أصبحت قديساً
مجاھد کے لباس میں — بزی مقاتل! !

۱۹۶۷ء کی شکست کے سائے میں جو فلسطین کی جو قومی مسلح کشمکش ابھری۔ وہ مقبوضہ فلسطین کے شعراء کے خوابوں کی تفسیر، ان کی طویل جد و جہد کا ثمر اور ان کے عزم و ایمان کا مظہر تھی، اور یہ کوئی اتفاقی امر نہیں کہ یہ ان کے خون جگر میں لکھے اشعار کی شمعہائے فروزاں تھیں، جنھوں نے اس مسلح انقلاب کی پذیرائی اور رھنمائی کی۔

ملتان — اسماء رشید

۵ دسمبر ۱۹۷۲ء

مآخذ اور References

کتابیں :

۱۔ غسان کنفانی: الادب الفلسطینی المقاوم (تحت الاحتلال ۱۹۴۸ - ۱۹۶۸ء)
مؤسسة الدراسات الفلسطينية - بیروت ۱۹۶۸ء (عربی)

۲۔ صبری جوریس: العرب فی اسرائيل -
مؤسسة الدراسات الفلسطينية - بیروت ۱۹۶۱ء (عربی)

۳۔ The Arabs in Israel : Landau Oxford University Press, 1969 (انگریزی)
(اسرائیل میں عرب، از لانڈو آکسفورڈ یونیورسٹی پریس) لندن ۱۹۶۹

۴۔ حبیب قهوجی: العرب فی ظل الاحتلال الاسرائیلی منذ ۱۹۴۸ء
مرکز الابحاث - منظمة التحریر الفلسطینیه - بیروت (عربی)

۵۔ مرکز الابحاث منظمة التحریر الفلسطینیه: *They Claim There is No Resistance*. (انگریزی)
(ان کا دعوی ہے کہ مقاومت کی کوئی تحریک نہیں)

رسائل (مجلات) :

۱۔ الفتح: نشرة خاصه تصدر عن الاعلام المرکزیة لحرکة التحریر الوطنی الفلسطینی (الفتح) بیروت (انگریزی اور عربی)

۲۔ الثورة الفلسطینیه: تصدر عن حرکة التحریر الوطنی الفلسطینی (الفتح) بیروت (عربی)

۳۔ شؤون فلسطینیه: مرکز الابحاث، منظمة التحریر الفلسطینیه بیروت - (عربی)

۱۔ ص ۹ : *They Claim There is No Resistance*.

مولانا محمد عبدالقدوس

قصیدۂ بردہ کی دو عربی شرحیں

از

مولانا جمال چنابی و مولانا جلال چنابی

آج کے عربی مدارس کی طرح مغل شہنشاہوں کے دور میں بھی برعظیم پاک و ہند کے مدارس میں دینی و عقلی علوم کا ذریعۂ تعلیم عربی زبان تھی ۔ نصاب کی کتابیں عربی زبان میں ہوتی تھیں۔ ان پر شروح و حواشی بھی عربی زبان میں لکھے جاتے تھے ۔ افہام و تفہیم غالباً مقامی زبانوں میں ہی ہوا کرتی ہوگی ۔ اس وقت برعظیم کے شمالی حصوں پر ایران و توران کا اثر غالب تھا ۔ اور یہاں کے علوم و معارف میں ایرانی و تورانی علماء کی ثقافت کے نقوش نمایاں تھے۔ علماء و فضلاء بھی عموماً انہی علاقوں سے ھجرت کر کے یہاں اقامت پذیر ہوتے جاتے تھے اور مدارس دینیہ عربیہ کے اساتذہ و تلامذہ میں ولایتی۱ اصحاب کی کثرت ہوا کرتی تھی ۔ اس لئے اس وقت کے نصاب تعلیم میں چند امور نمایاں تھے ۔

۱۔ شروح و حواشی کی تدریس کا رواج : یعنی کسی مشہور کتاب یا اس کی شرح کی تدریس اور اس پر حاشیہ کی شکل میں خود مدرس کی تحقیقات کا اضافہ ۔

۲۔ صرف و نحو اور علوم بلاغت میں منطقی طرز استدلال کا غلبہ، جس سے ذہن کو نکتہ سنجی کی مشق میں خوب مدد ملتی تھی ۔ مگر اس مشغولیت کی وجہ سے کثرت مطالعہ کے لئے وہ فراغت نصیب نہ ہوتی جس کی بدولت اہل زبان کے محاورہ سے شناسائی حاصل ہو سکے ۔

۱۔ اس وقت کی اصطلاح کے مطابق ایران و توران کا علاقہ ولایت کہلاتا تھا اور وہاں سے متعلق اصحاب ولایتی کہلاتے تھے ۔

۳۔ ادبی کتابوں کا فقدان : جہاں تک راقم الحروف کو معلوم ہوسکا ہے۔ اس دور کے شمالی ہند کے نصاب تعلیم میں فحول شعرائے عرب کا کوئی دیوان داخل نصاب نہ تھا ۔ سوائے بوصیری کے قصیدۂ بردہ کے جسے عقیدت کے طور پر زیر مطالعہ بھی رکھا جاتا تھا ، یاد بھی کیا جاتا تھا اور اس کا درس بھی لیا جاتا تھا (بعض قرائن سے یہ بات اخذ کی جا سکتی ہے کہ مقامات حریری اور قصیدۂ بانت سعاد بھی بعض بعض مقامات پر زیر درس رہے ہوں گے) ۔

قصیدۂ بردہ کی تعلیم و تعلم کے ذریعہ اہل علم اپنے ادبی حاسہ کی تشنگی کا علاج بھی کر لیتے تھے اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مسلمانوں کو عموماً اور اس وقت کے اہل علم کو خصوصاً جو والہانہ محبت تھی اسے تسکین دینے کا بھی موقع میسر ہو جاتا تھا ۔

قصیدۂ بردہ کے داخل نصاب ہونے کی وجہ سے عالم اسلام کے دوسرے خطوں کی طرح یہاں بھی اسے خوب قبولیت حاصل ہوئی ۔ فارسی، اردو، پنجابی۲، سندھی، پشتو وغیرہ مقامی زبانوں میں اس کے منظوم ترجمے ہوئے اور علماء نے بکثرت اس کی شروح و حواشی لکھے۔

زیر تحریر مقالہ میں قصیدۂ بردہ کی دو شرحوں کے ساتھ ان کے لاہوری مصنفین کا تعارف مقصود ہے (یہ ذکر دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ اگرچہ قصیدۂ بردہ کی عربی شروح برصغیر میں کافی لکھی گئی ہوں گی ، مگر ڈاکٹر زبید احمد صاحب کی کتاب میں کسی ایک کا بھی ذکر نہیں) ۔

غالباً دور اکبری کے اوائل یا اواسط میں دو طالب علم برادر غزنی سے آ کر پنجاب میں مقیم ہوئے ۔ برادر کبیر مولانا جمال بن نصیر تھے اور برادر صغیر مولانا جلال بن نصیر ۔ دونوں حضرات تحصیل علم کے بعد پنجاب ھی میں مقیم ہوئے اور دریائے چناب کے آس پاس بسنے کی بنا پر چنابی کہلانے لگے ۔ دونوں حضرات صاحب علم، صاحب نسبت اور اہل

۲۔ اسلامیہ کالج پشاور کے کتب خانہ میں قصیدہ بردہ کا ایک منظوم ترجمہ پنجابی میں ہے ۔ مؤلف جنڈیالے کا ہے اور اپنے ترجمہ کو ھندی ترجمہ کہتا ہے ۔

قلم تھے ۔ وقت تحریر تک حاصل شدہ معلومات کی رو سے مولانا جمال چنابی کی تصنیفات چار ھیں :

۱۔ حاشیہ شرح جامی برکافیہ ۔ یہ حاشیہ ۱۰۱۹ھ میں لکھا گیا ہے ۔ مطبوعہ بھی ہے اور اس کے قلمی نسخے بھی جا بجا کتب خانوں کی زینت ھیں ۔ کتب خانہ، اسلامیہ کالج پشاور میں اس کے دو مخطوطے ھیں ۱۳۰۸ھ و ۱۳۴۵ھ ۔ (ڈاکٹر زبید احمد صاحب نے اسے مولانا جمال خان دھلوی کی طرف منسوب کیا ہے ۔ مگر چونکہ مولانا جمال خان دھلوی کا سن وفات ۹۸۴ھ ہے اور اس حاشیہ کا سن تصنیف ۱۰۱۹ھ، اس لیے یقیناً یہ حاشیہ مولانا جمال دھلوی کا نہیں بلکہ مولانا جمال (الغزنوی مولداً اللاھوری تعلما و الجنابی سکناً) کا ہے۔

۲۔ شرح قصیدۂ بانت سعاد۳ ۔

۳۔ شرح قصیدۂ بردہ فارسی موسوم بہ قامع البدعۃ۴ ۔

۴۔ شرح قصیدۂ بردہ عربی ۔ جس کے دو مخطوطے اسلامیہ کالج پشاور کے کتب خانہ میں ھیں ۔ مخطوطہ ۱۱۲۱ھ و ۱۱۴۵ھ (مخطوطہ ۱۱۴۵ھ میں یہ خوبی ہے کہ اس پر مصنف کی شرح فارسی کے اقتباسات بھی حاشیہ پر دیے گئے ھیں) ۔

مولانا جلال بن نصیر کی تین تصانیف دریافت ہو سکی ھیں :

۱۔ بدیع المیزان از مولانا عبد اللہ تلنبی کا حاشیہ جو مطبوعہ ہے۔

۲۔ تفسیر بیضاوی کے آخری پارے پر (جو غالباً ان کے ھاں زیر درس رھا ہوگا) حاشیہ جس کا مخطوطہ انڈیا آفس لائبریری میں ہے (فہرست عربی مخطوطہ نمبر ۱۱۱۹) ۔

۳۔ شرح قصیدۂ بردہ عربی موسوم بہ کشف الحقائق جس کا قلمی نسخہ اسلامیہ کالج پشاور کی لائبریری میں ہے۔

۳، ۴۔ ھر دو کے قلمی نسخے کتب خانۂ واں مہاں ضلع سرگودھا میں ھیں بہ حوالۂ مضمون ڈاکٹر محمد شفیع مرحوم درضمیمۂ اورینٹل کالج میگزین اگست و نومبر ۱۹۵۲ء ۔

اس کتاب میں مولانا جلال نے اپنے برادر کبیر مولانا جمال کا ذکر نہایت احترام سے کیا ہے اور ان کی عربی شرح کے حوالے جا بجا دیئے ہیں۔ جیسا کہ عرض کرچکا، ہر دو حضرات اپنی نسبت چنابی بیان کرتے ہیں۔ تاہم کشف الحقائق کے اس قلمی نسخہ کے آخر میں کاتب نے یہ تحریر ثبت کی ہے ۔

”قد وقع الفراغ من تسوید ھذا الکتاب بعون الملک الوھاب المسمی بکشف الحقائق من تصنیف العالم شارح الدقائق مولانا جلال بن نصیر ساکن کیلا والہ فی شرح قصیدۃ البردۃ فی مدح النبی صلی اللہ علیہ وسلم، بید الفقیر الضعیف اعظم بن زاھد بن اسماعیل فی یوم الاربعا بعد الظھر من شھر الصفر (کذا) ۱۱۸۷ھ“

اس تحریر نے وضاحت کر دی کہ مولانا جمال و مولانا جلال حضرت کیلیانوالہ کے رہنے والے تھے جو ضلع گوجرانوالہ تحصیل حافظ آباد کا ایک قصبہ ہے ۔(۱۹۵۱ء کی مردم شماری کی رو سے اس کی آبادی ڈھائی ہزار ہے۔ اس میں ایک پرائمری سکول اور ڈاک خانہ ہے)۔

اتفاقاً جولائی ۱۹۷۲ء کے ماہنامہ سیارہ میں ایک مضمون نظر سے گذرا جس کے مندرجات کے مطابق ان دونوں بزرگوں کے مزارات کیلیانوالہ میں اب بھی موجود ہیں۔ مولانا شاہ جمال کی اولاد اب بھی حضرت کیلیانوالہ میں قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہے اور اس موجودہ صدی میں ان کی ساتویں پشت کی اولاد میں صاحبزادہ نور الحسن شاہ صاحب، میاں شیر محمد صاحب شرقپوری کے خلیفۂ مجاز اور صاحب نسبت بزرگ ہو گذرے ہیں۔ اس مضمون سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اس خاندان کے حالات سے متعلق کوئی کتاب بھی شائع ہوئی ہے مگر راقم الحروف تاحال اسے دستیاب نہ کر سکا ۔

صاحبزادہ نور الحسن شاہ صاحب کے خلیفہ کے حوالہ سے صاحب مضمون نے یہ بھی لکھا ہے کہ مولانا جمال کا تذکرہ مکتوبات مجدد الف ثانی میں بھی موجود ہے ۔ راقم الحروف نے مکتوبات کی طرف رجوع کیا تو اس میں مندرجۂ ذیل عبارت ملی جو حضرت مجدد رحمۃ اللہ علیہ نے ملا حاجی محمد لاھوری کے نام کے ایک مکتوب میں درج فرمائی ہے ۔

"فوت مغفرت پناهی میان شیخ جمال جمیع اهل اسلام را باعث حزن و تفرقه است۔ مخدوم زاد هائے ایشان را از جانب فقیر عزا نموده فاتحه خوانند و السلام"۵۔

اگر یه عبارت مولانا جمال چنابی هی سے متعلق هے (اور به ظاهر اس میں کوئی بعد نہیں۶) تو اس کا مطلب یه هے که وفات کے وقت مولانا جمال چنابی اپنے وقت کے مشهور بزرگوں میں سے تھے۔

مولانا جمال کی تاریخ وفات بالضبط معلوم نه هو سکی مگر مکتوبات کی اس عبارت اور سنهٔ تصنیف حاشیهٔ شرح جامی سے یه نتیجه اخذ هوتا هے که ان کی وفات موخر الذکر سن (۱۰۱۹ھ) کے بعد اور سنهٔ تالیف مکتوبات دفتر اول (۱۰۲۵ھ) سے پهلے واقع هوئی هے۔

مولانا کی شرح قصیدهٔ برده کا عربی مخطوطه نمبر ۱۱۲۱، ۳۴ اوراق (۶۸ صفحات) پر مشتمل هے۔ هر صفحه میں ۲۳ سطر هیں۔ اور هر سطر میں ۲۲ تا ۲۶ لفظ هیں۔ ابتدائی صفحات میں حاشیه پر چند اشعار قصیده کا منظوم فارسی ترجمه بهی ساتھ ساتھ درج هے مگر یه التزام آخر تک نہیں پهونچ سکا هے۔ آخری سات اوراق کے حاشیه پر حضرت علی کرم الله وجهه کے مقولوں کا فارسی منظوم ترجمه هے۔

اس شرح کی ابتدا مندرجهٔ ذیل عبارت سے هوئی هے۔

"الحمد لمرسل المرسلین و الصلوة علی قائد الغر المحجلین و اله و اصحابه المهدیین الهادین و بعد فلما کان (؟) القصیدة المیمونة المبارکة فی مدح سید المرسلین حبیب الله العالمین اکرم الاولین و الاخرین شفیع المذنبین من المؤمنین امام الانبیاء و اسبقهم یوم الدین افتتح الناظم قدس سره بذکر ابتلائه بالعشق الخ..."۔

۵۔ مکتوبات دفتر اول مکتوب ۳۶۔

۶۔ بلکه مولانا جمال و مولانا جلال کی شرحوں کے مندرجات سے معلوم هوتا هے که دونو بزرگ رد بدعت و حفاظت سنت میں شیخ مجدد کی طرح خوب متصلب تھے اس لئے ان کے بارے میں شیخ مجدد کے قلم سے اس قسم کے کلمات کی توقع هوسکتی هے۔

اس عبارت میں مصنف نے حمد و صلوۃ کے بعد ھی پہلے شعر کی شرح کرنے کی تمہید باندھی ھے۔ اپنی طرف سے وجہ تصنیف وغیرہ بیان کرنے کا تکلف نہیں فرمایا ۔ تاھم کتاب کے اختتام پر مندرجہ ذیل عبارت ھے جو ھمارے لئے مفید مطلب ھے ۔

”قد استراح من کدالانتہاض لمسودة هذا الشرح العبد جمال الجنابي وفقه الله سجانه و تعالى لتخليص النية عن شوب الاغراض و جعله فارغا من مطالبة الاعواض من قبل ظهر يوم الثلاثاء الخامس عشر من جماد (ى) الاخر (ى) المنتظم فى سلک سنة نسع و تسعين و تسعمائة“ ۔

اس عبارت سے تاریخ تصنیف (۱۵ جمادی الاخرة ۹۹۹ھ) بھی معلوم ھوئی اور یہ بھی کہ حضرت مصنف اپنی نسبت جنابی تحریر فرماتے ھیں ۔

اس شرح سے ایک اور اقتباس بھی قابل توجہ ھے۔

قصیدہ کے شعر :۔

یا نفس لا تقنطی من زلة عظمت ان الکبائر فی الغفران کاللمم

کی شرح کرتے ھوئے مولانا شاہ جمال فرماتے ھیں :۔

لکن لا ینبغی ان یبنی الامر علی ذلک فید خل فی المعاصی و یصر علیہا فان ذلک حماقة یبرز(ها) الشیطان فی معرض الدین . . .
و لیس برجاء بل هو قمة شیطاینة قال الله تعالی ولا یغر نکم بالله الغرور . . . .

و من الاعجب ما وقع لی من هذه الهوا جس انی نظرت فی قوله صلی الله علیه و سلم ان الله یحب الممتحن التواب، و قوله ما اصر من استغفر و ان عاد فی الیوم سبعین مرة، و قوله حاکیا عن الله تعالی : من علم انی ذوقدرة علی مغفرة الذنوب غفرت له و ان لم یستغفر ما لم یشرک بی شیئا و غیر ذلک من الاحادیث فوقع فی روعی ان اقترف ذنبا ثم اتوب ثم هکذا ثم هکذا ولیس علی بذلک شئی بل اصیر محبوب الله و لیس الاصرار فی الاعادة سبعین مرة مع الاستغفار فکیف ان افعل مرة و استغفر مرا را و النفس بین طامحة راغبة و الشیطان معن مفتن فخرجت الی بعض الصحاری و معی تفسیر القاضی و قد

كنت مشغولا في تلك (الايام) بقراءته عندالاستاذ العارف بالله الزاهد في الدنيا و الراغب في العقبى مولانا سعد الله قدس سره فبينا انا (في) هذه الخطرة اذ فتحته فوقع نظري على قوله تعالى ولا يغرنكم بالله الغرور (بان يمنيكم التوبة و المغفرة فيجسركم على المعاصي) فقلت سبحان الله هذه خطرة نفسانية و لمة شيطانية فذهبت بعون الله و حسن توفيقه عني بالكلية، من يهدى الله فلا مضل له و من يضلل الله فلا هادي له ۔

اس اقتباس سے چند امور کی طرف ھماری رھنمائی ھوتی ھے اولا مصنف کا عمدہ انداز بیان اور اپنے زمانے کے رائج طرز عبارت میں سلاست کے ساتھ ادائے مطلب پر قدرت ۔ کہ یہ نثر اگرچہ نثر فنی نہیں لیکن ادائے مطالب کے لئے کافی اور ایجاز مخل تطویل ممل اور تعقید وغیرہ عیوب سے خالی ھے۔ ثانیاً یہ کہ مصنف کو زمانۂ طلب علم ھی سے مجالس علم اور احادیث نبوی سے وابستگی رھی ھے۔ ثالثاً یہ کہ مصنف زمانۂ طلب علم ھی سے پاکیزہ سیرت اور گناھوں سے محفوظ زندگی پر فائز رھا ھے ۔ اور رابعاً تاریخی لحاظ سے یہ اھم بات کہ مصنف لاھور میں مولانا سعد اللہ ملتانی ثم لاھوری متوفی ۹۹۰ھ کے حلقۂ درس میں شامل رھا ھے ۔ اس سے سیارہ ڈائجسٹ کے مدیر کے اس بیان کی تردید ھوجاتی ھے کہ شاہ جمال و شاہ جلال دور جھانگیری میں غزنی سے تشریف لائے تھے ۔ یہ بیان اس لئے بھی محل نظر ھے کہ مولانا جمال ۹۹۹ھ کی تصنیف میں اپنی نسبت جنابی (چنابی) بیان کرتے ھیں جس سے معلوم ھوتا ھے کہ وہ اس سنہ سے بہت پہلے علاقۂ چناب کے ساتھ وابستہ ھو چکے تھے ۔

مولانا جمال نے اپنی شرح میں نحوی ترکیب کی نوک پلک درست کرنے کی طرف خود توجہ دی ھے اور اس ضمن میں کہیں کہیں بعض متقدم شروح کی توجیہات پر رد بھی کیا ھے ۔ ایسی شرحوں میں سے ایک کا نام طیب الجیب ھے (اس نام کی تصریح کئی مقامات پر حاشیہ میں کی گئی ھے ۔ مگر اس کے مصنف کا نام معلوم نہ ھو سکا) ۔ عموماً مصنف جس قول کو رد کرتے ھیں اس کے قائل یا اس کے مصدر کا حوالہ نہیں دیا کرتے ۔ ایک مختصر اقتباس بطور نمونہ پیش خدمت ھے ۔

بوصیری کے شعر:

من لی برد جماح من غوایتها کما یرد جماح الخیل باللجم

کی شرح کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

من یتکفل لی برد: دفع جماح کرماح: مصدر و ھو الشماس ناش من غوایتھا ضلالتھا کما یرد جماح شماس الخیل باللجم ای من یتکفل لی بدفع شماس واحد ناش من ضلالتھا و جھالتھا رد ا مثل رد شماس الخیل باللجم۔ و القول بان الجماح جمع جموح بالفتح وله معنیان الفرس الشموس الابی و النفس المرتکبة (الکبائر) علی ھواھا و المراد فی المصراع الاول الثانی و فی الثانی الاول اخلال بالنظم و جزالة المعنی فتدبر۔

اس نمونے سے آپ نے اندازہ لگایا ہوگا کہ مصنف نے اختصار کے ساتھ ضروری ترکیب کی ہے اور معنی بیان کئے اور دوسرے کسی شارح کے قول کی تردید کی ہے۔ لیکن قائل کا نام نہیں لیا۔

کبھی زہد و فقر کا موضوع چھڑتا ہے تو خوب کھل جاتے ہیں اور اشہب قلم کی جولانیاں دکھاتے ہیں۔ ایک مثال اوپر دی جا چکی ہے۔

مولانا جلال چنابی کی شرح قصیدۂ بردہ خوب مبسوط ہے۔ اس کا جو مخطوطہ نمبر ۱۱۲۱ پر اسلامیہ کالج پشاور کے کتب خانے میں ہے وہ ۳۴۸ صفحات پر مشتمل ہے۔ ہر صفحہ میں ۲۲ سطر اور فی سطر ۱۶ تا ۱۸ لفظ ہیں۔ اس مخطوطہ کی کتابت اعظم بن زاھد بن اسماعیل نے ۱۱۸۲ھ میں کی ہے۔ پشاور کے مولانا حافظ حبیب صاحب نے ۱۲۴۷ھ میں اسے خرید کر اپنے کتب خانہ میں شامل کیا۔ یہی کتب خانہ ان کے فرزند مولانا غلام جیلانی مرحوم کی وفات کے بعد اسلامیہ کالج میں منتقل ہوا۔

مولانا جلال بن نصیر نے اپنی تصنیف میں سن تحریر کا ذکر بھی نہیں کیا۔ اور کوئی تاریخی حوالہ بھی نہیں دیا۔ مگر ذیل کے اقتباس سے اس بات کی وضاحت ہوگی کہ وہ اپنے برادر کبیر کے 'تلمیذ مسترشد' اور ان کے علوم کے خوشہ چین ہیں۔ اور اس شرح کی تصنیف میں بھی انہوں نے مولانا جمال سے استفادہ کیا تھا۔ فرماتے ہیں

"ثم انی قد استفدت عن استاذی المحقق و مولوی المدقق اخی العالم العامل المختار عند الکریم المتعال مخدومنا و مولانا جمال سلمه الله تعالی و ابقاه حین عرضت شرح هذا البیت لدیه" (ورق ۱۲۰ الف شرح شعر و کالصراط و کالمیزان معدلة الخ)

اسی طرح انہوں نے چند مقامات پر اپنے برادر اکبر کا ذکر کیا ہے اور ہر جگہ ایسے ہی احترام کے الفاظ سے کیا ہے۔

مصنف نے دوسرے شارح یا شارحین کا ذکر 'بعض الشارحین' کے لفظ سے متعدد مقامات پر کیا ہے مگر نام کی تصریح نہیں کی۔ صرف ایک دو جگہ مولانا عصام الدین اسفرائنی کی شرح کا ذکر نام کی تصریح کے ساتھ کیا ہے۔ ان کے علاوہ مندرجہ ذیل کتابوں کا ذکر متعدد مقامات پر بطور مصادر کیا گیا ہے۔

تسہیل - ایضاح شرح مفصل - رضی شرح کافیہ - مطول شرح تلخیص تفتازانی - کشاف - حاشیۂ کشاف از سید شریف - تفسیر بیضاوی - الصحاح للجوہری - قاموس فیروز آبادی- الشفاء للقاضی عیاض- اربعین - منہاج العابدین - المقصد الاقصی - احیاء العلوم (الاربعة للغزالی) - عوارف المعارف للسہروردی - التعرف للکلاباذی - الکفایة شرح الہدایة للکرمانی - التلویح للتفتازانی - سیر معارج النبوة کاشفی - مختصر طیب الحبیب (؟ کسی نامعلوم مصنف کی شرح بردہ) خلاصة الحقائق (؟ عیون المجالس) (؟ منتقی) (؟ مفاتیح) (؟ شرح مصابیح مظہر الدین الزیدانی) -

مولانا جلال عقیدہ کے لحاظ سے اہل السنت کے اسی طبقہ سے تعلق رکھتے ہیں جو اس وقت (اور اس وقت بھی) افغانستان و سرحد کے مدارس اور مراکز علم میں مسند نشین ہے۔ وہ وحدة الوجود کے سخت مخالف ہیں۔ فصوص الحکم کے مضامین کا حوالہ دے کر اس کی تردید میں زور قلم صرف کرتے ہیں۔ اس زمانہ میں شیخ عبدالقادر جیلانی کی طرف ایک رسالہ موسوم بہ رسالۂ غوثیہ منسوب تھا - جس میں بہت سی باتیں وجودیہ

۷- و قال مولوی المحقق و استاذی المدقق اخی و نفسی فداه فی شرحه (ورق ۱۳۸ ب و ۱۶۳ ب و ۲۹ ب) کذا افاده الاستاد الاخ العالم الصالح فی شرحه لهذه القصیدة (ورق ۴۳ الف) -

کے رنگ میں تھیں مصنف اسے مجعولہ سمجھتا ہے ۔ باطل فرقوں میں انہوں نے کفرہ ۔ رفضہ ۔ طائفۂ مہدیہ ۔ ملاحدہ ۔ اہل السماع ۔ فلاسفہ اور فرقۂ محمودیہ کا نام متعدد مقامات پر لیا ہے ۔

اس شرح کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ ورق ۴۳ ب کے بعد مولانا جلال نے ہر شعر کی شرح کا اختتام درود شریف پر کیا ہے اور ہر بار نیا صیغۂ درود استعمال کیا ہے ۔

کتاب کے آخر میں قصیدۂ بردہ کی برکات کا ذکر کرتے ہوئے یہ تلقین کی ہے کہ اپنی حاجات کی طلب اور مہمات کے حل کے لئے اس قصیدہ کا ورد مجرب ہے ۔ اس لئے اس کو پڑھنا چاہئے اور مندرجہ ذیل واقعہ پر شرح کا اختتام کیا ہے ۔

و من جملة برکاتها انی قد اشتقت الی رؤیة النبی صلی اللہ علیه وسلم فی المنام و قرأت لاجلها و ظائف کثیرة ولم یتیسرلی هذه الدولة العظمی و الکرامة الکبری اصلا لقصوری ثم شرعت فی شرحها و بیان معانیها و مقاصدها و کشف حقائقها فاذا (؟ فلما) شرحت عدة ابیات منها تیسر لی و تشرفت بهذه المرتبة العلیا و الدرجة القصوی بحرمة خیر الوری علیه الصلاة والسلام بعدد الانفاس الاعلی و الادنی فانی نمت البارحة (باللیل) فی بلدة بهاؤر فکانی قائم فی سوقه و معی شخص آخر و وصلنی خبر مجیئه فمربی صلی اللہ علیه وسلم مع اصحابه رضوان اللہ علیهم فرأیته و ایاهم مقدما علیهم فی ثیاب بیض و لحیته المبارکة سوداء مرة فی ممر الناس فیه و اخری فی دکانه فوضعت یدی علی رجلیه المبارکتین فاخذ رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم یدی عن رجلیه علی وجه المرحمة و المکرمة فقمت من مکانی الساعة و قد مضی من اللیل اکثره و قد اشتغلت نذکر بکلمة التوحید (کذا) ای صلاة الفجر ۔

الغرض مولانا جلال کی شرح اس زمانے کے طریقۂ درس کے مطابق قصیدہ بردہ کی تدریس کے لئے ایک شاہکار ذریعہ تھا ۔ یہ شرح مصنف کے علم، تقوی اور طریق سنت پر مستقیم رہنے کی ایک مضبوط نشانی ہے اور مولانا شاہ جمال رحمة اللہ علیہ کی شرح کے مقابلہ میں اس کی عربیت کی کمزوری کی تلافی اس کے بسط و تفصیل کے ذریعہ کی گئی ہے ۔

احمد فاروق

دباغة الجلود و تجارتها عندالعرب في مستهل الاسلام

انما الحرفة هي مقياس الدول في اقتصادها . لهذا كانت جزيرة العرب تمارس الحرف كلها لدعم اقتصادها . و لكن دباغة الجلود قد امتازت من الاخرى كما لعبت دورا هاما في حياة اهلها، لان العرب في الأدوار السحيقة قد جعلوا جدار تجارتهم على دباغة الجلود وتصديرها الى الخارج فضلا على انهم معظم حياتهم محيطة باشياء مصنوعة من الجلد.

لقد من الله عليهم بالحيوانات كالابل والشاة والمعز والحيوانات الاخرى لريهم من لبنها[1] و لملابسهم من وبرها ولبيوتهم من جلودها[2] و انهم كانوا اكثر حاجة الى جلود الحيوانات منهم الى أدوات أخرى لصيانة أشيائهم الاستهلاكية لان الشمس الحارة في تلك البقعة كان لا يفاوسها من الاوعية والعلبات التي كانت تستعمل في البيوت غير الجلود . و لئن كانت عندهم اواني فخاربة ولكنها كانت قليلة بالنسبة الى ما كانت يستعمل من الجلود كما كانت غير ملائمة لحياتهم البدوية . و كانت الاعراب تستعمل الجلود لاختزان الماء ووقاية العسل والزيت وسوائل أخرى كما كانوا يضعون التمر في جوارب من الاديم[3] و يفيدنا هيرودوتس ان الاعراب خطوا قنوات بالجلود في

١- القرآن : سورة النحل : ٦٦. القرآن : سورة النحل : ٨٠ .

٢- ابن سيده : المخصص ، باب الجلود و الغمد و الكنانة ، مرتضى زبيدى : تاج العروس (السبة و العنبر) ، عيسى بن ابراهيم بن محمد الربعي : نظام الغريب طبع مطبعة هندية بمصر ص ٨٥ ، ٩٩—١٠٠ ، ١٥٢ ، جواد علي: تاريخ العرب قبل الاسلام طبع بغداد ، ١٩٥٩ : ج ٨ ص ٩٩ ، ٢١١— ٢١٢ ، ابن المجاور : تاريخ المستبصر، طبع لمدن - ص ٥٢ ، ٥٣ ، ٥٣ ، ٢٢٥ .

٣- ابن سيده: المخصص ، باب الجلود ، الربعي : نظام الغريب . ص ٨٥—١٠٠ .

الازمان الغابرة[٣] كما كانت لهم البيوتات المصنوعة من جلود الانعام صالحة وملائمة للسكنى فى اثناء نزول المطر بخلاف البيوتات المصنوعة من الوبر أو الشعر فانها لا تحمى ساكنيها من البرد والرياح حماية البيوتات المصنوعة من الجلود[٥] ومن المعلوم انهم كانوا يستعملون الجلود للباسهم و حياضهم[٦] كما استعملت الاعراب الجلود مكان الثمن لبعض السلع.[٧] وكانوا يستعملون الفلك المصنوعة من الجلود.[٨] لانغالى حين نقول ان الجلود كانت تعد من اهم الاشياء للعرب . فبذلك كان الناس يعنون بها عناية عظيمة على جانب صناعات أخرى.[٩]

(١)

ان دباغة الجلود تحتاج الى ثلاثة أمور . فمنها الاول أن يكون جو المكان صالحا للدباغة والثانى أن تتوفر الحيوانات التى توخذ منها الجلود والثالث أن تكون تلك المدينة التى فيها المدابغ سهلة الوصول للتجار . و لحسن الطالع كانت قد جمعت هذه الامور الثلاثة فى جزيرة العرب . فان جو اليمن والطائف ومكانتهما كانتا تناسبان كل المناسبة لدباغة الجلود وتجارتها . فبذلك قد ازدهرت هذه الصناعة فى هؤلاء البلاد . و لم تزل الدباغة انتشارا حتى احتوت فيها الامكنة المجاورة لمدن الشهيرة لها .

٣- هرودوتس : تاريخ هرودوتس الشهير (معرب) - ط بيروت ١٨٨٧م - الكتاب الثالث : ص ١٩٧—١٩٨ -

٥- البلاذرى : انساب الاشراف - تحقيق الدكتور حميد الله - ط القاهرة - ص ٢٩ ؛ الربعى : نظام الغريب - ص ٨٥ - فيه بيت لطرفة :

رايت بنى غبراء لاينكروننى ○ و لا اهل هذاك الطراف الممدد

٦- ابن سعد : طبقات - ط ليدن ، ١٣٢٢ هـ - ج ١ والقسم الاول ص ٣٥ .

٧- يقول شماخ فى ثمن الابل :

و بردان من خال و تسعون در هما
على ذاك مقروظ من الجلد ماعز

٨- Hourani : Arab Seafaring. Beirut, 1963. p 3.

٩- محمد عزة دروزه : عصر النبى - ط القاهرة ، ١٩٦٣م - ص ٩٩—١٠٩ .

وعندما توفرت محصولاتـهـا جعل الـعرب يصدرونهـا الى ممالک بعيدة نحو مصر والحبشة والفارس وبماوراء النهر والهند. ١٠

ان الحيوانات كالابل والشاة والبقرة وغيرها، التى كانت أساس الـدباغة، نجدهـا وفيرة فى جزيرة العرب كلها . الشاة والمعز كانت تربى على جبل السراة كما كانت عليه الغزال وبقرات الوحش . ولئن كانت الابل تـوجد فى الجزيرة كلها ولكنها كانت تعني بها خاصة فى اليمن كما توجد فـى الجرش الـسفرة الـشهيرة الـجيلانية و الـخذيرية التى توخذ منهـا الجلد اللين. ١١

وأما الجاموس و الفيل فقد ورد ذكرهما قيلة نحية فى الموارد ونجد بعض الاخبار منهما، قال الشاعر العذرى جميل :

و ما ينبغى منى العداة ، تفاقدوا
و من جلد جاموس سمين مطرف١٢

وامسا الـفيل فكانت الترسة تعمل من جلودها وهى أجود من جلود الجواميس ومن الخبزران ومن الورق والحجف التى تتخذ من جلود الابل . ١٣

و من الغريب أن العرب أخذوا جلودا من بعض حيوانات بحرية كالاطوم والحوت والسمک و منهـا الـنوع المعروف بالقرش (SHARK)١٤

وتـظهر من عناية الاعراب بالحيوانات أنهم كانوا أكثرهم حاجة اليهـا فى حياتهم لان الابل على جانب انتاج الجلد كانت لهم سيارة فى الصحراء وتؤتى باللبن فى أوقات الحاجة كما أن الحيوانات الاخرى كانت لهم دعم معيشتهم ومعونتهم .

و من الضرورى عندما أردنا بالماء و دباغة الجلود أن تلقى ضوءعلى

١٠- ابو عمر يوسف الكندى : كتاب الولاة و كتاب القضاة - بيروت ، ١٩٠٨م ص ٧ -
١١- الهمداني : صفة جزيره العرب - القاهرة ، ١٩٥٣م - ص ١١٧ ، ١١٨، ٢٠١ -
١٢- عمرو بن احمد الجاحظ : كتاب الحيوان - تحقيق عبدالسلام هارون - ج ٧ ص ٢٠٨ -
١٣- نفس المرجع - ص ٨٦ -
١٤- الدكتور جواد على : تاريخ العرب قبل الاسلام - ج ٨ ص ١١١ -

سلخ الجلود من الخيوانات وطرق ذبحها . اختلفت الآراء فى الذبح كما أنها عديدة . وهذه الطرق تحتاج الى التفصيل و لكنى لا أطيل عليكم الكلام فسأقول موجزاً . ١٥ أما طرق الشهيرة لذبح فهى :

القف : فانه قطع عنق الحيوان بعضه من قفاه .
والفرس : أن يقطع العنق كله .
والشرد : أن تغرب العنق بدون النظر الى لحم العنق ومن أى ناحية .

وأما مناهج السلخ فقد اختلفت أيضا على الاعراب فى أقطارهم منسجما لبيئتهم و طقوسهم و تقاليدهم كما كانت لسهولتهم، و هى :

١- الترجيل : هى التى يبدأ الانسان تسليخ الجلد من قدم الحيوان أو يستعمل رجله فى هذا العمل . و قد أشار اليه الشاعر :

أيام أسحب منزرى عفر الملا و أغض كل مرجل ريان

٢- النجل : راجت هذه الطريقة فى أيامنا هذه وهى أن يقطع الجلد من قرب عرقوب الحيوان ويبدأ من هنا تسليخه . يقول المخبل :

وأنكحتم رهواً كان عجانها مشق اهاب أوسع السلخ ناجله

و قيل سلخ الجلد من العرقوب حتى الرأس وتقليبه يقال لها المنجول أو المرجول .

٣- التزفيق : أن تبدأ السلخ من قبل رأس الحيوان .
٤- الشرع : تشقق ما بين رجليه و تسلخه .
٥- الدحس : وهى أن تدخل يدك بين جلد الشاة لتسلخها .
٦- و كانت هناك طريقه غريبة لقيام هذا العمل وهى أنهم كانوا يسبئون الجلد بالنار.

و لتعبير هذا الغرض أى السلخ كانت لديهم كلمات عديدة نحو الكشط والنزلع والسلخ والتجلد والنجو التى تخص ببعض الحيوانات و بعض الامكنة . ١٦

١٥- من يريد تفاصيل هذه الطرق فليرجع الى باب الجلود من كتاب المخصص لابن سيده -
١٦- نفس المكان -

بعد معالجة الحيوانات و سلخ جلودها خطينا خطوات الى المقصد . و سأعرض الآن عليكم المواد التي كان الاعراب يستعملونها لدباغة الجلود و صبغها .

ان المواد للدباغة كانت كثيرة وافرة في الجزيرة كما كانت عندهم طرق عديدة لاستعمالها، لسهولة جوهم ومكانهم ولما كانت عندهم من الاشجار والنبات . هذا لا يمكن لاحد أن يحيط عرضا بهذه النبات كلها فسنكتفي باتيان بعضها خوفا لملالكم .

نلاحظ قبل كل شيء أن العرب كانوا يستعملون النبات كلها بهذا العدد كما كانت يستفاد من لحاء الاشجار وأثمارها . و ها أنا أسوق اليكم بعضها : ١٧

☆القرظ : قال الليث ان ورق السلم يدبغ به ولكنه ليس بصحيح لان أوراق السلم هي الخبط ولا يدبغ بها وقد التبس القرظ على أبي حنيفة ولم يستطع ان يقطع الرأي الحاسم في شانه فقال مرة، هو النبت و مرة أخرى لحاء الشجر و نرى الفيومي على حق بقوله ان القرظ نبت ويجنى و الشجر لا يجنى الا ثمره . فقال ختاما : انه حب معروف يخرج من غلف كالعدس من شجر العضاه .

و كان القرظ ينبت قرب مدينة في وادي العقيق و بمكة أيضا . ١٨ و أما اليمن فكانت بلاده فلذلك قيل لها : "بلاد القرظ ." و كان يوجد في كل مكان الدباغة بمقدار وافر مثل صعدة و جرش و ما يجاورها . ١٩ والمزدوية المرة فكانت فيها الرحي لسحق القرظ كما كانت الجزيرة "قيس" بجنوب اليمن دار القرظ . ٢٠

١٧- لوصف هذه الكلمات انظر المعاجم كالصحاح و مصباح اللغة و القاموس، والتاج و اللسان و مد القاموس للين (Lane) .

١٨- ابن المجاور : تاريخ المستبصر - ص ٣٢ ، الازرقي : اخبار مكة - ط ص ٣٥ .

١٩- الهمداني : صفة جزيرة العرب - ص ٦٨ ، ١٢—١١٣ .

٢٠- ابن المجاور : تاريخ المستبصر - ٩٧—٩٨ ، ٢٩٥ .

☆الغلقة : يقول أبو حنيفة بأنها عشب تدرس وتهيأ للدباغة و لكن صاحب التاج ينكره و يقول بانها شجر مر ويدمع من يقربه و يدبغ من لحائه و ثدره . و أيده أبو حنيفة مرة لهذا القول في اللسان . وقال الشاعر المرار:

جربن فلا يهنان الا بغلقة　　　عطين و أبوال النساء القواعد

تكثر هذه الشجرة في الحجاز والتهامة . وفي الحبش يسمون سيوفهم به عند الصقل . و يعطن بها أهل الطائف. ٢١

☆الغرف : هذا شجر يدبغ بأوراقه يقول الراجز:

كان خضر الغرافيات الوسع　　　نيطت بأحقى مجرلشات همع

قال أبو منصور ان الشجر الذى يدبغ به يكثر في البادية . و الجلود الغرفية التي تدبغ به . و قال أبو حنيفة : الغرف شجر يعمل منه القسى ولا يدبغ به أحده و قال القراز: يجوز أن يدبغ بورقه وان كانت القسي تعميل من عيدانه . و قال الباهلى : الغرف جلود ليست بقرظية يدبغ بهجر ٢٢ و قد اختلف الناس في توصيف الغرف و توجد بسطها في المعاجم و كتب الادب.

☆الارطى : هذا ضرب من شجر ذا ساق واحد وله أوراق تسمى هدب و يدبغ بأوراقه. ٢٣

☆العلقى : ذهب صاحب القاموس الى أنها شجرة تدبغ بها . ولكن ابن سيده وهمها و قال : ضرب من النبات.

☆الصرف : هذا شئ أحمر يدبغ به ويصبغ به أيضا، يقول كلحبة اليربوعي :

كميت غير محلفة و لكن　　　كلون الصرف عل به الاديم٢٤

٢١- لسان العرب : غلق ، ابن سيده : كتاب المخصص ، باب الجذود - ص ١٠٦ -

٢٢- اللسان و التاج : غرف -

٢٣- مدالقاموس : ارطى ، و ابن دريد : كتاب الاشتقاق - ط دارالمعارف بمصر ص ١١٦ -

٢٤- اللسان و القاموس : صرف -

☆الفوه: قيل انها نبت ذات ساق يصبغ به. و يحمى الجلد عن الانشقاق، ينبت فى اليمن على الجبال.٢٥

☆النجب: قال ابن السكيت انها لحاء شجر وهو سوق الطلح. و لكن أبا حنيفة أضاف عليه قائلا بأن لحاء كل شجر نجب ويصلح للدباغة.

☆و القرنوه: هذه ضرب من النبات و لها أوراق كبيرة مسطحة أدكن تصبغ بها.

☆الظيان: ضرب من النبات يدبغ بأوراقه.

☆السلم: هذا شجر يدبغ بأوراقه و يشير اليه الشاعر:

لما رأيت عدى القوم ليسلبهم طاع الشواجن والطرفاء والسلم ٢٦

☆الدهناء: عشب أحمر وله أوراق مسطحة يصبغ بها.

هذه الاشجار و النبات التى أعرضت عليكم ليست كل ما يستعمل للدباغة و الصبغ و لكنها كثيرة لا تحصى و لا تعد كما قلت أنفا.

قبل أن أغلق الفصل لمواد المستعملة فى الدباغة أريد أن ألفت أنظاركم الى ما تتاثر به الجلود من الكواكب. و هذا من الغريب أن كوكب السهيل كان له سهما فى عمل الدباغة. فان الامكنة التى كان يطلع عليها كانت صالحة للدباغة مثل اليمن و الحجاز و العراق و مصر و بلاد المغرب.٢٧ أورد ابن المجاور فى كتابه المستبصر قصة يشرح فيها عن عمل السهيل فى الدباغة. فيقول:

حدثنى محمد بن رزق الله: قال لى: هل ترون فى خرا سان كوكب سهيل؟ قلت: لا و الله. قال: لهذا لم يصح لهم دباغة الادم. قلت: و كيف ذاك؟ قال: كل اقليم يطلع عليها سهيل يصح فيه دباغة الادم لانه يحمره و يصيره الى ما ترى من الليونة و النعومة.٢٨

٢٥- ابن المجاور: تاريخ المستبصر - ص ٢٥ -
٢٦- ابن دريد: كتاب الاشتقاق - ص ٣٠ -
٢٧- ابن الاجدابى: الازمنة و الامكنة: ط وزارة الارشاد القومى بدمشق - ص ٤٣ -
٢٨- ابن المجاور: تاريخ المستبصر - ص ١٤، ٨١ -

وكان السهيل يطلع بالحجاز فى تسعة آب من كل سنة، كما كان برى بالعراق فى تسعة و عشرين آب. ٢٩

وبقى شئ يتعلق بادوات الدباغة وهي الآلات التى كان الدباغون يستعملونها فى القيام بهذا العمل . لم نستطع لعدم المصادر وقلة الايراد لها فى كتب اللغة و الادب، أن نحيط الكل من الآلات المستعملة عند الدباغين، فاوردنا بعضها. ٣٠

اننا نرى المحط الذى كان مستعملا لصيقل الاديم و تنميقه و كان مصنوعا من الخشب عند البعض ٣١ و من الحديد عند الآخرين . ٣٢ و أما المجلاة فكانت لقشر الوسخ الذى يبقى فى جلد الاهاب. ٣٣ و نجد النشفة والازميل و المنحاز عندهم لاغراض شتى . كما كانوا يستعملون الاشفى والمبقر و المسرد و المخصف و المفراض و المجوب فى بعض الامور كانت لدباغة الجلود. ٣٤

(٢)

الآن نسير بكم الى نواحي جزيرة العرب تعني بهذا العمل أكثر من الاخرى . و لئن كانت هذه الصناعة رائجة فى الجزيرة كلها و لكنها كانت فى اليمن والطائف على مستوى عال بالنسبة الى المناطق الاخرى. ٣٥ ان اليمن كانت ذات صيت أبعد فى دباغة الجلود ونسيج الاكسية، فصار مثلا فيهما .

٢٩- ابن الاجدابي : الازمنة و الامكنة - ص ١٢٥ -
٣٠- ابن دريد : كتاب الاشتقاق - ص ٢٣٣ -
٣١- فى اللسان و التاج و تهذيب اللغة : حط ، قال الشاعر :
كأن محطا فى يدى حارثية صناع ، علت منى به الجلد من عل
٣٢- ابن سيده : كتاب المخصص ، باب الجلود -
٣٣- نفس المكان -
٣٤- جواد علي : تاريخ العرب قبل الاسلام - ج ٨ ص ١٥٥ -
٣٥- ابن المجاور : تاريخ المستبصر - ص ١٣ ، ٢٥ ، السيرة الحلبية - ط مصر ١٣٢٠ ه - ج ٣ ص ١١٢ ، ابن سعد : طبقات - ط بيروت ج ٤ ص ٣١٢ ، جواد علي : تاريخ العرب قبل الاسلام - ج ٨ ص ١٣٦ ،
Lammens. H. La Taif; Beirut, 1922. p. 119.

وقيل فى ساكنيها : ما انتم الا سائس قرد أو دابغ جلد أو ناسج برد، ملكتكم امرأة و غرقتكم فارة و دل عليكم الهدهد. ٣٦

وكانت بهذه البلاد بعض القبائل و البطون تعاطى الدباغة معيشة لهم . و منهم الشهير : مذحج و الخزيمة . ٣٧ و قد اشتق اسم مذحج من ذحج الاديم و كانت من بطن كهلان و بنو قحطان أصلا . و كانت القبيلة هذه ساكنة، فى العصور الغابرة، فى قلب اليمن ٣٨ كما نرى بطن أخر من كهلان وهو خولان الذى اختار هذه الصناعة متاثرا من المجاورين وسكن فى أعالى اليمن أى الجرش وصعدة ونجران . لا غبار عليه أن فى البداية كانت بنو قحطان فى جوار مأرب و لكنهم على كر الايام انبسطوا فتوجهوا الى أمكنة أخرى و استوطنوا بها . منهم من استقروا على جبال فى مشرق صنعاء و تسموا بخولان العالية . و بعضهم استعمروا صعده و جبال غور، و قيل لهم خولان مغرب و خولان مشرق . و هولاء كلهم كانوا فى قلب اليمن باسم خولان الشام، كما سماهم المورخون خولان اليمن . ٣٩ و هنالك قبيلتان أخريان : نمير و خزيمة، كان عملهما الدباغة كما يفيدنا عبيد عن أخبارها وذلك بأنه يفتخر عند معاوية بأبناء قحطان و ينشد :

فمنهم رعاء لاموالنا ... عليهم خراج لنا مغتصب
نميرا جعلت لحوك البرود ... وحد النعال و وضع اليلب
خزيمة كان عليها الدباغ ... وقد السيور وفتل السلب ٤٠

٣٦- ابن المجاور : تاريخ المستبصر - ص ٩٧ ، الهمدانى : كتاب البلدان - ط ليدن - ص ١٣ ، الجاحظ ، كتاب الحيوان - ج ٦ ص ١٥٢ -

٣٧- عبيد بن شرية : اخبار عبيد - طبع مع كتاب التيجان بالهند (حيدرآباد) ص ٣٧٦ - فيه قصيدة طويلة منشودة عن عبيد عند معاوية يفتخر ابناء القحطان فيقول :

وجمع العشيرة فى صفنا
و مذحج طرا عليها اليلب

٣٨- عمر رضا كحالة : معجم قبائل العرب- ط دمشق، ١٩٤٩-ج ٣ ص ١٠٦٢، الحميرى : شمس العلوم - ط ليدن - ص ٣٨، ٧٦-

٣٩- الحميرى : شمس العلوم - ص ٧٦ -

٤٠- عبيد بن شرية : اخبار عبيد بن شرية - ص ٧٥ -

الا أنهم كانوا يمارسون العمل وهو صناعة الجلود وتجارتها . ونحن لانغالى حين نقول ان باليمن كانت الدباغة هى العمل الوحيد لاكثر القبائل وعلينا أن نبحث عن الامكنة التي كانت لها الشهرة العظيمة و الصيت الابعد، فيما نحن بصدده .

نستطيع أن نقسم هذه المراكز على ثلاث :

١ ـ الجزائر التى تقع فى البحر الاحمر.

٢ ـ مكة والطائف وجدة و ما يجاورها من الامكنة.

٣ ـ مراكز الدباغة فى اليمن.

ان الجزائر الواقعة في البحر الاحمر فانها ليس لها الصيت أكثر من اليمن في هذا المضمار بيد أنها كانت تنتج الجلود بكمية وافرة، كما كانت مراكز تجار لكل ناحية من نواحى الارض كمصر واليونان والفارس والهند والصين . ٣١ فمنها الشهيرة بنى حدان وسنجلة والمتسحل ودهلك وباضع . و كانت ترد الجلود و الاهب من هذه الجزائر على اليمن و عدن و من ثم يستوردان منها صناع الاديم البقرى و الملمع و الثقيل. ٣٢

الآن نرجع الى مدينة العرب القديمة و هى مكة . كان الناس يمارسون الدباغة فيها على جانب من صناعات أخرى، رجالا و نساء . لا أريد أن أعرض عليكم الحوداث و الواقعات بحزافيرها التى تنم منها أن أهل مكة كانوا صناعين مهرة لدباغة الجلود فانني سأحصر القول بالاشارات الى مكانها فحسب . أنظر أمر الرسول صلى الله عليه وسلم في كتاب البخارى باب تفسير سورة التحريم . و الخبر عن ام سلمة و حضور الرسول عندها فى المسند لاحمد ابن حنبل، و عن اسماء بنت عميس على وفاة زوجة جعفر فى الطبقات لابن سعد . و عن سودة ام المؤمنين فى المسند لابن حنبل . و عن ميمونة فى صحيح مسلم و عن على كرم الله وجهه فى جامع الترمذى باب صفة القيامة . و عن رسول الله صلى الله عليه و سلم حين يطلب هدية الجلود من سفيان فى

٣١- ابن حوقل : صورة الارض ـ ط ليدن ، ١٩٣٨م ص ٣٣ ، ابن خرداذبه: المسالك و الممالك ـ ط ليدن ـ ص ١٥٣ ـ

٣٢- ابن حوقل : صورة الارض ـ ص ٣٢ ، ٥٠ ـ

كتاب الاموال لابى عبيد و المبسوط للسرخسى، و شرح السير الكبير له، و اهداء الادم الى نجاشى الذى كان أحب ما يهدى اليه من أرض العرب. ٣٣

دباغة الجلود كانت سائدة على جميع مكة و ما يجاورها من القرى. ٣٤ مرة غادر مكة عبدالله بن جحش و اصحابه حتى نزلوا بنخلة فمرت به عير قريش تحمل زبيبا و ادما و تجارة من تجارة قريش. ٣٥ و كانت هنالك واد تسمى العقيق، بقرب المدينة ترد منها القرظ الى مكة ٣٦ و لا مجال للشك بانها كانت تستعمل فى الدباغة لاغير.

و قد اشتهرت مدينة الطائف بدباغة الجلود و كثرة أعنابها ونخيلها وعرفت بحسن هوائها وبصناعاتها و كثرة ماشيتها. ٣٧ كانت هذه المدينة واقعة على قرنى جبال وقد انقسمت على محلتين: طائف ثقيف و الوهط. و كانت لهما صيت أبعد لما كانت فيها المدابغ. ٣٨ فكان نتاجها الاديم المليح و الثقيل المعروف بهما وهو الذى يصلح لخوارزم. ٣٩ يشيد هنرى لامنس (Henri Lammens) صاحب كتاب الطائف عمل أهلها و يقول

La grande spécialité industrielle de Taif, c'etait la préparation du cuir.[50]

انه لمن الشاق العسر أن يحصل الانسان على معلومات دقيقة عن جدة وخاصة عن اخبارها نحو الدباغة فى القرون قبل الاسلام ان المصادر قليلة

٣٣- كتاب البخارى - ط القاهرة، ١٣١٢هـ - ج ٦ ص ١٥٨، المسند - ط بولاق - ج ٣ ص ٢٨، الطبقات - ج ٨ ص ٢٠٦، المسند ج ٦ ص ٣٢٩، صحيح مسلم - ج ١ ص ٢٦٦، جامع الترمذى - ط الهند - ص ٣٧، كتاب الاموال - ط القاهرة - ص ٢٥٧، المبسوط - ط القاهرة - ج ١٠ ص ٩٢، شرح السير الكبير - ط القاهرة - ج ١ ص ٩٨، الطبرى ط ليدن: القسم الاول ص ١٦٠٢ -

٣٤- ابن المجاور: تاريخ المستبصر، ص ١٣ -

٣٥- ابن هشام: سيرة - ط اوروبا - ص ٤٢٣ -

٣٦- ابن المجاور: تاريخ المستبصر - ص ٣٢ -

٣٧- السيرة الحلبية: ج ٣ ص ١٥١، ابن سعد: الطبقات (ط بيروت) ج ١ ص ٣١٢ -

٣٨- ياقوت الحموى: معجم البلدان: الطائف -

٣٩- ابن المجاور: تاريخ المستبصر ص ٢٥ -

٥٠- Lammens, H. La Taif. p. 114.

شحية و لكننا استقصينا بعض المعلومات وهى أنها كانت تتمتع بشهرة عظيمة لكونها المرفأ الوحيدة فى هذه الناحية من الجزيرة كما كانت مركزا لتجار الاجانب وذلك قبل الاسلام . و نستشف من قول ابن المجاور بأنه كان فيها باب المدبغة. ٥١ اما كانت هى الناحية لمدابغ أو كانت فيها مساكن لدباغى جدة . كما اننا نجد فيه أحجارا كبيرة لرحى و لعلها كانت تستعمل لسحق القرظ لدباغة الجلود. ٥٢

و فى جنوب مكة كانت مدينة عظيمة تسمى المزدوية المرة فلما خربت بناها الفرس من أهل سيراف فبنوا فيها المدابغ كما عملوا بها طواحين القرظ. و لا شك فى أن أهلها كانوا دباغين . و كانت محصولاتهم تصدر الى العراق وخراسان و ماوراء النهر وخوارزم٥٣ .

هذا، و نرجع الآن لنعالج اليمن بسطة . و كانت هى مركز الدباغة من القرون. و ان لبعض القبائل اليمنية كانت يد طولى فى هذه الصناعة كما أوردناها آنفا . و فى هذه العجالة سنبحث عن الامكنة و المواضع التى نعبت دورا هاما فى تحسين دباغة الجلود و تطورها فى جزيرة العرب عاماً و فى اليمن خاصة.

من حسن الطالع أن الله قد من على أهل اليمن جودة الجو و ملاة الواد بالعشب للحيوانات و القرظ للدباغة . فبذلك كانت الدباغة فى اليمن كلها كما كانت وفرة الحيوانات على سهولها. ٥٤ وانهم كانوا يصدرون الاديم الى الخارج بعد سد حاجاتهم و حاجات الجزيرة كلها . و كانت بعض الامكنة من الشهرة بمنزلة لا سبيل الى تجاوزها، فمنها :

١- الجرش : بناها الملك من تبع و اسمه أسعد بن كليكرب الذى كان قد خرج من قلب اليمن و أحبته خصبة هذا المكان فأمر لبنائها. ٥٥

٥١- ابن المجاور : تاريخ المستبصر - ص ٤٢ -

٥٢- نفس المكان -

٥٣- نفس المرجع - ص ٩٧-٩٨ -

٥٤- جواد على : تاريخ العرب قبل الاسلام ج ٨ ص ١٣٦ ، ١٥٤-١٥٥ ، قدامة بن جعفر : كتاب الخراج - ط ليدن - ص ١٨٩ -

٥٥- ياقوت الحموى : معجم البلدان - الجرش -

وكانت قبيلة خولان من سكانها . وان المطر كان يهطل على الجبال القريبة منها فتنتج العشب لحيواناتها والقرظ لدباغيها . ومن مزاياها الاخرى بأن أهلها كانت نصنعون العرادة والمناجيق والدبابات كما كانوا يعلمون الناس استعمالها في الحروب . ٥٦

٢- صعدة : ان هذه المدينة تقع شمالى صنعاء و جنوب نجران . وكانت مسكنا لقبيلة خولان . و سميت في الجاهلية بجماع . و كانت لهذه المدينة شهرة عظيمة في دباغة الجلود و تجارتها، لان أوديتها كانت مخصبة وصالحة لحيواناتها فمنها الشهيرة : الدماج والخانق ورحبان والحاديات وقضان والغيل وعكوان كما كانت في غربيها ربيع ونسرين وعلاف خيبر، حاشدة كل الخعمروات وكروم الزبيب . ٥٧ يقول ياقوت الرومى فى شأن خصبتها :

قال الحسن بن محمد المهلبى : صعدة مدينة عامرة آهلة يقصدها النجار من كل بلد وبها مدابغ الادم وجلود البقر التى للنعال و هى خصبة كثيرة الخير . ٥٨

وكانت قد بلغت صناعة الجلود فى هذه المدينة فى تلك العصور شاوها فلذلك كانت كعبة للتجار و محطة للناس فيما يعنيهم من مواد التجارة وكانوا يشترون منها فيذهبون بها الى ممالك بعيدة . ٥٩

قريبا من هاتين المدينتين كانت مدينة نجران عامرة بأهلها اليهود وهم كانوا متولين على دباغة الجلود وتجارتها فى بلدهم، وكانوا يصدرون الاديم الى سوق صعدة وغيرها من المدن . و اما الصناعة فى هذه البلدة فكانت أقل منها فى صعدة لان القرظ ، و هو المواد الاهم للدباغة ، كان يستجلب من صعدة .

٥٦- ابن سعد : الطبقات (ليدن) : ج ١ القسم الثانى، ص ٥٢ -
٥٧- الهمدانى : صفة جزيرة العرب - ص ٦٧، ١١٣ -
٥٨- ياقوت الحموى : معجم البلدان : صعدة -
٥٩- ابن خرداذبه : المسالك و المسالك - ص ١٣٥—١٣٦، ١٨٩ -

و قد أفادنا المقدسى بأنها كانت هناك مدينة زبيد مما يدبغ فيها الاديم وكانت لها شهرة بذلك كما كانت يصدر منها نيل الى ممالك أخرى. ٦٠ و كان يتخذ الاديم من صنعاء كما اشار اليه ابن حوقل٦١.

ان هذه الصناعة كانت فى اليمن رائجة فى قراها كما نرى فى الهجر وهى قرية صغيرة بقرب عثر و كان الناس يدبغون بها الجلود. ٦٢ و لئن لم نستطع على حصول أخبار الامكنة الاخرى التى كانت الدباغة هى الوحيدة من صناعاتها و لكننا مؤكدين بأن هناك كانت عدة الاماكن التى ازدهرت فى تلك القرون بصناعتها الدباغة و لكنها الان اما اندرست من وجه الارض أو لم تصل الينا من أخبارها.

و لا نغالى حين نجزم الرأى بأن اليمن كلها كانت مكان الدباغة ومحل الجلود والادم. فلذلك ذهب ابن المجاور وغيره من المؤرخين الى هذا الرأى: يدبغ الاديم فى جميع اليمن و لم يخرج منها الا دابغ جلد.٦٣

(٣)

ان العرب، عموما، قوم اشتهروا بالتجارة وكانوا ينظرون اليها على أنها أشرف الحرف و أعلاها قدرا ومنزلة، و بقيت على هذه المنزلة فى الاسلام كذلك. و قد وردت كلمة تجارة فى مواضع عديدة من القرآن، و أشير الى شرفها و سمو منزلها فى الحديث النبوى مما يدل على ما كان للتجارة من منزلة و اجلال فى نفوس العرب.٦٤

و من المعلوم أن العرب، اذا نظرنا الى مكانتها بين الامم الاخرى، كانت تتمتع بمكانتها العالية فى التجارة بكونها فى وسطهم لان تجار الفرس

٦٠- المقدسى: احسن التقاسيم - ط ليدن - ص ٩٨-
٦١- ابن حوقل: صورة الارض - ص ٣٦ -
٦٢- لسان العرب: غرف، ياقوت الحموى: معجم البلدان - هجر.
٦٣- الجاحظ: كتاب الحيوان - ج ٦ ص ١٥٢، الهمدانى: كتاب البلدان ص ١٣، ابن المجاور: تاريخ المستبصر - ص ٦٣ -
٦٤- القرآن الكريم: البقرة: ٢٨٢ و التوبة: ٢٤ و النور: ٣٧ و الجمعة: ٦٢ والقريش و النساء: ٢٩، محمد عزة دروزة: عصر النبى - النشاط التجارى برا و بحرا - ص ٤٢ - ٩٣ -

والهند والصين كانوا يأتون بأتجارهم الى المغرب ولا بد لهم أن يعبروا العرب برا أو بحرا . كذلك كان يمر بها تجار أروبا وافريقية الى الهند والصين والجزائر البعيدة الى المشرق. فلذلك أصبحت العرب وسيط الناس كما كانت في نفسها تنقل تجارة اليمن الى أسواق الشام و مصر و تجارة هذه البلاد و حوض البحر المتوسط الى الحجاز و نجد و اليمن . كانت فيها حركة تجارية فعالة فبهذا أفاضنا استرابون اليوناني عن أموالهم فقال : العرب تجار و سماسرة .٦٥

لا أريد أن أبسط القول في تجارة العرب، و فعالينها و ماكان شأن الامم القديمة في العرب نحوها و لكنني سأقتصر القول بان قريش في القرن السادس كان لهم نصيب أوفر في التجارة . ونرى أن بعض القبائل كانت لها صيت أبعد في تجارة الاديم و الجلود و منها قريش و بنو ثقيف على رأس الكل . لاننا نرى أصحاب الايلاف وهم من قريش ذاهبين الى الشأم وحبشة ومصر واليمن والعراق، محملين تجارتهم اليها ومنها . وكانت الجلود احد المواد الهامة لتجارتهم.٦٦ و كان بعض الناس متوغلين في تجارة الجلود على جانب أتجارهم الاخرى. هذا من المعلوم أن عمرو بن العاص كان يتجر في الجاهلية بالاديم و العطور فيذهب الى الشأم ومصر وياخذها من اليمن والحبشة.٦٧ و كانت تجارة العرب ضاربة أقدامها في الممالك الرومية حيث جاء بخبرها عثمان بن حويرث، فقال :

يا قوم : ان قيصر من قد علمتم أمانكم ببلاده و ما تصيبون من التجارة في كنفه وقد ملكني عليكم وانما انا ابن عمكم واحدكم

٦٥- سعيد الافغاني : أسواق العرب في الجاهلية و الاسلام - ط دمشق، ١٣٥٦هـ ص ١٧ -

٦٦- جواد علي : تاريخ العرب قبل الاسلام- ج ٨ ص ١٣ ، الطبري (ط بيروت) ج ٢ ص ٢٦٤ ، محمد بن حبيب البغدادي: كتاب المنمق في اخبار قريش- ط الدكن (الهند)، ١٣٨٤هـ - ص ٣١—٣٣ ،
Lammens, H, La Taif. p. 115.

٦٧- ابو عمر محمد بن يوسف الكندي : كتاب الولاة و كتاب القضاة ص ٧-

و انما أخذ الجراب من القرظ و العكة من السمن و الاهاب فاجمع ذلک ثم أبعثه اليه.٦٨

و كان أيوب السختياني قد اشهر لتجارة بسختيان: قسم من الجلود . و كان أبو سفيان بن حرب أحد من تجار أدم في الجاهلية.٦٩

ان الاسواق كانت في جزيرة العرب مكان التجارة و محل المفاخرة فيما بينهم ، فان الناس كانوا يجتمعون فيها في مكان خاص و وقت مقرر . لا أملكم بتفاصيلها المتضاربة في الاقوال لان أخبارها موجودة بدقائقها في كتب التاريخ و الادب. على الاخص في كتاب اسواق العرب في الجاهلية و الاسلام تاليف سعيد الافغاني . و كانت تعرض في هذه الاسواق كلها جميع أقسام السلع للبيع و الشراء. و لكن معظمها كانت التمر والزبيب والادم والبرود والحيوانات٧٠ كانت بعض المدن والقرى محل التجارة في جزيرة العرب دون هذه الاسواق . وتجتمع الادم في محل التجارة من القرى المجاورة فيأتيه تجار الجزيرة و من الاجانب لاخذها عن طرق معبدة. أما تفاصيل هذه الطرق و بسطها فتوجد في الكتب.٧١ فمثلا مدينة صعدة، كما ذكرناها آنفا، كانت فيها قبيلة خولان مشرفة على التجارة و كانوا يجمعون الادم من القرى المجاورة والتجار يحضرون عندهم برا وبحرا و من كل حدب وصوب.٧٢ كما كانوا يذهبون منها الى الجرش لهذا الصدد.٧٣ قد يكون في بعض الاحيان مقصدهم زبيد مكان الدباغة و تجارتها.٧٤ و لو كانت

٦٨- حسن ابراهيم حسن : عمرو بن العاص - ط القاهرة - ص ٣٢٥ -

٦٩- ابن رسته : الاعلاق النفيسه - ط ليدن ص ٢١٥—٢١٦ -

٧٠- سعيد الافغاني : اسواق العرب في الجاهلية و الاسلام - ص ١٦٦ -

٧١- ابن خرداذبه : المسالک و الممالک - ص ١٣٦—١٤٧ ، قدامة بن جعفر: كتاب الخراج - طبع مع المسالک و الممالک لا بن خرداذبه - ص ١٨٩، المقدسي: احسن التقاسيم - ص ٨٧ ، ١٠٦—١١٣ -

٧٢- ياقوت الحموى: معجم البلدان - صعدة -

٧٣- المقدسي : احسن التقاسيم - ص ٨٧ ، ياقوت الحموى : معجم البلدان الجرش -

٧٤- المقدسي : احسن التقاسيم - ص ٨٣ ، ٨٦ ، ٨٧ ، ياقوت الحموى : معجم البلدان -زبيد -

الدباغة في نجران قليلة بالنسبة الى المدن الاخرى و لكن كانت لها نصيب من التجار لادمها و كانت قد أصبحت مركزا و لو لا مثل صعدة ولكن الناس المجاورة كانوا يأمونها للتجارة.٧٥

من المعلوم أن للطائف كانت شهرة عظيمة وصيت أبعد لادمها الثقيل والمليح التي كانت تصلح لاهل خوارزم خاصة و للقبائل القاطنة ما بين مكة والطائف. كان لهم سهما كبيرا في انتشار أدمها و مصنوعاتها الادمية في العرب كلها كما كان ادمها يعرض في الاسواق المجاورة مثل عكاظ، وغيره من الاسواق بل قل الى جميع نواحي الجزيرة . عملت العرب من أدمها النعال و السروج و الخيام و الحياض.٧٦ و أصدرته الى الخارج مثل العراق و عدن و مصر و الهند حتى الصين . و هذا من الشطط ان لم نذكر هنا عناية أهل الحبشة بهذه الجلود . فانها كانت قد اكتسبت عندهم مكانة مرموقة فلذلك أهدى قريش الادم للنجاشي كذلك أهدوها لبطارقة الحبشة و ذلك لمحاولة انزالهم عن الرأى في شأن المسلمين الذين كانوا قد لجأوا عندهم.٧٧

في مشرقي الجزيرة كانت مدينة صحار مقصد التجار للمصنوعات الجلدية في الجاهلية وفي الاسلام أيضا فياتونها من داخلها و خارجها. ٧٨ و قد أفادنا ابن حوقل عن كثرة مالها و تجارتها، فقال :

. . . قصبتها صحار وهي على البحر و بها من التجار و التجارة ما لا يحصى كثرة . وهي أعمر مدينة بعمان و أكثرها مالا.٧٩

و كانت هناك تجار اليهود الراذانية٨٠ الذين كانوا ينطلقون عن مكاناتهم و يذهبون الى أقصى المغرب قرب صقلية ومعهم السلع من منتوجات

٧٥- الاصطخرى : مسالك الممالك - ط ليدن - ص ٢٣ ،
Lammens, H. Yazid I. Beirut, 1921. p. 344.

٧٦- Lammens, H. La Taif. p. 115, 116.

٧٧- ابن هشام : سيرة - ج ١ ص ٢١٨ -

٧٨- ابن المجاور : تاريخ المستبصر - ص ٢٨٣ -

٧٩- ابن حوقل : صورة الارض - ص ٣٨ -

٨٠- "راذان" موضع بالجزيرة او قرب منها ، كما قال ابو غسان - و قال ابو عبيد : قرية من قرى السواد - انظر معجم ما استعجم للبكرى ط القاهرة - ص ٦٢٦ ، ٦٢٦ - و لكنها مدينة بقرب هراة ، انظر مسالك الممالك للاصطخرى - ص ١٠٢ و احسن التقاسيم للمقدسي - ص ٢٠٧ -

بلادها مصاحبة لهم الرجال الذين كانوا يجيدون اللغات العربية و الفارسية والرومية و غيرها من اللغات . و من ثم كانوا يسافرون من المغرب الى العرب و السند و الهند و الصين ماراً من البحر الاحمر متوجها الى المشرق فى بحر الهند، و كانوا يرجعون منها الى مكان انطلاقهم محملين من منتوجات هولاء الممالک كانوا يبيعون فيها سلعهم، و كانوا يتاجرون فى المراسى كلها ذاهبا وآئبا عندما كانوا يحطون رحالهم فيها. ٨١ و ليس بقريب ان تكون الجلود من اهم مبيعاتهم . و كان بعض التجار من الهند يتوجهون الى مدينة قرية من مراكز يمامة و قانة من مراسي حضرموت و يذهبون من ثم الى عدن ومعين تجارة للجلود و مصنوعاتها. ٨٢ ان أهل كنباية كانوا يوردون هذه الجلود و يصنعون منها النعال، التي كانت تعرف بنعال كنبايتية. ٨٣

عثرنا على حادث طريف جاء فى "مهابهارته" فانه أهدى رجل ما بعض الهدايا الى ملک الهند و منها كانت الملابس المصنوعة من الكتان والادم . و من المحتمل أن هذه الهدايا كانت تهدى من رجل يمانى لان علاقات الهند كانت سائرة من طريق البحر حتى و الى اليمن و بعض مدن العرب و ذلک قرونا قبل مولد المسيح عليه السلام. ٨٤

على ضوء ما قدمناه من دباغة الجلود و تجارتها نستطيع أن نقول أن لهذه الصناعة كانت مكانة عظيمة عند العرب على جانب صناعات أخرى .

٨١- ابن خرداذبه : المسالک و الممالک - ص ١٥٣ -

٨٢- ابو ظفر ندوى : تاريخ گجرات - ط ندوه المصنفين دهلى - ص ١٨٢ -

٨٣- المقدسي : احسن التقاسيم - ص ٨٨ ، الجاحظ : البيان و التبيين تحقيق عبدالسلام هارون - ط القاهرة ص ١٦٢ -

٨٤- Schof, V. H. (trans) : The Periplus of the Erythrean Sea New York, 1912. p. 171, art. 137.

محمد طفیل

عرب جاہلیت میں قانون کا تصور

انسانی تہذیب و تمدن کی تاریخ کا مطالعہ کیا جائے تو پتہ چلتا ہے۔ کہ انسان، جو کہ آج تہذیب کے اعلیٰ معیار پر قائم ہے، اپنی تخلیق کے آغاز سے ہی ایسا نہیں تھا۔ بلکہ اس نے موجودہ مرتبہ تک پہنچنے کے لیے بہت سے مراحل طے کئے ہیں۔ انسان نے فرد واحد سے اپنی زندگی کا آغاز کیا اور افراد کے اضافے کے ساتھ ساتھ اس کی ضروریات میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ مزید برآں انسانی ذہن و شعور اور عقل نے جوں جوں ترقی کی اور اس کے سوچنے کا انداز بدلا، اس کی ضروریات زندگی میں اضافہ ہوا اور جب اس کے روابط اپنے دوسرے ہم جنسوں سے استوار ہو کر ترقی پذیر ہوئے تو اسے بہت سی چیزوں کی ضرورت پڑی۔

ان انسانی ضروریات کے تحت بہت سی چیزوں نے جنم لیا، بھائی چارہ اور اخوت، انسیت اور واقفیت معرض وجود میں آئی، تو عداوت، دشمنی، حسد، کینہ، بدنیتی اور غصہ خوری جیسے قبیح خصائل بھی زیر عمل آئے۔ چنانچہ ان سب امور کو جادہ اعتدال سے ہٹنے اور راہ مستقیم پر قائم رکھنے کے لیے معاشرتی قدروں، قوانین اور اصول و ضوابط نے رواج پایا۔ ہر تہذیب اور ہر معاشرہ میں قوانین مختلف رہے ہیں۔ کبھی تو صرف زبانی قوانین پر بھروسہ کیا جاتا رہا اور کبھی چند قوانین کے مجموعہ کو اساس قرار دیا گیا اور بعض اوقات ایسے مجامیع مرتب ہوئے جو روحانی اور دنیوی جملہ امور پر مشتمل تھے۔

اس نشست میں ہم ترتیب قوانین کے جس عہد کا جائزہ لے رہے ہیں وہ اپنی نوعیت اور نسبت کے لحاظ سے بڑا عجیب و غریب اور ساتھ ہی ساتھ بہت اہم دور ہے۔ یہ تاریخ ارتقاء قانون کی ایک ایسی کڑی ہے۔ جس کے بغیر ارتقاء قانون کا تسلسل قائم نہیں کیا جا سکتا۔ اس عہد سے ہماری مراد ''زمانہ جاہلیہ'' ہے۔ یہ ایسا وقت ہے جبکہ ایک

جانب تو حمورابی کا مجموعہ قانون دوازدہ۔ قانون روما اور تورات دنیا میں موجود تھی اور دوسری طرف جس قوم کے جس خاص زمانہ کا ہم ذکر کر رہے ہیں اس میں مرتب قانون کی کوئی واضح یا غیر واضح شکل موجود نہیں تھی۔ بلکہ اس عہد میں صرف روایات اور رسومات کو ہی اس وقت کے قوانین کا نام دیا جا سکتا ہے۔

عہد جاھلیہ، جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہوتا ہے، جہالت کا دور نہیں تھا بلکہ یہ بنی نوع انسان کی ایک حالت اجتماعیہ کا نام ہے۔ جس میں علم و دانش، شعر و حکمت اور فراست و قیافہ شناسی کا دور دورہ تھا۔ جیسا کہ سید قطب تحریر کرتے ہیں۔

''و الجاھلیۃ لیست فترۃ معینۃ من الزمان۔ انما ھی حالۃ اجماعیۃ معینۃ ذات تصورات معینۃ للحیاۃ۔ و یمکن ان توجد ھذہ الحالۃ و ان یوجد ھذا التصور فی ای زمان و فی ای مکان۔ فیکون دلیلا علی الجاھلیۃ حیث کان۔

ہم جب جاھلیۃ کا لفظ استعمال کرتے ہیں تو اس سے عموماً ہماری مراد تاریخ کا وہ دور ہوتا ہے، جو حضرت عیسی علیہ السلام کے بعد سے حضرت نبی اکرم صلی اللہ علیہ و سلم کے اعلان نبوت تک ہے، کیونکہ بعض روایات کی رو سے ''العصر الجاھلی'' کا دوسرا نام زمانہ ''فترۃ'' ہے یعنی وہ عہد جس میں کوئی نبی نوع انسانی کی ھدایت کے لیے مبعوث نہیں ہوا۔ چنانچہ دائرہ معارف اسلامیہ کا مقالہ نگار لکھتا ہے۔

"Djaheleya : In a narrow sense the period when there was no prophet between Jures and Muhammad.

یعنی اصطلاح ''جاھلیۃ'' سے محدود معنوں میں مراد وہ دور ہے جب کہ حضرت عیسی علیہ السلام اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ و سلم کے درمیانی عرصہ میں کوئی پیغمبر اس دنیا میں موجود نہیں تھا۔

عرب معاشرہ پر جب ہم نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے۔ کہ وہاں کوئی مرتب نظام حیات نہیں تھا بلکہ وہ قوم تاریخ تہذیب کے اس دور کی نمائندگی کرتی ہے۔ جسے ہم قبائلی (Trible System) کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ عرب جاھلیۃ کی سیاسی، تہذیبی، معاشی، معاشرتی

حتی کہ مذہبی زندگی بھی اس نظام کے تحت گھومتی ہے۔ ان کے ہاں سب کچھ قبیلہ ہی ہے۔ انفرادی زندگی وہاں کچھ اہمیت ہی نہیں رکھتی۔ بلکہ ہر انسان کو کسی نہ کسی قبیلہ کے ساتھ وابستہ رہ کر زندگی گذارنا ہوگی اور قبیلہ کی پکار پر لبیک کہنا ہوگا، چاہے وہ کسی وقت بھی، کسی جرم کے لیے بھلائے چنانچہ دور جاہلیہ کا مشہور شاعر قریط بن انیف لکھتا ہے۔

لا یسالون اخاہم حین یندبہم　　　فی النائبات علی ماقال برھانا

لیکن اس کا یہ ہرگز مطلب نہیں ہے کہ ان کے ہاں اخلاقی اور معاشرتی قدریں بالکل مفقود تھیں۔ یا ان کے ہاں عدل و انصاف اور حق و صداقت کا کوئی معیار نہیں تھا۔ بلکہ ان کے ہاں عدل و انصاف کا نہ صرف واضح تصور پایا جاتا تھا۔ بلکہ وہ لوگ اس کے حسن و قبائح سے بھی بخوبی آگاہ تھے۔ چنانچہ محمود شکر آلوسی اپنی شہرہ آفاق تصنیف "بلوغ الارب" میں رقم طراز ہیں۔

"ایام جاہلیت میں بھی عربوں کے بعض اکابر ان مصلحتوں سے آگاہ تھے۔ جو عدل و انصاف سے مرتب ہوتی ہیں۔ لہذا انہوں نے باہم پیمان کیا کہ وہ ظلم سے یکسو رہیں گے۔ جوا سے دور رہیں گے اور لوگوں پر زیادتی نہیں کریں گے"۔

اس امر کی تائید اس بات سے بھی ہوتی ہے۔ کہ عربوں کے ہاں منصف (Arbitrator) کا ایک واضح تصور پایا جاتا ہے۔ اور عربوں کے حکام وہ علماء تھے۔ جو ان میں پیدا شدہ جھگڑوں کا فیصلہ دیا کرتے تھے اور ہر قبیلہ کا ایک منصف ہوتا تھا جس کے پاس وہ اپنا جھگڑا چکایا کرتے تھے، چنانچہ عرب کی تاریخ میں بہت سے منصفین کے نام ملتے ہیں جن میں سے چند ایک کے یہ نام ہیں۔ اکثم بن صیفی، حاجب بن زرارہ، اقرع بن حابس۔ ربیعہ بن مخاشن التمیمی، ضمرۃ بن ضمرۃ التمیمی، عامر بن الظرب العدوانی، ہاشم بن عبد مناف، عبد المطلب بن ہاشم القرشی اور ابوطالب بن ہاشم وغیرہم۔

هم نے سطور بالا میں اس امر کا ذکر کیا ہے۔ کہ عربوں کے ہاں قبائلی نظام رائج تھا ۔ اس لیے ان کے ہاں کوئی مرتب قانون کی شکل موجود نہیں تھی ۔ بلکہ ان کے ہاں سب سے زیادہ انحصار روایات اور رسومات پر کیا جاتا تھا اس لیے هم عرب کی رسومات اور خاندانی یا قبائلی روایات ھی کو قانون کا درجہ دیتے ہیں۔ اور جدید اصطلاح قانون میں ان کو روایتی قانون (Customary law) کے نام سے یاد کیا جاتا ہے ۔ لہٰذا هم مختلف عناوین کے تحت جو جزئیات نقل کریں گے وہ انہیں رسومات سے ماخوذ هوں گی ۔

اهل عرب کی تمام زندگی کا عموماً اور قانون یعنی رسوم و روایات کا خصوصاً جو ماخذ بیان کیے جا سکتے هیں، ان میں سب سے زیادہ اهمیت عربی نظم کو حاصل ہے ۔ اس کے بعد وہ نثری روایات هیں ۔ جو هم تک پہنچی هیں ۔ اور اس تعلق سے تیسرا بڑا ماخذ خود قرآن مجید اور حدیث نبوی ہے اور چوتھے درجے پر عربی اساطیر کو ماخذ کی حیثیت حاصل ہے ۔

سطور بالا میں هم نے یہ بیان کیا کہ عربوں کے هاں عدل و انصاف پایا جاتا تھا ۔ جس کے حصول کے لیے ان کے یہاں حکم مقرر هوتا تھا ۔ اور حکم فیصلہ دیتے وقت رسومات و رواج اور روایات کی روشنی میں فیصلے کرتے تھے ۔ اب هم قانون کے خاص خاص پہلوؤں کا جائزہ پیش کرتے هیں تاکہ اس کے بعد هم محاکمہ کر سکیں کہ ان کے هاں قانون کو کیا حیثیت یا مقام حاصل تھا ۔

عربوں میں حریت کوٹ کوٹ کر بھری هوئی تھی وہ کسی غیر حاکم یا رئیس کے مطیع هوکر رهنا نہ جانتے تھے ۔ وہ اپنے خون کو بہت هی ممتاز جانتے تھے ۔ اس لیے کبھی بھی ایران و روم کی عظمت کے قائل نہیں هوتے ۔ لیکن اس کے ساتھ هی ان کے هاں قبیلہ سے باهر تنہا فرد کی کوئی حیثیت نہیں تھی ۔ البتہ جو شخص قبیلہ میں داخل هوتا تھا ۔ اسے جمہوری ممالک کی طرح مساوی حقوق حاصل هوتے تھے ۔ چنانچہ احمد امین لکھتے هیں ”عرب قوم مساوات کو بہت پسند کرتی ہے ۔ بلکہ اس سے عشق رکھتی ہے ۔ لیکن یہ مساوات بھی قبیلہ کی حد تک . . . .“

قبائلی نظام میں قبیلہ کے سردار کو۔ جسے وہ شیخ یا رئیس قبیلہ کہتے تھے۔ بہت اہمیت حاصل ہوتی تھی۔ سردار کا انتخاب بڑی حد تک جمہوری طریقہ پر ہوتا تھا۔ ہر شخص کو اس کے انتخاب میں رائے دینے کا حق حاصل ہوتا تھا۔ تاہم اس عہدہ کا امیدوار وہی شخص ہو سکتا تھا۔ جو جواں مردی، شجاعت، جنگجوئی، حسب و نسب کی حفاظت، قبیلہ کی بہبود، سخاوت، صلہ رحمی، ذہانت و عقلمندی اور دیگر اوصاف و محاسن میں یکتا ہو۔ اور قبیلہ میں کوئی اور فرد اس کے ہم پلہ نہ ہو۔ سردار کے انتخاب یا کسی اور معاملہ میں اختلاف رائے کی صورت میں فیصلہ حکم کرتا تھا۔ اور جن ارکان کو فیصلہ منظور نہیں ہوتا تھا۔ وہ اس قبیلہ سے الگ ہو جاتے تھے۔ یا پھر وہ اپنا الگ قبیلہ بنا لیتے تھے۔ یا کسی اور قبیلہ سے جا ملتے تھے۔ جس کا واضح مطلب یہ ہے۔ کہ ان کے ہاں حزب اختلاف (Opposition) کا کوئی وجود نہیں تھا۔ قبیلہ میں رہتے ہوئے اکثریت کا فیصلہ بہر حال تسلیم کرنا ہوتا تھا۔

سردار منتخب ہونے کے بعد وہ اپنے قبیلہ میں سے چند افراد پر مشتمل ایک مجلس مشاورت منتخب کرتا تھا اور وقتاً فوقتاً ان سے مشورہ کرتا رہتا تھا۔ اور اگر ضرورت پڑتی تو وہ قبیلہ کے سارے افراد کو طلب کر کے ان سے مشورہ اور رائے حاصل کر لیا کرتا تھا۔ اور اس طرح وہ جمہوری نظام کے بہت قریب ہو جاتا تھا۔ لیکن جب مجلس مشاورت یا ارکان قبیلہ اور شیخ کے مابین اختلاف رائے پیدا ہو جاتا تو اس صورت میں آخری اور حتمی فیصلہ شیخ کا ہوا کرتا تھا۔ اس لحاظ سے عوام کی حیثیت صرف ایک رائے دہندہ کی سی رہ جاتی اور شیخ مطلق العنان حاکم قرار پایا جاتا۔ کیونکہ شیخ کو جو بھی حیثیت دی جائے اس کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ چنانچہ جرجی زیدان نے اپنی مشہور کتاب ''تاریخ تمدن اسلام'' میں شیخ کی اہمیت کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچتا ہے۔

''زمانہ جاہلیت میں تمام اہل بادیہ کے ہاں حکومت کا انداز یکساں تھا۔ جو ضرورتیں متمدن دنیا کے رہنے والوں میں بیسیوں شخصوں سے پوری ہوتی ہیں۔ صحرائی قوموں میں وہ تنہا ایک ہی سردار کی ذات میں جمع ہو جاتی ہیں۔ وہی امیر یا بادشاہ بھی ہوتا ہے۔ وہی قاضی،

وھی صاحب خزانہ اور سردار فوج وغیرہ، غرضیکہ تمام کاروبار اسی شخص واحد کی ذات سے وابستہ ھوتے تھے"۔

شیخ قبیلہ کے فرائض میں یہ امور شامل تھے کہ وہ ھر معاملہ میں قبیلہ کی نمائندگی کرتا تھا ۔ لڑائی کے وقت امیر لشکر اور سپہ سالار ھوتا تھا ۔ کسی بھی قبیلہ سے تعلقات کا قیام یا تعلقات کا انقطاع اس کے دائرہ اختیار میں ھوتا تھا ۔ معاشرتی امور مثلاً شادی بیاہ ، اس کے مشورہ سے طے پاتے تھے ۔ باھر سے آنے والے مہمانوں کی نگہداشت اور خاطرو مدارت اسی کے ذمہ ھوتی تھی ۔ کسی دوسرے دشمن قبیلہ کو سیاسی پناہ دینا یا اس کے ساتھ معاھدہ کرنا سردار ھی کے ذریعہ ممکن تھا ۔

سردار کی اھمیت اس امر سے بھی واضح ھے کہ اگر سردار قبیلہ نے کسی دوسرے قبیلہ سے کوئی معاھدہ کر لیا یا اس کے کسی فرد کو سیاسی پناہ دے دی تو سارا قبیلہ اس امر کا ذمہ دار ھوتا تھا کہ وہ آخری دم تک اپنے شیخ کی اطاعت کرتا رھے گا ۔ خود چاھے ختم ھو جائے ۔ لیکن اس شخص کو دشمن کے حوالے نہیں کرے گا جسے اس کے قبیلے کے سردار نے پناہ دے رکھی ھے ۔

اس طرح قبیلہ کے جملہ ارکان، ان کی جان و مال ، عزت و ناموس اور مفادات کا تحفظ ھر فرد کی ذمہ داری ھوتی تھی ۔ کسی ایک فرد کا نقصان، ھتک عزت یا حق تلفی سارے قبیلہ کا نقصان تصور کیا جاتا تھا اور اسے مد مقابل قبیلہ کی جانب سے دعوت مبارزت (Challange for War) تصور کیا جاتا تھا ۔ اور قبیلہ کا ھر فرد اس کا بدلہ لینے کے لیے کوشاں رھتا تھا ۔

عرب جاھلیۃ کی معشیت کا زیادہ تر انحصار تجارت پر تھا ۔ ان کے ھاں کوئی سکہ یا نوٹ وغیرہ مروج نہیں تھا ۔ بلکہ ان کی تجارت میں جنس، جنس سے تبدیل کی جاتی تھی ۔ یعنی ایک شخص کو جو کی ضرورت ھے اور اس کے پاس کھجور ھے تو وہ کھجور دے کر جو حاصل کر لیتا ۔ اس کے علاوہ ان کے ھاں سونے چاندی کی مالی حیثیت بھی قائم تھی ۔

ان کے ھاں انفرادی تجارت بھی ھوتی تھی اور اجتماعی بھی ۔ بعض مرتبہ ان کے ھاں ایسا ھوتا تھا کہ ایک شخص کے پاس کچھ مال ھے ۔

جسے وہ کسی باہر کے ملک بھیجنا چاہتا ہے۔ لیکن وہ مال اتنی مقدار میں نہیں کہ وہ جسے لے کر قافلہ کے ساتھ طویل سفر اختیار کرے ۔ ایسے موقع پر وہ اپنے قبیلے کے کسی ایسے فرد کے ساتھ معاملہ کر لیتا تھا ۔ جو قافلہ کے ساتھ جا رہا ہوتا ۔ ایسے موقعہ پر وہ دونوں نفع اور نقصان میں برابر کے شریک ہوتے تھے ۔ چنانچہ شراکت کبھی بڑھتے بڑھتے بہت وسیع ہو جاتی تھی ۔ اور اس میں بہت سے افراد حصہ دار قرار پاتے تھے ۔ جس کی مثال وہ قافلہ ہے جو ابو سفیان کی قیادت میں شام سے واپس آ رہا تھا ۔ جس میں بہت سے افراد حصہ دار تھے ۔ اس کی مثال موجودہ نظام تجارت میں بالکل کسی فرم یا کمپنی کی سی ہے یہاں بہت سے حصہ دار (Share holders) ہوتے ہیں۔ جو نفع و نقصان میں برابر کے شریک ہوتے ہیں۔

ان کے ہاں قرض کا لین دین بھی ہوتا تھا ۔ جس کی واپسی کی مدت متعین ہوتی تھی ۔ اور اگر مقروض مدت معینہ میں قرض ادا نہیں کر پاتا تھا ۔ تو اسے سود دینا ہوتا تھا یعنی وقت کے مقابلہ میں مقروض کو کچھ زیادہ رقم ادا کرنی ہوتی تھی ۔ یہ وہی شکل ہے جس کے مطابق موجودہ دور میں وقت کے مقابلے میں اضافہ (Interest against Time) وصول کیا جاتا ہے ۔ اور پھر مدت قرض میں اضافہ ہونے کے ساتھ اصل رقم بمعہ عائد شدہ سود کے حساب سے سود بڑھتا رہتا تھا ۔ اسی کی طرف قرآن حکیم کی آیت ”یایھا الذین امنوا لا تاکلوا الربو اضعافاً مضعفة“ میں اشارہ کیا گیا ہے ۔ اور ایسے سود کو حرام قرار دیا گیا ہے ۔ چنانچہ اس آیت کی تفسیر بیان کرتے ہوئے ابن کثیر رقم طراز ہیں ۔

”اہل جاہلیہ سودی قرضہ دیتے تھے، مدت مقرر ہوتی تھی، اگر مقررہ مدت میں روپیہ وصول نہ ہوتا تو مدت بڑھا دیا کرتے تھے ۔ اسی طرح سود در سود مل ملا کر اصل رقم کئی گنا بڑھ جاتی تھی“ ۔

یہاں تک شخصی قوانین کا تعلق ہے ۔ اس عنوان پر بھی ان کے ہاں واضح اشارے ملتے ہیں۔ ان کے ہاں نکاح کا واضح تصور تھا ۔ عام طور سے نکاح یوں ہوتا تھا، کہ ایک مرد دوسرے مرد کی بیٹی، یا اس عورت سے، جو اس کی ولایت میں ہوتی تھی ۔ منگنی کی درخواست کرتا، اور

اس کا مہر مقرر کرتا ۔ جب منگنی منظور کر لی جاتی تو مہر معین کے عوض ان دونوں کا نکاح کر دیا جاتا ۔ منگنی کی درخواست عورت کے باپ بھائی، چچا، چچا زاد بھائی یا اس کے ولی قریب سے کی جاتی تھی ۔ ان کے ہاں قبیلہ اور کفو کا واضح تصور تھا، وہ شادی کرتے وقت اس بات کا بہت خیال رکھتے تھے ۔ اگر عورت کی شادی قریبی رشتہ داروں میں کی جا رہی ہوتی تو رخصتی کے وقت اس کی خوشحالی ، نرینہ اولاد جننے اور شوہر کی عزت کرنے کی دعا دی جاتی، بصورت دیگر اس کے لیے اچھی تمناؤں کا اظہار نہیں کیا جاتا تھا ۔

ان کے ہاں نکاح کی ایک صورت ''استبضاع'' بھی تھی ۔ جس کی رو سے ایام حیض کے اختتام پر عورت کسی سردار، شجاع یا سخی مرد کے ساتھ ہم بستر ہوتی اور اس کا شوہر اس وقت تک دوبارہ اپنی اہلیہ کے قریب نہ جاتا جب تک کہ وہ حاملہ قرار نہ دے دی جائے یہ اس لیے کیا جاتا تھا ، کہ بچہ اعلیٰ نسل کا پیدا ہو ۔ اس کی مثال آریہ قوم کے ''نیوگ'' سے دی جا سکتی ہے ۔ نکاح کی تیسری قسم یہ تھی کہ چند آدمی عورت کی رضا مندی سے اس سے نوبت نبوبت ہم بستر ہوتے ۔ جب وہ حاملہ ہو کر بچہ جنتی تو ان سب کو بلا کر ان میں سے کسی ایک کو اس بچے کا باپ اور اپنا شوہر قرار دے لیتی اور اس شخص کو انکار کی مجال نہیں ہوتی تھی ۔ آج بھی اس کی مثال بعض مغربی ممالک میں پائی جاتی ہے ۔ ان کے ہاں نکاح بدل، نکاح شغا اور بہت سے دیگر طریق بھی مروج تھے ۔

جاہلیہ میں نکاح کی کوئی حد معین نہیں تھی ۔ وہ جتنی عورتوں سے چاہتے شادی کر لیتے تھے ۔ جیسے کہ قیس بن حارث اور غیلان بن سلمہ ثقفی جب مسلمان ہوئے تو ان کے پاس بالترتیب آٹھ آٹھ اور دس دس بیویاں تھیں ۔ اس عہد میں ماں، بیٹی ، خالہ، پھوپھی، بہن، بھانجی وغیرہ سے نکاح جائز نہیں تھا ۔ اور یہ رشتے نسبی یا رضاعی ایک ہی حکم میں آتے تھے ۔ البتہ وہ اپنے باپ کی منکوحہ سے شادی کر لیا کرتے تھے ۔ چنانچہ بنی قیس بن ثعلبہ کے تین بھائیوں نے یکے بعد دیگرے اپنے باپ کی بیوی سے نکاح کیا تھا ۔ اوس بن حجر التمیمی نے ان کے اس قبیح فعل پر ان الفاظ میں انہیں ملامت کی ۔

ینکوا فکیھۃ حول قبتھا فکلکم لابیہ ضیزن سلف

ان کے ھاں دوسری قبیح رسم یہ تھی کہ وہ دو سگی بہنوں سے بیک وقت نکاح کر لیا کرتے تھے ۔ اور یہ ان کے نزدیک کوئی عیب نہیں تھا ۔ چنانچہ قرآن مجید نے اس امر سے انہیں منع کیا ہے ۔ ارشاد باری ہے ۔
ان تجمعوا بین الاختین

نکاح کے ساتھ ساتھ طلاق کا تصور بھی ان کے ھاں موجود تھا ۔ امام شافعیؒ سے ایک روایت منقول ہے ۔ کہ وہ فرماتے ھیں ۔ ''میں نے ثقہ اور معتبر اھل علم کی زبان سے سنا ہے ۔ کہ اھل جاھلیت تین طریقہ سے طلاق دیتے تھے ۔ ایلاء کے ذریعہ، ظہار کے ذریعہ اور طلاق سے ۔ طلاق کو اللہ تعالی نے بعینہ قائم رکھا اور ایلاء و ظہار میں ترامیم کیں ۔ جس کا ذکر قرآن مجید میں بصراحت موجود ہے''۔

اھل جاھلیہ میں شوہر کی طرح بیوی کو طلاق کا حق حاصل ہوتا تھا ۔ اس کا طریق کار یہ ہوتا تھا کہ جب کوئی عورت اپنے شوہر کو طلاق دینا چاہتی ۔ تو جس خیمہ میں وہ مقیم ہوتی اس کے دروازے کو بدل دیتی، یعنی اگر خیمے کا دروازہ مشرق کو ہے ۔ تو اسے مغرب کی طرف اور مغرب کو ہے ۔ تو اسے مشرق کی جانب تبدیل کر دیتی ۔ اس عورت کا یہی عمل طلاق قرار پاتا ۔ اور خاوند جب خیمے کا بدلہ ہوا رخ دیکھتا تو سمجھ جاتا کہ اس کی بیوی نے اسے طلاق دے دی ہے، پھر اس کے پاس نہ جاتا اور یہ دونوں میاں بیوی ایک دوسرے سے جدا ہو جاتے ۔

ان کے ھاں طلاق بصورت خلع بھی مروج تھی ۔ اس طریقہ کا ذکر علامہ آلوسی نے اپنی کتاب ''بلوغ الارب'' میں کیا ہے ۔ کہ خلع کا موجد عامر بن ظرب ہے ۔ جس کا مختصر حال یہ ہے ۔ کہ اس نے اپنی بیٹی اپنے بھتیجے عامر بن حارث سے بیاہی تھی ۔ نکاح کے بعد جب دلہن نے اپنے دلہا کو دیکھا تو وہ اسے پسند نہ آیا اور اسے اپنے شوہر سے نفرت ہو گئی ۔ جس کا ذکر اس نے اپنے والد سے کہا ۔ باپ نے کہا ۔ کہ اگر تو اس سے علیحدگی چاہتی ہے تو وہ مال جو اس نے تمہیں مہر میں دیا ہے ۔ اسے واپس لوٹا دے ۔ یہ مجھ سے نہیں ہو سکتا کہ تجھے تیرے شوہر سے میں چھڑا دوں

اور اس کا مال بھی تیرے پاس رہے - پھر اس کے شوہر سے کہا کہ جو مال تو نے اسے دیا تھا وہ میں اس سے واپس کرائے دیتا ہوں - تو اسے چھوڑ دے - چنانچہ وہ رضا مند ہو گیا اور یہ سب سے پہلا خلع تھا - جو عرب جاھلیہ میں واقع ہوا -

طلاق کے بعد عدت کا تصور بھی ان کے ہاں پایا جاتا تھا - طلاق اور موت دونوں کی عدت مقرر تھی - مطلقہ کی عدت کی مدت تو معلوم نہیں ہو سکی - البتہ قرآن مجید کی آیت - ''والذین یتوفون منکم و یذرون ازواجا وصیة لا زواجھم متاعا الی الحول غیر اخراج'' - اس طرف اشارہ کرتی ہے - کہ وفات کی صورت میں ایک سال کی عدت پوری کی جاتی تھی - عدت کا طریق کار یہ تھا - جب کسی عورت کا شوہر فوت ہو جاتا تو وہ ایک چھوٹے سے تنگ گھر - جس کی چھت عموماً نیچی ہوتی - میں نہایت خراب اور میلے کچیلے کپڑے پہن کر بیٹھ جاتی - سال بھر اس میں بیٹھی رہتی ، نہ نہاتی، نہ کپڑے بدلتی، نہ ناخن کاٹتی، نہ خوشبو لگاتی جب سال پورا ہو جاتا تو اس وقت اس کے پاس کوئی جانور - گدھا، بکری یا کوئی پرندہ لایا جاتا تو اس کے ساتھ وہ اپنی عدت توڑتی - جب وہ باہر نکلتی تو اس کے ھاتھ میں چند مینگنیاں ہوتیں - جن کو وہ اپنے کندھے پر سے پیچھے پھینک دیتی یہ گویا عدت کے اختتام کا اعلان ہوتا تھا - اس کے بعد وہ ضروریات زندگی استعمال کرنا شروع کر دیتی تھی -

عرب جاھلیت میں میراث اور ترکے کے بھی کچھ اصول تھے - ان کے ہاں میت کے ترکے کی مالک اس کی اولاد نرینہ ہوتی تھی ، جو دشمن کا مقابلہ کر سکتی - حسب و نسب اور قبیلہ کے وقار کی حفاظت کر سکتی تھی - عورتیں لڑکیاں اور نابالغ لڑکے، جو جنگ کی طاقت نہیں رکھتے تھے، میراث سے محروم رہتے تھے - ان کے ہاں حصص کا کوئی واضح تعین نہیں ملتا - جو شخص جس قدر بہادر، جنگجو اور طاقت ور تسلیم کیا جاتا - اس کا حصہ اسی قدر کم یا زیادہ آتا تھا -

ان کے معاشرہ میں متبنی بنانے کی بھی رسم پائی جاتی تھی اور متبنی لڑکا اپنے والدین کی جائداد کا ویسا ھی وارث قرار پاتا تھا - جیسا کہ نسبی اور صلبی لڑکا ہوتا تھا -

ہم نے اپنے مختصر سے مقالے میں عربوں میں سیاسی قانون، تجارتی قانون اور شخصی قانون کا نہایت اختصار کے ساتھ جائزہ لیا ہے۔ جس سے ہم اس نتیجہ پر پہنچے ہیں۔ کہ عرب معاشرہ کوئی بے قانون معاشرہ نہیں تھا۔ بلکہ اس میں جو رسوم و رواج پائے جاتے تھے۔ انہیں ہی قانون کی حیثیت حاصل تھی۔ اور یہ قوانین نسلاً بعد نسل منتقل ہوتے رہتے تھے۔ نئے قوانین کا اجراء بھی عمل میں آتا رہتا تھا۔ اور معاشرہ کے موجودہ قوانین میں ترامیم اور تبدیلیاں بھی ہوتی رہتی تھیں۔

اب یہ ہماری سب کی ذمہ داری ہے کہ ہم عرب معاشرہ کا گہرا مطالعہ کر کے ایک مکمل قانونی ڈھانچے کا تعین کریں۔ تاکہ جاہل قوانین کا اسلامی قوانین سے موازنہ کیا جا سکے۔ اور پتہ لگایا جا سکے۔ کہ اسلام نے کس حد تک جاہلی قوانین کو قبولیت یا عدم قبولیت سے نوازا ہے۔

محمد طفیل
ادارۂ تحقیقات اسلامی،
اسلام آباد

الشیخ محمد بن ناصر العبودی

خطاب خاص

یونیورسٹی اوریئنٹل کالج لاهور کے جشن صد ساله کی تقریب میں شریک هونے کے لیے دنیاے عرب کے ایک نامور محقق فضیلة الشیخ محمد ابن ناصر العبودی، سیکرٹری جنرل، جامعه اسلامیه، مدینه منوره تشریف لائے۔ اوریئنٹل کالج کی طرف سے انهیں ایک استقبالیه دیا گیا۔ جناب ڈاکٹر رانا محمد نصر الله احسان الهی نے اپنے ترحیبی خطبے میں جناب الشیخ العبودی کا مفصل تعارف کروایا اور کالج کے پرنسپل، اساتذه، طلبه اور کانفرنس کے منتظمین کی طرف سے انهیں خوش آمدید کہا اور موقر جامعه اسلامیه کی نمایندگی کرتے هوئے جشن صد ساله کی تقریب میں تشریف لانے پر ان کا شکریه ادا کیا۔

فضیلة الشیخ العبودی نے صاحب السماحة الشیخ عبد العزیز بن باز، رئیس الجامعه الاسلامیه کا پیغام پڑھ کر سنایا۔ اور رئیس الجامعه، جمله اساتذه اور دیگر موظفین جامعه کے علاوه طلبه جامعه اور اهل مدینة الرسول (صلی الله علی صاحبها و آله وسلم) کی طرف سے هدیهٔ تبریک پیش کیا اور ان کے عواطف پاکیزه اور نیک تمنیات کا اظهار کیا۔

اس کے بعد جناب الشیخ العبودی نے اپنے فاضلانه خطبے میں کہا که هم اهل عرب اور خصوصاً اهل مدینه کو پاکستان اور اهل پاکستان سے بےانتها محبت هے۔ پاکستان اسلام کا قلعه هے اور هم سب اس کی سر بلندی کے خواهاں هیں۔ انهوں نے مزید فرمایا که اگرچه عرب اور پاکستان کے درمیان جغرافیائی فاصلے حائل هیں لیکن هم دلوں کی محبت اور عقیدے کے اتحاد کی وجه سے بے حد قریب هیں۔ یہاں پاکستان آ کر مجھے ایک لمحے کے لیے بھی محسوس نهیں هوا که میں وطن سے دور هوں۔ پھر فرمایا که عقیدے کی قرابت خون اور نسل کی قرابت سے زیاده مضبوط هوتی هے۔ خون اور نسل کا رشته ایک زمینی رشته هے جبکه عقیدے کا رشته آسمانی رشته هے اور ظاهر هے که آسمانی رشته زمینی رشتوں سے افضل اور مقدم هے۔

جناب محمد ناصر العبودی نے فرمایا کہ اسلام وحدت کا پیغام لے کر آیا ۔ عربستان سے ھدایت کی جو روشنی چار دانگ عالم میں پھیلی وہ کسی نسل یا قوم کی روشنی نہ تھی، اس کے پھیلانے والے صرف عرب ھی نہ تھے، ان میں روم کے صہیب رض اور حبشہ کے بلال رض اور فارس کے سلمان رض بھی شامل تھے ۔ بلال رض اگرچہ حبشہ کے تھے لیکن اسلام کی نسبت سے حضرت عمر الفاروق رض نے انھیں اپنا ''آقا'' کہا ۔ اور ابولھب حضور اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کا سگا چچا تھا لیکن وہ تا قیامت ھلاکت اور بربادی کا شکار بنا دیا گیا ۔

جناب الشیخ العبودی نے بیت اللہ پر ابرھہ کے حملے کی تمثیل دی اور فرمایا کہ جب ھاتھی حملہ آور ھوئے تو اھل مکہ بیت اللہ کو غیر محفوظ چھوڑ کر خود پہاڑوں میں جا چھپے ۔ لیکن چند سالوں کے بعد جب اسلام کی قوت انھیں حاصل ھو گئی تو وھی عرب جو بیت اللہ کی حفاظت نہ کر سکتے تھے قیصر و کسریٰ کی سلطنتوں کے مالک بن گئے ۔ قوت کا سر چشمہ درحقیقت ایک نظریہ تھا اور وہ نظریہ اسلام ھے ۔

الشیخ العبودی نے فلسطین اور پاکستان کے حالیہ بحران کا ذکر کرتے ھوئے فرمایا کہ ھم جب تک اپنی مغلوبیت کے اسباب کا تدارک نہ کریں گے ھم فتح اور کامرانی کے نہ خواھاں ھو سکتے ھیں نہ مستحق ۔ انھوں نے کہا کہ قرآن مجید اور حدیث میں واضح طور پر بتایا گیا ھے کہ بنو اسرائیل دنیا میں دو بار غلبہ حاصل کریں گے اور فساد عظیم برپا کریں گے ۔ پہلی بار ان کے فساد کا ازالہ غیر مسلم کریں گے اور دوسری بار ان کا قلع قمع اھل اسلام کریں گے ۔ چنانچہ پہلی بار بخت نصر نے انھیں مغلوب کیا ۔ اب ھمیں اپنا کردار ادا کرنے کے لیے تیار رھنا چاھیے ۔

الشیخ العبودی کے مرصع و مسجع خطبے کے بعد سابق چیف جسٹس (پاکستان) جناب ڈاکٹر ایس ۔ اے ۔ رحمان نے جناب الشیخ العبودی کا شکریہ ادا کیا ۔ ان کے عالمانہ خطاب سے مستفید ھونے پر اظہار ممنونیت کیا اور اورینٹل کالج کے جشن صد سالہ (اپریل ۱۹۷۳ء) پر دوبارہ ضرور تشریف لانے کی درخواست کی ۔

(۲۳ دسمبر ۱۹۷۲ء)

ڈاکٹر محمود زینی

عربی مخطوطات

یونیورسٹی اورینٹل کالج لاہور کے جشن صد سالہ کی ایک تقریب جمعرات ۲۱ دسمبر ۱۹۷۲ء کو اورینٹل کالج میں منعقد کی گئی سعادۃ الشیخ/خالد حمدان، مدیر المرکز الثقافی العربی، لاہور نے اجلاس کی صدارت کی۔

اس موقعہ پر عالم عرب کے ایک جوان سال محقق الدکتور/محمود زینی نے جامعۃ الملک عبدالعزیز، جدہ کی نمائندگی کرتے ہوئے "مسلمانوں کا علمی و فکری ورثہ اور ہماری ذمہ داریاں" کے موضوع پر ایک نہایت وقیع اور فکر انگیز مقالہ پڑھا۔

الدکتور/محمود زینی نے بڑے جامع اور تفصیلی انداز سے عربی زبان میں اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے اس حقیقت کی طرف متوجہ کیا کہ یہودیت، ہندومت اور اشتراکیت (کمیونزم) سیاسی اور فکری میدان میں مسلمانوں کے خلاف ہمیشہ تحریکی انداز میں سرگرم عمل رہے ہیں۔ ایشیا اور افریقہ میں مسیحیت بھی مسلمانوں کے خلاف مصروف چلی آ رہی ہے۔ الدکتور/زینی نے تاریخ اور حقائق کا تجزیہ کرتے ہوئے کہا کہ صیہونیت اور کمیونزم دو ایسی تحریکیں ہیں جنہوں نے اسلام کو ختم کرنے کی پوری کوشش کی اور ان تحریکوں کے علم بردار آج تک اپنی کوششوں میں مصروف ہیں۔ لیکن الحمد للہ مسلمانوں کا تشخص برقرار ہے اور بحیثیت ایک قوم اور ملت کے ہم دنیا میں اپنا ایک وجود رکھتے ہیں۔ سازشیں آج بھی جاری ہیں۔

الدکتور/زینی نے بطور مثال ذکر کیا کہ حبشہ میں مسیحیت کی جد و جہد مسلمانوں کے خلاف اب بھی جاری ہے۔ اسی طرح یوگنڈا کے عدی امین کے خلاف یہودیوں اور برطانوی عیسائیوں کی سازشوں کا جال پھیلا ہوا ہے۔ اور فلپائن میں اہل اسلام کے خلاف تحریک زور پکڑ رہی ہے۔ الدکتور/زینی نے مسلمانوں کو مغربی خبر رساں ایجنسیوں کی مسخ

شدہ مجرموں سے ہوشیار رہنے کی اپیل کی اور بتایا کہ تاشقند، بخاری اور دوسرے روسی ترکستان کے شہروں میں کمیونسٹوں کے بہیمانہ اور انسانیت سوز مظالم جو انھوں نے وہاں کے مسلمانوں کو ختم کرنے کے لیے روا رکھے وہ بڑی تاریخ کا ایک حصہ ہیں - اور فلسطین و یروشلم میں یہودیوں کی چیرہ دستیاں تو تاریخ معاصر کا ایک باب ہیں -

الدکتور/زینی نے کہا کہ ایک زمانہ تھا کہ اہل اسلام ساری دنیا میں سائنس، تہذیب و ثقافت، فلسفہ اور ادب میں سب اقوام عالم کے امام متصور ہوتے تھے - لیکن مقام افسوس ہے کہ آج کا مسلمان خود علم کی روشنی کے لیے یورپ کی طرف دیکھتا ہے - یہ حقیقت ہے کہ یورپ میں علم و فن کی روشنی مسلمانوں کے جلائے ہوئے چراغوں ہی کی مرہون منت ہے لیکن اہل یورپ اب اپنے افکار اور علمی کاوشوں میں اتنے متعصب واقع ہوئے ہیں کہ وہ علم جو آج تک ہمارے شاہزادوں تک یورپ کے واسطے سے پہنچ رہا ہے اس میں اسلام کی تاریخ اور ثقافت کے خلاف زہر بھرا ہوتا ہے -

الدکتور/زینی نے اس بات پر زور دیا کہ علمائے اسلام کو وہ علمی خزانے جن سے یورپ کی یونیورسٹیاں مستنیر ہوئیں ہمیں ان سے براہ راست مستفید ہونے کا عزم کرنا چاہیے - انھوں نے یہ انکشاف کیا کہ صرف متحف بریطانیا (برٹش میوزیم) لندن ہی میں مسلم علماء کے کم از کم ڈیڑھ لاکھ علمی مخطوطات محفوظ ہیں اور مجموعی طور پر لندن، پیرس جرمنی، سپین ، واٹیکن، روم، صنعاء، تاشقند، وغیرہ کی لائبریریوں میں تیس لاکھ قلمی مخطوطے موجود ہیں جو امت مسلمہ کے نوجوان سپوتوں کی توجہ کے منتظر ہیں اور مسلمان محققین کی راہ دیکھ رہے ہیں - لیکن آج اغیار کی سازشوں کے باعث مغربی تہذیب کی بالا دستی اور ہماری اپنی ایمانی کمزوری کی بناء پر مسلمان خود تشکیک کا شکار ہے - اس لیے وہ یورپ کی طرف دیکھتا ہے - الدکتور/زینی نے اس انداز فکر کو سختی سے تبدیل کرنے کی ضرورت پر زور دیا اور رابطۃ العالم الاسلامی کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ اس دور میں مسلمانوں کے لیے وہ مرکز نشأۃ ثانیہ کا آغاز بن سکتا ہے، اور ہم اس مرکز سے تہذیبی، ثقافتی اور علمی احیاء کی عالم گیر تحریک کو کامیاب بنا سکتے ہیں -

چوتھا اجلاس

ایران اور فارسی زبان و ادب

خطبات و مقالات

ڈاکٹر عبادت بریلوی

ڈاکٹر میاں عبدالشکور احسن

جناب آقای منوچہر ظلی، سفیر کبیر ایران

آقای عبداللہ فریاد

دکتر ناصرالدین حسینی

دکتر ضیاء الدین سجادی

دکتر جلال متینی

دکتر مشکوٰۃ الدینی

دکتر محمد سعید افغانی

دکتر مظاہر مصفا

جلسات کنگرهٔ بین المللی خاورشناسان که به مناسبت جشن صد ساله تأسیس دانشکدهٔ خاورشناسی تشکیل گردیده از لحاظ ما قسمت فارسی مهم بود. طبق برنامه ریاست جلسهٔ فارسی را آقای دکتر سید ناصر الدین شاه حسینی، استاد دانشکدهٔ تهران، بعهده داشتند ولی برنامه را ترتیب میدادیم درست معلوم نبود که آیا استاد مجتبی مینوی نیز درین کنگره شرکت میفرمایند یا نه. ولی خوشبختانه اظهار لطف فرموده همان روز تشریف آوردند.

بعد از قرائت کلام الله مجید آقای دکتر شاه حسینی فرمودند که چون استاذ الاساتذه جناب آقای مینوی بین ما تشریف دارند و استاد بنده نیز میباشند، پیشنهاد بلکه تقاضا میکنم که ریاست این جلسه را ایشان قبول فرمایند. بنابرین ایشان صندلی ریاست را مزین فرمودند. در پایان این جلسه استاد مجتبی مینوی به بیانات شیرین و شیوای خود که دربارهٔ دانشکدهٔ خاورشناسی دانشگاه پنجاب و لاهور بود، حضار جلسه را مستفید فرمودند و سپس ارادت و عقیدت خود نسبت به حضرت علامهٔ اقبال ابراز نموده منظومه های ذیل از حضرت علامه را بایک شور خاصی قرائت کردند. آهنگ قرائت کردن شان اینقدر جذاب و جلالی بود که حالی به شنوندگان محترم جلسه دست داده بود و همه کس بجای خود می جنبید و کیف میکرد.

عبادت بریلوی

چون چراغ لاله سوزم در خیابان شما
ای جوانان عجم جان من و جان شما!

غوطه ها زد در ضمیر زندگی اندیشه ام
تا بدست آورده ام افکار پنهان شما

مهر و مه دیدم، نگاهم بر تر از پروین گذشت
ریختم طرح حرم در کافرستان شما!

تا سنانش تیز تر گردد فرو پیچیدمش
شعلهٔ آشفته بود اندر بیابان شما

فکر رنگینم کند نذر تهی دستان شرق
پارهٔ لعلے که دارم از بدخشان شما

می رسد مردے که زنجیر غلامان بشکند
دیده ام از روزن دیوار زندان شما

حلقه گرد من زنید اے پیکران آب و گل
آتشے در سینه دارم از نیاگان شما !

اے غنچۂ خوابیده چو نرگس نگران خیز
کاشانۂ ما رفت بتاراج غمان خیز
از نالۂ مرغ چمن، از بانگ اذان خیز
از گرمی هنگامۂ آتش نفسان خیز
از خواب گران، خواب گران خواب گران خیز!
از خواب گران خیز!

خورشید که پیرایه بسیماے سحر بست
آویزه بگوش سحر از خون جگر بست
از دشت و جبل قافله‌ها رخت سفر بست
اے چشم جهان بیں به تماشاے جهان خیز
از خواب گران، خواب گران خواب گران خیز!
از خواب گران خیز!

خاور همه مانند غبار سر راهے است
یک نالۂ خاموش و اثر باخته آهے است
هر ذرۂ این خاک گره خورده نگاهے است
از هند و سمرقند و عراق و همدان خیز
از خواب گران، خواب گران خواب گران خیز!
از خواب گران خیز!

دریاے تو دریاست که آسوده چو صحراست
دریاے تو دریاست که افزون نشد و کاست
بیگانۂ آشوب و نهنگ است چه دریاست!
از سینۂ چاکش صفت موج روان خیز
از خواب گران، خواب گران، خواب گران خیز
از خواب گران خیز!

این نکته کشائندهٔ اسرار نهان است
ملک است تن خاکی و دین روح روان است
تن زنده و جان زنده ز ربط تن و جان است
باخرقه و سجاده و شمشیر و سنان خیز
از خواب گران، خواب گران خواب گران خیز!
از خواب گران خیز!

ناموس ازل را تو امینی تو امینی!
دارائے جہان را تو یساری تو یمینی
اے بندهٔ خاکی تو زمانی تو زمینی
صہبائے یقین درکش و از دیر گمان خیز
از خواب گران، خواب گران خواب گران خیز!
از خواب گران خیز!

فریاد ز افرنگ و دل آویزی افرنگ
فریاد ز شیرینی و پرویزی افرنگ
عالم همه ویرانه ز چنگیزی افرنگ
معمار حرم! باز به تعمیر جهان خیز
از خواب گران، خواب گران خواب گران خیز!
از خواب گران خیز!



پروفیسر ڈاکٹر میاں عبدالشکور احسن

دکتر عبدالشکور احسن

خیر مقدم

برای اینجانب مایهٔ کمال افتخار و سعادت است که عده‌ای از استادان نامدار دانشگاه‌های تهران و مشهد و استانبول در جشن صد سالهٔ بنیان گذاری دانشکدهٔ خاور شناسی شرکت نموده و جناب آقای منوچهر ظلی سفیر محترم شاهنشاه آریا مهر در پاکستان ریاست جلسه را بعهده گرفته اند ـ شرکت مهمانان گرامی ارزش و اهمیت جشن ما را بمراتب افزوده و روابط نزدیک فرهنگی و علمی و سیاسی سه کشور برادر ایران و ترکیه و پاکستان را خاطر نشان ساخته است ـ وظیفهٔ خود میدانم که از استادان ارجمند عالیقدر و مقام محترم سفارت صمیمانه خوش آمد عرض نمایم.

خانم‌ها و آقایان گرامی! چنانکه مستحضر هستید زبان فارسی در پاکستان سابقهٔ یک هزار ساله را دارد ـ مورخان و جغرافیادانان و سیاحان قرن چهارم هجری از رواج این زبان در سند سخن رانده اند ـ در طی قرنهای متمادی زبان فارسی نه تنها زبان اداری و رسمی بلکه زبان شعر و ادب و تصوف و عرفان و حکمت و فلسفهٔ مسلمانان شبه قاره بود ـ و دانشوران و ادباء و فضلای ما افکار و عقاید و احساسات خود را در همین زبان شیرین ابراز نموده اند ـ

بنا به عقیدهٔ عادی تاریخ ادبیات فارسی در پاکستان از دورهٔ غزنویان آغاز میگردد ولی پیش از آن اولین زن شاعر فارسی رابعه قزداری در خضدار فعلی بلوچستان پاکستان میزیسته است ـ بنابرین تاریخ طولانی شعر و ادبیات فارسی در کشور ما از شعر دل انگیز همین شاعرهٔ زیبای خضدار آغاز میگردد و تا مرحوم علامه اقبال میرسد که کلام وی محتوی بهترین و درخشان ترین سنن شعر فارسی میباشد ـ

در دورهٔ غزنویان زبان فارسی در پنجاب رونق زیادی پیدا کرد و لاهور مرکز مهم زبان و ادبیات فارسی گردید ـ با تأسیس سلطنت اسلامی

در دهلی در آغاز قرن هفتم هجری تا انقراض سلسلهٔ گورگانی بابری در قرن سیزدهم هجری فارسی نه تنها زبان رسمی و اداری مسلمانان شبه قاره پاکستان و هند بلکه زبان فرهنگی و علمی ایشان بوده است و در طی قرنهای متمادی عدهٔ زیاد شاعران و نویسندگان توانا و مبتکر و هنرمندان و دانشوران برجسته بوجود آمده است که تمام آثار خود را بفارسی نوشته اند و در نتیجهٔ آن تمام علوم دینی و عرفانی و فلسفی ما اصولاً در فارسی برشتهٔ تحریر در آمده است ـ

ناگفته نماند که زبان فارسی در پاکستان بطور مستقل رشد کرده و باتغییر مکان وگذشت زمان مشخصاتی را پیدا کرد که آنرا تا اندازه ای از فارسی معاصر ایران متفاوت میسازد ـ این تفاوت بر حسب اصول زبانشناسی است و در صورت و معنای و تلفظ و آهنگ زبان مؤثر است ـ رویهم رفته زبان فارسی که در شبه قاره رشد کرده هم نزدیک‌تر بزبان سعدی و حافظ و هم نمودار ذوق و سلیقهٔ مردم محلی میباشد ـ

زبان فارسی زبانهای محلی پاکستان را تحت تأثیر فراوانی قرار داد ـ خود زبان اردو که زبان ملی ماست غیر از قواعد دستوری آن در سایر جهات شبیه بفارسی است و در حدود پنجاه در صد، کلمات اردو از فارسی گرفته شده است ـ اصطلاحات و لغات علمی و ادبی که تقریباً همه فارسی است و یا عربی است که توسط زبان فارسی در اردو نفوذ کرده است ـ ادبیات اردو از سنن شعر و ادب فارسی الهام گرفته است و شعر اردو از لحاظ قوانین شعری و عروضی از زبان فارسی تبعیت میکند ـ انواع شعر و تشبیهات و استعارات و تلمیحات و صنایع و بدایع که در شعر کلاسیکی اردو بکار رفته همه و همه از شعر فارسی ریشه گرفته است ـ

خلاصه زبان فارسی بصورت زبان فرهنگی پاکستان درآمده است و بر ما لازم است که برای حفظ سنن علمی و فرهنگی خود زبان فارسی را زنده نگاه داشته باشیم ـ گذشته ازین برای تحکیم روابط فرهنگی و معنوی و تشیید مبانی دوستی و برادری با کشور همجوار ایران زبان فارسی برای ما اهمیت فوق العاده را داراست ـ بخش فارسی دانشکدهٔ خاورشناسی برای ترویج زبان

فارسی خدمات شایانی را انجام داده است و استادان فارسی باتحقیقات و تتبعات مداوم علاقه‌مندی فراوان خود را بازبان و ادبیات فارسی و فرهنگ و تمدن ایران ابراز نموده اند - امیدواریم که باگذشت زمان و تحکیم روابط صمیمانه بین دوکشور برادر ایران و پاکستان این علاقه مندی هرچه بیشتر رو به افزایش میرود و هر دو ملت برادر مسلمان از لحاظ معنوی و روحی بایکدیگر نزدیکتر میشوند -



آقائی منوچہر ظلی سفیر کبیر ایران، پروفیسر مجتبیٰ مینوی، ڈاکٹر جلال متینی، ڈاکٹر جسٹس اے رحمان

خطابهٔ

جناب آقای منوچهر ظلی

سفیر کبیر دولت شاهنشاهی ایران در اسلام آباد

ایران و پاکستان دو قالب و یک جان

در گفتگویی دربارهٔ روابط ایران و پاکستان، یکی از دوستان پرسید: ''به نظر شما روابط ایران و پاکستان از چه زمانی شروع شد؟'' معلوم بود که انتظار دارد من از هخامنشیان شروع بکنم و به زمان حاضر برسم ـ گفتم: ''روابط ما از زمانی شروع شد که کرهٔ زمین به شکل فعلی خود درآمد و ایران و پاکستان درکنار هم پیوسته و جوش خورده بهم قرار گرفتند ـ آری در نظر من اصطلاح ''روابط''را در مورد ایران و پاکستان بکار بردن درست نیست ـ چه روابط درمیان دو چیز جدا از هم بوجود میآید نه بین قسمتهای مختلف یک واحد یک پارچه که از بپیوستن تارها و پودها بوجود آمده است ـ

قطعاً منظور روابط مردم ایران و پاکستان است ـ دراین مورد هم می پرسم: ''شما دوره ای از زمان بیکران را نشان بدهید که درآن دوران مردم این دو سرزمین ، هم خون و هم نژاد و هم زبان نبودند تا بگویم از فلان وقت رابطه بین ما بر قرار گردید ..

تاریخ را ورق بزنیم و به اوراق آن به اجمال نگاه کنیم ـ از عصر حجر آغاز کنیم که طولانی ترین بخش زندگی بشر است ـ در آغاز این عصر، بشر جانور دوپایی بیش نبود که گیاه می خورد و میوه می چید و سنگ می انداخت و شکار می کرد و در غار پناه می گرفت ـ کم کم سنگها را شکل و صورتی داد و گرزی بر شانه گذاشت و کمان و تیرهائی بدست گرفت و شکارچی ماهری شد ـ آتشی بر افروخت و ظروفی ساخت و زمینی کاشت و غار را ترک کرد و خانه ای ساخت و دهکده ای را بنیان گذاشت و

جانوران را اهلی گردانید- افزارهای سنگی و همه آثاری که بدست کاوشگران باستانشناسی کشف شده مبین آن است که در این عصر طولانی پیشرفت بشر در سرتاسر ایران و پاکستان یکسان و همسان بوده است و این منطقه را مردمانی واحد و همبسته آباد کرده بودند-

عصر حجر را پشت سر می گذاریم و به عصر مفرغ می رسیم- دهکده‌ها و شهرستانهای این منطقه یعنی از آذربایجان و کردستان و خوزستان گرفته تا سرحد و پنجاب و سند را می بینیم که در آن مردمی زندگی می کنند که به استناد کاوشهای باستانشناسی، مشتمل بر دو یا سه نژاد بودند ولی باهم زندگی می کردند و تمدن واحدی داشتند و چون اکثریت با یک نژاد خاص بود، به احتمال قوی به یک زبان گفتگو می کردند- همین مردم بودند که در شرق تمدن موئن جودارو (Moenjo-Daro) را بوجود آوردند و در غرب پادشاهی عیلام را تشکیل دادند- تمدن موئن جودارو که اوج تمدن این مردم را در بر دارد، زاده و پروردهٔ عصر مفرغ است- از بازرگانی مردم موئن جودارو با غرب ایران آگاهیم و می دانیم که اهالی این منطقه وسیع همیشه باهم در تماس بودند و هرچه تمدن پیش رفت و منطقه گسترش پیدا کرد، آمد و شد آنها بویژه به صورت مهاجرت بیشتر شد- اطلاعاتی که راجع به این مردم داریم از حفاریهای باستانشناسان بدست آمده است- اما اگر وسعت منطقه را با حفاریهایی که انجام گرفته بسنجیم، باید بگوئیم که هنوز در خم اولین کوچه ایم- بسیار دانستنیها است که در دل این خاک نهفته مانده است، ولی هر روز که جائی حفاری می شود، دلیل تازه ای بر هم فرهنگی ایران و پاکستان یافت می شود- همین چندی قبل مقاله ای دربارهٔ نمایشگاه اشیای مکشوفه از شهداد در کنار دشت کویر و در هفتاد و پنج کیلومتری کرمان خواندم- این تمدن مربوط به چهار هزار سال قبل از میلاد مسیح است- مهمترین عامل مشخصهٔ این تمدن علایم تصویری (Pictography) است که بعقیدهٔ باستانشناسان اولین خطی است که انسان ابداع نموده است- آیا این خط که از آن هفت صد علامت مهندسی روی سفالها دیده شده است، ربطی با خط موئن جودارو که هنوز خوانده نشده است، دارد یا نه؟، باید انتظار تحقیقات بیشتری را داشت.

چهار هزار سال قبل مهاجرت دستجمعی قوم آریایی آغاز گردید و سیلاب‌وار همه ایران و پاکستان را فرا گرفت و تمدنهای موئن جودارو و سیالک (Sialk) در جوار کاشان امروز و عیلام را پوشاند و جان تازه‌ای به این سرزمین داد و خون تازه‌ای به مردم آن بخشید - اگر دربارهٔ همزبانی و همکیشی و همنژادی مردم قبل از آریا و دلیلی جز آنکه باستانشناسان می گویند نداریم، دربارهٔ این نوواردان دلایل زبانشناسی، مردمشناسی، دینشناسی و باستانشناسی بس محکمی داریم که از یگانگی آنان حکایت می کند - بطوریکه هزار و اندی سال بعد هم زبان شاهنشاهان هخامنشی با لهجهٔ مردم پنجاب نزدیک بود - کافی است که به نوشته های کهن اوستا، فارسی باستان و سانسکریت رجوع کنیم و ملاحظه نمائیم که چگونه در هر چیز، زبان و عقاید و اجتماع و سایر شئون زندگانی، این مردم فرهنگ یگانه‌ای داشته اند و اگر هم فرقی مشاهده می شود، اقلیمی بوده است که بسیار طبیعی است -

دو هزار پانصد سال پیش، نخست مردم ماد و سپس قوم پارسی برخاستند و برق آسا نه تنها همه آریایی‌ها را بزیر یک پرچم گرد آوردند بلکه دنیای متمدن آن زمان را در لوای شاهنشاهی خود بهم پیوستند و بار دیگر آمد و شد، داد و ستد در محیط صلح و آشتی آغاز گردید و بسرعتی بی نظیر بسوی ترقی و پیشرفت گام برداشتند .

بزرگترین ارمغانی که شاهنشاهی هخامنشی به جهان داد مدیریت بود و آن مدیریت نظمی به جامعه بشر بخشید - پس از هخامنشیان، خاندانهای ممتازی مانند موریان (Mauryan) و اشکانیان و کوشانیان و ساسانیان از این مدیریت پیروی کردند و پیشرفتیهایی کردند ولی چون فرمانروایی های متعدد از یک طرف و وجود مذاهب هند و بودایی و زرتشتی و مانوی و مسیحی از طرف دیگر آن اتحاد و همبستگی را به آن وسعت و عظمت و قوت خود باقی نگذاشته بود، جدائیها و دوریهایی پدید آمده بود تا آنکه چهارده قرن پیش نوری از مکه درخشید و بر عالم تابید و ایران و پاکستان را یگانگی تازه‌ای بخشید و آن وحدت دین بود - از آن روز تا امروز این وحدت یگانگی بجای مانده است -

اسلام آن دین توحید اتحادی را بوجود آورد که بزودی زبان و ادب و فرهنگ فارسی از آن فروغ یافت و بار دیگر مردم این سامان را همدل و همزبان گردانید ـ آری اسلام و فارسی، ایران و پاکستان را بیش از پیش بنحو بی‌نظیری یگانه و یکی کرده است ـ

اکنون به زمانی رسیده ایم که نمیدانم از کجا و از که و ازچه سخن بگویم ـ از صدر اسلام و گسترش آن در این سر زمین گفتگو کنم یا از سلاطینی یاد کنم که دینشان اسلام و زبانشان فارسی بود ـ یا از عارفانی بگویم که دین اسلام را بوسیلهٔ زبان فارسی گسترش دادند یا از عالمان، دانشمندان، ادیبان، شاعران، هنرمندان، صنعتگران و تاجران و سربازانی سخن بمیان آورم که به دین و زبان خود خدمت کردند ـ از پادشاهی، فرمانروایی، کشورداری، کشورگشایی، کشاورزی، آبیاری و راهسازی تعریف کنم یا از بازرگانی، معماری، هنر پزشکی، نویسندگی و رواج آن .

برگردیم به یک قرن و نیم پیش ـ با ورود اروپائیان به آسیا، ایران و پاکستان دوره‌هائی سختی گذراندند، دوره‌هائی که نه فقط آنهارا ازهم جدا ساخت بلکه از یک سو چراغ خاندان سلطنتی تیموریان را در شبه قاره خاموش کرد و از سوی دیگر موجب تضعیف ایران گردید ـ اما دیری نپائید که بخواست خداوند بزرگ بار دیگر جنبش عظیمی این سرزمین پرافتخار را فراگرفت ـ در ایران، اعلیحضرت فقید رضا شاه بزرگ قیام کرد و پایه ایران نوین را گذارد و در شبه قاره، قایداعظم محمد علی جناح برخاست و بنیانگذار پاکستان شد ـ تأسیس پاکستان، یاران جداگشته را بهم رسانید و ما هرروز شاهد توسعه همکاری پاکستان و ایران هستیم ـ لازم نمیدانم که آنچه تحت رهبری خردمندانه سران معظم دوکشور بزرگ انجام می گیرد، به کسانی بازگوکنم که خودشان در این همکاری روز افزون سهیم و شریکند و فقط این را خاطر نشان می سازم که علاوه بر علایق تاریخی، مذهبی و فرهنگی، ملتهای ما دارای آرمان مشترک نیز هستند و هر دو مشغول زیر سازی تمدن درخشانتری که رفاه و ترقی ملتهای ما را تأمین خواهد نمود، می باشند .

ایجاد پاکستان توجه مردم این سامان را به میراث فرهنگی غنی و مشترک ایران و پاکستان جلب کرده است و می بینیم که از همان ابتدا مؤسسات تحقیقی و آموزشی خدمات گرانبهای خود را بخصوص به زبان و ادبیات فارسی که الحق پاسدار و نگهبان این میراث عظیم بوده است آغاز کرده اند ـ یکی از آن مؤسسات همین دانشکده خاورشناسی دانشگاه پنجاب است که امروز گردهم آمده ایم تا صدمین سال پی‌نگذاری آن را جشن بگیریم و خدمات آن را به فرهنگ مشترکمان گرامی بداریم.

خدماتی که این دانشکدهٔ دانش‌پرور و دانش‌گستر به زبان و ادبیات فارسی و فرهنگ ایرانی نموده است برهمه، علی الخصوص ایرانیان، عیان است و حاجتی به بیان نیست ـ همه آنها را با نگاه احترام و امتنان می نگرند ـ استادان فارسی و اردوی دانشکده از سرشناسان جهان ادب و فرهنگ مشترک ایران و پاکستان هستند ـ نتیجه زحمات آنان، علاوه بر معرفی مفاخر ملی به جوانان کشور، به صورت کتابهای گرانمایه در گنجینه‌های ادبی پاکستان و ایران و سایر کشورهای فارسی دوست محفوظ و مورد استفاده دانش پژوهان می باشد.

اینک در پایان به استادان این دانشکدهٔ ارزنده و گردانندگان این جشن فرخنده تبریک گفته و مؤفقیت آنان را در خدمات شایانتری خواستارم ـ دوستی و یگانگی ایران و پاکستان پاینده باد و مشعل تمدن و فرهنگ مشترک فروزنده باد.

متشکرم

عبدالله فربار- رئیس دانشگاه مشهد (ایران)

پیام دانشگاه مشهد

به کنگرهٔ شرق شناسی دانشکدهٔ خاور شناسی دانشگاه پنجاب، لاهور

دانشگاه مشهد مراسمی را که بمناسبت یک صدمین سال تأسیس دانشکده خاور شناسی دانشگاه پنجاب در شهر زیبا و تاریخی لاهور برگزار می شود بدیدهٔ تجلیل و تکریم فراوان می نگرد و بااعزام هیأتی از استادان خود به شهر لاهور، در مجالس بحث علمی دانشکدهٔ خاور شناسی که بدین سبب تشکیل گردیده است باعلاقه و افتخار شرکت می جوید و نیز بمناسبت پایان پذیرفتن یک قرن فعالیت ثمر بخش و موفقیت آمیز دانشکدهٔ خاور شناسی تبریک و تهنیت دانشگاهیان مشهد را به استادان و دانشجویان دانشکدهٔ خاورشناسی دانشگاه پنجاب و عموم برادران و خواهران هم کیش و همدل شریف پاکستانی تقدیم می دارد۔

سخن گفتن از میراثهای مشترک تاریخی و دینی و ادبی و فرهنگی دو ملت شریف پاکستان و ایران، که بین آن دو پیوند استوار و ناگسستنی بوجود آورده است، مجالی موسع می خواهد، و در این فرصت کوتاه، که به پیام تهنیت و تبریک اختصاص یافته است، حتی نمی توان فهرست وار بدان اشاره ای کرد۔ ولی این حقیقت گفتنی است که هر کس تاریخ ادب و فرهنگ ایران را در طی قرون و اعصار پیشین مطالعه می کند از مراجعه به گذشتهٔ ادب و فرهنگ برادران پاکستانی ما بی نیاز نیست، هم چنانکه مطالعه و بررسی سوابق فرهنگی و تاریخی و دینی پاکستان بی مراجعه به اسناد و مآخذ مربوط به تاریخ و ادب و فرهنگ ایران امکان پذیر نمی نماید، زیرا وجود مشترکات در گذشتهٔ این دو ملت آنقدر زیاد است که آن دو را بحق نمی توان، نه درگذشته و نه در حال حاضر از یکدیگر جدا پنداشت۔

زبان شیرین پارسی و اشعار نغز و دلکش شاعران فارسی زبان مقیم شهرهای چون لاهور و پیشاور و سند و کشمیر در این ارتباط معنوی سهمی اساسی بعهده دارد ـ اگر در این مجلس شریف از دو تن مشاهیر شاعران فارسی زبان لاهور، مسعود سعد سلمان و محمد اقبال، که در فاصله نه قرن، یعنی از قرن پنجم تا قرن چهاردهم هجری، با زبان مؤثر شعر بر این ارتباط قلبی ـ معنوی ساکنان سر زمین های ما و شما به نحو مؤثر و چشمگیر افزوده اند یاد کنیم تذکری بموقع و شایسته است ـ نقشی که دانشکدهٔ خاور شناسی دانشگاه پنجاب، یعنی کهن ترین دانشگاه پاکستان در زنده نگاهداشتن این پیوند معنوی عهده‌دار است بر اهل بصیرت پوشیده نیست ـ کوشش استادان و محققانی که در یک صد سال گذشته در این دانشکده به ترویج زبان و ادب فارسی پرداخته اند مشکور است و دانشگاه مشهد برای تحقیقات و تألیفات ارزندهٔ استادان دانشمند این مؤسسهٔ علمی بزرگ برادر ارج بسیار قائل است ـ

دانشگاه مشهد که از سال تحصیلی جاری تدریس زبان و ادبیات اردو را در برنامهٔ دانشکدهٔ ادبیات و علوم انسانی خود گنجانیده، امیدواراست بدین وسیله با آشنا ساختن دانشجویان ایرانی با زبان اردو، موجبات تقویت بیشتر ارتباط معنوی بین ملت های پاکستان و ایران را فراهم آورد .

درخاتمه برای استادان و محققان دانشکدهٔ خاور شناسی دانشگاه پنجاب و اعضای بخش زبان فارسی آن دانشکدهٔ از خداوند بزرگ توفیق کامل مسألت می نماید .



پروفیسر ڈاکٹر ناصرالدین شاہ حسینی (تہران)

ناصرالدین شاه حسینی، تهران

تصوف در ایران

پس از آنکه مسلمانان به فرقه‌های گوناگون تقسیم شدند درمیان هر فرقه زاهدان و عابدانی بودند که جز عبادت کاری نداشتند ـ در همین زمان بود که دسته‌ای بنام صوفیه و متصوفه پیدا شدند و در حدود سال دویست هجری این نام شایع گشت و نخستین کسی که به لقب صوفی خوانده شد ابوهاشم صوفی است که بسال ۱۵۰ هجری روی از جهان بر تافت ـ وی در اواخر قرن دوم نخستین خانقاه را در رمله از شهرهای فلسطین بنا کرد و وقف بر صوفیان نمود و نخستین کتابی که درآن لفظ صوفیه بمعنی فرقه مخصوص آمده است 'البیان و التبیین' جاحظ است ـ چون این طایفه جامهٔ پشمینه می پوشیدند بدانها صوفی گفتند زیرا صوف بمعنی پشم است و عادت بـه پشمینه پوشی از دیر باز درمیان زهاد و فقرا معمول بوده است و در حدود سال صد هجری مسیحیان جامهٔ سپید میپوشیدند و از اواخر قرن دوم هجری این جامه شایع شد و حتی لباس اسلامی بشمار می رفت و احادیث بسیاری ذکر کرده اند بر اینکه این نوع لباس پسندیدهٔ پیامبر بزرگوار بوده است ـ دربارهٔ کلمه تصوف سخن بسیار گفته اند ولی از میان آنهمه گفتگوها کلام شیخ ابو سعید ابی الخیر حالی دیگر دارد او میگوید ''تصوف دو چیز است یک سو نگریستن و یکسان زیستن''ـ

در اینکه تصوف اسلامی از شیوه صحابهٔ پیامبر و تابعان تقلیدی کرده و تحت تعلیمات پیامبر بزرگوار و قرآن مجید و مخصوصاً سیرة علی بن ابیطالب علیه السلام که سر حلقهٔ اولیاء محسوب می شود مایه گرفته است، تردیدی نیست ولی نباید زهد و عبادت و ترک دنیا و تعلیمات اشراقی و آرای عیسوی و زردشتی و مانوی و مزدکی و بودائی و حکمای پهلوانی ایران و دانشمندان هندی را که در آن مستقیماً اثر کرده است نادیده گرفت ـ

روش صوفیه خلوت و ذکر قلبی و توجه به باطن و مداومت فکر و انصراف از محسوسات و چله‌نشینی و حلقهٔ ذکر و نیاز است که بمدد این

اعمال نفس را از آلودگیها بری میسازند و سر انجام آدمی از امور جسمی متوجه بامور روحانی میشود ـ تصوف اسلامی بنام تصوف اثباتی و یا فقر محمدی خوانده میشود در برابر تصوف سلبی یا فقر عیسوی ـ

از قرن سوم تصوف به وادی کمال گام نهاد و تصوف راستین بدست کسانی چون ذوالنون مصری که اهل کیمیا و فلسفه بود از فلسفه نو افلاطونی اقتباساتی کرده باتصوف درآمیخت و بایزید بسطامی و حسین بن منصور حلاج که در طریقهٔ وحدت وجود راه افراط می پیمود و آشکارا اناالحق میگفت و سخنان او بعدها دستاویز ابن العربی گشت اساس محکم و استواری یافت و در طول زمان هر چه به قرن هفتم نزدیک میشد کمال بیشتری کسب میکرد تا در قرن هفتم که بهمت صوفیان بزرگواری چون ابن العربی و مولانا جلال‌الدین مولوی پختگی و رونقی افزون از حد یافت ـ جنبهٔ فلسفی تصوف بدست کسانی چون غزالی و ابن العربی و سهروردی مایه گرفت ـ و در هماهنگ ساختن شرع و تصوف و دستورهای سیر و سلوک و تعیین مقاماتی که سالک باید طی کند و قوانین و اصول آن با رعایت اصول شرع و استناد به قرآن مجید و حدیث کسانی چون قشیری و ابونصر سراج و هجویری و غزالی سهم مؤثری دارند ـ

از قرن سوم بود که افکار تازه ای از قبیل عشق و محبت و عرفان و معرفت و فنا و بقاء و امثال آن در تصوف تعالی یافت و بالنتیجه از قرن هفتم دو مکتب نامدار یا دو طریقه بزرگ در تصوف پدید آمد یکی طریق عطار و مولوی که آنرا تصوف عاشقانه خواندند و دیگر مکتب سهروردی و محی الدین ابن عربی و ابن فارض که آنرا تصوف عابدانه نام نهادند ـ مکتب محی الدین و ابن فارض مکتب علمی بود و مکتب سهروردی عملی .

از این پس سالکان طریقت علوم عرفانی را از کتب محی الدین و اشعار ابن فارض و اعمال طریقت و رسوم خانقاه را از عوارف المعارف سهروردی کسب میکردند ـ

ازآنجهت کتاب فتوحات و فصوص محی‌الدین و تائیه ابن فارض میان آنان اهمیت یافت و جزو کتب درسی شد ـ

در مکتب عارفانه علوم عرفانی با تشرع و زهد در آمیخته و تصوف عبادت از زهد و عبادت و مجاهدت و رعایت فرایض و مداومت بر آداب و سنن و اوراد و اذکار است و رهروان رساله قشیریه و احیاء العلوم غزالی و عوارف سهروردی و فتوحات مکیه و فصوص محی‌الدین را میخوانند اما در تصوف عاشقانه وجد است و سماع و قول و ترانه و اشعار و حدیقهٔ سنائی و الهی نامهٔ عطار و مثنوی مولانا جلال الدین مولوی خوانده میشود ـ

از این دو مکتب سلسله‌های بسیاری در ایران و عراق و هندوستان و پاکستان پدید آمد که بذکر معروفترین آنها مبادرت میورزیم ـ

۱ ـ کبراویه منسوب به شیخ نجم الدین ملقب به طامة الکبری که در سال ۶۱۸ در حملهٔ مغول به قتل رسید ـ

۲ ـ مولویه، منسوب به مولانا جلال الدین مولوی ـ

۳ ـ نقشبندیه منسوب به خواجه بهاءالدین عمر نقشبند بخارائی که آنهارا خواجگان نیز میگویند و این سلسله در هندوستان و عراق و کردستان طرفداران بسیار دارد ـ

۴ ـ ذهبیه که از پیروان خواجه اسحاق متوفی در قرن نهم هجری اند معروفست که شیخ یکی از شاگردان خود بنام سید عبدالله گفت ذهب از آن ببعد پیروان سید عبدالله به ذهبیه معروف شدند و در حال حاضر در شیراز و تبریز پیروان فراوان دارند ـ آنها شیعه دوازده امامی اند در این اواخر شهر شیراز مرکز اقطاب این سلسله بوده است ـ

۵ ـ بکتاشیه ـ پیروان سید محمد رضوی معروف به حاجی بکتاش متوفی بسال ۷۳۸ هجری اند این سلسله در ترکیه پیروان بسیار دارد ـ

۶ ـ نعمة اللهیه، مؤسس این طایفه سید نورالدین نعمت الله ملقب به شاه و معروف به ولی است که فرزند میر عبدالله نامی است از اولاد امام محمد باقر ـ او درسال ۷۳۱ درحلب متولد شد ابتدا به مکه رفت و درمحضر شیخ عفیف الدین یافعی یمنی به مکتب تصوف در آمد و خلیفه و جانشین او شد پس به ایران سفر کرد و مدتی درسمرقند و هرات بود وسپس به حوالی یزد آمد و در آنجا خانقاهی ساخت در آخر عمر به قریه ماهان در کوه بنان

کرمان رفت و بیست و پنج سال در آنجا بارشاد رهروان سرگرم بود سر انجام در رجب سال ۸۳۴ وفات یافت و در همان قریه مدفون شد -

۷ - ملامتیه - ملامتیه فرقه ای از صوفیه اند که قبل از قرن پنجم هجری در نیشابور نام و نشانی یافتند پیشوای این گروه را ابو صالح حمدون بن احمد بن عمارة القصار و ابو حفص نیشابوری دانسته اند حمدون قصار یکی از عالمان بود در مذهب ثوری بود صوفیان ملامتی عقیده داشتند که قبول و توجه خلق سالک و راهرو را از راه بازمیدارد و مغرور و برضای خاطر مردم سرگرم میسازد و در نتیجه از توجه بحق و عنایات او محروم میسازد و چون جزبه اخلاص و محبت خدای بهیچ چیز دیگر نیازی نداشتند خوش آمد مردم را بچیزی نگرفتند و بخاطر سلامت باطن تن به ملامت خلق در دادند و از اینطریق غرور نفس را درهم شکستند و بجای توجه به خرقه و سجاده و سبحه به تهذیب نفس و صفای باطن پرداختند و از اینروی به ملامتی منسوب شدند۲ـ در تهیهٔ این مقاله از این کتابها استفاده شده است -

---

۱- احیاء العلوم الدین غزالی -
۲- عوارف المعارف سهروردی -
۳- تاریخ تصوف دکتر غنی -
۴- مقدمه مصباح الهدایه استاد همائی -
۵- صوفیهٔ اسلام تألیف نیکلسون -
۶- ملل و نحل شهرستانی -

دکتر ضیاءالدین سجادی، تهران

مصباح الارواح جمالی دهلوی

هنگامی که به تصحیح شرح قصیدهٔ مسیحیت خاقانی تألیف شمس الدین محمد لاهیجانی برای نشر در فرهنگ ایران زمین در سال جاری اشتغال داشتم به چند بیت در بحر رمل مسدس برخورد کردم که پس از این عبارت آمده است : وصاحب مصباح حالات اولیاء را چنین به نظم آورده . . . . » و پیش از این مصباح الارواح شمس الدین محمد بردسیری کرمانی به تصحیح استاد علامهٔ فقید فروزانفر به چاپ رسیده که در بحر هزج مسدس اخرب مقبوض محذوف است و سیر و سلوک عرفانی را به راهنمائی پیری بیان می دارد و در ص ۶۲ آن نیز تخلص به مدح خاتم النبین شده است ـ اما چنانکه گذشت چون ابیات منقول در شرح قصیدهٔ مسیحیت خاقانی در بحر رمل مسدس مقصور است بر خورد به آن مرا به این اندیشه واداشت که مصباح دیگری شاید به همین نام مصباح الارواح منظوم داشته باشیم و چون تعقیب کردم و به جستجو پرداختم مصباح الارواح حامد بن خضرالله جمالی دهلوی شاعر و عارف قرن نهم و أوائل قرن دهم هجری را یافتم که در ۸۶۸ هـ ق سروده شده و خود مصنف در ۹۴۲ هـ ق در گذشته است ـ

و این حامد خضرالله جمالی دهلوی که در تذکرهٔ نتایج الافکار او را شاه خضر الله جمالی دهلوی گفته و اصلش را از کبنو دانسته و دائرة المعارف فارسی او را حامد بن خضر الله از فرقهٔ سهروردیه گفته و تاریخ نظم و نثر در ایران سعید نفیسی او را حامد بن خضر الله جمالی کبنو دهلوی ضبط کرده، از عارفان و شاعران معروف و پرکار بوده و آثار فراوان به وجود آورده ـ او پس از مسافرت به حجاز هنگام باز گشت به ملاقات جامی نایل شده است و جالب و توجه آنکه بسیاری از مآخذ آثار او را به پیر جمال یعنی جمالی اردستانی متوفی به سال ۸۷۹ هـ ق نسبت داده اند از جمله

هدایت در ریاض العارفین، فتح الابواب و شرح الواصلین جمالی دهلوی را به نام جمالی اردستانی ذکر کرده است. هم چنانکه مصباح الارواح بردسیری را هم غالباً به اوحد الدین کرمانی نسبت داده اند (روضات الجنان و مآخذ دیگر).

در هر حال مصباح الارواح جمالی دهلوی که موضوع بحث ماست یک مثنوی است که در حدود چهار هزار و چهار صد و پنجاه بیت دارد و نخستین مثنوی از هفت بخش بیان حقایق احوال المصطفی است که شش بخش دیگر آن به ترتیب: احکام المحبین، نهایة الحکمه، بدایة المحبه، هدایة المعرفه، فتح الابواب و شرح الواصلین است که درباره اش می گوید:

چونکه شرح الواصلین است این کتاب
وا نمایم حسن ماه و آفتاب

آغاز مصباح الارواح اینطور است: "بسم الله الرحمن الرحیم، ای طالب انوار اسرار و معانی و جویای تجلیات ظاهر و باطن و مستسقی و تشنهٔ زلال عشق و نگران طریق شهرستان عقل یک لحظه بیدار باش و معنی الله نور السموات والارض مثل ذره کمشکوة . . . . . الخ آیه، در ذکر مولود حضرت سید ولد آدم و سلطان عالم و آفتاب گیتی فروز اول ما خلق الله نوری، بشنود نظر در حقیقت اول، خلق الله العقل کن. . . . شرح این کلمات در سیر و روش نور حضرت محمد صلی الله علیه و علی آله وسلم گفته شود انشاء الله تعالی، گوش و چشم دار و صلی الله علی النبی محمد و علی آله.

شحنهٔ دل میل صحرا می کند	ترک مستش فکر غوغا می کند
زلف پر پیچ وگره همچون کمند	می گشاید تا کشد دلهابه بند

و اشاره به "اول ما خلق الله نوری" و "اول ما خلق الله العقل"، نزدیک است به بیان سایر نادر کتب خود مانند بیان صاحب مصباح الهدایه که در فصل هفتم از باب سوم کتابش سه حدیث "اول ما خلق الله نوری" و "اول ما خلق الله العقل" و "اول ما خلق الله القلم" را آورده و شرح کرده و میان هر سه جمع نموده است.

جمالی در مصباح الارواح با توجه به آیهٔ "الله نور السموات والارض" و وجود کلمهٔ "مصباح" در آن، مثنوی نخستین خود را مصباح الارواح نام نهاده و در یک جا گفته است :

دیدم آن مصباح چون نور صباح　　یافت جانم از شعاع آن فلاح

و در آغاز پس از مقدمات، آغاز داستان مولود رسول اکرم صلعم و نور خدایی را بیان داشته و گفته است :

حق تعالی اول این نور آفرید　　پرتو این نور شد نیکی پدید

و بعد روایات و احادیث و آیات گوناگون را ذکر کرده و چند سطر به نثر پرداخته و آنگاه دربارهٔ آنها شعر گفته است مثلاً روایتی از جابر که گفت : "قال سالت رسول الله صلی الله علیه و علی آله وسلم عن اول شیعی ما خلق الله تعالی قال هو نور نبیک. . . . . ." و حدیث، "العجلة من الشیطان والتانی من الرحمان" و "کنت نبیا و آدم بین الماء والتین" و آیهٔ : "انا عرضنا الامانه علی السموات والارض والجبال . . . . ." و در این میان به سلسلهٔ نسبت رسول اکرم صلعم و نوری که در اصلاب شامخه و ارحام مطهره بوده اشاره کرده، و جامی جای حکایات و قصص آورده از جمله حکایت رفتن اسکندر به ظلمات و حکایتی نیز از منطق‌الطیرعطار با اشاره به نام او دارد و همه جا به تخلص خود یعنی جمالی اشاره می کند مثلا :

ای جمالی ترک آن نازار کن　　یک زبان ذکر دل بیمار کن

(ورق ۳۴)

و نیز "ای جمالی رو به سوی قصه باز　　تا خبر یابد همه گوش نیاز"

در این مثنوی و سایر آثارش نثرهای عربی، احادیث و قصص یا ابیات تازی را به پارسی ترجمه کرده مثلا در یک جا (ورق ۹۷ از نسخهٔ مورد استفاده) وصیت حضرت علی بن ابیطالب را به حسن و حسین آورده و آنرا تماماً ترجمه کرده است ـ

در ورق ۱۳۲ روایتی از استاد ابوالقاسم قشیری به استاد از انس ابن مالک آورده که قال رسول الله "متی التی احبائی فقال اصحابه . . . الخ که این روایت در باب صحبت از رسالهٔ قشیریه عیناً هست (چاپ اول مصر

ص ۵۷۱) و ترجمه اش در ترجمهٔ رسالهٔ قشیریه (چاپ فروزانفر ص ۵۰۲) این طور است! "کی بود که دوستان خویش را بینم یاران گفتند پدران و مادران ما فداء تو شوند نه ما دوستان توایم، گفت شما یاران منی اما دوستان من قومی باشند که مرا ندیده، به من ایمان آورند و من بدیشان آرزومندم" ـ

پس از نقل این روایت رفتن خود را به حجاز با پدرش گفته و اینطور آغاز کرده.

بی خبر باب این فقیر دردمند | در طفولیت به غربت او فکند
بنده بودم بی خود و بی اختیار | بی وقوف از سیر و راه هر دیار
برد القصه مرا سوی حجاز | بادل غمگین و با سوز و نیاز

در یک جا می نویسد: "اهل شریعت به مثال زبانند و اهل طریقت به مثال چشمند و اهل محبت و عشق که محرمان سرا پردهٔ حقیقت اند به مثال دل اند و شرح این کلمات در نظم گفته شود . . . . "ـ

مصباح الارواح جمالی از نظر شعر فارسی قابل توجه است، شعرش خوب است و یک دست، و غالباً بسیار ساده و بی تکلف، نکات جالب عرفانی دارد، و شمول آن بر احادیث و اخبار و روایات جالب است، کلمات و ترکیبات فارسی زیاده به کار برده مانند: "دنگ" و ترکیباتی با پساوند "ناک" نهند: "آیناک، نورناک، خوابناکان، زنگناک و گردناک" کلمه، "منزلات" بسیار به کار برده مثلاً :

ذکر می بد درمیان فکر و جام | شرح راه و منزلات خاص و عام

در پایان مثنوی مصباح الارواح به تاریخ سردون آن اشاره دارد و درحقیقت به آنچه آغاز کرده بود پایان می دهد و می گوید :

هست این رسم قدیم ای سروران | بر در ایوان شاهان جهان
که چو مولودی شود خوش آشکار | مجلس آرایند بی گرد و غبار
مطرب از شادی قصاید هر زمان | همچو ترجیعات آرد درمیان
تا که میزان حقایق در حضور | وزنها بنماید اندر شر و شور
بعد ازآن مصباح روح عاشقان | شعله افروزد دراین مشکوة جان

زانکه بی مصباح ننماید جمال　　حسن خوبان در جبین بی مثال
ذکر نور مصطفی در منزلات　　فاش بنمودم درین ذات و صفات
مانده بد ده روز از ماه صفر　　کاین فلک گردند با شمس و قمر
هشت سال و شصت سال و هشتصد　　رفته بود از هجرت شاه رصد
کاس حقیقت پردهٔ صورت درید　　دل به دل پیوست و جان با جان رسید
در نمی گنجد کنون حرف و کلام　　زانکه عشق صرف آمد والسلام

و بعد فرشته : "تم الکتاب لعون الله و حسن ترصیة والحمدلله رب العالمین والصلوة والسلام علی سید المرسلین و آله الطیبین" و در آغاز کتاب احکام المحبین صریحاً به نام مصباح الارواح خود اشاره کرده و گفت است : "ابتدای کتاب مصباح الارواح" آیة الله نور السموات والارض بود و صفت نور و عقل" ـ

اما نسخه ای که مورد استفادهٔ ما در این تحقیق قرار گرفته ضمن مجموعه ای است در کتابخانهٔ مرکزی دانشگاه تهران که از روی مجموعهٔ پاریس به نشانهٔ (SP ۸۱۳، بلوشه ۱۲۵۷) به عکس در آمده و ۸۵۳ برگ دارد و با خط نستعلیق خوش نوشته شده و هر صفحه ۲۱ سطر دارد اما به اشتباه مانند بسیاری از تذکره نویسان که یادآور شدیم نوشته است : "رسائل منثور و منظوم فضل الله جمالی اردستانی دهلوی در گذشتهٔ ۹۰۱ هـ . . . ." و در فهرست فیلم‌های کتابخانهٔ مرکزی تألیف دانش پژوه همهٔ این مجموعه ذکر شده است ـ

در این مجموعه بجز هفت بخش شرح حال رسول اکرم صلعم که پیش از این نام بردیم، سهر قلوب از ورق ۷۷۰ و شرح رباعی بابا افضل از ورق ۸۳۸ و بعد از سهر قلوب، قدرت نامه، نصرت نامه، فرصت نامه و مرآة الحبیب آمده و در پایان همهٔ آثار خود این دو بیت را ذکر کرده است :

ای طلبکار لذت دو جهان　　از کف دل منه تو این میزان
ای که خواهی حیات با لذات　　هان منه از کف دل این مرآت

در بعضی از مآخذ آثاری دیگر نیز به جمالی دهلوی نسبت داده اند مانند مثنوی مرآت المعانی و نیز کتاب سیرالعارفین که به سال ۱۲۱۱ هـ ق

در دهلی به چاپ رسیده و تذکره ای در مقامات و احوال مشایخ چشتیه و سهروردیهٔ هند دارد (دائرة المعارف فارسی) -

در مصباح الارواح به نکات تاریخی نیز اشاره دارد، مثلا ولادت رسول اکرم را از قول امام جعفر صادق نقل می کند که :

"جعفر صادق چنین کرده بیان که دو شنبه جدم آمد در جهان
در ربیع الاول و روز دهم قول شه زادست این بی اشتلم"
(ورق ۲۰ ؛) .

و خطاب او در شعر و نثر غالباً بالفظ: "ای اخی" است - نام بعضی از بزرگان از عارفان و عالمان نیز در شعرش آمده است -

در شرح احوال رسول اکرم به بسیاری از کتب سیر و تواریخ مراجعه کرده و از اغلب نام برده، مثلاً در یک جا از مولانا سعیدالدین کازرونی نام می برد که فاصلهٔ تاریخی آدم تا نوح و تا ابراهیم و موسی و عیسی و رسول اکرم را ذکر کرده است و این شیخ سعیدالدین محمد بن مسعود الکازرونی که در ۷۵۸ھ در گذشته و شرح مشارق الانوار، و سیر سید الابرار صلی الله علیه و آله الاخیار معروف به سیر کازرونی از او مشهور است و شرح حالش در حبیب السیر آمده -

بنابر آنچه گذشت، بر دو مثنوی فارسی به نام مصباح الارواح بردسیری کرمانی و مصباح الارواح شیخ اوحد الدین احمد بن الحسن محمد النخجوانی الکرمانی متوفی ۶۳۵ھ ق که مرحوم فروزانفر در مقدمهٔ مناقب اوحدالدین کرمانی ذکر کرده و از آنجا در مقدمهٔ مصباح الارواح بردسیری نقل شده است، مثنوی مصباح الارواح جمالی دهلوی را نیز باید افزود و سومین آنها دانست .

مآخذ

۱ - از سعدی تا جامی — ادوارد برون - ترجمهٔ علی اصغر حکمت

۲ - تاریخ حبیب السیر — خوند میر

۳ - تاریخ مغول — عباس اقبال

۴ - تاریخ نظم نثر در ایران — سعید نفیسی

۵ - تذکرهٔ آتشکده — آذر بیگدلی

۶ - تذکرهٔ نتایج الافکار — قدرت الله گوپاموی

۷ - ترجمهٔ رسالهٔ قشیریه — به تصحیح فروزانفر

۸ - دائرة المعارف فارسی (النفس) — به سرپرستی غلامحسین مصاحب

۹ - رسالهٔ قشیریه — چاپ مصر

۱۰ - روضات الجنان و جنات الجنان — حافظ حسین کربلائی تبریزی

۱۱ - ریاض العارفین — رضا قلی خان هدایت

۱۲ - شرح قصیدهٔ خاقانی از شمس الدین لاهیجانی — به تصحیح دکتر سجادی در نشریهٔ فرهنگ ایران زمین سال ٥١-٥٠

۱۳ - فرهنگ سخنوران — دکتر خیام پور

۱۴ - فهرست میکروفیلم های کتابخانهٔ مرکزی دانشگاه تهران — محمد تقی دانش پژوه

۱۵ - لغت نامه — علی اکبر دهخدا

۱۶ - مجموعهٔ عکسی بنام میزان الحقایق در کتابخانهٔ مرکزی دانشگاه تهران از ۱۹۰٦ تا ۱۹۱۳ ء

۱۷ - مصباح الارواح شمس الدین بردسیری کرمانی — به تصحیح فروزانفر

۱۸ - مصباح الهدایهٔ عزالدین محمود کاشانی — به تصحیح جلال الدین همایی

خلاصهٔ مقاله

بحثی دربارهٔ مصباح الارواح حامد بن فضل الله جمالی دهلوی از روی نسخهٔ عکسی کتابخانهٔ مرکزی دانشگاه تهران و اشاره به حال و سایر آثار آن عارف و شاعر نامی، و نیز اشاره ای به دو مصباح الارواح دیگر و مقایسه ای کوتاه با یکی از آنها ـ

در این مقاله اهمیت کار جمالی دهلوی در این مثنوی و سایر آثارش نموده شده و به اختصار دربارهٔ آنها گفتگویی به میان آمده ولی موضوع اصلی بحث همان ''مصباح الارواح،، است که برای نخستین بار اینگونه از آن صحبت می شود ـ

این مثنوی در بحر رمل مسدس مقصور سروده شده و یک مثنوی عرفانی است که به آغاز تولد رسول اکرم اختصاص دارد و نکات جالب از جهت عرفان و نقل احادیث و اخبار و هم از نظر زبان فارسی در آن دیده می شود، امید است این مقاله مورد پسند و قبول اهل فضل و دانشمندان خاورشناس قرار گیرد ـ



پروفیسر جلال متینی (مشہد یونیورسٹی) تقریر کر رہے ہیں

جلال متینی، مشهد

"مین" و "مینه"

دوپسوند نادر و فراموش‌شدهٔ زبان فارسی

آنچه امروز بعرض دانشمندان عالی‌قدر در این مجلس می رساند موضوعی است که بعنوان اقتراح مطرح می نماید و پس از ذکر سابقهٔ آن در زبان فارسی با توجه به موارد مشابه، عقیدهٔ خود را دربارهٔ موضوع نیز بیان می کند ـ

بطوری که می دانیم نویسندگان کتابهای دستور زبان فارسی برای صفت نسبی در این زبان چند پسوند ذکر کرده اند که عبارتست از :

"ی، i" درکلمات : ایرانی، پاکستانی، نوروری، شهری وغیره ـ

"ین، in" درکلمات : زمرّدین، زرّین، سیمین ، شکّرین وغیره ـ

"ینه، inah (ineh)" درکلمات : زرینه، سیمینه، پشمینه، ابریشمینه، دیرینه وغیره ـ

"گان، gān" درکلمات : بازارگان، گروگان، خدایگان، دهگان وغیره ـ

"ه ، a (e)" در کلمات : یکروزه، هفته، چلّه، سده، هزاره وغیره ـ

دربارهٔ استعمال این پسوندها چند موضوع در خور یادآوری است : نخست آنکه حدود استعمال این پنج پسوند یکسان نیست بطوری که فی المثل پسوند "ی" صفت نسبی در زبان فارسی بسیار بکار می رود، ولی پسوند "گان" بندرت ـ

دیگر استعمال این پسوندها باصطلاح "سماعی" است نه "قیاسی"، چنانکه صفت نسبی از کلمات "دیر، پار، دوش" با "ی" نسبت بصورت : "دیری، پاری، دوشی" بکار نرفته، ولی شکلهای "دیرین، دیرینه، پارین، پارینه، دوشین، دوشینه" از آن مستعمل است و یا صفت نسبی ازکلمات"

طلا، نقره، شهر ''فقط با پسوند ''ی'' بکار رفته است نه باپسوندهای ''ین'' و ''ینه'' ـ برخی از کلمات نیز مانند ''پشم و ابریشم'' باهرسه پسوند : ''ی'' ''ین''، ''ینه'' استعمال شده است مانند : ''پشمی، پشمین، پشمینه، ابریشمی، ابریشمین، ابریشمینه'' ـ صفت نسبی بعضی از کلمات فقط باپسوند ''ین'' بکار رفته است مانند ''برین'' که از آن شکلهای ''بری، برینه'' دیده نشده است، همچنانکه صفت نسبی برخی کلمات فقط باپسوند.. ''ینه'' استعمال گردیده است مانند ''لوزینه، گوزینه'' که باپسوند ''ی'' و ''ین'' بکار نرفته است و چنانکه می دانیم هیچ یک از کلماتی که در این قسمت بدان اشاره کردم باپسوندهای ''گان'' و ''ه'' در زبان فارسی استعمال نشده است ـ

سدیگر دامنهٔ استعمال انواع صفتهای نسبی مانند بسیاری از صفتهای مرکب مختوم به پسوندهای : ناک، ناگ، مند، کده، ستان در آثار منظوم و منثور فارسی درقرون مختلف و نیز در استعمال مردم نواحی گوناگون ایران یکسان نیست ـ چنانکه شکلهای مختلف این گونه صفتها در آثار شاعران و نویسندگان ما تا قرن هفتم هجری بیشتر از امروز بکار رفته، ولی ازقرن هفتم ببعد دامنهٔ استعمال آنها محدود گردیده است ـ

* * *

از طرف دیگر می دانیم پسوندهای ''ین'' و ''ینه'' مانند سه پسوند ''ی''، ''گان''، ''ه''، در موارد دیگری نیز ـ جز بعنوان پسوند صفت نسبی، بکار می رود :

۱ ـ برای ساختن صفت عالی، پسوند ''ین'' به آخر صفت تفضیلی افزوده می شود مانند : داناترین (داناتر + ین).

۲ ـ برای ساختن عدد ترتیبی (صفت عددی) پسوند ''ین'' به آخر اعداد ترتیبی مختوم به ''ـُـ م، *om*'' (و یا به تعبیر دیگر پسوند ''ـُـ مین، *omin*''، به آخر عدد های اصلی) اضافه می شود مانند : چهارمین (چهارم + ین، یا : چهار + ـُـ مین)، صدمین (صدم + ین، یا : صد + ـُـ مین)، هزارمین (هزارم + ین، یا : هزار + ـُـ مین)ـ

۳ ـ برای ساختن اسم جنس، در بعضی از موارد "ینه" به آخر اسم عام افزوده شده است مانند: بزینه، میشینه، نرینه، مادینه ـ

اکنون با توجه به این مقدمه اجازه بفرمایید مطلب اساسی را بعرضتان برسانم. در متون نظم و نثر فارسی که بنده تا بحال مورد مطالعه قرار داده است به سه کلمه برخورده است که صفت مرکب می نماید و جزء آخر آنها "مین" یا "مینه" است ـ این سه کلمه عبارتست از: خندمین، بودمین، نازمینه:

در مثنوی معنوی و کلیات شمس، چند بار کلمهٔ "خندمین" بمعنی مضحک و خنده‌آور استعمال شده است:

لابه کردش ترک کز بهر خدا | لاغ می گو که مرا شد مغتذا
گفت لاغی خندمینی آن دغا | که فتاد از قهقهه او برقفا
همچنین بار سوم ترک خطا | گفت لاغی گوی از بهر خدا
گفت لاغی خندمین تر زآن دوبار | کرد او این ترک را کلی شکار...
ای فسانه گشته و محو از وجود | چند افسانه بخواهی آزمود
خندمین تر از توهیچ افسانه نیست | بر لب گور خراب خویش ایست[۲]

راح نما روح مرا که روح خندد و گوید سخن خندمین[۳]

کلمه "خندمین" را در کتابهای لغت قدیمی فارسی ندیده ام ـ ولی معنی آن "در فرهنگ لغات و تعبیرات مثنوی"[۴] و در جلد هفتم کلیات شمس[۵] بی توضیحی دربارهٔ ساختمان آن ذکر شده است ـ فقط استاد فقید شادروان دکتر محمد معین در فرهنگ فارسی این کلمه را ذکر کرده و در توضیح آن نوشته اند: "خندمین *X:ndu-mīn* [قیاس غلط با آزر مین، کند مین] (ص نسب) مضحک؛ خنده آور ـ"[٦] بنده نیز می پنداشت که مولانا جلال الدین بلخی این کلمه را ظاهراً بقیاس کلمات یمین، گندمین، شرمین و امثال آن ـ که حرف "م"، در آنها جزو کلمهٔ اصلی است نه حرف نخستین پسوند ـ ویا بقیاس کلمات چهارمین، پنجمین، صدمین و نظایر آن بکار برده است ـ

در کتاب ''بخشی از تفسیر می کهن'' که چند ماه پیش از طرف بنیاد فرهنگ ایران بچاپ رسیده، و نسخه‌ای بسیار کهنه و محتملاً از آثار قرن چهارم هجری است یک بار کلمهٔ ''بودمین'' بدین شرح بکار رفته است :
''بدیع السموات والارض و اذا قضی امراً - نوکننده‌ی آسمانها و زمیهاست، و اذ اقضی امراً - و چو خواهد خدای عز و جل بودن چیزی و آفریدن مخلوقی، فانما یقول له کن فیکون - مرآن چیز بودمین را کاندر علم او بود که بخواهد بودن، گوید بباش' بباشد - چنانکه او خواهد''.

بعلاوه در ضمن تصحیح نسخهٔ خطی بخشی از تفسیر قرآن مجید، محفوظ در کتابخانه موزهٔ بریتانیا، لندن، به نشانهٔ Or. 65 73 - که اکنون به نام ''تفسیری بر عشری از قرآن مجید'' در بنیاد فرهنگ ایران تحت طبع است' به کلمهٔ نادر دیگری برخوردم که در هیچ یک از کتب لغت قدیم و جدید فارسی ضبط نگردیده است۸- از مؤلف این تفسیر اطلاعی در دست نداریم، نمی دانیم نامش چه بوده است، زادگاهش کجاست و اثر خود را درچه سالی تالیف کرده است؟ فقط باتوجه به قرائن سبک شناسی و اسلوب نگارش آن می توان گفت کتاب محتملاً اواسط قرن پنجم هجری تالیف شده است۹ - در این کتاب چند بار کلمهٔ ''نازمینه'' در عبارتهای زیرین بکار رفته است :

''وَ عَمِلُوا الصَّالِحَاتِ'' و کارهای نیکی کردن، بگزاردن امرها، و باز بودن ازنهیها، ''فی جنات النعیم'' اندر بوستانهای بهشت باشند نازمینه همی نازند و گرازند و سینه می افرازند''۱۰-

''و نیز دروغ زن داشتند پیامبرانراعلیهم السلام بحدیث قیامت ''وَ اَتْرَفْنَاهُمْ فِي الْحَيوةِ الدُّنيا'' و اندرین دنیا مالهای بسیارشان داده بودیم تا نازمینه و انبارده گشته بودند-''۱۱

یاد آوری این موضوع ضروری است که نسخهٔ خطی تفسیری که کلمهٔ ، ''نازمینه'' در آن بکار رفته، نسخه‌ای است کاملا روشن و مضبوط - در طرز نگارش این کلمه نیز شک و تردید نمی توان روا داشت که جز ''نازمینه'' بصورت دیگری خوانده شود - بعلاوه اسلوب نگارش

کتاب نیز مؤید این امر است که نسخهٔ کهنه است و از نظر زبان و لغات و ترکیبات دارای اختصاصاتی است که در بعضی از موارد در کتابهای دیگر و حتی در تفسیرهای کهنه قرآن مجید نظیر ترجمهٔ تفسیر طبری، تفسیر قرآن مجید (تفسیر کمبریج)، تفسیر پاک، بخشی از تفسیری کهن، تفسیر سور آبادی نیز دیده نمی شود۱۲.

تصدیق می فرمایید که لفظ مهجور ''نازمینه'' نخست لفظ ''نازنین'' را به یاد می آورد ولی چنانکه می دانیم درساختمان کلمهٔ رایج ''نازنین'' نیز سخنهاست ـ ساختمان کلمه ''نازنین، باآنکه در نظم و نثر فارسی، لا اقل از نیمهٔ اول قرن پنجم هجری ببعد، بسیار بکار رفته است ، روشن نیست ـ صاحب ''بهار عجم'' آنرا مرکب از ''ناز'' و لفظ ''ین'' کلمهٔ نسبت، می داند۱۳ ـ شادروان دکتر محمد معین در حاشیهٔ ''برهان قاطع'' آنرا مرکب از: ناز + نین (= ین نسبت) دانسته که بقیاس کلمهٔ بوزینه ـ بوزینه، ساخته شده است۱۴ ـ ولی ایشان در ''فرهنگ فارسی'' نحو دیگری دربارهٔ ساختمان این کلمه اظهار نظر کرده اند ـ در این فرهنگ آمده است: ''نازنین *Nāz-an-īn* [ناز + ن + ین نسبت = نازین (قس بوزنینه = بوزینه)] (ص نسبت)''۱۵ ـ شادروان عبدالرحیم همایون فرخ در ''دستور جامع زبان فارسی.، غرابت ساختمان این کلمه را دریافته و نوشته است ''کلمهٔ نازنین از ناز گرفته شده و معنی ان ناز دار و با کرشمه است مطابق معمول بایستی نازین باشد ـ معلوم نشد یک نون اضافه برای چه مقصودی است و نظایر ندارد بایستی در اطراف آن تحقیق نمایند ـ۱۶ بعلاوه قیاس کلمهٔ ''نازنین'' با ''بوزنینه = بوزینه'' نیز برای بنده روشن نیست ـ زیرا کلمهٔ اخیر که به سه شکل مختلف: بوزنه، بوزینه، بوزنینه در کتابهای لغت ضبط شده است۱۷ جزو اولش ـ بوز ـ به تنهائی بکار نرفته است که بتوان جزو آخر آن ـ نه، ینه، نینه ـ را پسوند صفت نسبی نظیر ''نین'' در کلمهٔ ''نازنین'' تلقی کرد مگر آنکه فقط به شباهت صوری موجود بین ''نینه'' و ''نین'' در کلمات ''بوزنینه'' و ''نازنین'' بسنده کنیم ـ باعرض مطالب فوق ملاحظه می فرمایید که پسوند کلمهٔ ''نازنین'' نه با پسوندهای پنج گانهٔ صفت نسبی

شباهتی دارد و نه با دیگر پسوندهای صفات مرکب در زبان فارسی- آیا نمی توان پذیرفت که لفظ ''ین'' در کلمهٔ ''نازنین'' پسوندی است مستقل و از جمله پسوندهای اتصاف، زیرا این کلمه در زبان فارسی بمعنی ناز دار، باناز، باکرشمه بکار رفته است-

*****

اکنون موقع آن رسیده است که با توجه به موضوعاتی که ذیلاً از نظر حاضران محترم در این جلسه می گذرد نظر خود را در مورد دو لفظ ''مین'' و ''مینه'' نیز بیان کند :

۱ - چنانکه قبلاً اشاره شد کمیت استعمال پسوندهایی که برای ساختن صفت نسبی و دیگر انواع صفات مرکب در زبان فارسی بکار می رود در دوره‌های مختلف ادبی ما یکسان نیست - این پسوندها در آثار شاعران و نویسندگان پیش از حملهٔ مغول بخصوص در آثار خراسانیان بمراتب بیشتر از آثار غیر خراسانیان و آثار بعد از حملهٔ مغول است - شاید این پسوندها در لهجهٔ مردم بعضی از شهر های خراسان نیز در آن روزگار بیشتر از دیگر شهرهای آن سامان رایج بوده است - بطوری که در کتاب ''هدایة المتعلمین فی الطب''، از آثار نیمهٔ دوم قرن چهارم هجری که مؤلفش بخارایی است این صفتهای مرکب بکار رفته است : بوی ناک، بیماری ناک، خواب‌ناک، سپوس ناک، سنگ ناک، تنک ناک، گوشت ناک، خوابناگ، شوره ناگ، موی ناگ، بیمارگین حسدگین، غمگین، شوخگن، رحمگن۱۸ - همچنین کثرت استعمال این گونه صفات مرکب در مثنوی معنوی و کلیات شمس در خور توجه است که بنده در اینجا فقط به ذکر چند مثال از این در کتاب اکتفا می کند: رشک ناک، ساحرناک، رشک مند، روحمند، زهر مند، روشن کده،۱۹ روحناک، سودناک، سلسله مند، عیش مند، دلکده، نقشین، عشقین، خوشین، خشمین، تنگین، زبانور، ستمستان، صفاتستان۲۰ - اما استعمال انواع صفتهای‌نسبی (بجز ''ی'' نسبت) و صفتهای مرکب مختوم به پسوندهای مورد بحث در دوره‌های اخیر و در روزگار مابسیار محدود شده است

۲ ـ هریک از شاعران و نویسندگان ما در قرنهای سوم، چهارم و پنجم و حتی اوایل قرن ششم هجری در سرودن اشعار و نوشتن آثار خود بیشتر تحت تأثیر لهجهٔ محلی خاص خود بوده اند بر خلاف شاعران و نویسندگان قرن هفتم هجری ببعد که بی توجه به شهر و دیاری که زادگاه ایشان بوده است، تقریباً همه زبانی واحد (Standard) یا باصطلاح ''لفظ قلم'' بکار برده اند ـ بنده عقیدهٔ خود را در این باب در مقالهٔ ''ضرورتهای شعری''[۲۱] بشرح ذکر کرده ام و نیازی به تکرار آن نیست ـ مطالعهٔ دقیق آثار منظوم و منثور قرن سوم، چهارم، پنجم و حتی قرن ششم ثابت می کند که در بیشتر این آثار اختصاصاتی وجود دارد که منحصر به یک یا چند کتاب است که در دیگر آثار این عهد دیده نمی شود و بدین جهت تنوعی چشمگیر از نظر استعمال لغات و ترکیبات، و حتی رعایت قواعد دستوری در آثار پیش از قرن هفتم مشهود است ـ همهٔ اینها بعقیدهٔ بنده مربوط به لهجهٔ محلی خاص هر یک از نویسندگان و شاعران آن روزدر است ـ ذکر چند مثال در این مورد بیفایده نیست :

الف ـ استعمال ''ار'' و ''و'' (=ه) معادل ''آیا'' نشانهٔ استفهام در بعضی از تفسیرهای قرآن مجید نظیر تفسیر کمبریج[۲۲]، تفسیری برعشری از قرآن مجید[۲۳]ـ

ب ـ استعمال ''ای'' و ''آذا'' معادل ''آیا'' نشانهٔ استفهام در تفسیر سور آبادی[۲۴]ـ

ج ـ استعمال ''باش''، معادل ''آیا'' نشانهٔ استفهام در کشف الاسرار وعدة الابرار میبدی[۲۵]ـ

د ـ استعمال ''دیگرم'' ''و'' سدیگرم ''بجای دوم و سوم در کتاب هدایة المتعلمین فی الطب، و کلمهٔ ''دیگرم'' در التفهیم لاوائل الصناعة التنجیم و دانشنامهٔ علائی[۲۶]ـ

هـ ـ بکار بردن ''ید'' بجای ''ی'' استمراری در تفسیر سور آبادی[۲۷]ـ

و ـ استعمال صیغهٔ اول شخص جمع ماضی در وجهٔ شرطی و التزامی بشکل ''رفتیمان'' (بجای : رفتیمی) در مفتاح المعاملات محمد ایوب

طبری۲۸، یکی از نسخه های خطی تاریخ بلعمی،۲۹ و یک مورد در دیوان منوچهری.۳۰

ز ـ استعمال صیغهٔ اول شخص جمع ماضی در وجه شرطی و التزامی بشکل: رفتمانی (بجای: رفتیمی) در شرح تعرف، تفسیر سور آبادی و چند متن دیگر.۳۱

ح ـ استعمال فعل مرکب بجای فعل بسیط مانند: پوشیده داشتن ـ پوشیدن، آزموده کردن ـ آزمودن، بریده گردانیدن ـ بریدن در تفسیر کمبریج و برخی دیگر از آثار زبان فارسی.۳۲

ط ـ استعمال کلماتی نظیر: پای وه، پای واه (: پاد افراه، عذاب)، بی ستون (: کافر، ناباور)، راستخیز (: رستاخیز، رستخیز) در تفسیر پاک و تفسیری برعشری از قرآن مجید.۳۳

ی ـ استعمال کلماتی مانند: بنک (: نوعی بیماری پوستی)، افدر (: عم، عمو)، نیاک (: خال، دائی) در تفسیر کمبریج و تفسیری برعشری از قرآن مجید.۳۴

ك ـ استعمال کلمات بسیاری که در هر یک از آنها یک حرف به حرفی دیگر تبدیل شده است و هر کدام می تواند معرف یکی از لهجه های رایج یکی از شهرها در روزگار قدیم باشد چنانکه فی المثل در تفسیر سورآبادی بجای ''گرویدن'' و مشتقات آن همه جا ''برویدن'' بکار رفته است۳۵ ـ و در ''تفسیری برعشری از قرآن مجید'' کلمات ''سخن، پذیرفتن، گذشتن، گذاشتن'' و مشتقات آنها بی استثناء بشکل ''سخون، پدیرفتن، گدشتن، گداشتن'' بکار رفته است۳۶ ـ بطور کلی بخصوص آثار قرن سوم و چهارم و پنجم از این نظر بسیار غنی است ـ

۳ ـ کار اساسی نویسندگان کتابهای لغت در هر زبانی آنست که کلمات و ترکیباتی را که شاعران و نویسندگان دوره‌های مختلف در آثار خود برده اند با ذکر معنی آنها، براساس طرز استعمال ایشان بطور دقیق ضبط کنند، و در مورد قواعد صرفی و نحوی هر اثر منظوم و منثور طرز بکار بردن هر قاعده را چنانکه در آن اثر بکار رفته است ضبط نمایند، نه آنکه

قاعده‌ای را ولو کاملا منطقی باشد، لایتغیر تصور کنند و حتی شعرا و نویسندگان کهن را ملزم به رعایت آن بدانند. و هر موردی را که خلاف آن اصل مشاهده کردند، غلط و یا خلاف قیاس بدانند زیرا بقول استاد مجتبی مینوی حتی در مورد نکته‌های روشن و واضح که حاجت به هیچ استدلال و توضیح ندارد باز باید توجه داشت که "قاعدهٔ منطقی دیگر است و قواعد زبان ادبی دیگر" ۳۷ ـ تاچه رسد به مواردی که ما بفرس قاطع از نحوهٔ استعمال قدما، و یا از لهجه‌های قدیمی محلی اطلاعی نداریم ـ فی المثل شاعران و نویسندگان فارسی زبان از قرن چهارم هجری ببعد کلمهٔ "اولی" را که عربی و افعل تفضیل است بارها بصورت "اولیتر" بکار برده اند ۳۸ ـ نویسندهٔ کتاب هدایة المتعلمین فی الطب که اهل بخارا بوده است کلمات "دیگر" و "سدیگر" را که از اعداد ترتیبی و معادل "دوم" و "سوم" است و خود وی نیز بکرات آنها را بکار برده، در مواردی باافزودن پسوند "ـُم" مخصوص اعداد ترتیبی ـ به دو لفظ "دیگر" و "سدیگر" آن دو را بصورت "دیگرم" و "سدیگرم" هم استعمال کرده است۳۹ ـ جمع بستن کلمهٔ عربی "مولا = مولی" بصورت "مولاگان"۴۰، جمع بستن جمعهای مکسر و مؤنث سالم با علامتهای جمع فارسی در آثار منظوم و منثور فارسی نظیر: کتبها، اخبارها، ملوکان، ابراران، صدقاتها۴۱، افزودن یاء مصدری فارسی بر مصدرهای عربی مانند: قحطی، سلامتی، خلاصی ۴۲، جمع بستن کلمهٔ "کس" بانشانهٔ "ها" بصورت "کسها" نه بشکل "کسان" ۴۳ همه ازاین مقوله است ـ مواردی ازاین نوع در نظم و نثر فارسی تا قرن هفتم هجری کم نیست.

۴ ـ شک نیست که اگر بتوان برای استعمال هرلغت و ترکیب و یاهر قاعدهٔ صرفی و نحوی در آثار پیشینیان شواهدی متعدد ارائه داد بهتر است، ولی نمی توان این اصل را به تمام موارد تعمیم داد و فی المثل اگر برای موضوعی شواهد فراوان یافت نشد، به عدم رواج و یا به غلط بودن آن حکم کرد ـ چنانکه فارسی زبانان از بین همهٔ افعل تفضیل های عربی فقط برکلمهٔ "اولی" پسوند صفت تفضیلی فارسی "تر" را افزوده اند، و یا تنها کلمهٔ "مولا" ست که درچندین متن معتبر با "گان" جمع بسته

شده است، و نیز فقط در تفسیر سور آبادی است که کلمهٔ ''گرویدن'' همه به بشکل ''برویدن'' بکار رفته است ـ ما این موارد شاذ و نادر را بعنوان طرز استعمال گروهی از مردم ایران در ناحیه‌ای معین و زمانی معین باید بشناسیم و ضبط کنیم ـ

****

باتوجه به چهار اصلی که بدان اشاره شد چون در سه متن معتبر نظم و نثر فارسی : مثنوی معنوی، کلیات شمس و بخشی از تفسیر کهن و تفسیری برعشری از قرآن مجید کلمات ''خندمین'' ''بودمین'' و ''نازمینه'' چند بار بوضوح بکار رفته است، آیا نمی توان دو لفظ کم استعمال ''مین'' و ''مینه'' را در کلمات ''خندمین'' و ''نازمینه'' در زمرهٔ پسوندهای اتصاف، و لفظ ''مین'' را در کلمهٔ ''بودمین'' پسوند قابلیت و شایستگی بشمار آورد ؟ـ

بعلاوه بنظر بنده این کلمه را باید بترتیب ''خندمین Xande-mīn، Xanda-mīn (خنده + مین)، ''بودمین'' Bōd-mīn (بود + مین)، و ''نازمینه'' Nāz-mīne، Nāz-mīna (ناز+مینه) تلفظ کرد .

یاد داشت ها

۱ ـ ''و بعضی گفتند : قربانی هر کدام بزرگتر، آن بهتر، یعنی اشتر به از گاو، و باز، گاو به از گشن، باز، گشن به از گوسپند خرد و از بزینه. . . . . . . قوله ''ثَمانِیَةَ أَزْوٰاجٍ مِنَ الضَّأْنِ اثْنَیْنِ'' از میشینه جفتی نر و مادهٔ آن ''وَ مِنَ الْمَعْزِ اثْنَیْنِ'' از بزینه جفتی نر و ماده، ''وَ مِنَ الْإِبِلِ اثْنَیْنِ'' از اشتر جفتی نر و مادینه، ''وَ مِنَ الْبَقَرِ اثْنَیْنِ'' ازگاوان جفتی نر و ماده ـ یعنی از جنس این هشت چیز هر چه باشد مر شما را حلال کرده شد.'' ـ تفسیری برعشری از قرآن مجید، f. 142 b .

''[بیافریدم] هشت گونه: از میشینه دو و از بزینه دو [نر و ماده]'' ترجمه و قصه‌های قرآن، از روی نسخهٔ موقوفه برتربت شیخ جام، مبتنی بر تفسیر ابوبکر عتیق نیشابوری ـ بسعی و اهتمام : مهدی بیانی، یحیی مهدوی، انتشارات دانشگاه تهران، چاپ ۱۳۳۸

دو کلمهٔ ''ضأن'' و ''معز'' در ترجمه تفسیر طبری (۲ - ۳۶۲): کشف الاسرار و عدّة الابرار (۳ / ۴۰۵): تفسیر ابوالفتوح رازی (۵ / ۷۳) بترتیب ''میش'' و ''بز'' ترجمه شده است ـ

۲ - مثنوی معنوی، تصحیح نیکلسون، طبع لیدن، ۶ / ۱۶۹۹، ۱۷۰۲، ۱۷۱۰ -

۳ - کلیات شمس، مولانا جلال الدین، تصحیح بدیع الزمان فروزانفر، انتشارات دانشگاه تهران ۴ - ۲۲۳۷۲ .

۴ - فرهنگ لغات و تعبیرات مثنوی، تألیف دکتر سید صادق گوهرین، ۴ / ۳۳۰ -

۵ - کلیات شمس ۷ / ص ۲۷۷ .

۶ - فرهنگ فارسی، دکتر محمد معین ـ

مکرر ـ بخشی از تفسیر کهن، تصحیح آقای محمد روشن، صفحهٔ ۲۵، از انتشارات بنیاد فرهنگ ایران ـ

۷ - Handlist of Persian Manuscripts (1895-1966) British Museum, London.

۸ - کلمهٔ ''خندمین'' فقط در سه کتابی که در سالهای اخیر تألیف شده و بدان اشاره گردید، مذکور است این کلمه و نیز لفظ ''نازمینه'' و دو پسوند ''مین'' و 'مینه'' در کتابهای لغت معتبر مانند لغت فرس، فرهنگ جهانگیری، برهان قاطع، غیاث اللغات، فرهنگ نظام، فرهنگ آنندراج، لغت نامهٔ دهخدا، المرقاة، لغات فارسی عامیانه در افغانستان، و نیز در کتب هدایة المتعلمین فی الطب، تفسیر پاک، تفسیر قرآن مجید (تفسیر کمبریج)، کشف الاسرار و عدّة الابرار میبدی، قصص قرآن مجید (مبتنی بر نسخه خطی موقوفه بر تربت شیخ جام)، دیوان منوچهری، قابوسنامه که بآنها مراجعه کرده ام ضبط نگردیده است ـ بعلاوه دو پسوند ''مین'' و ''مینه'' در کتاب های ''وندهای فارسی'' و ''پیشوندها و پسوندهای زبان فارسی'' نیز نیامده است ـ (گرد آوردهٔ محمد علی لوائی، تهران، ۱۳۱۶ شمسی) (تألیف سید محمد صمصامی، اصفهان، ۱۳۴۶ شمسی)-

۹ - ''تفسیری برعشری از قرآن مجید''. نوشتهٔ جلال متینی، مجلهٔ دانشکدهٔ ادبیات و علوم انسانی مشهد، سال ۸، شمارهٔ ۲، ص ۲۱۱ تا ۲۳۵-

۱۰-۱۱-نسخهٔ خطی تفسیری برعشری از قرآن مجید، بترتیب 1 f 1 b, 152 b

۱۲ - از جملهٔ این لغات و ترکیبات است آکسه : قلاب، بچرک : سخره و کار بی مزد، پورندر: پسراندر، ناپسری، تاپال : تنهٔ درخت، توراب : سراب، چاپیدن، چاویدن : ناله و زاری کردن، سنگ ویژ کردن : سنگسار کردن، کربش : کرپاسه، فرویو بارانیدن : بلعیدن، نمکگنی : ملاحت -

۱۳ - به نقل از فرهنگ غیاث اللغات، به کوشش دکتر دبیر سیاقی -

۱۴ - برهان قاطع، باهتمام دکتر محمد معین -

۱۵ - فرهنگ فارسی، دکتر محمد معین -

۱۶ - دستور جامع زبان فارسی، تألیف عبدالرحیم همایون فرخ، ص ۳۴۱ -

۱۷ - فرهنگ جهانگیری، ویراستهٔ دکتر رحیم عفیفی، انتشارات دانشگاه مشهد، ۱۹۳۲/۲ - شاهد استعمال لفظ ''بوزنینه'' بیتی است از خاقانی :

بریش تیس و به بینی پیل و غبغب گاو
بخرس رقص کن و بوزنینهٔ لعاب

۱۸ - هدایة المتعلمین فی الطب، تألیف ابوبکر ربیع بن احمد الاخوینی البخاری، تصحیح جلال متینی، انتشارات دانشگاه مشهد، صفحهٔ بیست و یک مقدمه -

۱۹ - مثنوی معنوی، بترتیب ۵/۱۱ ،۳ ۲۰۸/۵، ۸۸/۵، ۵۳۳/۵، ۳۴۱/۳، ۳۸۳/۱ -

۲۰ - کلیات شمس، بترتیب ۳۲۱۰۶/۶، ۳۲۱۸۱/۶، ۱۶۸۲۸/۳، ۳۰۲۷۵/۶، ۲۷۲۰۹/۵، ۶۰۳۶/۲، ۲۷۶۵۹/۵، ۱۹۲۵۰/۴، ۸۷۷۵/۲، ۶۸۲۵۶/۶، ۱۷۹۲۳/۴، ۸۱۴۸/۲، ۲۹۵۴۰/۶ -

۲۱ - "ضرورتهای شعری، یجوزللشاعر ما لا یجوز لغیره"، جلال متینی، "در نامهٔ مینوی"، صفحات ۳۹۵ تا ۴۰۴، چاپ ۱۳۵۰ -

۲۲ - تفسیر قرآن مجید (تفسیر کمبریج)، تصحیح جلال متینی، انتشارات بنیاد فرهنگ ایران، در دو مجلد، ۱ / صفحهٔ هفتادونه تاهشتاد مقدمه -

۲۳ و ۲۴ و ۲۵ - "برخی نشانه‌های نادر استفهام در فارسی : آدا، ای، او، و، یا، بانی، دزنگر، بسنو . . . . . ؟ "مجلهٔ دانشکدهٔ ادبیات و علوم انسانی مشهد شمارهٔ اول، سال پنجم، صفحه ۱۱۲ تا ۱۳۴؛ "تلفظ و ضبطهای مختلف یکی از نشانه‌های نادر استفهام در فارسی : "او = آ - و = ه"، مجلهٔ دانشکدهٔ ادبیات و علوم انسانی مشهد، شمارهٔ اول، سال هشتم، صفحه ۴۸۱ تا ۴۹۲، بقلم جلال متینی -

۲۶ - هدایة المتعلمین فی الطب، صفحه بیست و سه تابیست و پنج مقدمه -

۲۷ - قصص قرآن مجید، برگرفته از تفسیر ابوبکر عتیق نیشابوری مشهور به سور آبادی، تصحیح دکتر یحیی مهدوی، انتشارات دانشگاه تهران، صفحهٔ بیست و چهارم مقدمه -

۲۸ - مفتاح المعاملات، محمد ایوب طبری، تصحیح دکتر محمد امین ریاحی، انتشارات بنیاد فرهنگ ایران، صفحهٔ سی و چهارم مقدمه : "خواستیمان، کاستیمان، کردیمان، گفتیمان، گرد آوردیمان" -

۲۹ - تاریخ بلعمی، نسخهٔ خطی متعلق به شادروان سعید نفیسی، مکتوب به سال ۸۳۸ هجری : "بودیمان" ص ۷۰، "شدیمان" ص ۱۴۰ -

۳۰ - دیوان منوچهری، تصحیح دکتر دبیر سیاقی، چاپ ۱۳۲۶ : "نکردیمان" ص ۸۷ -

۳۱ - مفتاح المعاملات، صفحهٔ سی و سه مقدمه؛ "ساختمانی از فعل ماضی"، علی رواقی، مجلهٔ دانشکدهٔ ادبیات و علوم انسانی دانشگاه تهران، ۳۸۱/۱۶ تا ۳۹۳ -

۳۲ - "فعل مرکب بجای فعل بسیط"، بقلم جلال متینی، مجلهٔ دانشکدهٔ ادبیات مشهد، شماره چهارم، سال چهارم، صفحهٔ ۱۰۴ تا ۱۲۴؛ تاریخ زبان فارسی، دکتر پرویز خانلری، انتشارات بنیاد فرهنگ ایران، ص ۴۱ - ۴۳ -

۳۳ و ۳۴ - "تفسیری برعشری از قرآن مجید"، مجلهٔ دانشکدهٔ ادبیات و علوم انسانی مشهد، شمارهٔ دوم سال هشتم، بترتیب صفحات ۲۱۸ تا ۲۱۹ و ۲۱۵ تا ۲۱۶ -

۳۵ - قصص قرآن مجید، صفحه بیست و پنج مقدمه -

۳۶ - "تفسیری برعشری از قرآن مجید"، مجلهٔ دانشکدهٔ ادبیات و علوم انسانی مشهد، صفحه ۲۱۹ ۳۷ - "تفسیری برعشری از قرآن مجید" مجلهٔ دانشکدهٔ ادبیات و علوم انسانی مشهد، صفحه ۲۱۹ ۳۷ - "من آن کسم که . . . . . (از مباحث نحو فارسی)"، مجتبی مینوی، در "هفتاد سالگی فرخ"، چاپ ۱۳۴۴ -

۳۸ - هدایة المتعلمین فی الطب، صفحات ۲۶۷ و ۲۰۷ -

۳۹ - رک زیر نویس شمارهٔ ۳۷ -

۴۰ - مفرد و جمع، دکتر محمد معین، ص ۴۲؛ تفسیر قرآن مجید (تفسیر کمبریج) ۱ - ۲۷۴ .

۴۱ - از جمله رک - هدایة المتعلمین فی الطب، صفحه فده؛ تفسیر قرآن مجید (تفسیر کمبریج) صفحه سی و پنج مقدمه، مفرد و جمع، دکتر محمد معین، ص ۸۱ - ۸۷ -

۴۲ - اسم مصدر و حاصل مصدر، دکتر محمد معین، چاپ دوم، ص ۱۱۹ -

۴۳ - هدایة المتعلمین فی الطب، صفحات ۳۷۴، ۶۲۴؛ تفسیر قرآن مجید (تفسیر کمبریج)، صفحهٔ سی و شش مقدمه -

دکتر عبدالمحسن مشکوة الدینی دانشیار فلسفه
در دانشگاه مشهد ـ ایران ـ

اصل تعلیم و تعلم از نظر پیروان ادیان ملی

گفت و گوی ما در مفهوم و ماهیت تعلیم از جهت مفهوم عمومی و مفهوم آن در ادیان ملی و بالنتیجه مفهوم تعلیم در فلسفه باطنیان اسماعیلی است که یکی از فرق منشعب از مسلمانانند ـ

به عنوان مقدمه عرضه می دارم که تنها سبب ائتلاف و اساس وحدت مابین جمعیتهای انسانی که موجب انس و نزدیک شدن افراد بایکدیگر می شود، همسانی در اصول فکری و رابطهٔ علمی و اشتراک در حوائج فرهنگی و ایمانی است ـ

امروز اگرچه اصول فرهنگی و مسائل علمی تا حدودی مشترک مابین جوامع است و همهٔ ملتها از جنبه‌های بسیاری با هم نزدیک شده اند و شباهتهای صوری در مسائل اجتماعی و فرهنگی بسیار است، اما در حقیقت و باطن امر، جدائی مابین انسانها ازحد در گذشته است زیرا بطوری که عرضه شد رابط حقیقی یکسانی در حوائج روحی و داشتن اصول اعتقادی است و علمی و ایمانی مشترک است و ایمان مشترک متکی بر اشتراک در روش تعلیم است ـ

(اختلاف در روشهای تعلیم)

بعضی از اهل تحقیق مردم را از لحاظ مبنای تعلیم و تعلم و روش فکری سه دسته شمرده اند :

گروه اول پیش خود اندیشان و خود سران درعلم هستند :

ایشان در همهٔ مسائل بر همان مبنای تفکرات شخصی که حاصل از تمایلات و معتقدات مولود از اجتماع معینی است که در آن پرورش

بافته اند متکی هستند و همهٔ مسائل را برهمان مبنای خاص حل و فسخ کرده و بر آن جمود می ورزند و بواسطهٔ استبداد و جمود خاطری که از محیط مسدود خود حاصل کرده اند خود را از مراجعه کردن به هر گونه مرجع و مأخذی که مربوط به خارج از محیط فکری آنان باشد بی نیاز می بینند و به قول فرانسیس بیکن، پیشوای تحقیق و تجدید علم در عصر جدید، این گروه از مردم مادهٔ فکر را از درون خود بر آورده بهم می بافند آنچنان که عنکبوت تارها را از درون خود برون داده بهم می تند و در قرآن کریم نیز خانهٔ عنکبوت به مثل آورده شده که از همهٔ خانه‌ها سست بنیان تر است و شهرستانی پیش خود اندیشان را غیر مستفید علم تعبیر کرده است۱ـ

۲ ـ گروه دیگر از مردم برخلاف دستهٔ اول به ظاهر از معارف دیگران بهره می گیرند اما در حقیقت از آنچه می شنوند و از بر می کنند، بهرهٔ علمی نمی برند بلکه خزانه‌دار و حامل و ناقل افکار هستند و بدون اینکه روابط موجود ما بین مسائل را درک کنند کور کورانه قضایائی را می شنوند و می بینند و قادر بر استخراج فروع از آن اصول فکری نیستند ـ فرانسیس بیکن این گروه را به مورچه مانند کرده که بذر مطالب را مانند دانه به درون ذهن می کشند اما مانند مورچه که هیچ تصرفی در دانه ندارد آنان نیز در محفوظات خود هیچ تصرف نمی کنند و شهرستانی ایشان را مستفیدان غیر مستنبط خوانده است ـ

۳ ـ سومین گروه آنانند که مسائلی را از منابع سمعی و بصری بدست آورده و بعد از تأمل و تحقیق در صحت آنها بـه رابطه‌های موجود مابین آن قضایا با مسائل، دیگر پرداخته فروعی از آن اصول استخراج می کنند و فرانسیس بیکن این دسته را به زنبور عسل تشبیه نموده که از گل و گیاه خارج از خود بهره می گیرند و در داخل خود ازآن ماده‌ها انگبین ساخته بیرون می دهند و شهرستانی ایشان را مستفیدان مستنبط خوانده است ـ

روش دانش آموزی برای دین داران در حقیقت همین تعلم مستنبطانه است که اصول فهم و درک خود را از منابع بصری و سمعی گرفته با معیار

۱ ـ ملل و نحل ج ۱ ص ۴۸

کلیات شرع آنها را تحلیل و ترکیب می کنند و ملیت اسلام مخصوصاً بر مبنای فایده‌جوئی علمی از منابع سمعی و بصری تأسیس گردیده است ـ

نکتهٔ دیگر این است که اصول اعتقادی و جوانح ایمانی که روح و باطن شرع است شخصیتهای فردی و اجتماعی ملتها را تشکیل داده است و به همین ملاحظه همهٔ ذوقیات و معارف و نحوهٔ تفکر هر قومی تاحدود بسیاری از اصول ایمانی مخصوص به آن قوم تبعیت کرده و از آن چشمه گرفته شده است ـ

ملت ایران و پاکستان که علاوه بر همجواری محیطی هر دو در اصول مستنبطانه اسلامی شریک هستند و جوانح ایمانی دو ملت یکسان است در مسائل فرهنگی و تاریخ دینی و ادبی هر دو یکسانند و ذوقیات علمی و هنری مشترک دارند و از جهات روحی و معنوی جنبه‌های اتحاد و اتفاق مابین آنان بسیار است ـ

بنابر این جشن کنونی که به مناسبت صدمین سال تأسیس دانشگاه پنجاب لاهور برپا شده است در حقیقت به خود ملت ایران نیز تعلق دارد و اینک به اصل مقصود نزدیک می شویم ـ

(مفهوم تعلیم از نظر عمومی)

پذیرفتن این قضیه که هر فردی از انسان برای بدست آوردن دانش به فرد دیگر نیاز دارد، مورد قبول بیشتر ملتها و جمعیتهای عالم است ـ

اما اختلافی که مابین نظر عموم با خصوص پیروان ادیان ملی در بین است، این است که در نظر عموم هر فرد نادانی برای کسب علم باید به فرد دیگری از همنوعان خود مراجعه کند که او نیز پیش از آن دانش خود را از افراد دیگر آموخته بوده است و بنا بر این همیشه نسلهای قبلی دانش و فرهنگ خود شان را که از نسل پیش گرفته اند به نحو تسلسل به نسل تازه که بعد از آنها خواهند زیست منتقل می نمایند با این تفاوت که نسل بعد از مشاهدات تازهٔ خود چیزی بر اصول موروثی افزوده و تصرفاتی در آن به عمل می آورند ـ

(مفهوم تعلیم و راهنمائی تعلیماتی به روش ادیان ملی)

مفهوم تعلیم و تعلم در نظر پیروان ادیان ملی این است که ریشه و اساس علم درست فقط از منابع مافوق انسانی از طریق وحی گرفته می شود زیرا افراد هر ملتی پایبند به تمایلات و آرزوهای شخصی و اجتماعی مخصوص به محیط و مواریث نژادی خود می باشند ـ ازاین جهت اصول فکری هیچ فردی از آنها بطور مطلق مربوط به نوع انسان نخواهد بود و برای همگی آنان سندیت مطلق نخواهد داشت و نتایج تجربه هر چه با دقت بیشتر انجام شده باشد، قرین شرائط و محدودیتهای خاص محیطی و نژادی خواهد بود و ناگزیر آموزندهٔ اصلی باید اصول دانش خود را از محیط مافوق انسان گرفته باشد تا محدودیتی در آن نبوده و پایه‌های علمی نوع انسان بر اساس غرضهای خاص و اندیشه‌های مخصوص پایه‌گذاری نشده و از هر جهت اطلاق و عمومیت داشته باشد ـ

(اختلاف روش مابین پیروان ملیت ها)

بعد از آنکه همهٔ پیروان ادیان ملی اتفاق بر آن داشتند که اساس تعلیمات باید از مبادی غیبی گرفته شود، اختلافات دیگری مابین ایشان پدید گردید که حدود استنباط و تصرفات جایز در آن اصول تاچه اندازه است و چه نوع از فروعی را از آن اصول می توان استخراج کرد و نزاع مابین عقل و شرع از همین نقطه آغاز گردید:

۱ ـ گروهی بر آن شدند که هر گونه تصرف و تأمل و اعمال نظر در متون شرعی غیر مجاز است زیرا شرع بی نیاز از عقل است و دخالت دادن عقل در هر مسأله ای از قضایای علمی و عملی بدعت است و فقط بر همان مفاهیم عرفی که از متون شرعی بدست می آید باید بس کرد و باید عقل را در هیچ کاری دخالت نداد، این گروه را اهل تقلید لقب دادند ـ

۲ ـ دستهٔ دیگر گفتند عقل اصل است و هر قضیه شرعی که قابل فهم نباشد و عقل آن را باور نکند قابل پذیرفتن نیست زیرا هدف شرع غیر از هدف عقل است و در هر کجا برخوردی مابین آنها حاصل شد، هدفهای عقلی همیشه بر شرع تقدم دارد ـ

۳ ـ گروه دیگر جانب شرع و عقل هر دو را در حدّ تساوی گرفتند و هر دو را در تشکیل معارف بشر سهیم قرار دادند بدون اینکه رجحانی برای یکی بر دیگری قائل باشند ـ

۴ و ۵ ـ گروه چهارم و پنجم آنانند که بعضی از آنها شرع را اصل قرار داده و عقل را بازگو کننده و شارح و مبیّن گفته‌های شرع و خدمتگزار آن معرفی کردند و جمعی دیگر به عکس عقل را اصل گرفته و شرع را راهنما و شارح احکام عقل قرار دادند ـ

فرق مابین این عقاید آنست که دو قسم اول معارضه و جدائی شرع از عقل را روا می دانستند و حق تقدم را بیکی از آنها وا می گذاشتند، امادر سه قسم اخیر همه جا شرع و عقل را موافق دانسته و مورد اختلافی برای آنها روا نمی داشتند ـ

(مفهوم تعلیم و راهنمای علمی در نظر فرقهٔ باطنیه)

فرقهٔ باطنی که اسماعیلی مذهب هستند نقش خاصی در مورد این ماجرا بر عهده داشتند و به همین سبب لقب اهل تعلیم اختصاص بدیشان یافت ـ

مطالبی که در این مورد ذکر می شود از باب توجه به فرقهٔ معین یا طرفداری از عقیدهٔ مخصوصی نیست، بلکه صرفاً از راه مطالعه در تاریخ عقاید و آراء عمومی است و یکی از فرق عمومی این فرقهٔ مخصوص اند که به حق و باطل بودن اعتقادات رسمی ایشان توجه ندارند اما در یک قسمت معین که اصل تعلیم است، باید بی‌طرفانه قضاوت کرد که روش تعلیم باطنی ایشان مشابه با سایر عرفان مسلکان و مطابق با فرق اهل تصوف است ـ

روش تعلیم باطنیه در دوره‌های اول، با دوره دعوت جدید که حسن صباح آن را آغاز کرد تفاوتهائی داشت زیرا در دعوت قدیم معلم باطنی راهنما و کمک عقل شناخته شده بود اما در دعوت جدید معلم راست گو به تنهائی جای عقل را گرفته است و مفهوم تعلیم به روش جدید باطنیه در آخر ذکر خواهد شد ـ

ظاهر کلمات باطنیهٔ قدیم مشابه با فرقهٔ سوم است که شرع و عقل هر دو را در یک ردیف باهم برای تشکیل معارف انسانی سهیم قرار می دادند بلکه گاهی چنین استفاده شده است که نظر ایشان مطابق با دستهٔ اول است که ذکر شد به همین سبب گاهی آنان را اهل تقلید خوانده اند اما باید دانسته شود که کلمهٔ علم و تعلیم و راهنمای علمی در اصطلاح ایشان مفاهیم دیگری داشته است که بکلی با مقاصد فرقه‌های دیگر مغایرت دارد همچنانکه سایر الفاظ را نیز در معانی رمزی بکار می برند و بر طبق همین اصل در مورد تعلیم موضوع سخن ایشان غیر از مقاصد دیگران است و تناقضی مابین گفتار آنان در باب روش معرفت موجود نیست هر چند که در ظاهر متناقض شناخته می شوند، ظاهر گفتار اهل تعلیم این است که اندیشهٔ نوع انسان در همهٔ مسائل و به خصوص در مسائل ایمانی اصلا به حقیقت رهبر نیست و آموزندهٔ راست گوئی لازم است که هر فردی را به دانش واقعی رساننده و به حقیقت رهبری کند زیرا که :

اولاً در همهٔ موارد دانشمندان باهم اختلاف نظر دارند و همین تفاوت رأی ثابت می کند که ذهن انسان خطاکار است وگرنه همهٔ متفکران در عقیده باید متفق باشند ـ

ثانیاً همهٔ صنعتهای ادبی و هنری را به وسیله آموزگاران یاد می گیرند و چگونه ممکن است مفاهیم دقیق و قضایای علمی که از همه مشکلتر است بدون آموزنده درک شدنی باشد و امام معصوم تنها کسی است که باید آموزندهٔ همه باشد ـ (شرح مواقف ص ٦٣) ـ

ناظران در مطالب به حسب ظاهر گفتارشان را مخالف باعقل دیده و به تقلید و کوری مسلک آنان را متهم کردند و علاوه بر آن هنگامی که به کتب اصلی ایشان مراجعه می شود همگی به روش استدلال منطقی و فلسفهٔ خالص نوشته شده است و از این جهت تناقضی مابین گفتارشان در ظاهر بنظر می رسد به همین سبب مدعیان بر ایشان خرده آوردند که :

اولاً هر کسی با مراجعه به ضمیر خود می باید که می تواند چیزهائی را بطور صریح و یقین بدون مراجعه به افراد دیگر بیاموزد و

پیش خود درک کند و همه کس می تواند مشکلات علمی را فقط باتمرکز فکر و اعمال دقت نظر از هم بگشاید.

ثانیاً لزوم طاعت امام و گوش به سخن رهنما دادن خود حکمی عقلی است که مستقلاً باید آن را عقل درک کند بنا بر این سندیت عقل و بی نیاز بودن عقل از شرع در اصول کلی از همه چیز روشن تر است.

در اینجا باید گفت که محکوم کردن عقل خالص و سست گرفتن استدلال منطقی روشی مشترک مابین این فرقه و همه فرقه های صوفی مشرب است و همانگونه که امام غزالی و دیگران باهمهٔ اختلافاتی که در سایر مسائل با این فرقه دارند، در عین حال همگی در این اصل کلی با ایشان همنظرند که فکر انسان بدون معاونت هدایت درونی از طرف راهنمای باطنی از اصل گمراه است و خضر راهی لازم است که مریدان را از خطر گمراهی نجات دهد، به همان گونه که اهل تعلیم تناقض مابین افکار اهل نظر را دلیل بر سستی علم و مبنای کار علمی و عقلی قرار می دادند، غزالی نیز کتاب ''تهافت‌الفلاسفه' نوشت تا تناقض مابین استدلات ایشان را نمودار کند و در کتاب ''المنقذ من الضلال'' بعد از آنکه همهٔ دانشمندان عقلی و عرفی از فلاسفهٔ الهی و طبیعی و اهل حدیث و مجتهدان و متکلمان و حتی اسماعیلیان را از حقیقت منحرف قلم داده است آنگاه روش روشن بینی درونی را جانشین برای همهٔ روشها قرار داده است و انتخاب مراد و رهنمای باطنی را از همین راه لازم شمرده است.

ابو یعقوب سجزی باطنی مسلک نیز در کتاب ''کشف المحجوب'' خود (ص ۲۸) به همین مطالب اشارت کرده است و علم ظاهر و باطن را از هم تفکیک نموده است و خلاصهٔ سخنش این است که دانشمندان سه بهر هستند:

۱ - گروهی از ایشان به دانشهای عرفی که مفاهیم حاصل از الفاظ است و به تلقین معاشران و کسانی که در بین آنها پرورده شده اند فراهم آمده است دل خوش داشتند (و آنان دانشمندان عرفی هستند).

۲ - گروه دیگر از مردم مفاهیم علمی و آنچه مربوط به تکالیف ظاهری است از الفاظ شرعی و سخنان آموزگاران شرعی گرفته اند (ایشان اهل حدیث و اهل ظاهرند).

۳ ــ همه دیگر گروه آنانند که به علم ظاهر قانع نشدند بلکه پوشیده‌ها را از خداوندان دین آموختند و بر باطن علوم واقف گردیدند ـ

ملاحظه می شود که در این سخنان آنچه نیازمند به معلم باطنی دانسته شده غیر ازآن مسائلی است که مردم عادی به فهم اجتماعی آن را درک می کنند و یا آنکه اهل حدیث از مفاهیم عادی الفاظ شرعی از بر می کنند ـ

ابو یعقوب در جای دیگر از کتاب خود مفهوم علم را به مصطلح اهل باطن علومی بیان کرده است که آمیخته با دلیل نباشد وآن را علم تاییدی که غیر از علوم عادی نست نامیده و می گوید: ''علم نیامیخته به دلیل نسزد مگر ایزد را و عقل اول که باعلم ایزد متحد است نور تایید خالص را بر دل گزیدگان از پیغمبران می ریزد و آنان از طریق تایید راه معاش و معاد مردم را پیدا کردند و علم خالص نیامیخته بادلیل اختصاص به پیمبران و وصیان و امامان دارد و دانایان اینجهانی بتوسط دلیل بدان دست یابی ندارند'' (کشف المحجوب ص ۲۱) ـ

و باز می گوید : ''حقایق علم سر ایزدست که بدان آگاه کند آنکس را که خواهد از اولیاء او و علم در خزینهٔ اوست که بدان منت کند بر آنکس که خواهد از بندگان او'' و بعد ازان دربارهٔ خودش می گوید: ''این علم برایم از طریق طاعت من ولی خدا را در زمین دعوت و شفقت او برمن حاصل شده است'' (کشف المحجوب ص ۲) .

حقیقت تعلیم

چنانکه دانسته شد علم در اصطلاح ایشان مفاهیم ذهنی نیست که از گفت و شنید لفظی حاصل شود بنا بر این تعلیم نیز آن نیست که الفاظی را به انسان بشنوانند یا چیزهائی را به رؤیت ظاهری آموزنده برسانند بلکه مقصود از آن بر قرار کردن رابطهٔ معنوی مابین شخص آموزنده است باحقایق غیبی و باطنی تا روشنی ضمیر و بصیرت درونی برای شخص حاصل گردد و همه چیز را آنچنانکه هست، بدون تصرف ذهنی بشناسد و بداند ، و پیدا شدن این بصیرت درونی و روشنی ذهن را تایید بوسیله کسانی روی می دهد که مظهر موجودات معنوی و صفات باطنی خدا باشند ـ

اساس تعلیم باطنی این گروه بر این اصل استوار است که هر چیزی دارای دو نوع از وجود است : وجود آشکار و وجود نهان، انسان نیز که سرآمد موجودات محسوس است دارای وجودی عیان است و موجودیت دیگری که نهان است.

دو موجودیت عیانی و نهانی که جسم و روح اند هر دو جویندهٔ غذا هستند.

جویندگی غذای عیانی اختصاص به جسد او دارد که وجود حسی اشیاء را به خود جذب می کند.

جویندگی نهانی انسان از وحی ضعیف و عقل غریزی حاصل می شود که در افراد بیش و کم است.

غذای موجودیت نهانی انسان صور ماهیات عقلی اشیاء است که از خزانهٔ علم خداوند به او می رسد همچنانکه غذای جسمانی او نیز از جانب خدا به تن ایشان عطا می گردد.

(زاد المسافرین ص ۲۱۰ و ص ۲۱۹)

(کتاب ظاهر و کتاب باطن)

غذای روحی افراد عادی انسان که شناختن اشیاء است از دو راه به ایشان می رسد : یکی از راه گوش و دیگری از طریق چشم.

نوشته‌ها و گفته‌ها که غذای روح اند هر دو از جانب خدا به او می رسد یکی از کتاب سمعی و دیگری از کتاب بصری خداوند است.

کتاب سمعی از لوح باطنی خداوند که لوح محفوظ است و صور حقیقی اشیاء از جانب عقل کلی بر نفس کلی که روح‌الامین است نقش گردیده گرفته می شود و فقط پیغمبران به خواندن آن کتاب باطنی آگاهند و آن علوم باطنی را در قالب الفاظ محسوس برای مردم می خوانند.

کتاب بصری لوح محسوس خاک است که صور طبیعی اشیاء از طرف نفس کلی به تایید عقل کلی بر آن لوح نقش گردیده و جهان محسوس از آن صور حاصل گردیده است.

(زاد المسافرین ص ۲۱۱، خوان الاخوان ص ۲۳۳)

(تعلیم)

تعلیم بر دو گونه است : درونی و برونی ـ تعلیم درونی الهام است که اختصاص به عقل کلی دارد و عقل مبدأ تایید است ـ زیرا تابش عقل بصیرت درونی در شخص ایجاد نموده صورت حقیقی اشیاء را برای آموزندگان روشن می کند ـ علم عقل کلی ذاتی است و کلمهٔ دانشها از او سر چشمه می گیرد ـ

(زاد المسافرین ص ۳۴۵)

تعلیم ظاهر، یا سمعی است و یا بصری و به معلمان دیگر که بعد از عقل هستند اختصاص دارد و معلمان دیگر واسطهٔ تایید می باشند و تایید عقل را بدیگران می رسانند ـ

دانش‌آموز اول، نفس کل است که موجودیتش از عقل کل است و دانش کل را از عقل کل فرا می‌گیرد ـ عقل کل با نفس کل دو گونه گفت و شنید دارد :

علوی و سفلی : (یاعلمی و عملی) خطاب اول سفلی و عملی است که نقش صور علمی از عقل بر لوح مادهٔ کلی فرود می آید و وجود عینی اشیاء به تایید عملی عقل توسط نفس کلی تحقق می یابد و نفس کلی در این خطاب از جهت انجام دادن کار نسبت به ماده کلی تعلق و الفتی می یابد (خوان الاخوان ص ۲۳۴) ـ

خطاب دوم عقل با نفس، علوی و علمی است زیرا در این تعلیم عقل کل تفصیل صوراشیاء را در نفس کل نقش کرده به خصوصیات آنچه در عمل آموخته بود او را آگاه نموده و او را به پستی و فانی بودن آن صورتهای جزئی واقف می گرداند و با خطاب دوم عقل کلی نفس کلی را از صورت عملی به صورت عقلی و علمی و از ظاهر به باطن اشیاء منصرف می‌گرداند ـ (خوان الاخوان ص ۲۱۹ و ص ۲۲۰) ـ

و او را از نفی توحید و رؤیت کثرت به اثبات توحید باز می‌گرداند زیرا صور علمی اشیاء را که حقیقت و ثابت است متعلق به حق می بیند (خوان الاخوان ص ۲۲۲) ـ

(علم تعلیمی)

مرحلهٔ دوم از تعلیم درمورد نوع انسان انجام می گردد زیرا درمیان همهٔ موجودات محسوس فقط نوع انسان به خواندن کتاب ظاهر و باطن خدا توانا گردید و از میان نوع مردم اول کسی که به واسطهٔ شدت عقل فطری جویای خواندن این دو کتاب گردید و شوق آن را یافت شخص پیغمبر بود -

(نور تأیید شرط توانائی بر خواندن است)

پیغمبر بواسطهٔ زیادتی عقل فطری به خواندن کتاب کثیف (کتاب عملی) و کتاب لطیف (کتاب علمی) شوق و رغبت پیدا کرد، اما توانائی برخواندن نداشت به همین سبب به تأیید عقل کلی که بصیرت درونی و امکان فهم و درک اشیاء از آن حاصل می شود نیاز پیدا کرد -
(زاد المسافرین ص ۲۱۱)

و از این جهت شخص پیغمبر درمیان نوع انسان به منزلت نوع انسان درمیان سایر جانداران است زیرا اول کسی است که شوق خواندن را یافت (زاد المسافرین ص ۲۰۶) -

اما پیغمبر امی بود و از پردهٔ بشریت پوششی بر چشم داشت که همه چیز را تاریک و مبهم می نمود تا آنکه نور تأیید بر ضمیرش تابید و او را به خواندن کتاب علمی و عملی خدا توانا گردانید و او درمیان همهٔ امی ها اول کسی بود که بینا و خوانا گردید -
(زاد المسافرین ص ۲۱۰ و ۲۱۶ و خوان الاخوان ص ۲۱۵)

در این هنگام او دارای اندیشه روشن و قادر به خواندن کتاب گردید و صورتهای علمی را در لوح نفس کلی که روح الامین است بواسطهٔ تابش عقل خواندن کرد - (زاد المسافرین ص ۲۱۴ و ۲۱۳) -

اما سایر افراد نوع انسان امی ماندند و برای خواندن کتاب علمی و عملی یا سمعی و بصری نیاز به نور بینش داشتند -

بدین سبب آموزندگی سایر مردم به شخص رسول محول گردید زیرا همچنانکه غذای جسمانی مردم در زمین است غذای معنوی او نیز در زمین

حواله شده است و همچنانکه نور حسی را ماه و ستارگان از خورشید می گیرند و به زمین می رسانند، بصیرت معنوی و نور تایید که از عقل است بتوسط رسول باید بدیگران برسد بنا بر این رسول تنها کسی است که کتاب ظاهر و باطن خدا را برای مردم خواند ـ (زاد المسافرین صفحه ۲۰۶ و ۲۱۹ و ۲۲۰) ـ

وجود علمی بیغمبران گفتار نفس کلی و صور موجودات مادی کردار نفس کل است زیرا همان صوری را که نفس کلی به شخص پیغمبر نمود همان صور را عیناً بر ماده خارجی منقش گردانید ـ

(خوان الاخوان ص ۱۳۶)

نفس کلی دارای دو وظیفه است یکی تعلیم و نمایاندن صورتهای علمی که خود از عقل کلی دریافت کرده است ـ وظیفهٔ دیگر نفس کلی، عملی، و ریختن همان صور علمی بر (لوح محو و اثبات) یا صفحه ماده کلی جهان است ـ

شخص ناطق که سومین موجود عالم است و فرد کاملی از همهٔ مردم است به منزلهٔ خدای و گفته‌اش گفتهٔ خدای و کرده‌اش کردهٔ خدای باشد و او پادشاه دو عالم است، (عالم نفوس و عالم اجسام) زیرا او پادشاه نوع انسان است و نوع انسان پادشاه عالم اجسام است و او پادشاه عالم لطیف و عالم کثیف است ـ بنا بر این او خدای عالم نفوس و عالم اجسام است ـ (زاد المسافرین ص ۴۷۳) .

(آغاز تعلیم در عالم محسوس)

وحی آغاز تعلیم است و نخست معلم آنکس باشد که وحی بدو آید و پیغمبر آن کسی است که خودش از راه گفتار علم نپذیرفته باشد اما از راه گفتار بدیگران بیاموزد، اما پیغمبر القا کنندهٔ علم و آموزندهٔ حقیقی نیست بلکه او آماده کنندهٔ نفوس امت است برای پذیرفتن وحی و شایستگی برای عنایت الهی و هر کس از امت فرمانبر باشد عنایت بسویش گرایش خواهد یافت ـ

(زادالمسافرین ص ۳۴۵)

(تعلیم خاص و تعلیم عام)

هر چیزی در عالم دارای ظاهر و باطنی است یکی سفلی و دیگری علوی: وجود علوی پیغمبرعقل کل است که در عالم باطن است. وجود سفلی پیغمبر شخص بالغ و کامل است که در عالم ظاهر است و در حقیقت پیغمبر عقل کل زمینی است در برابر عقل کل عالم باطن.

نفس کلی نیز دارای ظاهر و باطنی است. باطنش لوح محفوظ است که صور علمی را از عقل پذیرفته است، ظاهرش نفس زمینی است که در شخص اساس ظاهر گردیده، و همچنانکه نفس کلی در برابر عقل کلی طفلی است که رو به کمال می رود شخص اساس نیز در عالم جسمانی نسبت به شخص ناطق کودکی است که رو به کمال می رود.
(ملل و نحل ص ۲۳۲ و خوان الاخوان ص ۲۰۳)

بنا بر آنچه گفته شد پیغمبر عهده دار دو نوع از تعلیم است:

ظاهر و باطن: تعلیم ظاهری‌اش این است که آنچه را در کتاب علمی باطن خوانده است و با کتاب عملی مطابقت دارد در قالب الفاظ محسوس ریخته و کتاب ظاهر را برای ارشاد خلق بر آنها می خواند و احکام ظاهری شرع را که عمل کردن به آن مهیا کنندهٔ نفوس برای تابش عقل و گرفتن نور بصیرت است برای مردم می آورد و از این جهت او مهیا کنندهٔ امت است برای تابش نور عقل و بصیرت درونی.
(خوان الاخوان ص ۲۸۳ و زادالمسافرین ص ۳۴۵)

و روح تأییدی علمی که پیغمبر بدان زنده گردیده است همان زندگی رهبرانهٔ او است که خلق بدان هدایت می یابند.

(زاد المسافرین ص ۴۲۴)

تعلیم باطنی پیغمبر اختصاص به شخص اساس دارد و شخص ناطق همان نور باطنی را که عقل بر ضمیرش تافته بود بر نهان اساس تابانیده تا به باطن علوم آگاهی یابد و هر آنچه را خودش خوانده بود به شخص اساس نمود تا او نیز خوانا بدان گردید. (خوان الاخوان ص ۲۰۳)

عقل کلی و نفس کلی و ناطق و اساس چهار اصل روحانی هستند که جهان بدیشان پایدار است و چهار حرف اسم جلاله بدیشان دلالت دارد :

۱ ـ عقل معدن تأیید است ـ
۲ ـ نفس کلی معدن ترکیب (ماده با صور) است ـ
۳ ـ ناطق معدن تألیف (کتاب) ـ
۴ ـ اساس معدن تأویل است ـ

و چهار عنصر : آتش، هوا، آب و خاک که اولی معدن گرمی و دومی معدن ترکیب و سوم معدن سرشتن و چهارم معدن نگهداری سرشته‌ها است در جهان محسوس برابر همان چهار اصل روحانی و عوامل پایداری موجودات روحانی و جسمانی هستند ـ (خوان الاخوان ص ۹۷)

عقل کلی اصل همهٔ هستیهای روحانی و جسمانی است ـ

نفس کل اساس موجودیت عالم است زیرا از درخشیدن نور عقل، نفس لامع گردیده عالم جسمانی از آن حاصل میشود و نیز لوح ایزد است که صور علمی در آن منقش می گردد ـ

ناطق تدبیر کنندهٔ جهان جسمانی است آنچنانکه بخواهد اساس هدیهٔ ناطق به امت است زیرا خلق از او هدایت می یابند ـ
(خوان الاخوان ص ۱۹۱)

(امام تکمیل کننده تعلیم است)

بعد از اساس در عالم جسمانی نوبت تعلیم به امام می رسد زیرا آنچه را اساس از ناطق آموخته و در کتاب باطن خوانده بود عیناً به شخص امام می نمایاند و امام آن را به باب و او به حجت منتقل می سازد ـ
(خوان الاخوان ص ۲۱۳)

علم و معرفت در زمین از پیغمبر آغاز گردیده و بتوسط امام به حد کمال می رسد زیرا دین دارای ظاهر و دارای باطنی است ـ ظاهر دین باپیغمبر تأسیس گردیده و رشد و تکامل معنوی آن با اساس و امام حاصل می شود و همچنانکه موجودیت انسان بانفس نامیه آغاز می گردد پیغمبر نیز احکام عملی را که به منزلهٔ جسد دین است انشاء می کند ـ

شوق اساس به فراگیری علم و آگاهی از حقیقت برابر با نفس شهوانی انسان است که بعد از قوهٔ نباتی بوجود می آید و کمال علم به نفس ناطقه حاصل می شود و شخص امام آن را بر درون است می دمد بنا بر این امام نفس ناطقهٔ دین است که مردم بتوسط او به خواندن باطن کتاب توانا می گردند۔ (زاد المسافرین ص ۲۷۰ تا ۲۷۶ و خوان الاخوان ص ۲۰۵)

نبی و وصی و امام وسایط تأییدند و لحظه‌ای نیست که عالم از وجود یکی از آنها خالی باشد۔ (خوان الاخوان ص ۲۰۳)

زیرا بصیرت باطنی بدون تأیید باطنی امام و مأذون از قبل او حاصل نخواهد گردید (کشف المحجوب ص ۲۸)۔

(ادوار تعلیم : دور ستر و دور کشف)

شش دور تعلیم که شش روز آفرینش و شش دور تشریع است شش دور نبوت است از آدم تا به خاتم و هر دوره‌ای از آن مشتمل بر دور ناطق و اساس و دور امام می باشد۔

(پایان ادوار تعلیم)

همهٔ این دوره‌ها فاصلهٔ مابین ستر و کشف مطلق بودند و به دور کشف مطلق و ظهور باطن خالص پایان خواهند یافت و آن دور هفتم یا دور قائم است که نهایت ادوار است و دور قائم کور عظیم است۔
(کشف المحجوب ص ۸۲ خوان الاخوان ص ۸۶ و ص ۱۸۰ و ۱۲۹ و ۱۳۲)

همهٔ عالم برای کامل شدن نفس و تمام معرفت ساخته شده است و دور کمال مطلق دور قائم است که تعلیم پایان می یابد و معرفت باطن به حد کمال می رسد۔ (زاد المسافرین ص ۳۷۲)۔

در این دور کسانی که در عمل کردن به شریعت در دوره‌های قبل کوتاهی کرده باشند به لعنت و خشم او گرفتار می شوند و دائم در دوزخ می مانند (خوان الاخوان ص ۲۸۰ تا ۲۸۳)

مطیعان که عمل به شریعت کرده اند در این دوره به معرفت حقیقی نائل آمده به عقل کل محلق می شوند و آن بهشت موعود است که

همهٔ پیغمبران در شش دور قبل بدان بشارت دادند و مقدمه برای آن بودند و مردم دیگر در عذاب جهل خواهند ماند.

(زاد المسافرین ص ۴۸۳، خوان الاخوان ص ۱۳۲ و ۲۰۲ ؟ ۳۰۱)

امام زمانه پادشاه دو عالم است که مؤمنان را از حد قوت به فعلیت مطلق می رساند. (خوان الاخوان ص ۱۰۳)

(تعلیم در روش جدید اهل باطن)

روش تعلیم باطنی در دعوت جدید تغییر پیدا کرد زیرا دعوت قدیم باطنی‌ها بر این اصل تکیه داشت که خرد تنها برای کسب معرفت کافی نیست اما با کمک ارشاد باطنی آموزگار حقیقی خرد را رهبر به حقیقت می دانستند حسن صباح که دعوت جدید باطنیان را آغاز کرد تناقض مابین آرأ اهل نظر را دلیل بر بی اعتباری عقل بطور مطلق گرفت و معلم راست گو را به تنهائی جانشین خرد قرار داده و مردم را به تقلید کور کورانه از معلم راست‌گو می خواند و این مدعا را در یک الزام کوتاه گنجانیده از معترضان خود می پرسد که "خرد بس یا نه بس؟) و از این پرسش نتیجه می گیرد که اگر معترض بگوید: "نه بس"، پس اعتراف به بی اعتباری عقل نموده و راه کسب معرفت را منحصر در تلقین گرفتن از غیر دانسته است و اگر معترض بگوید: "خرد بس است" سخن هیچ کس قابل انکار و رد نخواهد بود زیرا هر کسی از خرد خود سخن خواهد گفت. (تاریخ جهانگشا ج ۳ ص ۷۱)

شهرستانی می گوید بعد از آنکه حسن صباح در فصل اول دلیل آورده که تلقین معلم یگانه راه کسب معرفت است، در فصل دوم از کتاب خود شرط راست‌گوئی را برای معلم بدین گونه ثابت کرده که از معترض خود می پرسد آیا گفتار هر معلمی پذیرفته است یا باید راست گو باشد اگر بگوید راست‌گوئی شرط نیست هیچ کس سخن دیگری را نمی تواند رد کند و سخن هر معلمی باید پذیرفته باشد. بنابر این راست گوئی شرط سندیت گفتار معلم است.

شهرستانی می گوید احتمال داده اند که با این بیان سخن اهل
حدیث را رد کرده است (۱) (زیرا راویان حدیث شاید راست‌گو نباشند و
بدین سبب یگانه مرجع برای کسب معرفت یا خود امام راست‌گو و یا
مأذونان راستگوی بلاواسطهٔ او خواهند بود و گفتار ایشان بدون چون و
چرا لازم القبول و واجب الاطاعة خواهد بود.

دکتور محمد سعید افغانی

تحول و تطور زبان پشتو و دری در افغانستان و تاثیر آن در پاکستان

حضار گرامی!

قبل از همه صمیمانه اظهار سپاس گزاری از دعوت پوهنتون پنجاب مینمایم که باثر دعوت پوهنتون موصوف برای عدهٔ از استادان و دانشمندان فرصت تبادل افکار مهیا گردیده ـ من در اول تصور میکردم که البته در کنفرانس های این دعوت راجع بمسایل اجتماعی خصوصاً راجع مسائل حاد و داغ منطقه تیحلات علمی و فلسفی بمیان خواهد آمد مگر طوریکه مطلع گردیدم دائره بحث در چهار زبان انحصار دارد بناءً من هم عنوان فوق الذکر را انتخاب نموده و قرار ذیل مطالبه مختصری را یاد آوری میکنم ـ

الف : طوریکه از مطالعهٔ افکار محققین دربارهٔ السنهٔ مردم افغانستان، پاکستان ، هند و ایران نتیجه بدست میآید نشان میدهد که اکثریت مردمان این منطقه در نژاد اصلی شریک اند چنانچه مقایسهٔ و مقارنه در لغات و کلمات مسموع از زبانهای آنها شباهت را نشان میدهد ـ

و از روی رسوم و عنعنات مشترک ذهنیتی میآید که مهد متکلمین اصل زبان هندی و اروپائی آن اراضی است بین حوزهٔ علیا سردریا و امودریا که عده ای از گویندگان آن از آسیای مرکزی برخاسته از راه جنوب یورال و شمال بحیرهٔ خزر راه مغرب را پیش گرفتند و عدهٔ دیگری آن که اقوام هندی و ایرانی شدند از شمال اکسوس بطرف جنوب متمایل گردیدند وعدهٔ دیگری اقوام بادیه نشین که در ما بعد بنام تورانی و تخاری وغیره یاد شده اند جا به جا ماندند و بعد از مدتی از یکجا به جای دیگری از افغانستان انتشار نمودند ـ پس بدین اساس پیشنهاد مینمایم که باید اصل و اساس اکثر زبانها منطقه را آریائی نام نهاده شود چنانچه اوضاع و حرکات اکثر مردمان

افغانستان، هند، پاکستان و ایران از صفائی قلب، دلیری و اخلاق ستودهٔ انسانی ترجمانی میکنند ـ

ب ـ از روی معلومات تاریخی در افغانستان و یا خراسان قدیم کشمکشهای زیاد بمیان آمده که در نتیجه فعلاً در افغانستان آثار سی زبان و ده ها لهجه دیده می شوند مگر اکثریت مردم افغانستان (نه ملیون) به زبان پشتو و تقریباً سه میلیون به زبان دری تکلم میکنند بناءً قرار ذیل راجع به شرح تحول و تطول این دو زبان اقدام مینمایم ـ

۱ـ پشتو

میگویند : مبداء زبان پشتو به هندو آریائی و هند و ایرانی تعلق میگیرد و بصورت قطع فیصله نشده که پشتو جزو خانوادهٔ هندی میاید ویا جزو خانوادهٔ ایرانی و یا شاخهٔ تحول مستقلی بین السنهٔ هندو آریائی و هند و ایرانی میباشد مگر به فکر من این همه مطالعات از حقیقت دور بنظر میایند زیرا اگر اعتبار باکثریت مطلق مردم افغانستان و پشتو زبانان سرحد آزاد و پشتو خوانان مردمان داخل پاکستان که تعداد آنها به بیست ملیون بالغ است داده شود در آنوقت باید گفت که زبان پشتو بخود اصل جداگانه آریائی و ما قبل از نام آریائی را دارد و گویندگان آن مردمان پشتون همیش بمقابل متجاوزین مقاومت نموده و در دفاع از وطن سهم بارز آنها غیر قابل الانکار است از این گونه مطالعات ثابت میشود که باشندگان اصلی سرزمین افغانستان و مناطق پشتو زبان پشتونها بوده و زبان پشتو در داخل افغانستان و مناطق پشتو ـ تحول و تطوری نموده نه اینکه از دیگر زبانها استخراج شده باشد ـ جای شکی نیست که اقوام پشتو زبانان در علم و معرفت باثر مجاهدات دفاعی مسلسل پس مانده اند که این هم خود بخود دلیل بران است که آنها زبان خود را از دیگران نه آموزیده بلکه باور به اینست که پشتو زبانان بالای دیگران در زبان آنها تاثیری وارد کرده ـ پس بدین اساس غلط باشد که بگوئیم پشتو ـ جزو خانواده هندی میاید و یا جزو خانوادهٔ ایرانی باشد بلکه اگر از انصاف کار گرفته شود باید بگویم که هندی و ایرانی اجزاء اصل زبان پشتو باشد که

باثر رحلت گویندگان ـ اصل زبان پشتو از یکجا بجای دیگری اصل زبان پشتوانها به هندی، دری، پنجابی و ایرانی تغیر یافته باشد ـ از روی مقایسه و مقارنه گرامری در زبان های منطقه چنین اصدار احکام و فیصله ثابت شده نمیتواند که زبان پشتو شاخهٔ زبانهای هندی و یا ایرانی باشد مثلا اگر در زبان پشتو حروف ډ،ټ،ځ،ږ،ژ،ڼ وغیره دیده میشوند دلیل شده نمیتواند که این زبان از زبان هندی و اردو گرفته شده باشد بلکه بالعکس باید گفت که اردو و زبان هندی و دیگر زبانهای منطقه شاید از زبان پشتو کسب نموده باشند و نیز تحلیل الفاظ و کلمات متقارب زبانها فیصله یک طرفه را قبول کرده نمیتواند و اگر تحلیلات صرفی، نحوی و گرامری با تحلیلات فلسفی آمیزش پیدا میکند آنوقت بوضاحت ثابت میشود که مردمان قدیم در قرون متمادی از کوهها، مغاره ها و مرتفعات حرکت نموده در ساحه های وسیع سکونت پذیر گردیده که بمرور ایام اصل زبان کوهی آنها در اراضی نرم و لین به تغیرات ملایم مواجه گردیده ـ این نوع مطالعه حکم میکند که اصل زبان در منطقهٔ اصلی سکونت مردم زبان پشتو بوده چنانچه باشندگان اصلی مرتفعا تا افغانستان تا بحال اکثریت آنها به پشتو تکلم میکنند ـ

بعضی نظریات اجانب دربارهٔ پشتو :

داکتر (فریدویک میولر) نظریه داشت که پشتو جزو السنهٔ ایرانی است داکتر تروسپ معتقد بود که پشتو جزو السنهٔ ایرانی نیست بلکه جزو خانوادهٔ هند و آریائی است باین فرق که عضو حقیقی خانوادهٔ هندی نبوده ـ شکلی مستقلی دارد ومميزات خانوادهٔ هندی وآریائی و هندی و ایرانی را دارا میباشد که اکثر به خانوادهٔ هندی شباهت دارد ـ این نظریه از طرف جمعی از پروفیسوران و دوکتوران قبول شده و نیز نظری دربارهٔ پشتو موجود است که از (زند) و یا از زبان شبیه به (زند) برآمده است و پشتو به زند همان نسبتی دارد که فارسی کنونی به فارسی هخامنشی دارد ـ

بهتراست بگوئیم انشعاب السنهٔ هندی و ایرانی از خاکهای دو طرف کوه هندو کش اهمیت زیاد دارد ـ

تبصره : این گونه نظریات متناقض دربارهٔ زبان پشتو و آن هم از مردمانیکه در مناطق پشتو زبانان سیاح مانند عبور کرده اند قابل اهمیت نبوده بناءً نظر ثاقب همانا که پشتو در مناطق کوهی و جبال شامخ اکثر بوضع اصلی خود باقی مانده .

۲- دری : دربارهٔ زبان دری میگویند که از 'در' بمعنی زبان درباری و یا دره بمعنی زبان کوهستانی است و روایت است که در اصل گویندگان زبان دری ساکنین چند شهری بوده که عبارت از بلخ - بخاری - بدخشان و مرو است و گروهی بران اند که در زمان بهمن اسفندیار چون مردم از اطراف بدربار او میامدند زبان یکدیگر را نمیدانستند بناءً تعلیم زبان فارسی را وضع و انرا دری نام نهادند .

زبان دری با زبان پرثوی ویا زبان پهلوی ویا فارسی هخامنشی ها شباهتی دارد مگر از روی آثار معلوم میشود که این زبان در افغانستان قدامت بیشتر از ایران دارد - انبساط زبان سغدی در دورهٔ یفتلی ها و تماس مزیدآن با پهلوی بی تأثیر نیست - مطالعه زبان ویدی - زبان زند یا اوستائی زبان پراکریت کندهاری - سانسکریت کلاسیک زبان پرثوی یا پهلوی پارتی خراسانی — سغدی اسکائی- تخاری - پهلوی ساسانی وغیره در افغانستان ما را بعهد اسلامی نزدیک میسازد و بعدا از سقوط کوشانی‌ها در افغانستان و عروج ساسانی ها در ایران و تسلط سلالهٔ آنها در خراسان زبان پهلوی ساسانی در صفحات شمال و غربی افغانستان در باختر و سیستان راه یافت و در سایر نقاط مماکت پراگنده شده و ممکن بالای زبان دری قدیم تأثیری وارد کرده باشد - قدیم ترین نظم و نثر دری یا در افغانستان یا در ماوراء النهر بمیان آمده - حنظلهٔ بادغیس و محمد بن وصیف سکزی که قدیم ترین شعر دری را بآنها نسبت میدهند از ولایات هرات و سیستان میباشند - مقدمهٔ (شاهنامهٔ ابی منصوری که ازطرف ابو منصور العمری بنام ابو منصور محمد عبد الرزاق در ۳۴۶ هجری تحریر گردیده و ترجمه تاریخ طبری که ازطرف بلعمی وزیر منصور بن نوح سامانی در ۳۵۶ هجری نوشته شده در عصر سامانیها در ماوراً النهر بوجود آمده است - میگویند پارچهٔ منظوم و منثور که بدست آمده در طی قرن چارم هجری در افغانستان و ماوراًالنهر بوجود آمده است - بناءً باختر نیم روز

زابلستان و ماوراالنهر پرورش گاه زبان دری محسوب میشود ـ شباهت لغات دری به سغدی و یرئری و با پهلوی پارتی خراسانی که پارچه های آن از خرابه‌های تورفان کشف شده و بالاخره انتشار زبان دری متطور از افغانستان به ایران چه در عصر ساسانی که تنها زبان دربار باقی ماند و چه بعد از قرن چهارم هجری که بجای زبان فارسی پهلوی زبان عامی و ادبی آنکشور نیز شده نشان میدهد که مهد اصلی تطور زبان دری افغانستان و ماوراالنهر است ـ فعلا حالت فارسی دری در خانوادهٔ السنه ایرانی بقسمی بوده که صورت قدیم آن فارسی هخامنشی، صورت متوسط آن پهلوی خراسانی و صورت جدید، فارسی و دری کنونی میباشد در اواخر عصر ساسانی و اوائل دورهٔ غزنوی در اثر فتوحات سلاطین خراسانی در (ری) و (گرگان) و اصفهان راه انتشار زبان دری از افغانستان بطرف خاکهای غربی افغانستان باز شده و بعد از تسلط سلجوقی‌ها بر عراق زبان دری در سراسر کشور ایران که بنام عراق عجم خوانده میشد انبساط یافت ـ کهنترین آثار نظمی و نثری دری به دو هزار سال قبل میرسد ـ نمونهٔ آن منظومه درخت آسوریک و دو قباله ملک و باغ است که بروی پوست آهو نوشته شده (۱۲۰ سال ق م) یک عده از نمونه های زبان دری از تاریخ طبری و معجم الادبأ و مسعودی و تاریخ بیهق بدست آمده میتواند روایتی است که اولین گوینده شعر فارسی بهرام گور است و مسعودی در مروج الذهب تحریر نموده که بهرام اشعار عربی و فارسی زیاد دارد ـ

خلاصهٔ نظر درباره زبان دری:

جای شکی نیست که زبان دری در افغانستان پیش از اسلام هم قدامت دارد چنانچه در عصر اسکندریه یونانی‌ها که بافغانستان آمدند در ما بعد رابطهٔ یونانی‌ها از یونان قطع و تقریباً دو قرن افغانستان زعامت نمودند ـ در این مدت زبان دری به لهجه های متنوع وجود داشته و در عصر کوشا نیها و ساسانیها و سوریان ـ اعراب ـ غوریان یفتای‌ها ـ سلاجقه و سلاسل دیگر خراسان در افغانستان باثر عوامل و حوادث زیاد زبان دری تحول و تطوری نموده حتی این تحول و تطور مصادف به دوره غزنویان رنگ رسمی را اتخاذ

و در عصر محمود غزنوی دواوین و معاملات دفتری و قباله جات و اسناد بزبان دری صورت گرفت و دری بحیث یک زبان علمی و رسمی حاکمیت درباری را بخود اتخاد میکند ـ ازین ببعد شعراء ادباء و علماء بزبان دری آثار خود را به جامعه تقدیم میدارند و از افغانستان به هند قدیم سرایت فراوان میکند و در هند قدیم بزبان دری کتب زیاد علمی و ادبی چاپ و طبع میگردند ـ نویسندگان دورهٔ غزنوی‌ها بزبان دری اهمیت فوق العاده را عطا نمودند و علوم زیاد بزبان دری ترجمه و به جامعه تقدیم شدند ـ حرکت محمود غزنوی دربارهٔ انتشار زبان دری حرکت سیاسی بمقابل زبان عربی و شاید حرکت اجتماعی هم بود مگر این حرکت را مردم اکثریت پښتونهای موجوده افغانستان برای افغانستان حرکت ملی نمیدانند زیرا در وقت غزنویان در داخل افغانستان موجوده اکثریت مردم بزبان پشتو تکلم میکردند و حتی فعالیت غزنویان برای انتشار و تعمیم زبان دری نتواست مردم پشتونها از زبان پشتو خود منصرف سازند ـ فعلاً عده قلیل دانشمندان پشتو میگویند که زبان دری و پشتو هر دو زبان جنب، قدامت تاریخی در افغانستان دارند و اکثریت دانشمندان پشتو باین عقیده اند که زبان اصلی افغانستان زبان آریائی است که این زبان پس از تحولات زیاد بنام زبان پشتو یاد میشود و شاید از اصل زبان آریائی فروعات زبان‌های دیگر این منطقه هم تجزیه شده باشند ـ

تأثیر زبان دری درهند قدیم و پاکستان موجوده :

زبان دری درهند قدیم و پاکستان موجوده تأثیر علمی و ادبی بار آورده و عدهٔ کثیر علماء و دانشمندان بزبان دری آثاری نوشتند که در این عده دانشمندان زیاد هند قدیم دیده میشوند که بزبان دری مشاعر و احساسات ملی مردم هند قدیم را بمقابل استعمار و استثمار بحرکت آورده اند ـ در این سلسله باید گفت که اشعار علامه اقبال تا به حال ابتکار ذوقی را از دست نداده ـ علامه اقبال در وقت استعمار انگلیس میگوید ـ

ای همالہ ای اتک ای رود گنگ

زیستن تا کی چنان بی آب و رنگ

پیر مردان از فراست بی نصیب
نوجوانان از محبت بی نصیب
شرق و غرب آزاد و ما نخچیر غیر
خشت ما سرمایهٔ تعمیر غیر
زندگانی بر مراد دیگران
جاودان مرگ است نی خواب گران

این نوع معلومات در هند قدیم نشان میدهد که مردم این منطقهٔ هند قدیم بزبان دری توجه خاصی ننموده مگر زبان دری در بین مردم آن شیوع فامیلی نداشته و نه کدام حصهٔ باشندگان هند قدیم بزبان دری تکلم داشته بلکه سرایت زبان پشتو به هند قدیم تا حد زیاد دیده میشود چنانچه فعلاً در پاکستان موجوده باشندگان مناطق شمالی بزبان پشتو تکلم میکنند و برادران آنها بلوچ و سندی و پنجابی به لهجه های خود گفتگو میکنند که بدین اساس سرایت آیندهٔ زبان دری را به پاکستان دشوار میسازد ـ بناء ضمناً اگر به پیشنهاد مخلصانهٔ من عطف توجه میگردد پیشنهاد مینمایم که در ما بعد اگر از طرف پوهنتونهای پاکستان دربارهٔ السنهٔ منطقه بحث میگردد بهتر است زبان پشتو را هم در لست آن داخل فرمایند ـ

اختلافات لسانی در منطقه بنگاه من :

طوریکه دیده میشود در افغانستان، هند، پاکستان و ایران اختلافات لسانی وجود دارد که این نوع اختلافات در اکثر استعمار بنفع خود تقویه کرده و میکند و شاید یک نوع از این اختلافات طبعی و جائزهم باشند مگر این همه بفکر من باید مردمان این مناطق یک بدیگر احساسات برداری داشته باشند زیرا همه آنها دراصل اولاد خاک خویش بوده و بمثل گیاه از زمین‌های خویش روئیده اند و بعداً نامهای افغانی، هندی، پاکستانی و ایرانی را بخود اختیار کرده اند که در حقیقت اصل همهٔ آنها از همان مرتفعات افغانستان انتشار نموده اند ـ بناءً بالای همه مردمان افغانستان، هند، پاکستان و ایران لازم است که در این عصر قمر بمشکلات اقتصادی خویش زیاده تر متوجه گردند و یک به دیگر تعاون و تساعد

مخلصانه داشته اختلافات داخلی را از راه تفاهم نیک حل کرده بحل مشکلات حیاتی خویش متوجه گردند.

باور کنید اکثر اختلافات موجوده این مناطق اگر اولیای امور و دانشمندان آن بدون مداخله دیگران عاقلانه بآن متوجه گردند بخوبی حل شده میتواند. تنها چیزیکه مایهٔ تأسف است خودسری ها و کوتاه نظری های بعضی اولیاء امور است که دشوار را قصداً و یا خطا از روی منافع شخصی بدشواری ها مواجه میسازند.

میگویند: خطای یک قدم در سیاست موجب خطرات زیاد واقع میشود.

بناءً بالای اولیای سیاست لازم است که در اجرای وظائف از احتیاط مناسب کار اخذ نمایند و علماء و دانشمندان بمسؤلیت‌های اساسی جداً متوجه گردند.

در خاتمه از مهمان نوازی‌های گرم شما قبلا متشکرم و از طرف پوهنتون افغانستان و استادان آن بشما در تامین اهداف ملی و اجتماعی مردمان منطقه و آرامی بشر همبستگی را اعلان مینمایم.

تابنده و پاینده باد حرکت مترقی و علمی در مناطق رو به انکشاف دنیا و مخصوصاً در افغانستان، پاکستان و ایران.

با امید اتحاد تعاون و تساعد علمی و اجتماعی مؤثر همه جانبه و بی طرفانه مثبت و فعال.

عبدالمحسن مشکوة الدینی

گزارشی دربارهٔ جشن صدمین سال تأسیس خاور شناسی، لاهور

به

ریاست محترم دانشکدهٔ الهیات و معارف اسلامی، مشهد

عطف به ابلاغ شماره ۱۹۴۶۳ / ک ۱۹ / ۹ / ۵۱ و ۲۶۰۲۹ / ک مؤرخ ۱۰ / ۱۲ / ۵۱ دانشگاه مشهد، برحسب مأموریتی که به این جانب داده شده بود در تاریخ دهم مارس - (۱۹ اسفند ماه ۵۱) از فرودگاه مهرآباد به پاکستان عزیمت نمودم -

صبح بیستم اسفند به اتفاق همراهان دانشگاهی ایرانی در فرودگاه کراچی مورد استقبال آقای جوان مسؤل خانهٔ فرهنگ ایران و یکنفر دیگر از مأمورین رسمی دولت ایران قرار گرفته و باهدایت ایشان پس از انجام تشریفات مرزی بسوی لاهور عزیمت کردیم و حدود ظهر آن روز در فرودگاه لاهور آقای دکتر پناهی وابستهٔ دانشگاهی ازطرف دولت ایران و استاد ادبیات فارسی در دانشکدهٔ خاور شناسی و استاد محترم آقای دکتر وزیر الحسن عابدی و آقای دکتر رانا احسان الهی و بعضی از استادان دیگر ما را استقبال کردند و مورد محبت قرار دادند و به محل اقامتی که تعیین شده بود راهنمائی کردند -

جشن صدمین سال تأسیس دانشکدهٔ خاور شناسی دانشگاه پنجاب لاهور که برای شرکت در کنگره و جلسات آن دعوت شده بودیم بسیار پرشکوه بود و نمایندگان علمی و دانشگاهی کشورهای بزرگ دعوت شده بودند- از دانشگاه تهران، دانشسرای عالی، دانشگاه مشهد و از طرف وزارت فرهنگ و هنر نمایندگانی حضور داشتند - از دانشگاه کابل (افغانستان) و استادان دانشگاههای مختلف پاکستان و از طرف دانشگاههای مختلف امریکا و انگلستان و ترکیه و عربستان سعودی و بعضی از دولتهای دیگر عربی و مصر و هلند نیز نمایندگانی بودند -

اولین جلسهٔ کنگره صبح روز دو شنبه ۱۲ مارس (۲۰ اسفند) افتتاح گردید. ابتدا آقای دکتر عبادت بریلوی رئیس دانشکدهٔ خاورشناسی و آقای پروفسور محمد اجمل نایب رئیس دانشگاه و رئیس کمیته پذیرائی به مهمانان خوش آمد گفتند و بعد از آن آقای دکتر جاسطس- ایس- ای- رحمن رئیس محترم جشن دربارهٔ تاریخ دانشکدهٔ خاورشناسی و فعالیتهای آن مطالبی ایراد فرمودند و بعد از آن آقای ملک معراج خالد مقام اول دولتی پنجاب خطابهٔ افتتاحیهٔ رسمی را قرائت کردند.

صبح روز سه شنبه ۱۳ مارس بعد از خطابهٔ افتتاحیه که آقای دکتر عبدالخالق وزیر محترم آموزش و پرورش پنجاب لاهور ایراد فرمودند. از نمایشگاه مرکز تحقیقات دانشکدهٔ خاورشناسی بازدید دسته جمعی بعمل آمد و کتب بسیاری که بوسیله استادان دانشکده تصنیف و تألیف شده بود و نمایشگر کنجکاوی دقیق و فعالیتهای علمی بسیار وسیع ایشان بود ملاحظه گردید و بعد ازآن جلسات رسمی کنگره آغاز گردید و پیش از ظهر و بعد از ظهر این روز خطابه‌های سودمندی در زمینهٔ خدمات علمی و ادبی دانشکدهٔ خاورشناسی ایراد شد.

روز چهار شنبه ۱۴ مارس پیش از ظهر و بعد از ظهر زبان و ادبیات عرب و مسائل علوم اسلامی و تأثیر آن در ادبیات فارسی و هندی مورد گفتگو بود و نتایج تحقیقات دانشمندان بسیاری دراین زمینه عرضه گردید و مقالات ارزنده ای قرائت شد.

روز پنجشنبه ۱۵ مارس برای بحث دربارهٔ زبان و ادبیات فارسی تعیین شده بود. جلسه ابتداً با مقالهٔ مفصلی که مشتمل بر نکته هائی بسیار جالب بود و جناب آقای منوچهر ظلی سفیر شاهنشاهی ایران در پاکستان قرائت کردند افتتاح شد و آقای ظلی در زمینهٔ روابط علمی و فرهنگی و همبستگی های بسیار کهن ایران و پاکستان شرح مبسوطی بیان کردند.

بعد از آن استاد ممتاز دانشگاه تهران آقای مجتبی مینوی جملات کوتاهی بزبان انگلیسی ادا کردند و دو قطعه از اشعار علامهٔ فقید فیلسوف و شاعر دانشمند بزرگ مرحوم اقبال لاهوری با آهنگ خاصی خواندند بطوری که حالت عمومی جلسه را بکلی دگرگون کرد و عواطف وطن دوستی

و شور درونی مرحوم اقبال را چنان مجسم نمود که هیجان خاصی در همگی ایجاد کرد ـ

سایر سخنسرایان مطالب ارزنده ای در زمینهٔ شعراء و نویسندگان فارسی زبان هند و پاکستان ادا کردند و دربارهٔ فارسی هندی که شعبه ای از زبان فارسی اصلی است سخن گفتند و مطالبی مربوط به تأثیر زبان و ادبیات فارسی در ادبیات اردو بیان کردند و اشعار شیوا و دلپذیری که بعضی از استادان ادبیات فارسی سروده بودند جلب توجه نمود ـ

در برنامهٔ صبح این روز به این بنده نوبت سوم داده شده بود و خلاصهٔ مقاله ای که در زمینه اصل تعلیم بروش عام و تعلیم ظاهری بروش پیروان ادیان ملی و تعلیم باطنی بروش اهل تعلیم تهیه شده بود قرائت کردم و اصل مقاله قبلاً برای درج در مجموعه مقالات فرستاده شده بود ـ

روز جمعه ۱۶ مارس بحث دربارهٔ زبان و ادبیات اردو و تاریخ[فرهنگ مسلمانان هند و پاکستان بود و مقالات بسیار جالبی در این زمینه قرائت گردید ـ

روز شنبه ۱۷ مارس در اطراف زبان و ادبیات پنجابی سخن گفته شد و مطالبی مربوط به علوم و ادبیات عمومی شرق ایراد گردید ـ

نتیجه گیری از جلسات

امتیاز بزرگ و مشخصی که برای این کنگره مشهود بود این است که اصول تمدن و فرهنگ و ادبیات چند ملت بسیار کهن شرقی و خصوصیات هر یک از آنها مورد بررسی قرار گرفت و نتایج تحقیقات و تتبعات عمیق افراد برجسته و کنجکاو از ملل گونا گون شرق و غرب در جلسات عمومی کنگره عرضه گردید و نکته‌های بسیار جالبی درسخنرانیها تذکر داده شد ـ

اجتماع این شخصیتهای بزرگ علمی در چنین محافل عمومی و همکاری آنان در زمینه‌های مشترک علاوه بر پیشرفتهای علمی و فرهنگی کلی، مسلماً موجب همبستگی‌های ملی جهانی و تسهیلات عام و باعث استحکام و گسترش روابط انسانی مابین ملتها خواهد بود ـ

مجموعهٔ این سخنرانیها که طبع و منتشر خواهد شد منبع استفاده سرشار برای اهل تحقیق خواهد گردید.

خلاصه آنکه تشکیل این کنگره خدمت بزرگی به عالم انسانی بود و بالخصوص منافع بزرگی از آن عاید ملتهای گونا گون شرقی گردید و برای پیشرفت فرهنگ و ادب همه ملتهای شرقی عامل بسیار مؤثری بود.

توفیقات روز افزون بانیان و متصدیان این کنگره علمی و اسلامی را در راه پیشرفتهای انسانی از پیشگاه خداوند متعال خواستارم.

صبح روز یکشنبه ۱۸ مارس بنا بدعوتی که از طرف رایزنی فرهنگی سفارت شاهنشاهی ایران در پاکستان و از طرف خانهٔ فرهنگ ایران در راولپندی بعمل آمده بود، اینجانب در ملازمت آقای استاد مجتبی مینوی به راولپندی رفتیم و همه گونه هزینه این قسمت از مسافرت ما را اداره رایزنی فرهنگی عهده‌دار بود. در فرودگاه راولپندی جناب آقای سفیر با چند تن از اعضاء سفارت تا جلوی هواپیما مارا استقبال کردند و مدتی درسالن پذیرائی فرودگاه سورد تفقد قرار دادند و بعد ازآن به هتلی که قرار اقامت بود هدایت شدیم.

صبح روز دو شنبه، بر حسب تعیین وقت قبلی به منزل جناب آقای سفیر رفتیم و مطالبی در زمینه های علمی و اجتماعی آن سر زمین ادا فرمودند.

بعد از ظهر همان روز یکسره به کراچی پرواز کردیم و بر حسب دعوتی که از طرف دانشمند محترم آقای پیر حسام الدین راشدی شده بود در ضیافت مفصلی که تشکیل دادند و چندین تن از شخصیتهای دولتی ایران و پاکستان نیز دعوت شده بودند شرکت جستیم.

روزسه شنبه مارس (۲۹ اسفند) از کراچی به تهران وارد شدیم.

بازدید های علمی در شهرهای پاکستان

علاوه بر آثار و عقاید علمی که از دانشمندان مشهور قدیم پاکستان دسترس است چیزی که حکایت از مرکزیت علمی و فرهنگی این کشور می کند وفور همه گونه کتب خطی و چاپی در این کشور است و به قراری که شنیده می شد، علاوه بر کتابخانه های رسمی و دولتی و کتابخانه های

خصوصی در شهرها حتی در قرا و قصبات نیز کتاب خطی و چاپی فراوان است از جمله کتابخانه های خصوصی که دیدن کردیم کتابخانه شخصی بسیار مفصلی است که از استاد علامه فقید مرحوم پروفسور مولوی محمد شفیع در لاهور بر جای مانده است ـ

در این کتابخانه نسخه های خطی کمیاب و کتابهای دست اول زیادی که آن مرحوم برای تحقیقات و تتبعات شخصی خود شان فراهم کرده بودند اکنون موجود است ـ قرآنهای خطی بسیار نفیس، کتب خطی ارزنده و نمونه هائی از دستنویس خطاطان مشهور جدول کاریها و مینیاتورها و کتب چاپی بسیاری در آنجا ملاحظه گردید ـ

این کتابخانه با چند تن کارکنانی که هستند اداره می شود و فرزند فرزانه و دانشمند آن علامه فقید از کتابخانه سرپرستی نموده بسیاری از نوشته های پدر ارجمند خودشان را با کمک استادان دانشگاه جمع آوری و مرتب کرده و تا کنون چندین جلد ازآن کتابها را که در موضوعات مختلف تاریخی و ادبی نظم و نثر نوشته شده چاپ و منتشر کرده اند و بقیه را هم به چاپ خواهند رسانید ـ مجلس ترقی ادب لاهور عهده دار چاپ این کتب است ـ

توفیقات روز افزون ایشان را برای تکمیل این خدمات بزرگ فرهنگی و علمی خواستاریم ـ

۲ ـ کتابخانهٔ دیگری که بازدید شد متعلق به خانهٔ فرهنگ ایران در لاهور است که آقای رشید فرزانه پور مسؤل خانه فرهنگ آنجا را اداره می کنند ـ آقای فرزانه پور برای مطالعه دوستداران فرهنگ و ادب فارسی کتب بسیاری جمع آوری نموده و سعی بلیغی در تکمیل این کتابخانه و فراهم کردن تسهیلات بیشتر برای تعلیم و ترویج زبان فارسی دارند و افراد بسیاری از طبقات مختلف مردم حتی از کسانی که تحصیلات عالیه دارند دوره‌های سه ماهه کلاسهائی را که ایشان تشکیل می دهند گذرانده و خواندن و نوشتن و سخن گفتن فارسی می آموزند و گواهینامه رسمی دولتی ایران را دریافت می کنند ـ

۳ - کتابخانهٔ دیگری که دیدن شد متعلق به مرکز تحقیقات ایرانی در راولپندی بود و از آنجا که گنجینه های کتب خطی قدیم در خطه پاکستان فراوان و در اماکن دور از دست پراکنده است، آقای دکتر جعفری رایزن فرهنگی ایران در پاکستان در شهر راولپندی کتابخانهٔ دولتی بسیار وسیعی تشکیل داده اند و برای اینکه کتب پراکنده را هر قدر میسور باشد یکجا جمع کنند تا دسترس دانش پژوهان داخلی و خارجی کشور باشد سعی بلیغ می کنند و تاکنون کتب خطی و چاپی فراوانی فراهم کرده اند -

خدمت بزرگ دیگری که آقای دکتر جعفری مشغول انجام آن هستند و برای عموم اهل تحقیق در هر کشوری باشند بسیار مفید است اقدام به جمع آوری فهرستی از همه کتب خطی موجود در پاکستان است و این عمل را ایشان به کمک خود صاحبان کتابخانه‌ها و دانشمندان پاکستانی به تدریج انجام می دهند تاکنون جلد اول فهرست کتابخانهٔ خود شان را که ۳۲۸ جلد کتاب خطی در فنون مختلف معرفی شده است به چاپ رسانده اند -

۴ - کتابخانه متعلق به خانه فرهنگ ایران در راولپندی نیز ملاحظه شد - این کتابخانه بسرپرستی آقای دکتر مظاهری مسئول خانهٔ فرهنگ ایران در آن شهر اداره می شود و کتب بسیاری از نظم و نثر فارسی وغیره برای استفادهٔ عموم در آنجا فراهم کرده اند -

۵ - کتابخانهٔ دیگری که دیدن شد متعلق به مرکز تحقیقات اسلامی در راولپندی بود - در این کتابخانه کتب بسیاری از نسخه های خطی و چاپی بزبانهای مختلف فارسی و عربی و کتب چاپی بزبان اردو و پنجابی و زبانهای دیگر شرقی و غربی در موضوعات متنوع جدید و قدیم از کتب دست اول وجود داشت و کتب مربوط به هر یک از موضوعات دستوری و لغوی و فنون ادبی و غیر ادبی نظم و نثر و علوم مربوط به اصول ادیان و فروع از قبیل فقه و اصول و رجال و حدیث و تفسیر که بر طبق اصول مذاهب گوناگون اسلامی نوشته شده و آنچه مربوط به ادیان غیر اسلامی است، کتب مربوط به هر کدام از این رشته‌ها به ترتیب موضوعی دقیق در قسمتهای جداگانه نگهداری می شود والحق زحمتی که در ترتیب نگهداری کتب کشیده شده بسیار قابل تمجید است -

۶ - نمایشگاه کتاب و کتابخانه مرکز تحقیقات دانشکدهٔ خاور شناسی که مطالعه اجمالی در آن شد، نیز مشتمل بر نفایس بسیار است -

۷ - کتابخانه دانشمند بزرگ آقای پیر حسام الدین راشدی در کراچی مشتمل بر نفایس کتب است -

موزه ها

موزه و کتابخانهٔ دولتی شهر کراچی مشتمل بر نسخ بسیار نفیسی از قرآن کریم و نسخه های قدیم از کتب مختلف و نمونه‌های بسیاری از دستنویس خطاطان مشهور و نقاشیها و تابلوهای بسیار نفیس ملاحظه شد -

۲ - موزهٔ بسیار وسیع شهر لاهور مشتمل بر اشیای گرانبهای عتیق از قبیل مجسمه ها، سلاحهای جنگی، صنایع دستی، منبت کاریها، مسکوکات، تابلوها و فانسهای بسیار نفیس و چیزهای دیگر بازدید شد -

ابنیه

بناهای قدیم و آثار باستانی در پاکستان فراوان است و آنچه مشاهده شد عبارت است از:

۱ - مسجد شاهی به سبک زیبای مغولی بامناره‌های کاشی کاری و ایوان رفیع مفروش به سنگهای مرمر شفاف الوان بسیار گرانقیمت که در محلی مرتفع ساخته شده و دارای محوطه بسیار وسیع است -

۲ - نمایشگاه مخصوص ملبوسات و سلاحهای جنگی و اشیای دیگری منسوب به حضرت امام حسین[ع] و حضرت فاطمه زهرا[رض] و حقه‌ای مشتمل بر قطعه موئی منسوب به حضرت پیغمبر[ص] و همهٔ این اشیای در محفظه‌هائی زیبا باتشریفاتی مخصوص به عنوان آثار باستانی و متبرک نگهداری می شود -

۳ - مسجد جامع و آکادمی علماء در محوطه بسیار سبز و گلکاری و مشجر وسیع در قرب قلعه شاهی -

۴ - قلعه شاهی باسورهای مرتفع و اماکن وسیع بسیار متعدد که خرده کاریهای بسیار ذوقی و هنری در آن بعمل آمده و جایگاه سازمانهای مختلف لشکری و کشوری و خدم و حشم و اماکن مختص به حالات مختلف زندگانی درباری در آن مشهود است -

۵ - ایوان و سرسرای اکبر شاهی مشتمل بر رواقها و جایگاههای مخصوص سازمانهای دولتی و محل بار عام عیناً به جای مانده است -

۶ - مقبره شخصی بنام شیرازی با معماری مخصوصی ساخته شده و با سنگهای مختلف رنگا رنگ شفاف با سبک مخصوص هنری روکاری آن تزیین شده است -

۷ - مزار داتا گنج بخش عارف بزرگ دارای جلوخان و صحن وسیع و بقعه و رواق و مسجد بزرگی در جوار آن است -

۸ - باغ شالیمار که دارای جایگاههای مخصوص و مناظر بسیار شگفت انگیز قدیم است وابنیه و چشم‌انداز هایش بیننده را به زیبائیها، گلها و سبزه‌ها، استخرها و درختها و طراوت خود خیره می کند -

۹ - شهر جدید البناء اسلام آباد که هر قسمتی از آن با نقشه مخصوصی ساخته شده و متناسب با سازمانهای مخصوصی دولتی و اداری و قسمتهای مسکون آماده گردیده است و در محلی مشرف بر شهر تفرجگاههائی وسیع دلنشین فراهم گردیده است -

رویهمرفته مطالعه و دقت در همه مناظر طبیعی و هنری و علمی و اجتماعی شهرها و صحراهای مختلف پاکستان و ملاحظه آثار ذوق سرشار وغریزهٔ ادب و هنرپرور مردم پاکستان از جنبه‌های گوناگون در هائی از معرفت بروی انسان می گشاید و بر شگفت و حیرت و دقت بیننده می افزاید -

مهمان نوازی و پذیرائیهای گرمی که از طرف مقامات دانشگاهی و و شخصیتهای ملی و دولتی پاکستان بعمل آمد موجب تشکر فراوان است و مهر و محبتی که مخصوصاً نسبت بواردین و بویژه نسبت به مردم ایران دارند مستلزم ثنای بسیار است -

سر آمدهمه محبتها کتب ارزندهٔ بسیاری بود که چه از طرف دانشگاه چه از طرف شخص استادان و دانشمندان بهر یک از مهمانان داده شد و

این تحفه‌ها یادگار بزرگ و شایانی بود که بیش از پیش موجب تشکر گردید -

گزارش مختصری از مسافرت پاکستان بدین وسیله برای استحضار خاطر عالی تقدیم گردید -

عبدالمحسن مشکوة الدینی،
دکتر در فلسفه و حکمت اسلامی
دانشگاه مشهد (ایران)



ڈاکٹر مظاہر مصفا (تہران ایران)، ڈاکٹر عبادت بریلوی، خانم مظاہر مصفا، پروفیسر ولی‌اللہ سمیعی (کابل افغانستان)

دکتر مظاهر مصفا

قصیده

این قصیده را شاعر جوان سال و جوان بخت ایرانی با یک ذوق و شغف خاصی سرودند و سنت شعرای پیشین مثل مسعود سعد سلمان وغیره را یک بار دیگر زنده ساختند۔ ایشان این منظومه را با یک جذاب صحیح و مبتهج قرائت کردند و هر همه از حضار محترم جلسه حظی وافر بردند (مدیر)

****

گفت و گوی با لاهور را بهانهٔ حسب حالی کرده و کرانهٔ دفع ملالی
چاهی است که در آن نالیده ام و آهی است که در آن پیچیده ام
سر پناه المی است و گریزگاه غمی
زنجیر شکستن است نه تدبیر بستن
هرای اسد است نه غوغای حسد
نه مدح و ذم کسی است نه هم و غم هوسی
نه حماسهٔ روزه است و نه کاسهٔ دریوزه
و اگر حماسه است نشنیدی که در شعر مفتخر است
و ندیدی که به شرم و جمال اندرست۔

آذر ماه ۱۳۵۱

ایا خجسته لهاوور شاد و خندان باش
سلام من بپذیر و سلامت ارکان باش
بسوز عود و بیاور می و بیفشان گل
چو زندواف سخن می رسد گلستان باش

به مهر سوی تو عیسی دمی گذر دارد
تو چون سپهر چهارم بلند ایوان باش
امیر کیست ادب را در آن دیار بگوی
که شاه ملک ادب را مطیع فرمان باش
عزیز مصر بلاغت چو می رسد از راه
به اشتیاقش کنعان و پیر کنعان باش
تهمتنم من و در جست و جوی رخش مراد
بی سپردن تهمینه ام سمنگان باش
ز هفت خوان زمانه به شش در دردم
به رغم دردم پایان هفتمین خوان باش
به دردمندی درد آزمای یمگانم
شفای خاطر درد آزمای یمگان باش
مباش خوان فرومایگان دشمن خوی
چو خوان بیاید بودنت خوان اخوان باش
به نکته دانی مسعود سعد سلمانم
به میزبانی مسعود سعد سلمان باش
نظیری ام همه فیروزه های نیشابور
مراست خواهی اگر تلوخان خانان باش
هزار سر ز غم دل به زانویی دارم
هزار مرد ادب را هزار دامان باش
به فضل و همت سلطان هفت مردانم
پی پذیرهٔ سلطان هفت مردان باش
به میزبانی من گر همی نخواهی خاست
به سفرهٔ سخنم می نشین و مهمان باش
بگو به اقبال از خاک تیره سر برکن
مدیح گوی لهاوور را ثنا خوان باش
چو من به شوکت بحر آیم و شکوه جبال
درشت لاد قوی پی، درست بنیان باش

چو کعبه خانه به وقت طواف ابدالان
به پیش کعبهٔ ابدال خیز و گردان باش
دل من آتش طور است و سینه ام سیناست
ببین تجلی این نور و پور عمران باش
ز پشت ابر سواری رسد که پیشش باد
فتد به خاک که بر تخت من سلیمان باش
هزار شام سیه پشت سر گذاشته ام
به دل نوازی من یک دو بامدادان باش
غریب خانهٔ جان است تن، ز تن بگریز
وگر نه جای، چندی نشیمن جان باش
به پشت و شانهٔ من زخم تازیانه ببین
ز کاوریشی این روزگار حیران باش
کمال بی هنری بین که در کمال هنر
مرا چو دید بر آشفت و گفت نقصان باش
وگر بخواهی جستن مرا ز عین کمال
کمال کم جو در عین نقص و شادان باش
ز کام شیر بری آهوی فلک چه هنر
سگی بیار و سگ آسا به صید ستخوان باش
چو نیستی به ره من مرا پسند نیی
قبول من طلبی هر چه گویمت آن باش
به حکم غولان محکوم گرد و سر بر خط
به رغم مردان خارا شو و مغیلان باش
به نرم خوئی در پیش ظالمان چون گل
به سخت رویی با ظلم دیده سندان باش
ببین به هر دو جهان بین شهادت مظلوم
گه شهادت سر تا به پای کتمان باش
به دل به دم به قدم خصم بر و تقوا شو
به جان و دست و قلم عون اثم و عدوان باش

شریک شب رو در شب رفیق قافله روز
به کام کافر و هم کاسهٔ مسلمان باش
بهین معاضد تلبیس حضرت ابلیس
مهین معاند حق چون جناب شیطان باش
جهان دگر نگراید به راستی همه عمر
گرین نخواهی زاری کن و در افغان باش
گهی به حسرت زانو کشیده در دامن
گهی ز حیرت سر برده در گریبان باش
به کام شام چو شیر سیاه گردن و یال
به چنگ صبح چو گرگ سپید دندان باش
مرا یکی است چو با من یکی نداری دل
مگوی ثانی خاقانی ام چو طبان باش
عقاب قله نشین نه همای اوج برین
و یا زرستهٔ بومان ز جمع غربان باش
به نظم همچو پرن یا به نثر همچو نعش
چراغ دان فلک آفتاب کیهان باش
به پخته طبع عجم را بدیل خاقانی
به سخته نظم عرب را نظیر حسان باش
به لفظ، نادره گوی مدینة العذرا
به وعظ نکته سرا شاعر خراسان باش
به نظم نثر لآلی ابوالمعالی شو
به نثر نظم معالی جریر و سحبان باش
****
ز پنج گنج تنم شعله خیزد ای پنجاب
به پنج آب حیاتم شفای نیران باش
به پنج سجن تنم من به پنج پوشیده
خلاص جانم ازین سهم ناک زندان باش
مرا ز قهر زمانه به پا کلیدان است
به دست مهر کلیدی برین کلیدان باش

ز جور و جبر زمانم شکسته پهلو و پشت
به عزم جبر عظامم درست پیمان باش
به آب لطف تو مستسقی‌ام به پنج انگشت
طبیب علت این دردمند عطشان باش
هزار نیشم در دل نشسته از غم و درد
به پنج نوش نشاطم یکی به درمان باش
سکندرم نه، جهان خواره ام، نه خضرم من
خیال صحبت من خوش‌تر آب حیوان باش
دو چشم آهوی لاهور خوانده که به من
بیا به خانهٔ پنجاب و زیور خوان باش
ببین ز چشمهٔ هوره سرشک شوق روان
روان به سوی من ای آفتاب تابان باش
کنون که اهل هنر رهسپار پنجاب اند
ز چار سوی جهان شمع جمع ایشان باش

****

ایا لهاوور از چشم زخم حادثه ها
مصون بمان و به دور از بلای دوران باش
سرای از تو نخواهم نه پایگه و نه مال
به یک بدست از آن خطه‌ام ستودان باش
هزار لعل، هزاران عقیقت از دل و چشم
دهم که رشک یمن غیرت بدخشان باش
چو نام خویش که عاری ز منت نقطه است
به نقطه نقطه ز هر قید و بند عریان باش
ز بی تعلقی نام خویش پند آموز
دل از تعلقی آسوده دار و آسان باش
به لام الف چو به لبدار آیت تهلیل
به ها نشان هویت ز حیّ سبحان باش

چو واوت آمده در جان چو روح در دل هور
به حرف پایان آغاز روح و رضوان باش
چو آبنه به عیان همچو کیمیا به نهان
ستودهٔ همه در آشکار و پنهان باش
به جان مرا چه آزادگی و دانش و داد
به دل مدینهٔ دین‌دار ملک ایمان باش
غزالهٔ فلک است این غزال کعبه مرا
بدین قصیدت منت پذیر احسان باش

****

بیاه گوید و ستلج که جیلما باتک
بیا و راوی این سلک در و مرجان باش

پانچواں اجلاس

اُردو زبان و ادب و ثقافتِ اسلامیانِ پاکستان و ہند

خطبات و مقالات

مولانا کوثر نیازی، وزیر اطلاعات، حج و اوقاف

پروفیسر حمید احمد خان

پروفیسر جے۔ ایم۔ ایس بولجاں

ڈاکٹر محمد شمس الدین صدیقی

ڈاکٹر فرمان فتحپوری

خاطر غزنوی



مولانا کوثر نیازی، مرکزی وزیر حج و اوقاف ایک اجلاس میں
صدارتی خطبہ دے رہے ہیں

مولانا کوثر نیازی
(وزیر اطلاعات، حج و اوقاف)

خطبۂ افتتاحیہ

برصغیر کی اسلامی ثقافت میں اردو زبان و ادب کی اہمیت

اردو زبان، جیسا کہ اس باوقار علمی اجتماع کے شرکاء بخوبی جانتے ہیں، اس برصغیر کے مسلمانوں اور ہندوؤں کے ایک ہزار سال کی باہمی بود و باش، میل جول اور ایک دوسرے کے تہذیبی اثرات قبول کرنے کے نتیجہ میں اپنی موجودہ اعلیٰ اور ترقی یافتہ صورت تک پہنچی ہے۔ جس طرح اس برصغیر میں محمد بن قاسم کی آمد کے ساتھ ہی ایک لحاظ سے پاکستان کی بنیاد پڑ گئی تھی اس طرح شمال مغرب کے راستے سے مسلمان فاتحین کی آمد کے ساتھ ہی ایک نئی زبان کی تشکیل کا آغاز بھی ہو گیا تھا۔ اس وقت باہر سے آنے والوں اور یہاں کے رہنے والوں کی زبانوں میں کوئی قدر مشترک نہ تھی۔ آنے والوں کی زبان عام طور پر فارسی تھی اور یہاں رہنے والوں کی کئی زبانیں تھیں جو باہمی اختلافات کے باوجود بنیادی طور پر اس لحاظ سے قربت رکھتی تھیں کہ جنوبی ہند کی زبانوں کو چھوڑ کر باقی سب زبانیں سنسکرت کی پروردہ تھیں۔

فارسی اور برصغیر کی یہ علاقائی زبانیں نہ صرف الفاظ ساخت اور مزاج کے اعتبار سے متباین تھیں۔ بلکہ ان کا رسم الخط بھی قطعاً مختلف تھا۔ اس لیے مسلمانوں اور برصغیر میں بسنے والی قوموں کے درمیان لسانی مغائرت ایک دیوار بن کر حائل تھی مگر جیسا کہ آپ جانتے ہیں ارتقائے انسانی کی تاریخی اور تہذیبی قوتیں لسانی فیصلوں کو توڑ پھوڑ کر رکھ دیتی ہیں اور مختلف انسانی نسلیں باہمی میل جول کے ذریعے

نئے نئے سانچوں میں ڈھلتی اور نئے نئے تہذیبی لباسوں میں جلوہ گر ہوتی رہتی ہیں۔ ارتقائے انسانی کا یہ تہذیبی اور تاریخی عمل اس برصغیر میں بھی بڑے بھرپور انداز میں ظاہر ہوا اور دوسرے مادی ذہنی اور روحانی تغیرات کے ساتھ ساتھ زبانوں پر بھی اس کے زبردست اثرات مرتب ہوئے۔ چونکہ سیاسی طور پر غالب فریق زندگی کے ہر پہلو میں فریق مخالف پر غالب ہوتا ہے اس لیے برصغیر کی زبانوں اور فارسی زبان کے میل جول میں قدرتی طور پر فارسی زبان کی حیثیت غالب رہی اور مقامی زبانوں کی حیثیت مغلوبانہ۔ مقامی زبانوں میں دوآبہ زبان جسے برج بھاشا کہا جاتا تھا اور بعد میں ہندی کہا گیا، ممتاز ترین زبان تھی۔ اس لیے اس زبان پر فارسی زبان کا اثر سب سے زیادہ ہوا اور ایرانی اور ہندی تہذیبوں کے قریبی میل جول سے جو نئی زبان پیدا ہوئی اس میں فارسی زبان کو ہر اعتبار سے فوقیت اور بالا دستی حاصل رہی اور نئی زبان، جسے ''لشکر کے ہوں کی زبان'' کی مناسبت سے ''اردو زبان'' کہا جانے لگا نہ صرف ساخت اور مزاج کے اعتبار سے فارسی زبان سے بہت قریب ہوئی بلکہ اس کا ظاہری لباس یعنی رسم الخط بھی فارسی ہی قرار پایا۔ اس کے ساتھ ساتھ بہت سے الفاظ جن میں غالب اکثریت افعال کی ہے، ہندی بھاشا سے اردو میں داخل ہوئے۔ جیسے جیسے زمانہ گذرتا گیا اردو اور ہندی دونوں زبانیں اتنی قریب ہوتی چلی گئیں کہ رسم الخط کے علاوہ عام فہم اردو اور عام فہم ہندی میں کچھ زیادہ فرق نہ رہا۔

اردو زبان کی تشکیل و تعمیر کا سلسلہ مسلمانوں کی آمد کے ساتھ ہی شروع ہو گیا تھا۔ لیکن ہندوستان میں اسلامی سلطنت کے بانی سلطان شہاب الدین محمد غوری کی فتوحات کے بعد تقریباً ایک سو سال کے اندر اندر یہ نئی زبان اتنی ترقی کر چکی تھی کہ فارسی زبان کے عظیم الشان صوفی شاعر حضرت امیر خسرو نے اس زبان میں دوہے، کہہ مکرنیاں اور متفرق اشعار کہہ کر اسے ادبی حیثیت بھی عطا کر دی۔ اس زبان کو اس زمانہ میں ریختہ کہا جاتا تھا۔ وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ بھی اکبر بادشاہ کے زمانے میں سرکاری کاغذات مال میں نظر آنے لگی اور پھر شاہ جہاں کے دور زریں میں اسے ''اردوئے معلیٰ'' کا ممتاز نام دیا گیا اور

راج دربار میں اسے پوری قدر و منزلت حاصل ہونے لگی ۔ اس کے بعد یہی زبان دکن جا پہنچی جہاں اسے "دکھنی اردو" کہا جانے لگا ۔ دکن کے مسلمان بادشاہوں نے اس زبان کو سنوارنے ، نکھارنے اور ترقی کے زینوں پر پہنچانے کے لیے جتنی محنت اور جانفشانی کی ، اس کی تفصیلات میں جانے کی ضرورت نہیں ۔ شاہی درباروں سے ہوتے ہوئے یہ زبان درویشوں اور شاعروں تک جا پہنچی اور میرزا مظہر جان جاناں اور خواجہ میر درد جیسے عظیم المرتبت بزرگوں نے اس زبان کو مسائل تصوف کا وسیلہ اظہار بنایا اور اس طرح اس زبان کی مقبولیت اور عوامیت میں روز بروز اضافہ ہوتا چلا گیا ۔

مغل حکومت کے آخری دور میں اردو زبان اور ادب کو بہت فروغ حاصل ہؤا ۔ میر ، سودا ، ذوق ، غالب ، مومن ، ناسخ ، آتش ، مصحفی ، انشا اور دوسرے بڑے بڑے شعراء اسی دور میں گذرے ہیں ۔ خود آخری مغل تاجدار ، بادشاہ کم اور شاعر زیادہ تھے ۔ اس زمانے میں کاروبار سلطنت کی طرف بادشاہ اور امراء کی توجہ کم اور شعر و ادب میں ان کا انہماک زیادہ تھا ۔ مغل سلطنت تو ختم ہو گئی لیکن مغل ادب ۔ مغل شاعری ۔ مغل فنون لطیفہ ۔ مغل تعمیرات ۔ یا یوں کہیے کہ مغل ثقافت جو دنیا کی ترقی یافتہ ثقافتوں میں شمار ہوتی ہے زندہ و تابندہ ہے اور اس کے گہرے نقوش برصغیر کی تمام علاقائی ثقافتوں پر آج بھی موجود ہیں اور مستقبل میں بھی عرصۂ دراز تک موجود رہیں گے ۔ ان نقوش میں اردو زبان اور ادب کے نقوش خصوصی امتیاز کے حامل ہیں ۔ ان نقوش کی پائیداری کا عالم یہ ہے کہ بھارت میں اردو کی آئینی حیثیت کے بہت کمزور ہو جانے کے باوجود وہاں کے عوام و خواص پر اس زبان کی گرفت بدستور نہایت مضبوط ہے ۔ اب بھی وہاں کے سیاست دان عوام سے جس زبان میں خطاب کرتے ہیں وہ اردو زبان ہے ۔ وہاں کے درجنوں اخبارات اور رسائل اردو میں شائع ہوتے ہیں اور تمام ملک میں پڑھے جاتے ہیں ۔ اور اگرچہ اردو کتابیں دیوناگری رسم الخط میں بھی چھپتی ہیں اور انہیں ہندی کتابیں کہا جاتا ہے لیکن انہیں اردو دان بخوبی سمجھ سکتا ہے ۔ خود فارسی رسم الخط میں بھی سینکڑوں کتابیں بدستور چھپ

رہی ہیں۔ اردو کی گرفت کا اندازہ اس چیز سے کیا جاسکتا ہے کہ پچھلے سال شملہ کانفرنس کے موقع پر خود بھارتی وزیر اعظم شریمتی اندراگاندھی نے اپنی پریس کانفرنس میں نہایت عمدہ اور شستہ اردو میں خطاب کیا۔

حقیقت یہ ہے کہ اردو مسلمانوں اور ہندوؤں کا مشترکہ سرمایہ تھی اور اس کی آبیاری میں ہندو ادیبوں اور شاعروں نے بھی بھر پور حصہ لیا۔ اردو ادب کی تاریخ میں بیسوں باکمال ہندو شاعر گذرے ہیں۔ نثر نگاروں میں پنڈت رتن ناتھ سرشار نے فسانۂ آزاد جیسی عظیم الشان کتاب لکھی جسے اردو کے کلاسیکی ادب میں بہت بڑا مقام حاصل ہے۔ آج کے دور میں فراق گورکھپوری، پنڈت آنند نرائن ملا، پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی، جوش ملیسانی اور کئی دوسرے سرکردہ ہندو شعراء کی شاعرانہ عظمت مسلم ہے۔ میرے ضلع کے پسماندہ علاقہ سے اردو زبان کا جو مشہور ترین شاعر اٹھا وہ منشی تلوک چند محروم تھا۔ محروم کے قابل فرزند اور جانشین جگن ناتھ آزاد آج بھی بھارت میں اردو شعر و ادب کی بے انتہا خدمات سرانجام دے رہے ہیں۔

تاہم اردو ادب کا مزاج سراسر اسلامی ہے۔ فسانۂ آزاد پڑھنے والے کو اگر یہ نہ بتایا جائے کہ اس کا لکھنے والا ایک ہندو تھا تو وہ کبھی خیال بھی نہیں کر سکتا کہ اس وقت کے مسلم معاشرے کی اتنی بھرپور عکاسی کرنے والا شخص مسلمان نہ تھا۔ یہ اردو ادب کا اسلامی مزاج ہی تھا کہ گذشتہ ادوار میں تو ہر ہندو شاعر اپنے دیوان کا آغاز حمد، نعت اور منقبت سے کرتا ہی تھا۔ دور حاضر میں بھی ہندو شعراء نے ایسی ایسی نعتیں کہی ہیں کہ انہیں مسلمان شعراء کی کہی ہوئی نعتوں کے مقابل فخر سے پیش کیا جا سکتا ہے۔ اس دور کے دو ہندو شاعروں دلو رام کوثری اور ہری چند اختر کی نعتیں تو خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔ مشاعروں اور اجتماعات میں کیا ہندو اور کیا مسلمان سامعین، کلمات تحسین کے طور پر سبحان اللہ، ماشاٗ اللہ اور جزا ک اللہ استعمال کرتے ہیں اور عام بول چال میں بھی غیر مسلم ان الفاظ کو نہایت کثرت سے کام میں لاتے ہیں۔

اردو ادب کا یہ اسلامی مزاج ہی درحقیقت اس کے خلاف ہندوؤں کے ایک طبقہ کے تعصب کا باعث ہوا۔ جب مسلمانوں کا سیاسی غلبہ ختم ہوگیا اور پہلی جنگ آزادی کے بعد وہ ایک غیر ملکی سامراج کے انتقام کا نشانہ بنے تو فرقہ پرست ہندوؤں نے سب سے پہلا وار اسلامی اقتدار کے اس مظہر پر کیا اور ۱۸۶۷ء میں بنارس میں ہندوؤں کے ایک گروہ نے ایک میمورنڈم کے ذریعے اردو کی جگہ دیوناگری رسم الخط میں لکھی جانے والی ہندی کو دفتروں اور حکومتی اداروں میں رائج کرنے کا مطالبہ کیا۔ اس وقت اتفاق سے سرسید احمد خان بنارس ہی میں متعین تھے۔ اس متعصبانہ غوغا آرائی نے ان کے دل کو بہت صدمہ پہنچایا۔ لیکن وہ برابر ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں قوموں کے لیے کام کرتے رہے۔ چنانچہ علی گڑھ کالج کے ابتدائی دور میں ہندو طلبا کی تعلیم اور رہائش کا ویسا ہی انتظام تھا جیسا مسلمان طلباء کے لیے تھا اور سائنٹیفک سوسائٹی کے نام سے جو ممتاز علمی ادارہ سرسید نے قائم کیا تھا اس میں بھی کئی ہندو اراکین شامل تھے۔ ان ہندو اراکین نے مطالبہ کیا کہ سائنٹیفک سوسائٹی کی مطبوعات اردو کے بجائے ہندی میں ہوں۔ چنانچہ ۲۱ اپریل ۱۸۷۰ء کو نواب محسن الملک کے نام ایک خط میں سرسید احمد نے لکھا:

"مجھے ایک اور خبر ملی ہے جس سے مجھے بہت دکھ اور تشویش ہوئی ہے۔ بابو شیو پرشاد کے اکسانے پر ہندوؤں نے عمومی طور پر تہیہ کر لیا ہے کہ وہ اردو زبان اور فارسی رسم الخط کو جو اس ملک میں مسلمانوں کی حکمرانی کے مظاہر ہیں ختم کر دیں گے"۔

متعصب ہندوؤں کے ان معاندانہ عزائم کو مسلمان دشمن انگریزوں نے بڑی تقویت پہنچائی۔ چنانچہ انیسویں صدی کے اواخر میں ایک متعصب انگریز کلکٹر مسٹر اینتھونی میکڈونلڈ نے بہار میں اردو زبان اور فارسی رسم الخط کی جگہ بہاری ہندی اور کیتھی رسم الخط رائج کر دیا۔ اس کے بعد یہی انتھونی میکڈونلڈ یو۔پی کا گورنر بن کر آیا تو مارچ

۱۸۹۸ء میں ہندوؤں نے ایک میمورنڈم پیش کیا جس میں یہ مطالبہ کیا گیا کہ اردو زبان اور فارسی رسم الخط کے بجائے دفاتر میں ہندی زبان اور دیوناگری رسم الخط رائج کیا جائے - ۱۸ اپریل ۱۹۰۰ء کے دن سر انتھونی میکڈونلڈ کے حکم سے ان کی حکومت نے ایک قرار داد شائع کی جس کی رو سے بعض سرکاری اغراض کے لیے ہندی بھاشا اور دیوناگری رسم الخط کے استعمال کی اجازت دی دے گئی -

میکڈونلڈ کا یہ اقدام مسلمانوں کے لیے سخت بے چینی اور اضطراب کا کا باعث بنا - چنانچہ نواب محسن الملک نے جو سرسید کے بعد مسلمانوں کے مسلمہ لیڈر تھے - مسلمانوں کے جذبات کی عکاسی کے لیے علی گڑھ کے ٹاؤن ہال میں ایک جلسہ کیا اور اردو ڈیفنس ایسوسی ایشن قائم کی - اس طرح گویا تحریک پاکستان کا آغاز ہی اردو زبان کی محافظت کے جذبہ سے ہوا - اور آج ہم بلا خوف تردید کہہ سکتے ہیں کہ جب مسلمانان ہند کا کاروان آزادی اپنی منزل کی جستجو میں نکلا تو اس کی کاروان سالار اردو زبان تھی -

آپ جانتے ہیں کہ کسی قوم کی تہذیب و ثقافت کے مظاہر میں زبان و ادب کو ہمیشہ بڑی اہمیت حاصل رہی ہے - زبان ثقافت کا ایک انتہائی اہم جزو ہے اور اس کے بغیر ثقافت کی پہچان ممکن نہیں - اردو زبان کو اسلامی ثقافت میں جو اہمیت حاصل ہے اس کا اندازہ اس چیز سے کیا جا سکتا ہے کہ عربی اور فارسی کے بعد علوم اسلامیہ کا سب سے بڑا سرمایہ اردو زبان میں ہے - اور خدا کے فضل و کرم سے اس سرمائے میں مسلسل اور متواتر اضافہ ہوتا چلا جا رہا ہے - اس سرمائے کی فراہمی کے سلسلے میں جن اداروں نے گراں بہا خدمات انجام دی ہیں ان کی تفاصیل میں جانے کی ضرورت نہیں - البتہ اتنا کہہ دینا ضروری ہے کہ آج ہم جس عظیم الشان ادارہ کی صد سالہ تقریبات کے سلسلہ میں یہاں جمع ہیں اس سلسلے میں اس کی خدمات بڑی ناقابل فراموش ہیں - یہ ادارہ ایک سو سال سے نہایت وقیع کام کر رہا ہے اور اس ادارے کے ساتھ برصغیر کی بعض بہت بڑی شخصیتیں منسلک رہی ہیں جن میں سے علامہ محمد شفیع، ڈاکٹر محمد اقبال، حافظ محمود شیرانی اور خود مفکر پاکستان حضرت

علامہ اقبالؒ کے اسمائے گرامی آسمان علم و ادب پر روشن ستاروں کی طرح جگمگاتے ہیں ۔ اس وقت بھی ملک میں اس ادارہ سے تعلق رکھنے والی کئی ایسی سرکردہ علمی شخصیتیں خداوند تعالی کے فضل و کرم سے زندہ و سلامت موجود ہیں جن کے کارنامے تاریخ علم و ادب میں سنہری حروف میں لکھے جائیں گے ۔ یہی ادارہ پنجاب یونیورسٹی کا پیش رو ادارہ تھا اور اسی ادارہ نے اردو علم و ادب کے علاوہ عربی اور فارسی علم و ادب کی شمعوں کو بھی اس برصغیر میں روشن کر رکھا ہے ۔ برصغیر کے اسلامی ادب اور اسلامی ثقافت کے لیے اس ادارہ نے جتنا کام کیا ہے اسے دیکھ کر ہمارے دل فخر و مسرت کے جذبات سے معمور ہو جاتے ہیں۔

جیسا کہ میں نے ذکر کیا ہے تحریک پاکستان کی ابتدا اردو زبان و ادب کے تحفظ کی تحریک سے ہوئی تھی ۔ چنانچہ برصغیر کی عظیم سیاسی جماعت آل انڈیا مسلم لیگ نے جہاں مسلمانوں کے مذہبی ثقافتی اور سیاسی حقوق کے تحفظ کے لیے جد و جہد کی وہیں اردو زبان کے تحفظ کے لیے بھی بھرپور کوششیں کیں۔ چنانچہ ۱۸ اکتوبر ۱۹۳۷ء کو الہ آباد میں منعقد ہونے والے سالانہ اجلاس میں مسلم لیگ نے اردو کے حق میں مندرجہ ذیل قرار داد منظور کی :

"۔۔۔ آل انڈیا مسلم لیگ ہندوستان کے عام اردو بولنے والے لوگوں سے مطالبہ کرتی ہے کہ وہ اپنی زبان کے مفادات کے تحفظ کے لیے جہاں جہاں مرکزی اور صوبائی حکومتوں کے شعبوں کا اس سے تعلق ہے کوشش کریں اور جن علاقوں کی زبان اردو ہے وہاں اس کے بے روک ٹوک استعمال اور ترقی کا علم بلند رکھیں اور جہاں جہاں یہ غالب اکثریت کی زبان نہیں وہاں اختیاری زبان کے طور پر اس کی تدریس کی اور تمام سرکاری دفاتر کچہریوں ۔ قانون ساز اداروں ۔ ریلوے اور محکمہ ڈاک میں اس کے استعمال کے لیے مناسب اقدامات کا اہتمام کریں" ۔

پاکستان کے لیے جد و جہد کے دوران ہی یہ بات طے ہو گئی تھی کہ پورے پاکستان کی سرکاری زبان اردو ہوگی ۔ جب قائداعظم کی

زندگی کے دوران مشرقی پاکستان میں متعصب لوگوں نے زبان کا مسئلہ کھڑا کیا تو قائداعظم اپنی کمزوری اور نقاہت کے باوجود ڈھاکہ تشریف لے گئے اور انہوں نے وہاں صاف اور واشگاف الفاظ میں فرمایا :

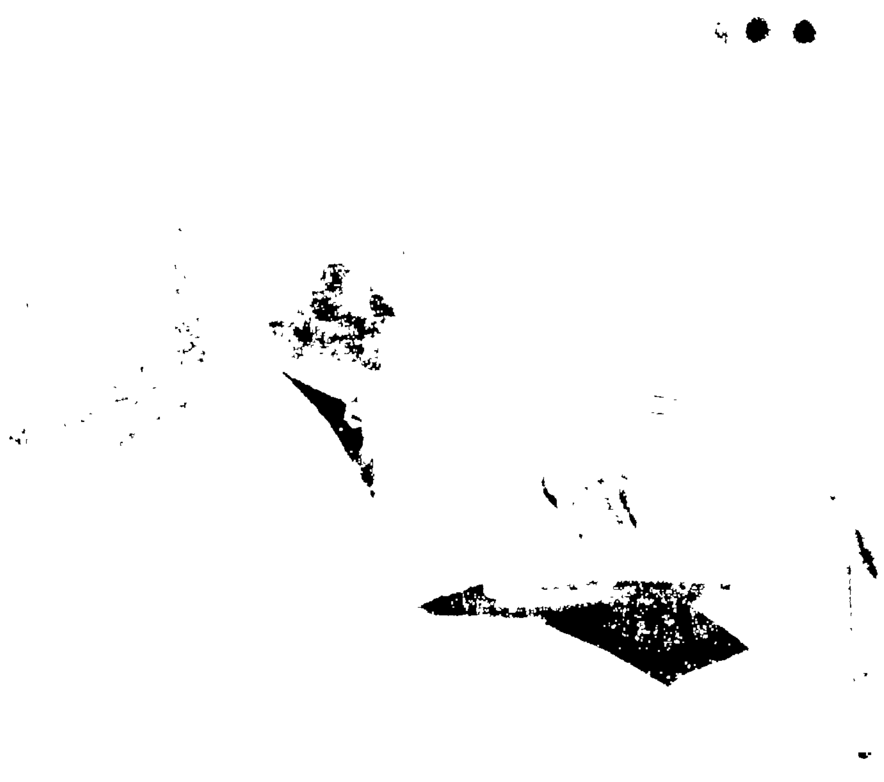
"میں آپ کو صاف الفاظ میں بتا رہا ہوں کہ جہاں تک آپ کی بنگالی زبان کا تعلق ہے آپ کی روزمرہ زندگی کو کوئی ہاتھ نہیں لگائے گا نہ اس میں خلل پیدا کرے گا۔ بالآخر آپ لوگوں یعنی اس صوبے والوں کا کام ہے کہ فیصلہ کریں کہ اس صوبہ کی زبان کون سی ہونی چاہیے ۔ لیکن میں صاف الفاظ میں واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ پاکستان کی سرکاری زبان اردو ہوگی اور کوئی دوسری زبان نہیں ہوگی ۔ جو شخص بھی آپ کو گمراہ کرنے کی کی کوشش کرتا ہے وہ پاکستان کا دشمن ہے ۔ ایک سرکاری زبان کے بغیر کوئی قوم ٹھوس بنیادوں پر متحد ہو کر کام نہیں کر سکتی دوسرے ملکوں کی تاریخ کی طرف دیکھیے"۔

قائداعظم نے جو کچھ ارشاد فرمایا تھا اس پر ان کے بعد آنے والوں نے عمل نہیں کیا اور اس کا نتیجہ ہم سب نے دیکھ لیا ہے ۔ ان کے بعد چوبیس برس تک زبان کے مسئلہ پر لوگ جھگڑے کھڑے کرتے رہے ۔ اب قائد عوام جناب ذوالفقار علی بھٹو کی رہنمائی میں عوامی حکومت نے فیصلہ کیا ہے کہ پاکستان کی سرکاری زبان اور اس کے ساتھ ہی تمام صوبوں کی سرکاری اور رابطے کی زبان اردو ہوگی ۔ یہ بھی واضح کر دیا گیا ہے کہ قائداعظم کے فرمان کی روشنی میں ہر انتظامی یونٹ اپنی صوبائی زبان کا تعین کرنے میں آزاد ہے وہ علاقائی ادب و ثقافت کو نشو و نما دینے کا بھی کامل اختیار رکھتا ہے ۔ قومی اور صوبائی زبانیں ، ایک ساتھ قدم بقدم آگے بڑھیں گی مگر اس طرح کہ نہ اردو کی مرکزی حیثیت مجروح ہوگی اور نہ علاقائی زبانوں کے حقوق پامال ہوں گے اس فیصلے پر کچھ وقت تو ہنگامہ آرائی ہوئی ۔ یار لوگ برسہا برس کے تعصبات کی وجہ سے کھل کھیلے ۔ سندھی اور اردو کے نام پر بھائی نے بھائی کا خون بہایا ۔ حالانکہ یہ زبانیں ہی نہیں، ہر زبان نفرت کی نہیں محبت کی پیغامبر ہوتی ہے ۔ خدا کا شکر ہے کہ اب

آنکھوں سے تعصب کی پٹی کھل چکی ہے - سالوں سے ملتوی زبان کا مسئلہ حل ہو چکا ہے اور پاکستانی قوم لسانی اور ثقافتی لحاظ سے اپنی منزل کا تعین کرنے کے بعد پوری ہوش مندی سے سرگرم سفر ہے -

آپ جانتے ہیں کہ پیپلز پارٹی نے انتخابی مہم کے دوران جس زبان کو اپنایا وہ اردو زبان تھی - صدر پاکستان نے ملک کے ہر حصہ میں اردو زبان کو ہی اپنے خیالات کے اظہار کا ذریعہ بنایا اور ان کی اہم تقاریر سب کی سب اسی زبان میں ہوتی رہیں بلکہ آپ کو یاد ہوگا کہ جس روز انہوں نے ٹوٹے ہوئے جہاز کی ناخدائی قبول کرکے پاکستان کی از سر نو تعمیر کے عزم کا اظہار کیا تھا تو اپنی پہلی تقریر میں اس چیز پر بڑے تأسف کا اظہار کیا تھا کہ وہ اردو کے بجائے انگریزی میں تقریر کر رہے ہیں اور اس کی ضرورت بھی واضح کر دی تھی - صدارت کی ذمہ داریاں سنبھالنے کے بعد انہوں نے جتنی عوامی تقاریر کی ہیں وہ سب اردو ہی میں ہیں - آپ کو یہ بھی معلوم ہے کہ قائد اعظم کی مادری زبان گجراتی تھی اور انہوں نے تمام عمر کام انگریزی زبان میں کیا لیکن جب وہ تحریک پاکستان کے لیے اٹھے تو انہوں نے اردو زبان سیکھنا اور اس میں تقریر کرنا شروع کر دیا تھا - اصل میں جتنا بڑا کوئی رہنما ہوتا ہے اتنا زیادہ وہ اپنی قوم کے جذبات اور احساسات کو سمجھتا ہے اور ان جذبات اور احساسات کے مطابق اپنے عمل کو ڈھالنے کی کوشش کرتا ہے - ہمارا فرض یہ ہے کہ ہم صدر جناب ذوالفقار علی بھٹو کی قائم کی ہوئی مثال کی روشنی میں اپنے عمل کا تعین کریں تاکہ ہماری قوم اور ہمارا ملک بھی ترقی کرے اور ان کے سہارے ہماری انفرادی زندگی بھی کامیاب اور بامراد ہو -

پاکستان پائندہ باد



پروفیسر حمید احمد خاں، صدر اجلاس اردو زبان و ادب

پروفیسر حمید احمد خاں
(سابق وائس چانسلر، پنجاب یونیورسٹی)

مولانا حالی کی نادر و نایاب تالیف

مولانا حالی کے ادبی کمال کا اعتراف ہم بالعموم اس شعری انقلاب کے ذکر سے کرتے ہیں جو مولانا نے ۱۸۷۴ء کے قریب اپنے شریک غالب محمد حسین آزاد کی رفاقت میں، برپا کیا۔ بلا شبہ خواجہ حالی کا امتیاز خصوصی یہ ہے کہ وہ غالب اور اقبال کی درمیانی نصف صدی میں اردو کے سب سے بڑے شاعر ہیں، لیکن یاد رکھنا چاہیے کہ بطور نثر نگار کے بھی ان کا بلند مقام ادب اردو میں ایک نشان راہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ ادبی تنقید میں ان کا اجتہادی کام ہمیشہ زندہ رہے گا اور گو فن تاریخ میں آزاد اور شبلی کی طرح انہوں نے کوئی کارنامہ نہیں چھوڑا مگر سوانح نگار کی حیثیت سے ان کی اولیت مسلم ہے۔ ''حیات سعدی'' (۱۸۸۶ء) - ''یادگار غالب'' (۱۸۹۷ء) اور ''حیات جاوید'' (۱۹۰۱ء) تین ایسی کتابیں ہیں جنہیں حالی کے ایوان عظمت کے تین ستون شمار کرنا چاہئیے۔

اسی قبیل کا ایک مختصر رسالہ ''حالات حکیم ناصر خسرو'' ہے جو حالی کے سوانحی شاہکاروں کی تمہید کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ سوانح عمری ''سفر نامہ حکیم ناصر خسرو'' کے ساتھ اس کے مقدمے کے طور پر ۱۸۸۲ء میں شائع ہوئی۔ ناصر خسرو کا سفر نامہ فارسی زبان میں ہے، اس لیے حالی نے صاحب سفر نامہ کی سیرت و حالات فارسی ہی میں قلم بند کیے ہیں۔ سفر نامے کے متن کی تصحیح کے علاوہ حالی نے ترتیب سوانح میں بے انتہا کاوش کی۔ چنانچہ مولوی عبد الرزاق کانپوری کے نام اپنے ۱۳ فروری ۱۹۰۰ء کے لکھے ہوئے خط میں اس سوانحی مقدمے کے متعلق خود تحریر فرماتے ہیں کہ ''میں نے جو اس کے اول میں ناصر خسرو کا حال فارسی میں لکھا ہے، اس میں سخت محنت اور تلاش مجھ کو کرنی پڑی ہے''۔

فارسی میں بھی حالی کا اسلوب نثر اتنا ہی صاف و شفاف ہے جتنا اردو میں۔ ان کے متین و وقیع بیان میں فالتو لفظ کی گنجائش نہیں نکلتی،

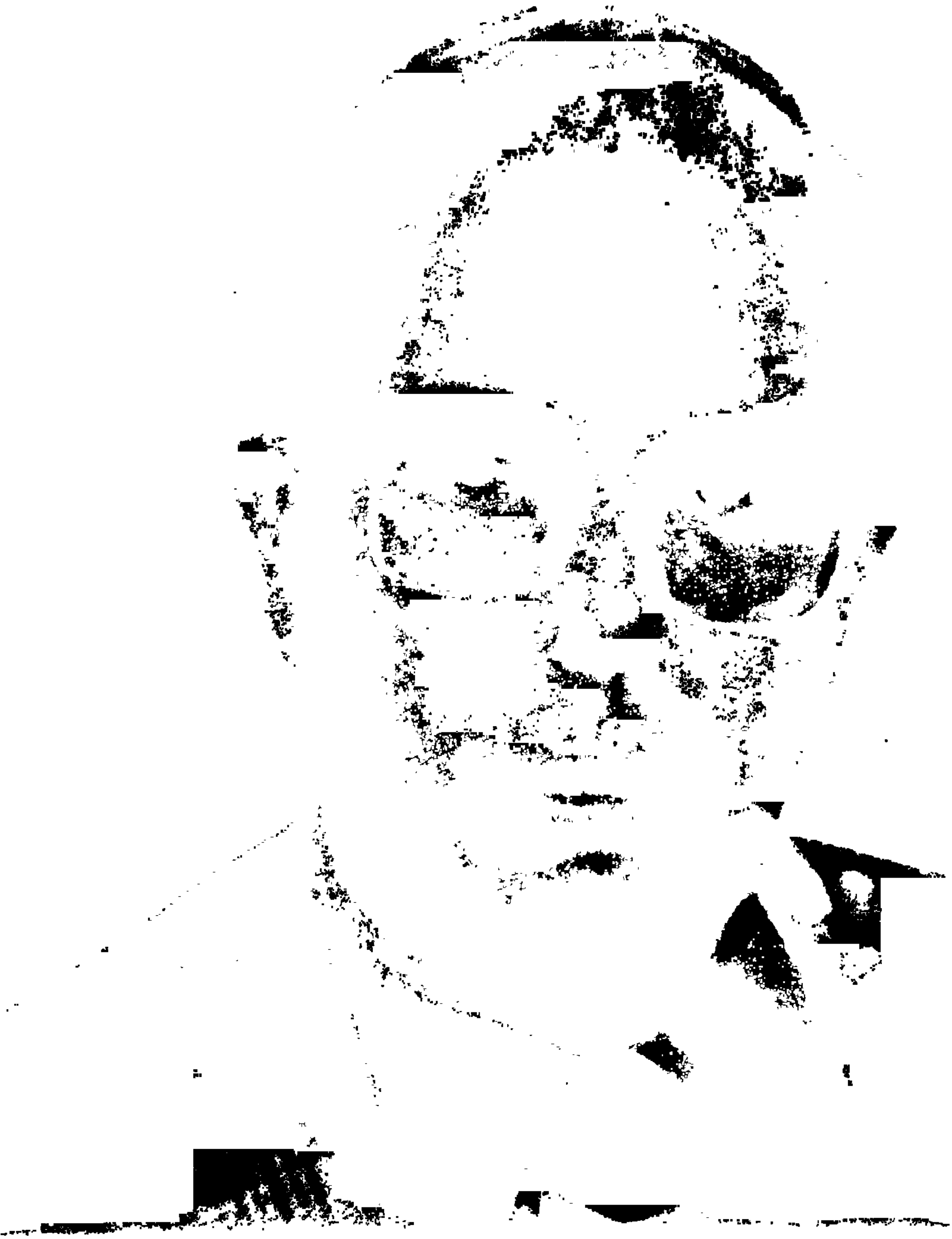
نہ انشا پردازی کا وہ انداز انہیں مرغوب ہے جو آرائشی ترکیبوں کی بھول بھلیاں میں غیر ضروری استعاروں کی بیسا کھیوں کے سہارے ڈگمگاتا ہؤا چلتا ہے۔ ''سفر نامہ حکیم ناصر خسرو'' کے سوانحی مقدمے کا آغاز انہوں نے کسی قسم کی تمہید باندھے بغیر کیا ہے اور ہم فوراً سمجھ جاتے ہیں کہ اس حکیم و شاعر کی سوانح عمری کے صحیح ماخذ کیا ہیں۔ ساتھ ہی انہوں نے بڑی خوبی سے وضاحت کر دی ہے کہ مدت مدید تک ارباب علم نے مذہبی تعصب کے باعث ناصر خسرو کی سوانح نگاری کے معاملے میں بے اعتنائی اختیار کی۔ پھر حالی خود ناصر خسرو کی تاریخ پیدائش اور مولد و منشاء کے تعین کے سلسلے میں داد تحقیق دیتے ہیں اور حمد اللہ مستوفی قزوینی سے لے کر رضا قلی خان اور چارلس شیفر تک کے کام کا ذکر کرتے ہیں۔ اس کے بعد ناصر خسرو کی تحصیل علوم کی تفصیلات، پھر سال ہا سال تک اس کے شغل درس و تدریس کی طرف ہلکا سا اشارہ اور بالآخر مرو پہنچنے پر کچھ عرصے کے لیے آل سلجوق کی ملازمت اختیار کرنے کا بیان ہمیں اس منزل پر لے آتا ہے جہاں ہم جان لیتے ہیں کہ ناصر خسرو کی شخصیت کا تعارف ہو چکا ہے۔ اب وہ ہفت سالہ سیر و سیاحت شروع ہوتی ہے جو اس کتاب کا اصل موضوع ہے۔ ناصر خسرو خراسان سے عراق عجم اور آذربائیجان، پھر آرمینہ، شام، فلسطین اور عراق عرب ہوتا ہؤا زیارت حرمین سے مشرف ہوتا ہے۔ عہد فاطمیہ کے مصر کا تمدن اس کی عقل و ضمیر دونوں کو بے حد متأثر کرتا ہے اور وہ یہاں مسلسل تین برس تک قیام کرتا ہے۔ مگر انجام کار ہمارا مسافر مراجعت وطن کا قصد کرتا ہے اور حجاز اور یمن کے علاقوں سے ہو کر فارس کی سیر دیکھتا ہؤا پھر خراسان میں آ نکلتا ہے۔

آج سے تقریباً ہزار برس پہلے کے شاعر و حکیم کا یہ سفر نامہ ساڑھے آٹھ سو برس بعد آنے والے حکیم و شاعر حالی کو کیوں اس قدر دلچسپ معلوم ہؤا کہ اس نے سفر نامہ کے متن کی تصحیح پر توجہ کی اور صاحب سفر نامہ کے حالات ''سخت محنت اور تلاش'' سے مرتب کیے؟۔ اس سوال کا صحیح جواب یہ ہے کہ حالی نے جب بھی سوانح نگاری کا تہیہ کیا، اس میں کسی معاصر یا قدیم شخصیت کے عقلی و اخلاقی کمال کی

تحریک ضرور کارفرما رہی ۔ معاصرین میں ایک طرف سید احمد خان کی فراست علمی و دینی اور جوہر قیادت نے اور دوسری طرف مرزا اسد اللہ خان غالب کی جودت تخیل اور ندرت افکار نے انہیں مسحور کیا ۔ اسی طرح قدما میں سعدی کی سلامت طبع اور نفسیات اخلاق پر گہری نظر اور ناصر خسرو کی راست روی و راست بیانی ان کے لیے باعث کشش ہوئی ۔ ناصر خسرو نے اپنے سفر نامے کی نثر کے لیے جو سیدھا اور سچا اسلوب بیان اختیار کیا تھا، وہ خود بخود حالی کے لیے مرکز توجہ بنا ۔ پھر ناصر خسرو کی شخصیت کا یہ پہلو کہ صدیوں پہلے کے بادشاہی دور میں پیدا ہوئے مگر سرکاری و درباری زندگی کے طلسم سے باہر نکل آئے، حالی کو خاص طور پر پسند آیا ۔ سرسید، غالب، سعدی اور ناصر خسرو، چاروں حالی کے معیار فکر و اخلاق پر اپنے اپنے رنگ میں پورے اترے اور اس لحاظ سے ایک ہی سلسلہ خیال کی مختلف کڑیاں بن گئے ۔

حالات ناصر خسرو کے بیان میں خواجہ حالی نے ضمنی طور پر اپنی ترجیح و پسند کا اظہار جا بجا اسی طرح کر دیا ہے جس طرح ہر ادبی تحریر کا مصنف لامحالہ کرتا ہے ۔ یہاں مذہبی تعصب سے حالی کی بیزاری، جاہ پرستی سے اِبا، سیر و سفر سے رغبت، تحقیق و تفحص سے لگاؤ، سادہ زندگی اور جفا کشی سے تعلق خاطر اور اس قسم کے بیسیوں مسائل پر برسبیل تذکرہ یا بالواسطہ روشنی پڑتی چلی جاتی ہے ۔ گویا قارئین کو اس کتاب میں نہ صرف ناصر خسرو کے حالات دریافت ہوں گے بلکہ خود مولانا حالی کے جواہر حکمت ہر صفحے پر بکھرے ہوئے ملیں گے ۔

اس گراں بہا مقالے کا پورے نوے برس تک دوبارہ نہ چھپنا حیرت انگیز معلوم ہوتا ہے ، لیکن اس عرصے میں فارسی زبان سے ہماری روز افزوں بیگانگی کا خیال کیا جائے تو یہ حیرت خود بخود رفع ہو جاتی ہے ۔ چنانچہ مجلس ترقی ادب کو ضروری معلوم ہوا کہ مولانا حالی کے فارسی متن کے ساتھ اس کا اردو ترجمہ بھی شائع کیا جائے ۔ راقم الحروف کی درخواست پر جناب طاہر شادانی نے اصل عبارت کو سلیس اردو میں منتقل کیا اور یوں اس دروازے کو جو عرصہ دراز سے بند پڑا تھا ہمارے لیے دوبارہ کھول دیا ۔



پروفیسر جے ۔ ام ۔ ایس ۔ بولجان (لائیڈن)

پروفیسر جے - ایم - ایس بولجان ، یونیورسٹی آف لائڈن
تلخیص و ترجمه : سهیل احمد خان

شاه ولی الله دهلوی کا فلسفۂ تاریخ

ماضی میں تاریخ کے بارے میں مسلمانوں کا رویه مغربی علماء کو پہلی نظر میں متضاد دکھائی دیتا ہے - ایک طرف یه سچائی ظاهر هوتی ہے که مسلمان عیسائیوں سے بھی زیاده شدت کے ساتھ تاریخ کو ارادۂ خداوندی کا مظہر اور اس کی کارگاه سمجھتے هیں ، ان کے لیے، (جیسا که ڈبلیو - سی - سمتھ نے اپنی کتاب ''اسلام تاریخ جدید میں'' مطبوعه پرنسٹن ۱۹۵۹ء کے صفحه ۳۰ پر مختصر لیکن جامع انداز میں کہا ہے) - ''تاریخ نے مذهب کی صداقت کو ظاهر کیا ہے'' - دوسری طرف (جیسا که هم ایف - روزن تھال کی تصنیف ''اسلامی فلسفه تاریخ کی تاریخ مطبوعه لائیڈن ۱۹۵۲ء میں پڑھتے هیں) - یه بھی ایک حقیقت ہے که مجموعی طور پر مسلمان علماء نے تاریخی تحقیق کو زیاده اهمیت نہیں دی -

شاه ولی الله کا انداز نظر بھی اسی طرح کا ہے وه ان لوگوں پر شدید اعتراض کرتے هیں جو قرآن و حدیث کی تفسیر کے علاوه کسی دوسری طرح کی تحقیق میں مشغول رهتے هیں اور جو ''علم بالتاریخ'' جیسے علوم میں اپنی صلاحیتیں صرف کرتے هیں اس طرح کے لوگوں کو وه ایسے عالم قرار دیتے هیں جو '' دنیاوی نفع تلاش کر رہے هیں'' چنانچه ''دین حق سے ایسے علم کا کوئی تعلق نہیں'' -

تاهم یه شاه ولی الله دهلوی هی هیں جو تاریخی واقعات سے اخذ کیے جانے والے تمام امکانی مطالب کو ایک شاندار طریقے سے ظاهر کرتے هیں اور جو بڑے مدلل اور قائل کرنے والے طریقے سے ڈبلیو - بی - سمتھ کی مذکوره بالا کتاب کے اس دعوے کو غلط ثابت کرتے هیں که ''صوفیا تاریخی عمل میں بہت کم دلچسپی لیتے هیں'' - اس مضمون کا

مقصد یہی ہے کہ آپ پر یہ ظاہر کیا جائے کہ آپ کے اس مفکر (شاہ ولی اللہ) نے تاریخ کے ارتقاء کے بعض چھپے ہوئے عناصر کو کتنی تخلیقی فکر کے ساتھ بےنقاب کیا ہے۔

اپنے رسالے ''سطعات'' میں شاہ ولی اللہ نے خدا کی طرف سے انسانوں کو عطا ہونے والے سات علوم میں ''ایام اللہ'' کے علم کا بھی تذکرہ کیا ہے (یعنی وہ واقعات جو تاریخ کا سبق فراہم کرتے ہیں۔۱ ان کی مراد واقعات کا وہ سلسلہ ہے جسے خدا نے فرمانبرداروں کو جزا اور گنہگاروں کو سزا دینے کے لیے تخلیق کیا ہے۔ ان واقعات کا ذکر قرآن مجید میں ہے۔ شاہ ولی اللہ کے خیال میں خدا نے ''ایام'' میں سے ان ''ایام'' کو تذکرے کے لیے منتخب کیا ہے جن کا ذکر وہ لوگ پہلے سے سن چکے تھے جنہیں خدا کا یہ پیغام سنایا جا رہا تھا۔ اس لیے ان ''ایام'' یا واقعات کا انتخاب بہترین تھا۔ رسول اکرمؐ کے معاصرین ان کہانیوں سے یہودیوں سے میل جول کے حوالے سے واقف تھے۔ خدا نے ایرانی اور ہندی داستانوں کو استعمال نہیں کیا اس کے پیچھے یہ حکمت ربانی کام کر رہی تھی کہ جب عام لوگوں کو تجسس انگیز کہانیاں سنائی جائیں تو ان کی توجہ ظاہری سطح میں گم ہو جاتی ہے اور کہانیوں کی اصل سطح یا ان کا جوہر غائب ہو جاتا ہے۔

اس تمام صورت حال کا جائزہ لینے سے شاہ ولی اللہ کے علم بالتاریخ کو حقارت سے دیکھنے کے سلسلے میں ایک اشارہ ملتا ہے ان کے خیال میں ''شاہنامہ'' اور دوسری جگہوں پر جیسے تاریخی واقعات کا تذکرہ ملتا ہے اس سے احتمال ہوتا ہے کہ پڑھنے والے کا خیال ''حقیقت اولیٰ'' سے ہٹ جائے۔ بعض مقامات پر انہوں نے تہذیب اور فنون کے رومی اور بازنطینی سلطنتوں پر ہونے والے مضر اثرات کا تذکرہ بھی کیا ہے۔

جہاں تک انسان کے تاریخی نتائج اور اسباق کے مطالعے کی اہلیت کا تعلق ہے، شاہ ولی اللہ نے خود قرآن مجید اور حدیث میں بیان ہونے والی پیغمبروں کی حکایت کے چھپے ہوئے رموز پر ابن العربی کی ''فصوص

۱۔ سطعات ص ۲۶۔

الحکم" کی طرز پر ایک کتاب لکھی ہے - اپنی اس تحریر کو انہوں نے "تاویل احادیث" کا نام دیا ہے -

اس کے بعد ہم شاہ ولی اللہ کی فکر کے اس رخ کا جائزہ لیتے ہیں جسے تاریخ کی تشریح کا عمرانی خطوط پر جائزہ کہا جا سکتا ہے - اس کی بنیاد شاہ ولی اللہ کے چار ارتفاقات کے مشہور نظریے پر ہے - "ارتفاق" کا لغوی مطلب "فائدہ حاصل کرنا ہے" - اس کی جمع کو دلی کے اس مکتب فکر نے ایک علمی اصطلاح کے طور پر استعمال کیا ہے - اس سے مراد وہ ذرائع اور وہ طریقے ہیں جن کو بروئے کار لا کر لوگ تہذیبی اور معاشرتی معیار کو بلند کر سکتے ہے- اس معیار کے حصول کے چار مراحل ہیں جنہیں وہ ارتفاق کہتے ہیں- "بدور بازغہ" میں معاشرتی ارتقاء کا یہ عمل مختلف پیغمبروں کے حوالے سے بیان کیا گیا ہے - پہلے پہلے مرحلے کو پہلے (ابتدائی) پیغمبر حضرت آدم علیہ السلام کے حوالے سے ظاہر کیا گیا ہے- یہ بدویت کا مرحلہ ہے - حضرت محمدؐ جو خاتم النبیین ہیں ارتقاء کے آخری مرحلے کے نمائندہ ہیں جہاں انسانی معاشرے کی بنیاد وطنیت سے ماوراء اور اعلیٰ تر ہے- مدنی زندگی جو دوسرا مرحلہ ہے حضرت نوح علیہ السلام کے ساتھ منسلک ہے - حضرت عیسیٰؑ انسانی معاشرت کے تیسرے مرحلے کو ظاہر کرتے ہیں - اس مرحلے پر ناہیاتی تنظیم پیدا کرنے کے لیے ریاست کی بنیاد پڑی -

تاریخ کے سلسلے میں مزید وضاحت کے لیے شاہ ولی اللہ کے ایک اور رسالے "لمحات" اور کتاب "تفہیمات" کی جلد اول سے رجوع کرنا پڑے گا- وہ خدا کی تجلی سے پیدا ہونے والے اثرات کا بیان کرتے ہیں - ان کی اصطلاح میں، تجلی خدا کے چار بنیادی کلمات میں سے آخری ہے - یہ کلمات حسب ذیل ہیں جو لاتعداد صفات میں ظاہر ہوتے ہیں -

۱- ابداع - عدم محض سے کسی کو وجود میں لانا -
۲- خلق یا تخلیق - ایک موجود چیز سے دوسری چیز پیدا کرنا
۳- تدبیر - کائنات کی چیزوں میں ایک نظام پیدا کرنے کے لیے خداوند کے مصالح -

چونھی اور آخری تجلی جس سے خدا اور انسانوں کے باھمی معاملات کی شکل بنتی ھے اس سے صحیح علم، درست راستہ یا روحانی تکمیل حاصل ہوتے ھیں۔ اس کے کئی ادوار اور کئی اطوار ہیں ۔

تاریخ کے پہلے عہد کا آغاز (Hermes Trismegistos) سے کیا جاتا ھے جو مصری دیوتا (Thot) کا یونانی نام ھے اور علم نجوم، کیمیا گری، طب اور جادو نے فن پر کئی تصنیفات ان کی طرف منسوب کی گئی ھیں ۔ اس عہد میں ستاروں کی گردش اور اس گردش کے عجائب کا راز حضرت ادریس علیه السلام پر منکشف ھؤا ۔ اسی عہد میں مجوس یا آتش پرستوں کی ملت وجود میں آئی اور علم نجوم،طب اور سحر وغیرہ کو فروغ حاصل ھؤا ۔ اسی طرح کچھ عہد گذرا ۔

پھر آھستہ آھستہ فرشتے ظاھر ھوئے ۔ دوسرے عہد کا آغاز کرنے والے حضرت ابراھیم ھیں۔ جنھوں نے لوگوں کی توجہ ستاروں سے ھٹا کر ملاء اعلی کی طرف لگائی ۔ اس عہد میں لوگ فرشتوں کی گرفت میں آئے اور انھوں نے صلوٰۃ کے ذریعے خدا سے لو لگائی ۔ فرشتوں ، پیغمبروں اور آسمانی کتابوں پر اعتقاد حاصل ھؤا . . . اور چاند اور سورج کے قدیم معبد کی جگہ کعبہ نے لے لی اور ملت حنیفه قائم ھوئی ۔

پیغمبروں اور فرشتوں کے اترنے سے آھستہ آھستہ عالم مثال اور ملاء اعلی کا علم بڑھنے لگا اور حضور رسول اکرم کے مبعوث ھونے تک آسمان اور زمین تجلی کی مثالی صورتوں سے مکمل طور پر بھر چکے تھے ۔ چنانچہ اب اگر کوئی علم معرفت حاصل کرنا چاھتا ھے تو یہ مثالی صورت یعنی رسول اکرم کی روحانی صورت ھی اس کا سب سے بڑا مآخذ ھے ۔

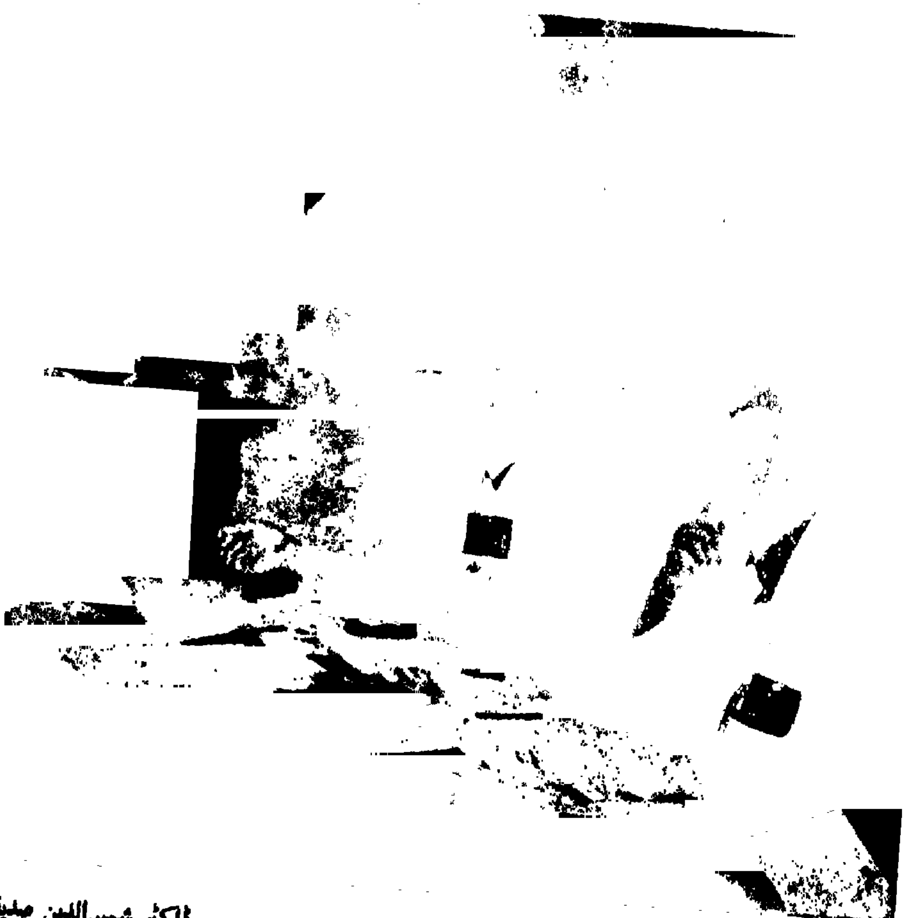
یہ تو رسول اکرم کے زمانے تک کا ذکر ھے، سوال یہ ھے کہ شاہ ولی اللہ کے فلسفۂ تاریخ میں بعد کے زمانے کو کیا اھمیت دی گئی ھے۔ تاریخی مذاھب میں مذاھب کے بانی کا زمانہ انسانیت کے لیے سب سے اھم زمانہ سمجھا جاتا ھے ۔ شاہ ولی اللہ نے بھی اس نظریے کو قبول کیا ھے کہ حضور کے زمانے کے بعد کے ادوار مذھبی طور پر کم اھمیت رکھتے ھیں چنانچہ وہ پانچ تغیرات کی بات کرتے ھیں اور ھر تغیر، تنزل کی طرف لے جاتا ھے ۔

پہلا تغیر حضرت ابوبکرؓ کو اقتدار منتقل ہونا ہے ۔ دوسرا تغیر حضرت عمرؓ کی وفات ہے جو فتنے کے دروازے پر کنڈی کی حیثیت رکھتے تھے ۔ تیسرا حضرت عثمانؓ کی شہادت ہے اور یہ سب سے بڑا تغیر تھا کیونکہ یہی پہلے کے اچھے زمانے اور بعد میں آنے والے انتشار اور ملوکیت کے زمانے میں خط فاصل کھینچتا ہے ۔ چوتھا تغیر سلطنت عباسیہ کا آغاز ہے اور پانچواں عرب سلطنت کا خاتمہ اور ترکوں کی حکومت کا آغاز ہے جن کی حکومت مجوسیوں کی طرح ہے ۔ فرق یہ ہے کہ وہ صلواۃ ادا کرتے ہیں اور زبان سے ''شہادت'' کا اقرار کرتے ہیں ۔ شاہ ولی اللہ کہتے ہیں '' کہ اس آخری دور میں پیدا ہونے کی وجہ سے وہ یہ نہیں جا سکتے کہ اب خدا کا ارادہ کیا ہے'' ۔ یہ نظریہ ان کی کتاب ''ازالۃ الخفاء عن خلافۃ الخلفاء'' میں ہے جس میں شیعہ عقائد کو رد کیا گیا ہے اور سنی عقائد اور اصولوں کو سامنے لایا گیا ہے لیکن شاہ ولی اللہ کی دوسری کتابیں دیکھنے سے یہ احساس ہوتا ہے کہ ان کا ذاتی نظریہ یہ تھا کہ رسول اکرمؐ کے زمانے کے بعد بھی ملکوتی اسرار و انہام کا سلسلہ جاری رہا اور انہوں نے خود اپنے زمانے میں اس کی بہت ارتقاء یافتہ شکل کو دیکھا ۔ ''تفہیمات'' میں وہ لکھتے ہیں کہ حضرت آدم علیہ السلام کے ساتھ نسل انسانی کا آغاز ہؤا اور اسے قلب، عقل اور نفس کے لطائف ملے ۔ اس کے بعد کے زمانے میں ان لطائف کو خدا کی سچائیوں کے علم کی خواہش دی گئی ۔ بود و ماند کے لیے (جو نفس کی کاروائی ہے) لوگوں کو جانوروں پر سواری کی اجازت دی گئی ۔ ان کا گوشت کھانے، دودھ پینے اور ان کی کھال کو لباس کے طور پر استعمال کرنے کی اجازت دی گئی ۔ حضور اکرم رسول مقبولؐ کے عہد کے قریب یہ زمانہ آتا ہے اور یہیں سے ایک نئے دور کا آغاز بھی ہوتا ہے ۔ اس عہد میں خدا نے ''روح'' اور ''سر'' کی طرف نگاہ کی ۔ چنانچہ اس زمانے میں محبوب وہ تھا جس میں یہ دونوں لطائف ہوں ۔ اس کے بعد ابن العربی کا زمانہ ہے جب خدا کی نگاہ ایک اور لطیفہ کی طرف مائل ہوئی جسے ''خفی'' کہا گیا ہے ۔ اس عہد میں روحانی رہنما ''توحید'' اور دنیا والے ایک حقیقت میں گم ہونے کے نظریے ''وحدت

الوجود" سے سرشار ہوئے ۔ آخر میں ہمارے زمانے میں خدا کی نگاہ جن لطائف کی طرف مائل ہوئی وہ "حجربحت" (عقل خالص) اور انا ہیں ۔

"فیوض الحرمین" کے گیارھویں مکاشفے میں شاہ ولی اللہ بیان کرتے ہیں کہ "الملاء الاعلیٰ" کی تعداد میں اضافہ آخر وقت تک ہوتا رہے گا اور دنیا میں خدا کا علم اور زیادہ پھیلے گا اور تاریخ کے راستے کے نزدیک تر ہوگا ۔ رسول اکرم ؐ کی ایک حدیث میں یہ نکتہ پوشیدہ ہے ۔

"جب قیامت قریب آئے گی تو ایمان والوں کے خوابوں میں غلطی کم ہوگی" ۔



پروفیسر رالف رسل — ڈاکٹر عبادت بریلوی — ڈاکٹر شمس الدین صدیقی

ڈاکٹر محمد شمس الدین صدیقی (پشاور یونیورسٹی)

تصانیف سودا کی تدوین اور اشاعت

ایک تحقیقی جائزہ

سودا نے اپنی زندگی میں بہت کچھ لکھا، بیشتر نظم میں اور کم تر نثر میں۔ بیشتر اردو میں اور کمتر فارسی میں، لیکن سودا کی بعض تحریریں نابید ہیں یا کم از کم محققین ان کا سراغ ابھی تک نہیں لگا سکے ہیں حالانکہ ان کا حوالہ بعض تذکرہ نگاروں نے دیا ہے۔ مثلاً قدرت اللہ قاسم نے خان آرزو۱ اور سعدی۲ کے ترجموں میں سودا کے لکھے ہوئے ایک تذکرے کا ذکر اس طرح کیا ہے جس سے متبادر ہوتا ہے گویا یہ تذکرہ انہوں نے دیکھا ہو۔ محمد حسین آزاد نے بھی سودا کے لکھے ہوئے تذکرے کا ذکر۳ کیا ہے لیکن اسے ناپید تسلیم کیا ہے۔ اگر قاسم اور آزاد کا دعوی درست ہے تو قیاس چاہتا ہے کہ یہ تذکرہ سودا نے فارسی میں لکھا ہوگا۴ (جیسا کہ اس زمانے کا قاعدہ تھا) اور اس میں اردو کے شاعروں کا حال لکھا ہوگا۔ ڈاکٹر خلیق انجم کا خیال ہے کہ سودا نے کوئی تذکرہ نہیں لکھا ہوگا۔ سودا کے کسی ہمعصر یا قریب العصر تذکرہ نگار نے اس کا ذکر نہیں کیا ہے۔ لیکن یہ طرز استدلال درست نہیں کیونکہ قاسم کے تذکرے کا بھی کسی ہمعصر تذکرہ نگار نے ذکر نہیں کیا ہے۔ کیا اس بنا پر ہم قاسم کے تذکرے سے انکار کر سکتے ہیں ؟

سودا کی ایک اور تحریر جو ناپید ہے لیکن جس کا ذکر رام بابو سکسینہ۵ اور ان کے مترجم مرزا عسکری۶ نے کیا ہے، ایک نثری مکتوب ہے جو اردو میں ہے اور میر تقی میر کے نام ہے۔ نہ تو سکسینہ نے اور نہ عسکری نے اس کی سند پیش کی ہے کہ یہ علم انہیں کیونکر ہوا۔ وہ صرف یہ کہنے پر اکتفا کرتے ہیں کہ یہ نثری مکتوب سودا کے مطبوعہ کلیات میں شامل نہیں ہے۔

ایک اور تحریر بھی جو ناپید ہے لیکن جس کا ذکر محمد حسین آزاد نے کیا ہے۷ - اردو نثر میں ہے - آزاد کہتے ہیں کہ سودا نے میر کی مثنوی شعلۂ عشق کو ایسی اردو نثر میں لکھا تھا جو بہت فارسی آمیز تھی لیکن آزاد نے اپنے اس دعوے کی کوئی سند نہیں دی ہے -

ایک اور چیز جو ناپید ہے ایک اردو مخمس ہے جس میں شیخ علی حزیں کی ہجو کی گئی ہے - شفیق نے اپنے تذکرے ۸ میں اس کا ذکر کیا ہے اور بتایا ہے اس مخمس میں ۱۹ بند تھے -

ایک اور شہادت بھی یہ ثابت کرتی ہے کہ سودا کا دیوان اس وقت مرتب و مدون ہو چکا تھا - شفیق اورنگ آبادی نے اپنا تذکرہ چمنستان شعراء ۱۱۷۶ھ میں مکمل کیا - اس میں ذکر ہے کہ سودا کا کلیات مختلف اصناف مثلاً غزل، قصیدہ، مثنوی، مخمس، ترجیع بند، رباعی اور مرثیے پر مشتمل ہے اور اس میں تقریباً دو ہزار شعر ہیں۹ - لیکن شفیق کا اندازہ تعداد اشعار کے بارے میں غلط معلوم ہوتا ہے کیونکہ ۱۱۷۴ھ کے مکتوبہ مخطوطے میں دو ہزار سے کہیں زیادہ شعر ہیں -

میر حسن نے اپنے تذکرہ شعرائے اردو میں معین بدایونی کے ترجمے میں سودا کے دیوان کا ذکر کیا ہے لیکن تعداد اشعار کے بارے میں کوئی اندازہ نہیں دیا - شورش نے ۱۱۹۳ھ میں تخمینہ لگایا ہے کہ سودا کے کلیات میں تقریباً پانچ ہزار شعر ہیں، لیکن یہ تخمینہ بھی غلط معلوم ہوتا ہے کیونکہ ۹۵ - ۱۱۹۴ھ کے مکتوبہ نسخہ جانسن میں جو انڈیا آفس لائبریری میں محفوظ ہے اور جس میں سلام و مراثی بالکل نہیں اور کئی اور منظومات بھی محذوف ہیں، تقریباً ساڑھے نو ہزار اشعار ہیں -

سودا کے مطبوعہ کلیات میں جو دیباچہ "رفیع ترین کلامے - - -" کے الفاظ سے شروع ہوتا ہے اس سے نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ سودا کی زندگی ہی میں اس کا دیوان اس کے ایک شاگرد حکیم اصلح الدین نے ترتیب دے لیا تھا - قدرت اللہ قاسم اس کی توثیق کرتے ہیں کہ سودا کے دیوان کا دیباچہ حکیم اصلح الدین نے لکھا تھا۱۰ - یہ دیباچہ سودا کے مطبوعہ کلیات کے تمام اڈیشنوں میں شامل ہے اور بعض مخطوطات میں بھی ملتا ہے

جب تک یہ سب ناپید تحریریں دستیاب نہ ہو جائیں ان کے بارے میں بقطع و یقین کچھ کہنا ممکن نہیں۔ ہو سکتا ہے کہ سودا نے انہیں لکھا ہی نہ ہو اور حوالہ دینے والوں کو غلط فہمی ہوئی ہو یا انہیں غلط اطلاع ملی ہو۔

اردو کا وہ تحریری سرمایہ جس کے بارے میں پورے وثوق سے دعوی کیا جا سکتا ہے کہ سودا ہی کا لکھا ہوا ہے بہ تفصیل ذیل ہے۔

(۱) غزلیات کا ایک دیوان جس میں بعض ناتمام غزلیں اور مطلعے اور مفردیات شامل ہیں (۲) چوالیس قصیدے جن میں ۳۹ مدحیہ یا بیانیہ ہیں اور پانچ ہجویہ (۳) ۱۴ مثنویات (۴) ۳ مخمسات (۵) ایک ترجیع بند (۶) ایک مسدس (۷) ۴۰ رباعیات اور ایک رباعی مستزاد، (۸) ۳۴ قطعات (۹) ایک ترکیب بندواسوخت (۱۰) چند اردو سلام و مراثی (۱۱) ایک نثر پارہ جو میر محمد تقی کے مرثیے کی تنقید کے پیش لفظ کے طور پر لکھا گیا ہے۔

سودا کی فارسی تحریروں میں ایک دیوان غزلیات ہے، ایک قصیدہ، چند قطعے اور رباعیات ایک مخمس اور ایک نثری رسالہ جس کا نام ہے "عبرت الغافلین" اس میں مرزا فاخر مکین کی شاعری پر تنقید ہے اور مکین نے شعرائے فارسی پر جو تنقیدیں کی ہیں ان کا جواب دیا گیا ہے۔

برج بھاشا میں چند پہیلیاں بھی سودا سے منسوب ہیں۔

سودا کے مطبوعہ کلیات میں مذکور کلام نظم و نثر سے کہیں زیادہ چیزیں ملتی ہیں لیکن وہ الحاقی اور مشکوک ہیں۔

سودا کے اردو غزلیات کے دیوان میں سوائے پ، ٹ، ج، ڈ، اور ژ کے باقی تمام ردیفوں میں غزلیں ملتی ہیں۔ قصائد بھی مختلف ردیفوں میں ہیں اور مختلف طرز کے ہیں مثلاً بیانیہ، وصفیہ، مدحیہ، تنقیدی، ہجویہ ــ مخمسات بیشتر تضمینوں پر مشتمل ہیں یا پھر ہجویہ ہیں۔ رباعیات ہر قسم کی ہیں مدحیہ، ہجویہ، اخلاقی، مذہبی، عشقیہ، موقتی اور آپ بیتی یا تعلی پر مبنی۔ قطعات بیشتر موقتی ہیں جن میں کسی نہ کسی تقریب کا ذکر ہے۔ بعض قطعے اخلاقی ہجویہ اور مدحیہ بھی ہیں۔ ترجیع بند

ھجویہ ھیں اور ترکیب بند واسوخت پر مشتمل ھے ۔ مسدس ھجویہ ھے ۔ مراثی اور سلام رثائی اور دعائیہ ھیں ۔ اردو کا نثری شذرہ اٹھارویں صدی کی نثرنگاری کا نمونہ پیش کرتا ھے ۔

سودا کا فارسی کلام نہ صرف مقدار میں کم ھے بلکہ کیفیت کے لحاظ سے بھی اردو کلام سے کم مرتبہ ھے ۔ لیکن اس کا رسالہ 'عبرت الغافلین' اس کی ادبی تنقید کا عمدہ نمونہ ھے اور اس سے سودا کے نظریہ شاعری پر خوب روشنی پڑتی ھے کہ وہ شاعری میں کن محاسن کا معترف اور کن نقائص کا قائل تھا ۔

پہیلیاں برج بھاشا پر سودا کی دسترس کا ثبوت ھیں اور اس کی ذھانت و طباعی کی دلیل ۔ پہیلیاں مختلف موضوعوں پر ھیں مثلاً چارپائی، قلم، گھڑی، شمع، جھاڑو، تکیہ وغیرہ ۔ لیکن یہ سودا کے معتبر مخطوطات میں نہیں ملتیں ۔

یہ طے کرنا مشکل ھے کہ سودا کی تحریریں کسی سال دیوان یا کلیات کی شکل میں پہلی مرتبہ مرتب و مدون کی گئیں ۔ سودا کے کلام کا قدیم ترین معلومہ نسخہ جو اب مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے کتب خانے میں محفوظ ھے ۱۱۷۴ھ کا مکتوبہ ھے جو ۱۷۶۰ء کے مطابق ھے ۔ یہ مخطوطہ سودا کی وفات سے ۲۱ سال پہلے لکھا گیا تھا اس لیے لازماً اس میں وہ کلام شامل نہیں جو سودا نے ۱۱۷۴ اور ۱۱۹۵ھ کے مابین لکھا ۔ شیخ چاند نے اپنے تحقیقی مقالے "سودا" میں اس مخطوطے کے بارے میں لکھا ھے کہ یہ خوش خط لیکن اغلاط سے بھرپور ھے ۔ املا کی بھی بہت غلطیاں ھیں اور کاتب نے کئی لفظ چھوڑ دیے ھیں جس سے بہت سے مصرعے بےوزن ھوگئے ھیں ۔ کاتب کا نام صادق علی مرزا ھے اور اس نے تسلیم کیا ھے کہ اس نے یہ دیوان احمد شاہ ابدالی اور مرھٹوں کے دھلی پر حملوں کے پرآشوب زمانے میں نقل کیا ھے ۔ چونکہ یہ مخطوطہ ۱۱۷۴ھ کا کتابت شدہ ھے اس لیے صاف نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ھے کہ سودا کا دیوان اس وقت مرتب و مدون ھو گیا تھا ۔

بلوم ھارٹ[۲] اور شیخ چاند[۳] دونوں نے لکھا ھے کہ سودا کا کلیات پہلی بار ۱۸۰۳ء میں کلکتے سے شائع ھوا ۔ شیخ چاند کا یہ بھی خیال ھے کہ

یہ کلیات شیر علی افسوس کا مدونہ و مرتبہ تھا کیوں کہ افسوس نے اپنی تألیف آرائش محفل کے دیباچے میں لکھا ہے کہ اس نے سودا کے کلیات کی تصحیح میں کچھ وقت صرف کیا تھا۔ لیکن یہ ۱۸۰۳ء کا اڈیشن جسے بلوم ہارٹ اور شیخ چاند کلکتے سے طبع شدہ بتاتے ہیں کسی کتب خانے میں ابھی تک دریافت نہیں ہو سکا ہے حتیٰ نہ انڈیا آفس لائبریری اور برٹش میوزیم میں بھی نہیں ہے جہاں سودا کے اور سب اڈیشن موجود ہیں۔ یہ اڈیشن شیخ چاند نے خود نکھوا دیکھا بھی نہیں تھا بلکہ محض بلوم ہارٹ کے بیان پر اعتبار کیا تھا۔ اصل میں واقعہ کچھ یوں ہے کہ فورٹ ولیم کالج کلکتہ سے سودا کے کلیات کا ایک اڈیشن ۱۸۰۳ء میں طبع ہونا طے تو پایا تھا۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ کسی نہ کسی وجہ سے وہ شائع نہیں ہو سکا۔ اگر واقعی شائع ہو جاتا تو اس کا کوئی نسخہ کہیں تو محفوظ رہ جاتا۔ بظاہر بلوم ہارٹ کو فورٹ ولیم کالج کے اشاعتی پروگرام سے دھوکا ہؤا اور اس نے یہ فرض کر لیا کہ وہ اڈیشن جس کی اشاعت ۱۸۰۳ء میں تجویز ہوئی تھی شائع بھی ہو گیا ہوگا۔ درحقیقت ایسا نہیں ہؤا۔ اس کی تصدیق یوں ہوتی ہے کہ کریم الدین نے ۱۸۴۸ء میں اپنے تذکرہ شعرائے اردو میں یہ لکھا ہے کہ اس وقت تک سودا کا صرف کچھ منتخب کلام شائع ہؤا ہے نہ کہ کلیات۔ اگر کلیات ۱۸۰۳ء میں شائع ہو چکا ہوتا تو کریم الدین اس سے لاعلم نہیں رہ سکتے تھے۔ ۱۸۰۳ء میں کلیات سودا کی عدم اشاعت کی مزید تصدیق یوں ہوتی ہے کہ انڈیا آفس لائبریری میں ایک مخطوطہ سودا کے کلیات کا محفوظ ہے جس کی حکومت مدراس کے میر منشی محمد عبدالقادر خان نے ۱۸۴۳ء میں سی پی براؤن فارسی مترجم حکومت مدراس کی فرمائش پر ترتیب و کتابت کی ہے۔ اس مخطوطے میں براؤن نے خود اپنے ہاتھ سے یہ لکھا ہے کہ سودا کے کلام کے صرف چھوٹے موٹے انتخابات اور مجموعے اب تک شائع ہو چکے ہیں۔ میں نے سودا کے کلام کے مختلف مخطوطے فراہم کر کے فاضل مرتب (یعنی عبدالقادر خان) کو یہ کام سونپا کہ وہ انہیں مدون کر دیں، چنانچہ انہوں نے یہ کلیات ترتیب دیا ہے جسے وہ واحد مکمل کلیات قرار دیتے ہیں۔ ان تمام شہادتوں کی موجودگی میں یہی نتیجہ اخذ ہوتا ہے کہ سودا کا کلیات ۱۸۰۳ء میں کلکتے سے شائع نہیں ہؤا۔

البتہ ۱۸۱۰ء میں کلکتے سے ایک انتخاب سودا شائع ہوا جسے محمد اسلام اور کاظم علی جوان نے مل کر مرتب کیا تھا ۔ اس انتخاب کا نام تھا انتخاب دیوان سودا ۔ یہ انتخاب سول ملازمین کے لیے ڈگری کے معیار کی نصابی کتاب کے طور پر تجویز کیا گیا تھا اور عین ممکن ہے کہ خاص اس غرض سے اس کی ترتیب و تدوین کرائی گئی ہو ۔ اس انتخاب دیوان سودا کے مطبوعہ نسخے لندن میں موجود ہیں ۔ اسی انتخاب کا ایک نظرثانی شدہ اڈیشن پھر کلکتے ہی سے ۱۸۴۷ء میں طبع ہوا ۔ نظر ثانی اور چند غزلوں اور قصیدوں کے اضافے مولوی نظام حیدر نے کیے تھے ۔

سودا کی تصنیفات کلیات کی شکل میں پہلی بار ۱۸۵۳ء میں دھلی کے مکتبۂ مصطفائی سے شائع ہوئیں ۔ اس کلیات کے آخر میں جو نوٹ دیا گیا تھا اس کی رو سے یہ اڈیشن غلام احمد نامی کسی غیر معروف شخص کے تالیف کردہ مخطوطے پر مبنی ہے جس کا کہنا ہے کہ اس نے سودا کی تصنیفات کو مختلف مقامات و ذرائع سے حاصل کر کے یکجا کیا اور اس طرح اس کا دعوی ہے کہ یہ اڈیشن کسی اور مخطوطہ سودا کے مقابلے میں جامع تر اور بہتر ہے ۔ لیکن غلام احمد نے اپنے مرتبہ کلیات سودا کو ضخیم‌تر اور جامع‌تر بنانے کی دھن میں بہت سی منظومات کو بغیر جانچ پڑتال کے شامل کر لیا، چنانچہ نتیجہ یہ نکلا کہ اس میں کئی ایسی چیزیں بھی شامل ہوگئی ہیں جو سودا کی لکھی ہوئی نہیں بلکہ اس کے معاصرین اور تلامذہ کی لکھی ہوئی ہیں ۔ کلیات سودا کے جو ایڈیشن بعد میں شائع ہوئے وہ سب اسی پہلے مطبوعہ کلیات پر مبنی ہیں اسی لیے ان میں بھی وہی غلطیاں اور الحاقی چیزیں موجود ہیں جو پہلے ایڈیشن میں راہ پا گئی تھیں ۔

۱۸۵۳ء کے دھلی ایڈیشن کی ہو بہو نقل نول کشور پریس نے کانپور سے ۱۸۷۲ء میں شائع کی ۔ اس کے بعد نول کشور ہی نے ۱۸۸۸ء میں کلیات سودا کا ایک اور ایڈیشن شائع کیا لیکن اس تیسرے ایڈیشن میں یہ کاٹ چھانٹ کی کہ سودا کی تمام فحش نظمیں اور منظومات کے فحش حصے حذف کر دیے ۔ پھر اسی تیسرے اڈیشن کی ہو بہو نقل ۱۹۱۶ء میں نولکشور پریس کانپور ہی سے شائع ہوئی ۔ اس کے بعد ۱۹۳۲ء میں نولکشور پریس لکھنؤ سے کلیات سودا کا چوتھا ایڈیشن نئی ترتیب و تدوین سے دو

جلدوں میں شائع ھوا - اس کے مرتب و مدون عبدالباری آسی تھے - یہی ایڈیشن ھے جو عام طور پر کتب خانوں میں موجود ھے۔ اس اڈیشن میں بھی فحش کلام محذوف ھے اور نئی ترتیب کچھ تو اصناف کے لحاظ سے ھے اور کچھ نفس مضمون کے لحاظ سے مثلاً مدحیہ کلام الگ حصے میں درج ھے ھجویہ کلام الگ حصے میں غزلیات کا حصہ علیحدہ ھے اور رباعیات کا علیحدہ - اس چوتھے ایڈیشن کے بعد کلیات سودا کا اور کوئی ایڈیشن اب تک شائع نہیں ھؤا ھے - یہ آخری ایڈیشن نہ صرف پیشتر کے ایڈیشنوں کی غلطیوں اور الحاقی کلام کو برقرار رکھتا ھے بلکہ کاتبوں کی بے پروائی اور خود مرتب کلام کی غلط قرأتوں کی وجہ سے اغلاط میں اور اضافہ کرتا ھے اور پیشتر کے ایڈیشنوں سے بھی زیادہ غیر معتبر اور غلطیوں سے پر ھے -

یہ تو کلیات کی ترتیب و اشاعت کا ذکر تھا - اب آئیے انتخابات پر بھی ایک نظر ڈال لیں - ۱۸۱۰ء اور ۱۸۴۷ء میں کلکتے سے شائع شدہ انتخابات کا پہلے ھی ذکر ھو چکا ھے ان کے علاوہ تاریخی نقطۂ نظر سے حسب ذیل انتخابات قابل ذکر ھیں -

۱- بقول شیخ چاند کریم الدین نے ۱۸۵۲ء میں ایک انتخاب مرتب کرکے شائع کیا جس کو شیخ چاند نے ایک جگہ انتخاب کلام سودا کا عنوان دیا ھے اور دوسری جگہ ''منتخب دیوان سودا'' - لیکن دونوں ھی عنوانات کی حامل کریم الدین کی مرتبہ کوئی کتاب انڈیا آفس لائبریری یا برٹش میوزیم میں نہیں ھے۔ قیاس کہتا ھے کہ شیخ چاند کا اشارہ اس انتخاب کی طرف ھے جو کریم الدین نے اپنے تذکرے 'گلدستۂ نازنیناں' میں شامل کیا تھا -

۲- ایک انتخاب آگرے سے ۱۸۶۰ء میں شائع ھؤا جس کے مرتب نصیر خاں اور ڈبلیو اینڈ رسن تھے ، اس کا عنوان تھا ''انتخاب کلیات قصائد وغیرہ مرزا رفیع السودا کا'' -

۳- ایک انتخاب قصائد لکھنؤ سے ۱۸۶۸ء میں شائع ھؤا جس کے مرتب کا نام رامچندر سین تھا ، اس کا عنوان تھا ''منتخب قصائد سودا''

۴- ایک انتخاب شملہ سے ۱۸۷۲ء میں شائع ھوا جس کا عنوان تھا

Selection from the Kulliyat or complete works of Mirza Rafi-oos-Souda being the parts appointed for the High Proficiency Examination in Oordoo—Literally translated by Major Henry Court.

۵۔ ایک انتخاب مثنویات کلکتے سے ۱۸۷۵ء میں شائع ہؤا جسے ایچ ایس جیرٹ نے ترتیب دیا تھا ، اس کا عنوان تھا "منتخب مثنویات سودا"۔

۶۔ ایک انتخاب ۱۸۹۷ء میں مدراس سے شائع ہؤا جسے عمادالملک سید حسن بلگرامی نے ترتیب دیا تھا ۔ اس کا عنوان تھا "مختار اشعار دیوان مرزا رفیع سودا"۔

۷۔ ایک انتخاب ۱۹۲۷ء میں دھلی سے شائع ہؤا جسے ثاقب کانپوری نے مرتب کیا تھا اس کا عنوان تھا "انتخاب سودا"۔

۸۔ ایک انتخاب ۱۹۲۷ء میں الہ آباد سے شائع ہوا جسے ایس ایم ایچ عالی نےمرتب کیا تھا۔ اس کا عنوان تھا "انتخاب کلیات سودا"۔

۹۔ ایک انتخاب ۱۹۵۷ء میں لاهور سے شائع ہؤا، جس کو ڈاکٹر وحید قریشی نے بعنوان انتخاب دیوان سودا" مرتب کیا تھا۔

۱۰۔ ایک انتخاب بعنوان "کلام سودا، علی گڑھ سے ۱۹۶۴ء میں شائع ہؤا جس کو ڈاکٹر خورشید الاسلام نے مرتب کیا تھا۔

ان سب انتخابات کے مطبوعہ نسخے لندن کی لائبریری میں موجود ھیں۔ آخر الذکر چار تو پاکستان کے کتب خانوں میں بھی عام طور پر دستیاب ھیں لیکن اول الذکر چھ اور کلکتے سے شائع شدہ ابتدائی دور انتخابات پاکستان کے کتب خانوں میں شاید ھی کہیں ھوں۔ جس طرح سودا کے کلیات کےمختلف ایڈیشن ھر قسم کی تحریف، تصنیف اور اغلاط اور الحاقی کلام سے پر ھیں اس طرح انتخابات بھی ھیں کیوں کہ یہ مطبوعہ کلیات ھی سے کیے گئے ھیں ۔ البتہ ڈاکٹر خورشید الاسلام کا انتخاب بیشتر اس عیب سے پاک ھے کیوں کہ انہوں نے سودا کے دیوان کے اس مخطوطے کو سامنے رکھا ھے جو انڈیا آفس لائبریری میں محفوظ ھے اور جسے سودا نے خود مسٹر رچرڈ جالنسن ایسٹ انڈیا کمپنی کے ھیڈ اسسٹنٹ متعینہ لکھنؤ کے لیے ۱۷۸۱ء میں کتابت کروایا تھا اور تحفے کے طور پر پیش کروایا تھا ۔ لیکن ڈاکٹر خورشید الاسلام کے انتخاب میں بھی بعض غلطیاں اور کچھ مشکوک کلام راہ پا گیا ھے کیوں کہ انہوں نے

سلام و مراثی کا انتخاب مطبوعہ کلیات ہی سے کیا ہے ۔ سودا کے ایسے کلیات اور ایسے انتخاب کی اشاعت ابھی تک عمل میں نہیں آئی ہے، جو مستند و معتبر ہو یعنی تحریفوں، تصحیفوں، غلط قرأتوں اور دوسری اغلاط سے بھی پاک ہو اور الحاقی کلام کا حامل بھی نہ ہو۔

۱- مجموعہ نغز جلد اول صفحہ ۳۰ -
۲- فہرست مخطوطات ہندی (انگریزی میں) صفحہ ۷۷ -
۳- سودا صفحہ ۱۰۲ -
۴- دیکھیے محمد عتیق صدیقی گلکرسٹ اور اس کا عہد صفحہ ۱۹۷ -
۵- صفحہ ۱۱۰ - ۱۰۶ -
۶- دیکھیے ایچ ایس جیرٹ کا پیش لفظ بر "مثنویات آف مرزا رفیع السودا" (انگریزی) -
۷- سودا صفحہ ۱۱۴ - ۳۹۷ -

ڈاکٹر فرمان فتحپوری، کراچی یونیورسٹی

اردو ادب اور علاقائی زبانیں

اردو اپنے نظامِ صوتیات اور ذخیرۂ الفاظ کے لحاظ سے ایک بین الاقوامی مزاج کی زبان ہے۔ اس میں عربی، فارسی، ترکی، انگریزی اور مقامی بولیوں ہی کے الفاظ نہیں دنیا کی بیشتر زبانوں کے الفاظ کم و بیش شامل ہیں۔ لیکن آوازوں کے اختلاط اور الفاظ کے ارتباط کا یہ مفہوم ہرگز نہیں کہ اردو، اپنی ساخت اور مزاج میں کسی خاص زبان کی تابع یا مقلد ہے۔ اس نے خام مواد یعنی گارا چونا اصوات و الفاظ کی شکل میں یقیناً ادھر ادھر سے لیا ہے لیکن اس کی تعمیر مخصوص تاریخی حالات کے تحت اپنے طور پر طبعی انداز میں ہوئی ہے۔ چنانچہ وہ اپنے رنگ روپ، رعنائی و صناعی، روز مرہ، محاورہ، طرز ادا اور الفاظ کے ایجاد و استعمال کے لحاظ سے اپنا منفرد وجود رکھتی ہے۔ حروف تہجی سے لے کر الفاظ کی ساخت، جملوں کی بناوٹ، تذکیر و تانیث کے قاعدے، واحد جمع کے اصول، صحت تلفظ اور الفاظ کی ساخت، جملوں کے استعمال تک سب میں اس کا اپنا مخصوص معیار و انداز ہے۔ اس لیے اردو کو کسی خاص زبان کے آئینے میں دیکھنا مناسب نہ ہوگا بلکہ ہر لفظ کے تلفظ، معنی اور استعمال کی صحت کے سلسلے میں اس کے اصل مآخذ کے بجائے اردو ہی کے لغت اور اردو ہی کے مستند ادیبوں اور شاعروں کی تحریروں، سے رجوع کرنا مفید ہوگا۔

انشا اللہ خان نے ''دریائے لطافت'' میں اب سے تقریباً دو سو سال پہلے اردو کی صحت کا یہی معیار قائم کیا تھا۔ ان کے خیال میں

''جو لفظ اردو میں مشہور و مستعمل ہو گیا خواہ عربی ہو یا فارسی، ترکی ہو یا سریانی، پنجابی ہو یا پوربی، اپنے اصل کی رو سے غلط ہو

یا صحیح، وہ لفظ بہرحال اردو ہے۔ اگر اصل کے موافق مستعمل ہو تو صحیح اور اگر اصل کے خلاف ہو تو بھی صحیح۔ اس کا غلط و صحیح ہونا اردو کے استعمال پر منحصر ہے، اس لیے کہ جو لفظ اردو کے مزاج کے موافق نہیں، غلط ہے، خواہ اصل کے لحاظ سے درست ہی کیوں نہ ہو، اور جو چیز اردو کے مزاج کے موافق ہے وہ صحیح ہے، خواہ اصل کے لحاظ سے غلط کیوں نہ ہو"۔

اس اصول سے صاف ظاہر ہے کہ انشا اللہ خان نے اردو کے مزاج کے تعین کے سلسلے میں جو اہمیت مقامی آب و رنگ، مقامی تمدن، مقامی مؤثرات اور مقامی بولیوں کو دی ہے وہ دوسری زبانوں کو نہیں دی۔ ان کے نزدیک اگرچہ اردو نے باہر کی زبانوں کا گہرا اثر قبول کیا ہے۔ خاص طور پر علمی و ادبی کاموں کے سلسلے میں اس نے الفاظ کا زیادہ ذخیرہ عربی و فارسی ہی سے لیا ہے۔ لیکن بہ حیثیت مجموعی اس کا رنگ روپ اور خمیر و مزاج مقامی ہی رہا ہے اور اس مقامیت نے اسے عربی و فارسی سے الگ اپنی اپنی انفرادیت قائم کرنے میں مدد دی ہے۔ اس انفرادیت میں جتنا ہاتھ مقامی اور علاقائی زبانوں کا ہے اتنا باہر کی زبانوں کا نہیں ہے بظاہر یہ بات عجیب سی معلوم ہوتی ہے لیکن حقیقت یہی ہے۔

عربی و فارسی اور اردو کے علمائے زبان نے ذخیرہ الفاظ کو بلحاظ قواعد تین خاص گروہوں میں تقسیم کیا ہے۔

۱۔ اسم (Noun)

۲۔ فعل (Verb)

۳۔ حرف (Preposition)

ان میں صرف اسم کا ذخیرہ ایسا ہے جس میں مقامی زبانوں کے الفاظ کے ساتھ ساتھ عربی، فارسی، ترکی اور دوسری زبانوں کے الفاظ بھی بکثرت شامل ہیں۔ لیکن "فعل" جسے آریائی زبانوں میں بنیادی حیثیت حاصل ہوتی ہے اور جس کے بغیر بامعنی فقرہ وجود میں نہیں آ سکتا اس کی نوعیت اسم کے ذخیرے سے بہت مختلف ہے۔ اردو کے سارے افعال اور ان کے مصادر مثلاً پڑھنا لکھنا، سونا جاگنا، اٹھنا بیٹھنا اور کھانا پینا وغیرہ یکسر

مقامی ھیں۔ یہی کیفیت "حرف" یا پری پوزیشن (Preposition) کی ھے۔ اردو میں عام طور پر استعمال ھونے والے سارے حروف جار مثلاً، نے، کو، سے، میں، تک، ساتھ وغیرہ بیرونی نہیں مقامی زبانوں سے تعلق رکھتے ھیں ۔ اردو میں فعل اور حروف کی یہ مقامیت ظاھر کرتی ھے کہ اردو کا حقیقی اور اساسی تعلق باھر کی زبانوں سے نہیں علاقائی زبانوں سے ھے۔ یہ تعلق آج کا نہیں صدیوں پرانا ھے۔ اس کی داغ بیل برصغیر میں مسلمانوں کی آمد ھی کے وقت بلکہ بعض کے نزدیک اس سے بھی پہلے پڑ گئی تھی۔

اب یہ خیال فرسودہ ھوچکا ھے کہ اردو کسی خاص جگہ، کسی خاص وقت میں، کسی خاص گروہ کے ھاتھوں پیدا ھوئی۔ زبان کی پیدائش کا مسئلہ افراد کی پیدائش سے بہت مختلف ھوتا ھے۔ زبان، فطرت کے تقاضوں کے مطابق انجانے طور پر بنتی رھتی ھے اور صدیوں کے بعد جب وہ کسی خاص شکل میں نمودار ھونے لگتی ھے اس وقت ھمیں اس کے وجود کا احساس ھوتا ھے ۔ اس لئے کسی زبان یا اردو کے متعلق یہ حکم لگانا کہ وہ فلاں وقت فلاں جگہ یا فلاں شہر میں پیدا ھوئی ، ایک بے معنی سی بات ھے ۔ علمی انداز پر اردو کی پیدائش کے خواہ کتنے ھی نظریے کیوں نہ قائم کر لیے جائیں لیکن اردو کے نامور محقق حافظ محمود شیرانی کے لفظوں میں اتنی بات تو سبھی تسلیم کرتے ھیں کہ

"یہ زبان ھندوستان میں مسلمانوں کے داخلے اور توطن گزینی کا نتیجہ ھے"

اردو اور علاقائی زبانوں کے تعلق کو استوار کرنے کی کئی صورتیں ھوسکتی ھیں۔ ایک صورت یہ ھے کہ اردو کے جو ادیب و شاعر علاقائی زبانیں نہیں جانتے وہ ان کی طرف بطور خاص توجہ کریں ۔ اگر اصل زبانوں سے استفادہ کرنے میں دشواری ھو تو اردو یا انگریزی ترجموں کی معرفت علاقائی زبانوں کے ثقافتی اور ادبی ذخائر سے فائدہ اٹھائیں۔ جو لوگ اردو کے ساتھ ساتھ پنجابی، سندھی، بلوچی یا پشتو وغیرہ سے بھی واقف ھیں وہ اخذ و ترجمہ کے ذریعے اردو کو علاقائی زبانوں سے متعارف کرائیں ۔ اس

سے قومی اور علاقائی دونوں زبانوں کو فائدہ پہنچے گا اور اردو کا دامن وسیع ہوگا۔ اس میں موضوع و مواد کی رنگا رنگی آئے گی، مقامی ثقافت کی نمائیندگی و ترجمانی کی صلاحیت پیدا ہوگی اور قومی زبان کی حیثیت سے وہ علاقائی زبانوں کے درمیان رابطے کا ذریعہ بن جائے گی۔ مختلف علاقوں کے لوگ جب اپنی علاقائی بولیوں کے اثرات و نفوذ قومی زبان میں دیکھیں گے تو وہ فطرتاً اس کی طرف لپکیں گے۔ اس طرز عمل سے علاقائی زبانیں بھی گھاٹے میں نہ رہیں گی۔ پنجابی، سندھی، بلوچی، پشتو اور سرائیکی وغیرہ ابھی تک اپنے اپنے علاقوں تک محدود ہیں۔ نتیجۃً ان زبانوں کے ادیبوں اور شاعروں کا حلقۂ اثر اتنا وسیع نہیں جتنا ہونا چاہیئے۔ لیکن اگر علاقائی ادب کے کار آمد پہلوؤں کو اردو میں اور اردو کے مفید عناصر کو علاقائی زبانوں میں منتقل کرنے کی شعوری کوشش کی جائے تو پنجابی سندھی، بلوچی اور پشتو کے ادیبوں کا حلقۂ اثر خاصا وسیع ہو سکتا ہے۔

اس میں شبہ نہیں کہ اردو میں علاقائی زبانوں کے بکثرت الفاظ شامل ہیں اور علاقائی زبانوں کے برعکس اردو کا حلقۂ اثر بھی ملک گیر ہے لیکن سوال یہ ہے کہ اردو کو قومی زبان کی حیثیت سے مقبول عام اور اس کے ادب کو پاکستانی ثقافت و قومیت کا متحمل بنانے کے لیے اس میں علاقائی زبان و ادب کی اہم روایات و اقدار کو کیوں نہ داخل کیا جائے۔ مختلف علاقوں کے تاریخی مقامات، تہذیبی مراکز، دریا پہاڑ، پھول پھل، باغ و راغ، ندی اور جھیل، قصے کہانیاں، رسم و رواج، پیر فقیر اور صوفی و شاعر، سب کو بطور تلمیح و مثال اردو نثر و نظم میں کیوں جگہ نہ دی جائے۔ جب عربی و فارسی سے گل و بلبل، لیلیٰ مجنوں، یوسف و زلیخا، شیریں فرہاد، رستم و سہراب، وامق و عذرا، محمود و ایاز، سکندر و دارا، دجلہ و فرات، اور اصفہان و شیراز کے طرز کی ہزاروں تلمیحیں، ہزاروں اصطلاحات اور سینکڑوں روایتیں، اردو میں جگہ پا سکتی ہیں اور سنسکرت و ہندی سے چانڈ چکور، راون و سیتا، رام و لچھمن، بھیم اور ارجن، گنگا و جمنا، تریبنی، پاربتی، شکنتلا، کرشن کنھیا کنھیا گوکل، گوپی، کام روپ، گوبر گنیش، رام لیلا اور ہولی دیوالی وغیرہ جیسے الفاظ و تراکیب اپنائی جا سکتی ہیں تو پھر ہیر رانجھا،

سسی پنوں، لیلا چنیسر ، عمر ماروی ، مرزا صاحباں ، شالیمار ، راوی چناب ، ستلج اور سندھ ، شاھی مسجد، شہید مینار، بھولو، اسلم ، سچل سرمست ، شاہ لطیف، بھلے شاہ ، رحمن بابا ، خوش حال خان خٹک ، داتا کی نگری، زیارت اور ھنا ۔ خیبر اور سوات وغیرہ کو اردو میں بطور تلمیح یا اصطلاح رواج کیوں نہ دیا جائے ۔ جب تک ایسا نہ کیا جائے گا اردو نہ تو صحیح معنوں میں پاکستانی تہذیب اور قومیت کی ترجمانی کا حق ادا کر سکے گی اور نہ اس کے ادب کو پاکستانی ادب کی حیثیت سے الگ پہچانا جا سکے گا ۔ گہرا مقامی رنگ ھی اسے دوسرے ملکوں کے ادب کے مضر اثرات سے محفوظ کر سکتا ھے ۔

ایک مفید کام یہ بھی ھو سکتا ھے کہ علاقائی زبانوں کی ساری مقبول عام کہانیاں خواہ نثر میں ھوں یا نظم میں اردو میں منتقل کی جائیں اور ان کہانیوں کے ممتاز کرداروں کو اردو زبان و ادب کے رموز و علائم میں داخل کیا جائے ۔ علاقائی زبانوں میں افسانوی ادب کا بڑا قیمتی ذخیرہ ھے۔ اس ذخیرے کے بعض اجزا ، مصحفی و انشاء کے زمانے ھی میں غیر معمولی شہرت پا چکے تھے، تبھی تو انشا اللہ خان نے ھیر رانجھا کی داد اس طور پر دی ھے ۔

سنایا رات کو قصہ جو ھیر رانجھا کا
تو اھل درد کو پنجابیوں نے لوٹ لیا

علاقائی زبانوں میں اس طرح کے اور نہ جانے کتنے منظوم افسانے ھیں جو قابل توجہ ھیں ۔ سسی پنوں کی داستان نہ صرف پاکستان بلکہ پاکستان کے باھر بھی مقبول ھوئی ھے۔ پاکستان کی ساری علاقائی زبانوں میں اسے ایک بار نہیں کئی بار نظم کیا گیا ۔ سندھی زبان میں شاہ عبدالطیف بھٹائی اور پنجابی میں ھاشم شاہ کی بدولت اسے جو قبول عام حاصل ھؤا ھے وہ کسی سے پوشیدہ نہیں ھے ۔ پشتو میں بھی اسے نظم کیا گیا ھے اور متعدد فارسی شعراء نے بھی اسے اپنی توجہ کا مرکز بنایا ھے۔ ھندوستان کے شمالی اور پوربی علاقے بھی اس داستان سے بے خبر نہ تھے ۔ یہ الگ بات ھے کہ اردو کے شعراء نے عربی ، فارسی اور سنسکرت کی کہانیوں کو جس انہماک کے

ساتھ اردو میں منتقل کیا ہے ، وہ انہماک علاقائی زبانوں کے سلسلے میں نظر نہیں آتا ۔ پھر بھی قدیم شاعروں میں سے بعض نے اس طرف توجہ کی ہے۔ مثلاً قلندر بخش جرأت کے شاگرد نواب محبت خان نے اب سے دو سو سال پہلے ۱۱۹۷ھ/۱۷۸۳ء میں سسی پنوں کو "اسرار محبت" کے نام سے مثنوی کی صورت میں نظم کیا تھا ۔ اس مثنوی کا ایک صاف ستھرا مخطوطہ انجمن ترقی اردو کراچی کے کتب خانے میں موجود ہے۔ مثنوی ہر لحاظ سے معیاری ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ اس مثنوی کو مقدمہ اور حواشی کے ساتھ شائع کیا جائے ۔ یہ کام اردو کا ہر ادیب کر سکتا ہے لیکن کیا اچھا ہو کہ وہ لوگ اس طرف رجوع کریں جو علاقائی زبانوں پر بھی پوری دسترس رکھتے ہوں تا کہ وہ یہ بھی بتا سکیں کہ اس اردو مثنوی کا حقیقی مآخذ کیا ہے اور اصل قصے سے اس میں کس حد تک انحراف یا اتباع پایا جاتا ہے ۔

علاقائی زبانوں کے بعض دوسرے پہلوؤں پر بھی اس انداز سے توجہ کرنے کی ضرورت ہے۔ مثلاً ایک اہم پہلو پاکستانی ثقافت کی تشکیل و فروغ کا ہے ۔ یہ پاکستانی ثقافت سندھ ، سرحد ، بلوچستان ، اور پنجاب کی ثقافتوں کے امتزاج و اشتراک ہی سے وجود میں آ سکتی ہے ۔ چوں کہ پاکستان کی ساری علاقائی ثقافتیں اسلامی تہذیب و تمدن اور مسلمان صوفیائے کرام کی آغوش کی پروردہ ہیں، اس لیے وہ فروعات میں ایک دوسرے سے خواہ کتنی ہی مختلف کیوں نہ نظر آئیں لیکن روح کے اعتبار سے ان میں بڑی مماثلت ہے۔ ان مماثل پہلوؤں کو تلاش کر کے انہیں یکجا کرنے اور ان میں ہم‌آہنگی پیدا کرنے کی ضرورت ہے ۔ اس ہم‌آہنگی کے بغیر پاکستانی ثقافت کا تصور خواب و خیال سے آگے نہ بڑھ سکے گا ۔ اس خواب کو شرمندۂ تعبیر کرنے کے لیے علاقائی ثقافتوں کے سب سے قوی عنصر یعنی علاقائی زبانوں کا سہارا لینا ہوگا ۔ اگر زبانوں میں یک رنگی و ہم‌آہنگی کے آثار پیدا ہوگئے تو یہ آثار علاقائی ثقافتوں کو خود بخود ایک خاص رشتے میں پرو دیں گے ۔ یہ کام ادبی اور تعلیمی دونوں سطح پر ہونا چاہیئے ۔ ہماری جامعات میں ایم ۔ اے اردو کے نصاب میں ایک پرچہ "اردو کے تہذیبی و ثقافتی پس منظر" کے عنوان سے ہوتا ہے، اس میں

هندی و فارسی شاعری کی تاریخ اور بعض ملی تحریکات پڑھائی جاتی ہیں۔ کیا اچھا ہو کہ اس پرچے میں علاقائی زبانوں کے ادب و فنون لطیفہ کی تاریخ اور مختلف صوبوں کے بعض بزرگان دین و صوفیائے کرام کی خدمات کا جائزہ بھی شامل کر لیا جائے۔ اس سے بڑا فائدہ یہ ہوگا کہ پاکستان کی نئی نسل اردو کے ساتھ اپنے ملک کے سارے ثقافتی ورثوں سے کم و بیش واقف رہے گی اور پاکستانی ثقافت کا تصور قائم کرنے میں اسے آسانی ہو جائے گی۔

ایک اور پہلو اس سلسلے میں قابل توجہ ہے۔ ہمارے ہاں دخیل الفاظ کے سلسلے میں ابھی تک زیادہ تر صرف عربی و فارسی ہی کو اہمیت دی گئی ہے۔ ہر قسم کی اصطلاحات ہر قسم کے نئے الفاظ اور ہر قسم کے انگریزی الفاظ کے تراجم کے لیے عربی و فارسی ہی کا سہارا لیا جاتا ہے اس رجحان کے نتیجے میں بہت سے ثقیل اور بے ہنگم الفاظ اردو میں داخل ہو رہے ہیں حالانکہ اگر کوشش کی جائے تو ان سے زیادہ سبک و شیریں متبادل الفاظ علاقائی زبانوں میں مل سکتے ہیں۔ مقامی صنعت و حرفت، زراعت و باغبانی، کھیل کود، عدالت و پنچائت، آداب مجلس اور کاروبار وغیرہ کے سلسلے کے ہزاروں الفاظ علاقائی زبانوں میں ہوں گے جنہیں اردو میں اپنا کر انگریزی الفاظ کے تراجم میں مدد لی جا سکتی ہے۔ لیکن اردو والوں نے اس طرف توجہ نہیں کی نتیجہ اردو اور علاقائی زبانوں کا تانا روز بروز مضبوط ہونے کے بجائے کمزور ہوتا چلا گیا۔ اب اس تانے کو استوار کرنے کی سخت ضرورت ہے۔ اس سے قومی زبان کے جثے میں نیا خون دوڑنے لگے گا اور اردو کو ہر صوبے ہر علاقے اور ہر سطح پر رواج دینے میں آسانی ہو جائے گی۔

مجھے اعتراف ہے کہ اردو کے ادیب اور شاعر علاقائی زبانوں کی طرف سے یکسر غافل نہیں رہے۔ انہوں نے حکومت کی مسلسل بے اعتنائیوں کے باوجود علاقائی زبانوں کے تعلق کی نوعیت و اہمیت کو محسوس کیا ہے اور اس سلسلے میں کچھ کام بھی ہوا ہے۔ پنجابی اور اردو کے تعلق پر سب سے اہم کتاب پروفیسر حافظ محمود شیرانی کی "پنجاب میں اردو ہے" یہ پہلی بار ۱۹۲۸ء میں شائع ہوئی اور اب تک اس کے متعدد

اڈیشن نکل چکے ھیں - ۱۹۶۰ء میں کالاسنگھ بیدی نے اردو اور پنجابی کے لسانی رشتے پر تحقیقی کام کر کے دھلی یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی ھے - کراچی یونیورسٹی میں منیر فاروقی صاحب، ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی کی نگرانی میں اس موضوع پر مزید تحقیقی کام کر رھے ھیں۔ ان کا کام تکمیل کو پہنچنے والا ھے۔ پنجابی ادب کے عنوان سے بھی اردو میں بہت کچھ لکھا گیا ھے اور یہ سب اردو اور اھل اردو کے لیے بہت مفید ھے - پنجاب کے ادیب و شاعر چوں کہ پنجابی اور اردو دونوں سے واقف ھیں اور دونوں میں لکھتے ھیں اس لیے ان کی تحریروں سے لاشعوری طور پر دونوں زبانوں کو فائدہ پہنچ رھا ھے -

سندھی اور اردو کے لسانی تعلق پر علامہ سید سلیمان ندوی کے مقالات خاصی شہرت رکھتے ھیں - اردو سندھی کے لسانی روابط پر ڈاکٹر شرف الدین اصلاحی کی تازہ کتاب قابل مطالعہ ھے۔ یہ مرکزی اردو بورڈ لاھور نے شائع کی ھے اور سندھ یونیورسٹی کے اردو شعبہ نے اس کام پر مصنف کو ڈاکٹریٹ کی ڈگری دی ھے - سندھ کے صوفی شعراء میں، شاہ عبداللطیف بھٹائی اور سچل سرمست نے اردو خوان طبقے کو خاص طور پر متأثر کیا ھے۔ ان کی زندگی اور شاعری کے بارے میں سینکڑوں مضامین لکھے گئے ھیں۔ کتابیں بھی مرتب کی گئی ھیں اور اردو کے بعض شعراء نے ان کے افکار و خیالات اور منظومات کا اردو نثر و نظم میں ترجمہ بھی کیا ھے - سندھی زبان کے کئی ایسے شاعر ھیں جو اردو میں بھی خوب کہتے ھیں ، اور ان کی کوششوں سے اردو سندھی دونوں ایک دوسرے سے قریب آ رھی ھیں -

اردو سے سرحد کی زبان پشتو کا رشتہ بھی بہت قدیم ھے - رام پور ٹونک اور بندیل کھنڈ کے دور دراز علاقوں تک کی اردو پر پشتو کا اثر پایا جاتا ھے۔ پشتو نے اردو سے اور اردو نے پشتو سے بہت کچھ لیا ھے۔ اس لسانی لین دین پر مولانا امتیاز علی خان عرشی کا مقالہ ''پشتو اور اردو'' خاص طور پر پڑھنے کے لائق ھے - سرحد کے ادیب و شاعر بھی عموماً پشتو اور اردو دونوں کے ادب کو اپنائے ھوئے ھیں - ان میں سب سے نمایاں نام

فارغ بخاری ، رضا ہمدانی اور خاطر غزنوی کے ہیں ان کی تحریروں کی بدولت اردو اور پشتو کو ایک دوسرے سے فائدہ اٹھانے کا خوب موقع مل رہا ہے ۔ پشتو ادب کے متعلق اردو میں مضامین کی صورت میں بہت کچھ لکھا گیا ہے ''پشتو افسانے'' ''پشتو لوک گیت'' ''پشتو ادب'' اور ''خوشی حال خان خٹک'' کے نام سے کتابیں بھی منظر عام پر آئی ہیں ۔ ان کتابوں کی معرفت اردو خوان طبقے کو پشتو ادب سے آگاہی اور شناسائی میں خاصی سہولت ہو گئی ہے ۔

بلوچی اور سرائیکی کے رشتے بھی اردو کے ساتھ بہت پرانے ہیں ۔ بلوچی اور اردو میں ہزاروں الفاظ مشترک ہیں اور فارسی کے زیر اثر دونوں میں ایک طرح کی ہم آہنگی نظر آتی ہے ۔ بلوچی کے ادیبوں میں بھی کئی ایسے ہیں جو اردو بلوچی دونوں پر قدرت رکھتے ہیں ، ان کی کوششیں دونوں زبانوں کے حق میں مفید ہیں ۔ اردو بلوچی کے تعلق اور بلوچستان میں اردو کی خدمات کے سلسلے میں ڈاکٹر انعام الحق کوثر کی کتاب خاص طور پر قابل ذکر ہے ۔

اردو کو مختلف علاقائی زبانوں سے بہ یک وقت ہم آہنگ کرنے اور اسے پاکستان کے مختلف صوبوں میں مقبول بنانے کا کام بھی شروع ہوا ہے ۔ اس سلسلے کا سب سے اہم اور قابل ذکر کام ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی کا ہے ۔ ان کی کتاب ''بنیادی اردو'' جسے اردو کے بنیادی الفاظ کا لغت کہنا چاہیئے اردو بورڈ لاہور سے شائع ہو چکی ہے ۔ سندھی، پنجابی اور دوسری علاقائی زبانوں میں بھی اس کے تراجم طبع ہو کر منظر عام پر آ چکے ہیں ۔ لسانی مطالعات پر مبنی ڈاکٹر سہیل بخاری کے بعض مضامین اور ان کی نئی کتاب ''اردو کا روپ'' بھی اس سلسلے میں بہت کار آمد ہیں ۔

غرض کہ اردو اور علاقائی زبانوں کے رشتوں پر کچھ نہ کچھ کام ہوا ہے اور ہو رہا ہے لیکن اب جب کہ پاکستان کے مختلف صوبوں میں اردو کو سرکاری اور دفتری زبان کی حیثیت سے اپنایا جا رہا ہے کام کی رفتار کو تیز تر کرنے کی ضرورت ہے ۔ اب ہر علاقے کے ادیبوں اور شاعروں کو ضمناً نہیں خصوصاً اس طرف متوجہ ہونا چاہیئے ۔ زبان کسی خاص علاقے

یا طبقے کی میراث نہیں ہوتی جو لوگ اور جہاں کے لوگ اسے بولتے اور برتتے ہیں ، وہی اس زبان کے حقیقی وارث و مالک ہؤا کرتے ہیں ۔ اردو کسی وقت لکھنؤ اور دلی کی زبان رہی ہوگی لیکن ہمیں اس حقیقت کو دل سے تسلیم کر لینا چاہیئے کہ وہ اب لکھنؤ یا دلی کی زبان نہیں رہی اب وہ لاہور، کراچی ، کوئٹہ ، حیدرآباد ، پشاور، پنڈی اورسرگودھا وغیرہ کی زبان ہے۔ یہیں کے لوگوں نے اسے اپنایا ہے۔ یہیں کے لوگ اسے بولتے اور برتتے ہیں۔ یہیں کے لوگوں کے ہاتھوں وہ آگے بڑھے گی اور یہیں کے لوگوں کے زیر اثر اس پر ایک نیا رنگ چڑھے گا۔ یہ رنگ علاقائی زبانوں اور علاقائی تہذیبوں کا ہوگا ، یہی رنگ پختہ ہوکر اردوئے معلی بنے گا اور اردو کا مستند اسلوب کہلائے گا۔

(ڈاکٹر) فرمان فتح پوری
استاد شعبۂ اردو،
کراچی یونیورسٹی، کراچی

...ر غزنوی، صدر شعبۂ زبان و ادبیات چین پشاور یونیورسٹی

چینی اور برصغیر پاکستان کی زبانوں میں مماثلت

اورینٹل کالج کے جشن صد سالہ کے افتتاح کے موقعے پر پنجاب کی صوبائی اسمبلی کے وزیر خزانہ جناب حنیف رامے نے چینی زبان کی تدریس کی اہمیت پر زور دیا۔ حقیقت یہ ہے کہ انہوں نے پنجاب یونیورسٹی کو دنیا کی اس عظیم زبان کی طرف متوجہ کر کے سیاسی ہی نہیں بلکہ علمی نقطۂ نظر سے بھی وقت کی ایک اہم ترین ضرورت کا احساس دلایا ہے۔

چینی زبان کے متعلق عام طور پر لوگوں میں یہ بات مشہور ہے کہ یہ دنیا کی مشکل ترین زبان ہے۔ لیکن حقیقت اس کے برعکس ہے یہ دنیا کی دلچسپ ترین زبان ہے۔ اهل پاکستان کے لیے اس زبان میں دلچسپی لینا اس لیے بھی لازمی ہو جاتا ہے کہ یہ بہت حد تک پاکستان کی مختلف زبانوں یعنی اردو۔ پنجابی۔ سرائیکی اور پشتو سے قریب تر ہے۔

یہاں یہ بات تو یقیناً نہیں کہی جا سکتی کہ برصغیر کے اس حصے کی زبانیں چین پہنچ کر مختلف پہلوؤں سے چینی زبان پر اثر انداز ہوئیں۔ کیونکہ چینی زبان اور اس کے رسم الخط کی قدامت برصغیر کی زبانوں کے مقابلے میں مسلم اور واضح ہے۔ البتہ ان زبانوں پر ایک دوسرے کے اثرات کا بنیادی سبب خاصا پیچیدہ اور تحقیق طلب ہے۔ اور مؤرخوں اور ماہرین لسانیان کی توجہ کا محتاج ہے۔

آج کی اس محفل میں چینی زبان اور برصغیر کی ان زبانوں کی مماثلت کے بعض پہلوؤں کا ایک سرسری جائزہ پیش کیا جاتا ہے۔ لیکن اس سرسری جائزے سے پیشتر مناسب ہوگا کہ آپ کو چینی زبان کی بعض بنیادی باتوں سے متعارف کرا دیا جائے۔

چینی زبان کا رسم الخط بلا شبہ ایک مشکل چیز ہے۔ میں آج تک نہیں بھول سکا کہ۔ چین پہنچنے کے بعد جب میں پہلی مرتبہ پیکنگ کے بازاروں میں گھوم رہا تھا تو مختلف اداروں دفتروں اور دکانوں کی پیشانیوں

ہر چینی زبان کے حروف مجھے یوں لگ رہے تھے جیسے پنجرے لٹکے ہوئے ہوں۔ ان پنجروں میں بند پرندوں کی زبان ہم نو واردوں کے لیے حیرت اور گھبراہٹ کا سبب بنی ہوئی تھی۔ میں اور میرے ساتھی سوچ رہے تھے کہ ان پرندوں کی بولی تک رسائی کیونکر ممکن ہوگی۔ لیکن جب ہم چین سے واپس لوٹ رہے تھے تو اداروں، دفتروں اور دکانوں کی پیشانیوں پر چینی حروف کے پنجروں کے پرندے ماؤزے تنگ کے خیالات اور ثقافتی انقلاب کے نغمے الاپ رہے تھے اور ہم ان کی زبان سمجھنے کے قابل ہو چکے تھے۔ میں نے یہاں استعارۃً چینی رسم الخط کو پرندے اور چینی بول چال کو نغمے کہا ہے لیکن سچ پوچھیے تو یہ استعارہ کم اور حقیقت زیادہ ہے۔ چینی رسم الخط کی اساس مصوری پر استوار ہے اور چینی بول چال میں موسیقی کا بڑا حصہ ہے۔ فنون لطیفہ کی ان ہی خصوصیات کے سبب دنیا کی یہ مشکل ترین زبان دلچسپ ترین زبان بن گئی ہے اور اس زبان پر تحقیق کرنے والوں کو اپنے کام میں بے حد لذت محسوس ہوتی ہے۔ فنون لطیفہ کے اس سدا بہار پہلو نے چینی زبان کو اپنی تمام تر روایات کے ساتھ زندہ و ارتقاء پذیر رکھا ہے ورنہ اس کے ساتھ کی دوسری قدیم اور کلاسیکی زبانیں یعنی سنسکرت وغیرہ اپنی موت آپ مر چکی ہیں۔

چینی تحریر میں حروف تہجی نہیں بلکہ ہر لفظ کے لیے کوئی نہ کوئی شکل یا تصویر بنائی جاتی ہے۔ ابتداء میں یہ اشکال ہو بہو تصویریں ہوتی تھیں لیکن وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ ان تصویروں میں اختصار اور آسانی پیدا کی جاتی رہی اور سہولت کی خاطر لکیروں سٹروکس (Strokes) کی تعداد میں کمی کی جاتی رہی پہلے چینی الفاظ اوپر سے نیچے لکھے جاتے تھے اور ان الفاظ پر مبنی کھڑی سطریں اردو، پشتو، پنجابی اور سندھی کی طرح دائیں سے بائیں چلتی تھیں۔ لیکن موجودہ دور میں رومن رسم الخط کی ہر دلعزیزی نے چینی تحریر کو بھی بائیں سے دائیں سیدھی سطروں میں تبدیل کر دیا ہے۔ الفاظ کی ارتقائی منازل کے چند نمونے ملاحظہ ہوں۔

یوں علامتوں کے ساتھ دوسری علامتوں کے امتزاج سے مزید مطالب پیدا کئے گئے۔ مثلاً سورج اور چاند کی علامتوں کو یکجا لکھنے سے منگ

یعنی چمکدار یا روشن کے معنی لئے گئے آدمی اور درخت کے امتزاج سے شیو یعنی آدمی کو درخت کے سائے میں دکھا کر آرام کا مفہوم پیدا کیا گیا۔ دو درختوں سے مراد جنگل اور تین آدمیوں کے اشارے سے ھجوم کے معنی لئے گئے۔ درخت کے پیچھے سورج سے مشرق، گھونسلے میں غروب آفتاب کے وقت پرندے سے مغرب کا مفہوم پیدا کیا گیا، یوں تحریر میں وسعت پیدا کی گئی۔

چینی زبان بہت قدیم زبان ہے۔ چینی حروف کی تاریخ تین ہزار دو سو سال پرانی ہے۔ اور تحقیقات کے مطابق سلطنت شانگ کے دور (۱۱۲۲ تا ۱۴۰۱ ق م) میں تحریر ھڈیوں پر کندہ ہونے لگی۔ چو چھاؤ دور یعنی گیارھویں صدی سے ۲۲ ق م کے کانسی کے برتنوں پر بھی تحریریں دستیاب ہوئی ھیں۔ چینی رسم الخط کی تین قسمیں ھیں۔ پہلی قسم مفرد الفاظ پر مشتمل ہے جنہیں بنیادی الفاظ کہا جا سکتا ہے۔ دوسری قسم وہ ہے جس میں دو تصویروں کو ملا کر ایک خیال کا اظہار کیا جاتا ہے۔ جیسے روشنی کے لئے چاند اور سورج کا یکجا کر دینا۔ تیسری قسم وہ ہے جس میں دو علامتیں ہوتی ھیں ان میں سے ایک علامت سے لفظ کے تلفظ کا پتہ چلتا ہے اسے بنیادی نشان کہا جاتا ہے اور دوسری علامت معنی کی مظہر ہوتی ہے۔

مثلاً یانگ کا مطلب سمندر ہے اس کا تلفظ یانگ دوسری علامت سے ظاھر ہوتا ہے جس کے معنی بھیڑ یا بکری کے ھیں۔ ابتدا میں یہ لفظ یوں لکھا جاتا تھا جو بکری کے سر کے مشابہ ہے۔ بائیں جانب کا بنیادی نشان یا Radical کا مطلب پانی ہے جو شروع میں یوں لکھا جاتا تھا۔ آواز اور معنی کی ان علامتوں کے امتزاج نے سمندر کے معنی پیدا کئے۔ پانی کے بنیادی نشان سے اور کئی ایسے الفاظ بنتے ھیں جن میں پانی کا کسی نہ کسی طرح دخل ہے۔ مثلاً

خو یعنی جھیل۔ خہ یعنی دریا۔ شی دھونا۔ چیانگ یعنی ندی۔ لے یعنی آنسو۔

جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے چینی زبان میں حروف تہجی نہیں بلکہ تصویری اشارے یا علامتیں ہیں ۔ کھن شتی لغت کے مطابق مترادفات کو چھوڑ کر ان علامتوں کی تعداد ۴۷۰۲۱ ہے ۔ بعض محققین نے حروف کی تعداد ستر ہزار بتائی ہے اور بعض نے ۵۰ ہزار۔ موجودہ دور میں پانچ ہزار حروف عام استعمال میں آتے ہیں ۔ لیکن حالیہ اعداد و شمار کے مطابق اب جو شخص صرف ۱۵۰۶ الفاظ جانتا ہے وہ دوسرے معنوں میں ۹۰ فیصد روزمرہ کے استعمال کے الفاظ پر قدرت رکھتا ہے ۔

چین نے ۱۹۴۹ء میں آزاد ہونے کے بعد عوام کو زیادہ سے زیادہ تعلیم یافتہ بنانے کی جو مہم شروع کی اس میں چینی رسم الخط کی طرف توجہ ایک خصوصی کام تھا ۔ جنوری ۱۹۵۶ء میں عوامی جمہوریہ چین کی اسٹیٹ کونسل نے چینی رسم الخط کو آسان بنانے کا ایک خاکہ مرتب کیا جس کے تحت حروف میں خطوط کی تعداد کم کر دی گئی ۔ اس سے پہلے ایک چینی حرف لکھنے کے لئے ایک سے پینتیس تک لکیریں کھینچی جاتی تھیں ۔ نیز بعض حروف کی دو یا اس سے زیادہ شکلیں بھی ہوتی تھیں ۔ ان میں سے ایک کو منتخب کیا گیا ۔ چینی عوام نے اس فیصلے کا خیر مقدم کیا اور اسے ناخواندگی کے خلاف بہت بڑا جہاد تسلیم کیا گیا ۔ ۱۱ فروری ۱۹۵۸ء میں پہلی عوامی کانگریس کی پانچویں نشست میں چینی حروف کی آوازوں کو حروف تہجی کے تحت لانے کی سکیم منظور ہو گئی ۔ اس کے لئے لاطینی حروف تہجی کو منتخب کیا گیا ۔ لاطینی حروف تہجی کے متعارف کرانے سے چینی زبان کی تعلیم کے حصول میں عمومی طور پر چینیوں اور خصوصی طور پر غیر ملکیوں کو بڑی مدد ملی ۔ پھر بھی بعض الفاظ کا تلفظ یکساں ہونے کے سبب ان کی پہچان کا واحد طریقہ چینی حروف ہی ہیں ۔ اس کا اندازہ ایک لفظ ”شہ“ سے لگایا جا سکتا ہے ۔ جو تلفظ کی یکسانیت کے باوجود مختلف معنوں کا حامل ہے اور اس کے لیے مختلف شکلیں بنائی گئی ہیں ۔ اس ایک لفظ کے مختلف معنی یہ ہیں ۔

دنیا [illegible] [illegible] شہر 市 کوشش [illegible] کام [illegible] ہے ۔ ہونا ۔ ہاں ۔ 是 وغیرہ ۔

چینی زبان کی آوازوں کی ادائیگی مشکل نہیں یہ ایک رکنی یا mono-syllabic زبان ہے اور اس لئے الفاظ کے ارکان کی ترکیب بڑی باقاعدہ ہے ۔ اکثر ارکان کی ترکیب ایک ابتدائی حرف صحیح اور ایک ثانوی حرف صحیح سے ہوتی ہے ۔ ثانوی حرف صحیح اکثر حرف علت ہوتا ہے ۔ بعض ثانوی حروف صحیح بذات خود یک رکنی تلفظ رکھتے ہیں ۔ ابتدائی حروف صحیح کی تعداد ۲۳ ہے اور ثانوی حروف یا حروف علت پینتیس ہیں ۔ کل تقریباً چار سو ارکان یا تلفظ بنتے ہیں ۔ ان میں اکثر ارکان کی چار آوازیں ہیں ۔

اور یہی آوازیں ہیں جن کی بنا پر میں نے ابتدا میں چینی زبان کو غنائی زبان کہا ہے ۔ یہ آوازیں ہمارے موسیقی کے پانچ ابتدائی سروں یعنی کھرج سے پنچم تک کے تحت آتی ہیں ۔

پہلی آواز سیدھی پنچم ہے ۔ دوسری گندھار سے پنچم تک اٹھتی ہوئی ۔ تیسری رکھب سے کھرج کو چھوتی ہوئی مدھم تک جھولا بنا کر چڑھتی ہوئی اور چوتھی آواز پنچم سے کھرج سر تک تیزی سے گرتی ہوئی ۔ یہ ایک دلچسپ بات ہے کہ چینی زبان کی انہی آوازوں یا Tones سے ایک ہی تلفظ والے الفاظ کے معنی بدل جاتے ہیں ۔ حالانکہ دوسری زبانوں میں Tone کے بدلنے سے موڈ کا اظہار ہوتا ہے ۔

چینی زبان کے اس تعارف کے پیش نظر اردو ، پنجابی ، سرائیکی اور پشتو کی مماثلت دیکھی جائے تو پہلی اور بنیادی چیز فقروں کا دروبست ہے اور صرفی نحوی قاعدے ہیں ۔ اس ضمن میں زیادہ تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں ۔ بس اس قدر کہنا کافی ہے کہ انگریزی یا دوسری یورپی زبانوں کے برعکس چینی اور برصغیر کی زبانوں کے صرفی و نحوی قاعدوں میں حد درجہ یکسانیت ہے ۔

لیکن جو بات حیرت انگیز طور پر چینی اور پنجابی زبان میں یکساں ہے اور جس کی طرف اہل پنجاب کو خصوصی توجہ دینی چاہیئے اور پنجاب کی صوتیات کو چینی زبان کی طرح سائینٹیفک طریقے سے برتنا چاہئے وہ دونوں زبانوں کی صوتی ہم آہنگی ہے ۔

تقریباً ہر پنجابی بڑے فخر سے یہ کہتا ہے کہ پنجابی زبان کے لفظ ''ڈھڈ'' کو صحیح طور پر ادا کرنا کسی غیر پنجابی کے بس کی بات نہیں ۔ یہ بت چین کے ضمن میں باطل ٹھہرتی ہے ۔ چینی صوتیات کی تیسری آواز یا ٹون کے تحت ایک چینی لفظ ''ڈھڈ'' کو بڑی آسانی سے ادا کر سکتا ہے ۔ اس کا سبب یہ ہے کہ چینی زبان کی طرح پنجابی زبان میں بھی موسیقیت کا عنصر بہت زیادہ ہے اور ابھی ابھی اس کا تذکرہ علامہ اقبال کے حوالے سے جناب پروفیسر حمید احمد خاں نے کیا ۔ میں ان صوتیات کو بعض پنجابی الفاظ کے حوالے سے واضح کرتا ہوں ۔

چینی زبان کی چار آوازیں یہ ہے ۔

۱۔ — پہلی ٹون چینی ای بمعنی ایک پنجابی جی ایک دعائیہ جوابی لفظ ہے

۲۔ ´ دوسری ٹون چینی بھائی بمعنی سفید پنجابی بھائی یعنی بھائی

۳۔ ˇ تیسری ٹون چینی ما بمعنی گھوڑا پنجابی ڈھڈ ۔ دب ۔ نٹھ او —بمعنی پانچ

۴۔ ˋ چوتھی ٹون چینی شہ بمعنی شہر ۔ اپنا ۔ کوشش وغیرہ پنجابی کھڑ اٹھ

چینی میں ان چار اصوات سے دو مزید اصوات بھی پیدا کی گئی ہیں ۔ جب تیسری ٹون کسی لفظ سے پہلے آ جائے تو بول چال کی آسانی کے لئے اسے نصف کر دیتے ہیں ۔ یعنی یہ ٹون جو رکھب سے کھرج کو چھوتی ہوئی مدھم تک جھولا بنا کر چڑھتی ہے اسے کھرج پر ختم کر کے اگلا لفظ ادا کر دیا جاتا ہے ۔ مثلاً او پانچ لیکن او گہ 五个 (یعنی پانچ عدد) میں ''آو'' پر نصف تیسری صوت استعمال ہوتی ہے پنجابی کے ۔ بھا (یعنی بھائی) پر تیسری ٹون ہے ۔ لیکن اگر یہ بھا جی یعنی جی کے امتزاج سے بولا جائے تو بھا کی تیسری ٹون نصف رہ جاتی ہے یعنی بھا نہیں بلکہ بھا جی رہ جاتا ہے ۔ ایک ٹون ان کے علاوہ ہے جو بعض الفاظ کو بڑا نرم لہجہ عطا کرتی ہے ۔ مثلاً ما ۔ بمعنی کیا — اور پنجابی میں ان ہی معنوں میں لفظ کی بھی اسی انداز سے بولا جاتا ہے ۔

چینی اور پنجابی زبان میں ایک لفظ تلفظ اور معنی کے لحاظ سے حیرت انگیز طور پر مماثلت رکھتا ہے۔ اور وہ ہے "دا" بمعنی کا۔ مثلاً اوریئنٹل کالج دا میلہ۔ چینی میں دا اسی مفہوم میں استعمال ہوتا ہے۔ اب چینی اور پنجابی میں دا کا استعمال ملاحظہ ہو۔ اس دا گھر (پنجابی) تھا دا چیا (چینی)۔ خان دا گھوڑا (پنجابی) خانہ دا ما (چینی)

چینی اور پنجابی دونوں زبانوں کے بعض ہم آواز اور ہم معنی الفاظ ملاحظہ ہوں۔

کٹو سو۔ کھو، کاکا۔ بڑا بھائی، ما / ماما۔ ماں

ان کے علاوہ ماں کو مُو بھی کہتے ہیں یہ ہزارے اور پوٹھوہار کے علاقے میں ماں کے لئے لفظ "مئو" سے مشابہہ ہے۔

پاپا۔ باپ، چھا۔ چا (چائے)

چائے کے معاملے میں تو یہ بات واضح ہے کہ یہ جنس اپنے نام کے ساتھ چین سے یہاں پہنچی۔ لیکن ہم نے انگریزی کی طرح اس کا نام بدل کر ٹی نہیں کیا "چا" ہی رہنے دیا۔

تائی۔ بمعنی چچی

چینی تھین۔ پنجابی دن

چینی زن بمعنی آدمی لہندا بولی کے "جنڑا" سے مشابہہ ہے۔

چینی شی۔ پنجابی شیں یا شیر

چینی تی آڑ۔ پنجابی تھوڑا

اسی طرح سرائیکی لفظ "بیا" یا "بئے دا" یعنی دوسرا یا دوسرے کا۔ چینی مین بعینہ اسی طرح انھی معنوں میں بولا جاتا ہے۔

پنجابی زبان میں ھلہ اچھا کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے چینی میں ھاؤلہ اسی مفہوم میں ادا کیا جاتا ہے۔

پنجابی اور چین کی معیاری زبان میں ایک اور مشترک خصوصیت یہ ہے کہ وھاں بھی ن کی شکل نڑ کی بن جاتی ہے۔ بالکل ایسے ھی جس طرح پنجابی میں پانی پانڑی ھو جاتا ہے۔

پنجابی اور چینی کے بعض قدیم محاورے بھی ملتے جلتے ھیں ۔ اس وقت میں ایک محاورے پر اکتفا کروں گا ۔ پنجابی میں جلدی کے مفہوم میں کہا جاتا ھے ''ھوا دے گھوڑے تے سوار ھونڑاں'' ۔ چینی میں ''ماشنگ یعنی ''گھوڑے پر سوار ھونا'' عجلت کے معنی دیتا ھے ۔

پنجابی اور اردو زبانوں میں بعض الفاظ تکرار کے ساتھ استعمال ھوتے ھیں ۔ مثلاً آھستہ آھستہ ۔ روز روز ۔ کل کل وغیرہ ۔

چینی زبان میں بھی تکرار الفاظ اسی انداز سے بکثرت ھوتی ھے ۔ مثلاً مان مان یعنی آھستہ آھستہ ۔ تھین تھین یعنی روز روز وغیرہ ۔ ایسی مثالیں سینکڑوں بلکہ ھزاروں ھیں ۔

اسی طرح پشتو اور چینی زبانوں کی مماثلت کے باب میں بعض حروف کے مخرج کا معاملہ یکساں ھے ۔ پٹھان لفظ ''ح'' کو ح سے زیادہ ''خ'' بولتے ھیں ۔ مثلاً محمد خان کو وہ مخمد خان ھی کہتے ھیں ۔ چینی میں بھی ح خ زیادہ اور ح کم ھے ۔ ھمارے ھاں ریڈیو ٹیلیویژن سے چینی مندوبین کے ناموں کو اکثر ھُوا یا ھُو نشر کیا جاتا ھے جو چینی صوتیات کے لحاظ سے غلط ھے اس کا صحیح مخرج خوا یا خو ھے ۔

چینی اور پشتو زبانوں کی ایک مشترک خصوصیت چین اور سرحد کے مختلف علاقوں کی زبانوں کے لہجے کا اختلاف ھے ۔ چین میں ھان Han اکثریت کی زبان ھے ۔ جبکہ اس کے علاوہ شمالی ، جنوبی، مشرقی اور مغربی علاقوں کی چینی کا لہجہ اور تلفظ ایک دوسرے سے یکسر مختلف ھے ۔ مثال کے طور پر آداب کے لیے ھان لہجے میں لفظ نی خاؤ [illegible] استعمال ھوتا ھے ۔ لیکن شنگھائی میں اسی کیریکٹر کا تلفظ ننگ خو بن جاتا ھے ۔ لیکن جہاں تک تحریر کا تعلق ھے اس میں کوئی تبدیلی نہیں ھوتی ۔ گویا ایک ھی تحریر کو مختلف علاقوں میں مختلف لہجوں اور تلفظ میں پڑھا جاتا ھے ۔

بعینہ اسی طرح پشتو میں بھی ایک ھی رسم الخط ھے ، لیکن خٹک اور یوسف زئی قبیلے اس تحریر کو اپنے اپنے انداز میں پڑھتے ھیں ۔ اس کی مثال ذیل میں دی جاتی ھے ۔

پشتو رسم الخط	یوسف زئی تلفظ	خٹک تلفظ
څادر	سادر	چادر
بنار	خار	شار
مونز	مُونگ	مُوژ

لفظ ژ کا استعمال بھی چینی ، پشتو اور پنجابی میں کثرت سے ہوتا ہے ۔ پشتو اور چینی ہم آواز اور ہم معنی الفاظ بے شمار ہیں اور ان کی ایک طویل فہرست تیار ہو سکتی ہے ۔

پشتو اور چینی میں اظہار کا ایک خاص انداز ''به'' کے استعمال سے ہوتا ہے ۔ مثلاً زو به—چلو چلیں—اس میں کسی قدر فرمائش، خواهش ، ارادے اور اجازت کا عنصر شامل ہے ۔ زو به دونوں زبانوں میں مشترک لفظ اور اس اظہار کا ایک واضح ثبوت ہے ۔

پاکستانی زبانوں اور چینی زبان کی ایک سب سے اہم قدر مشترک ان کا مشرقی مزاج ہے ۔ اس مشرقی مزاج کا تعلق آداب اور حفظ مراتب سے ہے ۔ مغربی زبانوں میں یہ بات نہیں پائی جاتی ۔ اردو ، پنجابی سرائیکی ، سندھی اور پشتو میں واحد حاضر کو عزت سے مخاطب کرنے کے لئے الفاظ آپ ، تسی ، تسائیں اور تاسو استعمال ہوتے ہیں ۔ چینی میں ''تو'' یا ''تم'' کے لئے لفظ نی 你 بولا اور لکھا جاتا ہے ۔ لیکن آپ کے لئے لفظ نن 您 استعمال ہوتا ہے ۔ چینی زبان کی تصویری خصوصیت اس لفظ کا یہ دلچسپ پس منظر پیش کرتی ہے ۔ کہ تو یا تم کے لفظ کے نیچے ''دل'' کی تصویر بنا دی جاتی ہے گویا ''آپ'' کو دل کے اوپر مقام دینے کا مقصد دلی عزت بخشنا ہے ۔ ہمارے ہاں بھی کسی کو میل جول یا آداب کے موقعے پر عزت بخشنے کے لئے سینے یا دل پر ہاتھ رکھتے ہیں ۔

اس ساری بحث کا مقصد یہ نہیں کہ ہم چینی زبان کو بر صغیر کی زبانوں کا ماخذ یا چینی کو بر صغیر کی زبانوں کا خوشہ چین سمجھتے ہیں ۔ اصل مقصد یہ ہے کہ اس قدیم ترین زبان نے سائینٹیفک خطوط پر

صوتیات میں جو ترقی کی ہے وہ خصوصی طور پر پنجابی زبان کے لئے مشعل راہ ہے اور اہل پنجاب کے لئے یہ دعوت فکر ہے ۔ کوئی صاحب علم اس میدان میں آئے اور پنجابی زبان کی صوتیات کو سائینٹیفک خطوط پر عام فہم بنانے میں اہم ترین کام کرے ۔

جشنِ صد سالہ

پنجاب یونیورسٹی اورینٹل کالج لاہور

(ایک رپورتاژ)

ڈاکٹر عبادت بریلوی، ایم اے، پی ایچ ڈی

پروفیسر ادبیاتِ اردو، پنجاب یونیورسٹی

پرنسپل

یونیورسٹی اورینٹل کالج لاہور

فہرست

پیش لفظ

اورینٹل کالج ایک ادارہ ہی نہیں، ایک تحریک بھی تھا۔ اس تحریک کا آغاز ۱۸۶۵ء میں انجمن پنجاب کے قیام کے ساتھ ہی ہو گیا تھا۔ ڈاکٹر لائٹنر انجمن پنجاب کے بانی تھے۔ انہوں نے اس انجمن کے زیر اہتمام ایک تدریسی ادارے کی داغ بیل ڈالی تھی، جس کا نام پہلے ۱۸۶۹ء میں یونیورسٹی کالج رکھا گیا۔ پھر ۱۸۷۲ء میں اس نے اورینٹل اسکول، اور آگے چل کر اورینٹل کالج کی صورت اختیار کر لی۔

اس طرح دیکھا جائے تو موجودہ اورینٹل کالج نے ایک ادارے اور ایک تحریک کی حیثیت سے ۱۹۷۲ء میں اپنی زندگی کے سو سال پورے کر لئے۔ چنانچہ اسی وجہ سے اورینٹل کالج سے دلچسپی لینے والوں کے دلوں میں یہ خیال پیدا ہوا کہ ۱۹۷۰ء یا ۱۹۷۲ء میں اس کالج کا جشن صد سالہ منایا جائے۔

پنجاب یونیورسٹی کی انتظامیہ نے بھی اس پر غور کیا اور متفقہ طور پر یہ فیصلہ کیا کہ اورینٹل کالج کا جشن صد سالہ منایا جائے اور یہ خواہش ظاہر کی کہ اس جشن کو اس کی عظیم روایت کے شایان شان

ہونا چاہیے۔ اس کا ایک منصوبہ بنانے اور اس کو عملی شکل دینے کے لیے پرنسپل، اورینٹل کالج کو پورا اختیار دیا گیا۔

یہ فیصلہ ۶۶-۱۹۶۵ء میں کیا گیا تھا۔ اس وقت ڈاکٹر محمد باقر فارسی کے پروفیسر اور کالج کے پرنسپل تھے۔ انہوں نے جشن صد سالہ منانے کا ایک منصوبہ بنایا، اور سب سے پہلے اشاعتی پروگرام کی طرف توجہ کی، کیونکہ اورینٹل کالج کی روایت میں اس کو نمایاں حیثیت حاصل تھی۔ ۱۹۷۰ء تک انہوں نے اورینٹل کالج میگزین میں شائع ہونے والے عربی، فارسی اور اردو سے متعلق مضامین کی تین جلدیں اور اورینٹل کالج کے اساتذہ کے تحقیقی کام کی دو جلدیں شائع کر دیں۔ ان کے ساتھ پروفیسر سید وزیر الحسن عابدی کی مرتب کی ہوئی غالب کی نادر و نایاب تصنیف "باغ دو در" کو بھی شائع کردیا۔ ۱۹۷۰ء میں انہوں نے جشن صد سالہ کے سلسلے میں ایک جلسے کا پروگرام بھی بنایا تھا، لیکن اسی سال وہ یونیورسٹی کی ملازمت سے سبکدوش ہو گئے۔ اس لیے اس جلسے کے منصوبے کو عملی جامہ نہ پہنا سکے۔

ڈاکٹر محمد باقر کے ریٹائر ہونے کے بعد سب سے زیادہ سینیر یونیورسٹی پروفیسر ہونے کی حیثیت سے اورینٹل کالج کا پرنسپل اس خاکسار کو مقرر کیا گیا۔ اس طرح جشن صد سالہ منانے اور اس سلسلے میں جو کام باقی رہ گیا تھا، اس کو مکمل کرنے کی ذمہ داری بھی مجھ پر آ پڑی۔

میں نے پرنسپل کا عہدہ سنبھالنے کے بعد اپنے احباب سے مشورہ کیا، اور اس موقع پر اشاعتی پروگرام کے ساتھ ساتھ ماہرین علوم مشرقی کی ایک بین الاقوامی کانگریس منعقد کرنے کا منصوبہ بھی بنا لیا۔ چنانچہ اس سلسلے میں دنیا کے مختلف ملکوں کی یونیورسٹیوں اور تحقیقی اداروں سے رابطہ قائم کیا گیا۔ جواب میں بیشتر یونیورسٹیوں اور تحقیقی اداروں نے اورینٹل کالج کی سو سالہ علمی اور تحقیقی خدمات کو سراہا، اپنے گراں قدر پیغامات ارسال کیے، اور یہ وعدہ بھی کیا کہ ان کے پروفیسر اس موقع پر ان کی نمائندگی کریں گے۔ اس طرح امریکہ، کینیڈا، انگلستان، آئرلینڈ، جرمنی، فرانس، بلجیم، ھالینڈ، اٹلی، سوئٹزرلینڈ، چیکوسلوویکیہ،

ڈنمارک، سوویٹ یونین، عوامی جمہوریۂ چین، سعودی عرب، ترکی، ایران، افغانستان، عراق، اردن، شام، مصر، جاپان ور آسٹریلیا کسی نہ کسی حیثیت میں اورینٹل کالج کے جشن صد سالہ کی تقریبات میں شریک ہونے کے لیے آمادہ ہو گئے۔

یہ بہت بڑی کامیابی تھی، اور مجھے اورینٹل کالج کے ایک ادنی خادم کی حیثیت سے اس کامیابی پر بڑی مسرت ہوئی۔ چنانچہ میں نے دسمبر ۱۹۷۲ء کے دوسرے ہفتے میں ماہرین علوم مشرقی کی اس بین الاقوامی کانگرس کو منعقد کرنے کا پروگرام بنا لیا۔ لیکن اسی زمانے میں شہر لاہور میں کچھ ہنگامے ہو گئے۔ اس لیے اس وقت کانگریس کو ملتوی کر کے مارچ ۱۹۷۳ء میں اس کانگریس کے لیے پورے ایک ہفتے کا پروگرام بنایا۔ چنانچہ یہ جلسے ۱۲ مارچ ۱۹۷۳ء سے ۱۷ مارچ ۱۹۷۳ء تک ہوتے رہے۔ ان جلسوں میں دنیا کے مختلف ملکوں کے نمائندوں نے شرکت کی، اور اپنے گراں قدر مقالے پڑھے۔ یہ کانگریس توقع سے زیادہ کامیاب رہی اور ساری دنیا کے علمی حلقوں میں اس کو تحسین کی نظروں سے دیکھا گیا۔

اورینٹل کالج کے جشن صد سالہ کے اس موقع پر منعقد ہونے والی اس بین الاقوامی کانگریس کی تفصیلات اس رپورتاژ کی صورت میں قلم بند کی جاتی ہیں تاکہ اس کی ایک واضح تصویر سامنے آ سکے، اور ہمیشہ کے لیے ایک مستقل ریکارڈ رہے۔

مجھے یقین ہے کہ اورینٹل کالج سے تعلق رکھنے والوں، علوم مشرقی کے ماہروں، استادوں، محققوں، نقادوں، ادیبوں اور شاعروں، سب کے لیے یہ رپورتاژ دلچسپی کا باعث ہو گا۔

ڈاکٹر عبادت بریلوی

یونیورسٹی اورینٹل کالج، لاہور

۲۵ جنوری ۱۹۷۴ء

خشت اول

اورینٹل کالج یوں تو ۱۸۷۰ء میں قائم ہوا، لیکن اس کی خشت اول تو اسی دن رکھ دی گئی تھی جس دن ۱۸۶۵ء میں انجمن پنجاب کا قیام عمل میں آیا تھا۔ کیونکہ انجمن پنجاب کے بانی ڈاکٹر لائٹنر کے پیش نظر انجمن پنجاب کے زیر اہتمام ایک ایسے تدریسی ادارے کا قیام بھی تھا جہاں مشرقی علوم کی تعلیم کا سلسلہ شروع ہو سکے۔

اس طرح دیکھا جائے تو اورینٹل کالج کی تحریک کا آغاز ۱۸۶۵ء ہی میں ہو چکا تھا۔ شاید اسی وجہ سے اورینٹل کالج کے جشن صد سالہ منانے کی تیاریاں ۱۹۶۵ء ہی سے شروع ہو چکی تھیں۔ پروگرام کوئی خاص نہیں بنا تھا۔ لیکن چند نادر و نایاب تحقیقی کتابیں شائع کرنے کا کام شروع کر دیا گیا تھا۔

اس کا علم مجھے لندن میں ہوا۔

وہ اس طرح کہ ۱۹۶۵ء میں ڈاکٹر محمد باقر اورینٹل کالج کے پرنسپل مقرر ہوئے۔ پرنسپل ہونے کے بعد انہوں نے ۱۹۶۵ء میں برٹش

کونسل کے کسی پروگرام کے تحت اپنی بیگم صاحبہ کے ساتھ لندن کا سفر کیا۔ میں چونکہ کئی سال سے لندن اسکول آف اورینٹل اینڈ افریکن اسٹڈیز میں پڑھا رہا تھا، اور میرے پاس معقول جگہ بھی تھی، اس لیے میرے اصرار پر انہوں نے لندن میں میرے ساتھ قیام کیا۔

اس قیام کے دوران انہوں نے اورینٹل کالج کے جشن صد سالہ منانے کی خبر سنائی اور اس موقع پر تحقیقی کتابیں شائع کرنے کے منصوبے کی تفصیلات کو واضح کیا۔

مجھے اس خبر کو سن کر اور اشاعتی منصوبے کی تفصیل کو معلوم کر کے بےحد مسرت ہوئی۔

ڈاکٹر باقر نے مجھے بتایا کہ یہ کتابیں جب شائع ہو جائیں گی تو جشن صد سالہ منانے کے لئے ایک جلسہ ترتیب دیا جائے گا اور یہ بھی فرمایا کہ میں (یعنی یہ خاکسار) کئی سال لندن میں رہ چکا ہوں ، اس لئے اب میری لاہور واپسی مناسب ہوگی تا کہ جشن صد سالہ کے کام میں ان کا ہاتھ بٹایا جا سکے۔

اگرچہ مجھے لندن میں رہنے اور اسکول آف اورینٹل اسٹڈیز میں کام کرنے کے لئے پنجاب یونیورسٹی کی طرف سے ایک سال کی مزید چھٹی مل گئی تھی، لیکن ڈاکٹر باقر کی خواہش اور یونیورسٹی کے وائس چانسلر پروفیسر حمید احمد خان صاحب کے اصرار پر میں جون ۱۹۶۶ء میں لندن سے لاہور واپس آ گیا اور اورینٹل کالج میں اردو کے صدر شعبہ اور پھر اردو کے پروفیسر کی حیثیت سے کام شروع کر دیا۔

ڈاکٹر محمد باقر اور پروفیسر حمید احمد خان صاحب نے اس زمانے میں جشن صد سالہ کے منصوبے میں گہری دلچسپی لی اور مجھے بھی اس میں شریک کر لیا۔ طباعت کا کام تیزی سے ہونے لگا۔ کیونکہ یونیورسٹی کی انتظامیہ (سنڈیکیٹ) کے فیصلے کے مطابق اورینٹل کالج کے جشن صد سالہ کو اس کی روایت کے شایان شان منانے کی ذمہ داری پرنسپل اور وائس چانسلر پر تھی، اس کے لئے پچیس ہزار روپے کی رقم بھی منظور کی

گئی تھی، اور کالج کمیٹی کی طرف سے وائس چانسلر پروفیسر حمید احمد خان، پرنسپل ڈاکٹر محمد باقر، پروفیسر خواجہ صلاح الدین اور پروفیسر خواجہ محمد اسلم پر مشتمل ایک کمیٹی بھی قائم کر دی گئی تھی۔

چنانچہ جشن صد سالہ منانے کا کام تیزی سے شروع کر دیا گیا، لیکن ۱۹۶۷ء میں ڈاکٹر باقر ایک سال کے لیے وزیٹنگ پروفیسر کی حیثیت سے بفیلو یونیورسٹی، امریکہ چلے گئے اور ان کی واپسی کے بعد میں ۱۹۶۸ء میں چند ماہ کے لئے پھر انگلستان چلا گیا۔ میری واپسی ۱۹۶۹ء میں ہوئی۔

واپس آ کر یہ معلوم ہوا کہ ڈاکٹر محمد باقر اسی سال پرنسپل اور پروفیسر، شعبہ فارسی کی حیثیت سے ریٹائر ہونے والے ہیں۔ ایک سال کی توسیع انہیں مل گئی اور اس کی ایک وجہ جشن صد سالہ کا اہتمام اور انصرام بھی تھا۔ چنانچہ توسیع کے زمانے میں وہ مستعدی سے جشن صد سالہ کے منصوبوں کو عملی جامہ پہنانے کے لیے کام کرتے رہے۔

باقر صاحب کی ملازمت میں توسیع کی مدت ستمبر ۱۹۷۰ء میں ختم ہونے والی تھی۔ انہوں نے ستمبر میں جشن صد سالہ کے جلسے کو ترتیب دینے کا پروگرام بنایا۔ لیکن وقت کم تھا، اس لئے وہ اپنے اس منصوبے کو عملی جامہ نہ پہنا سکے۔

یکم اکتوبر ۱۹۷۰ء کو ڈاکٹر باقر نے اوریئنٹل کالج کی پرنسپلی کا چارج مجھے دیا، اور کالج کی انتظامی ذمہ داریوں کے ساتھ کالج کے جشن صد سالہ منانے کی ذمہ داری بھی میرے کمزور شانوں پر آ پڑی۔

میرے لئے یہ بڑی آزمائش کا وقت تھا!

قرعۂ فال بہ نام من دیوانہ زدند

پرنسپل ہونے کے بعد میرے پاس یونیورسٹی کی طرف سے اس مضمون کا خط آیا کہ سنڈیکیٹ کے فیصلے کے مطابق اورینٹل کالج کے جشن صد سالہ منانے کا کام جاری رہنا چاہیے، اور یہ جشن کالج کی روایت کے شایان شان ہونا چاہیے۔ ڈاکٹر باقر کی پرنسپلی کے زمانے میں اگرچہ اس جشن کو منانے کے لیے کام کا آغاز ہوچکا تھا، لیکن باقاعدہ طور پر اس جشن صد سالہ کا انتظام نہ ہو سکا۔ اس لئے اب جلد اس کام کو مکمل ہونا چاہیے۔

پروفیسر حمید احمد خاں صاحب اس وقت تک وائس چانسلری کے عہدے سے سبکدوش ہو چکے تھے اور علامہ علاء الدین صدیقی صاحب وائس چانسلر مقرر کئے گئے تھے۔ انہوں نے اورینٹل کالج اور اس کے جشن صد سالہ سے اپنی غیر معمولی دلچسپی کا اظہار کیا۔

ایک دن ان سے ملاقات ہوئی تو انہوں نے فرمایا ”مجھے اورینٹل کالج سے صرف اس وجہ سے دلچسپی نہیں ہے کہ یہ کالج یونیورسٹی سے بھی زیادہ پرانا ہے اور اس نے تمام دنیا میں یونیورسٹی کا نام روشن کیا ہے، بلکہ اس وجہ سے بھی کہ میں اورینٹل کالج کا پرانا طالب علم ہوں،

اور میں نے اس کالج کے مخصوص تدریسی اور تحقیقی ماحول سے بہت کچھ حاصل کیا ہے"۔

علامہ صاحب کی یہ باتیں سن کر مجھے بہت اطمینان ہوا اور میں نے جشن صد سالہ کی تقریبات کو ترتیب دینے کا کام شروع کر دیا۔

سب سے پہلے تو میں نے یہ معلوم کیا کہ اس کام کے لئے یونیورسٹی سے کتنی رقم مل سکتی ہے۔ دریافت کرنے سے یہ معلوم ہوا کہ یونیورسٹی نے صرف پچیس ہزار روپے منظور کئے ہیں۔ اس رقم سے کتابوں کی طباعت بھی ہوگی اور جلسوں کا اہتمام بھی کیا جائے گا۔

مجھے یہ رقم کم معلوم ہوئی، کیونکہ جس پیمانے پر میں کتابوں کی طباعت اور جلسوں کا اہتمام کرنا چاہتا تھا، اس کے لیے اس سے کہیں زیادہ رقم درکار تھی۔ چنانچہ میں نے اس مسئلے کو کالج کمیٹی میں رکھا۔ کالج کمیٹی کا جلسہ ہوا، لیکن اس میں اس سے زیادہ رقم منظور نہ ہو سکی۔ البتہ کالج کمیٹی نے چند ممبروں پر مشتمل ایک ذیلی کمیٹی کی تشکیل کردی، جس کے ذمے مختلف ذرائع سے رقم فراہم کرنے کا کام کیا گیا۔ پروفیسر خواجہ صلاح الدین مرحوم اور پروفیسر خواجہ اسلم دونوں نے اس معاملے میں اپنی گہری دلچسپی کا اظہار کیا، اور ان کی اس دلچسپی کی وجہ سے کچھ امید بھی بندھی، لیکن اس کا کوئی خاص نتیجہ نہیں نکلا۔ اس کام میں مدد کرنے کے لئے بہت کم لوگ تیار ہوئے۔

میں اس صورت حال کی وجہ سے کچھ پریشان سا ہوا، کیونکہ کتابوں کی طباعت اور جلسوں کے اہتمام کا جو منصوبہ میرے ذہن میں تھا، اس کے لئے اس سے کہیں زیادہ رقم کی ضرورت تھی جو یونیورسٹی نے منظور کی تھی۔

اس موقع پر میں تو 'جشن نامہ' کے نام سے تحقیقی مقالات کا ایک نہایت ہی ضخیم اور دیدہ زیب مجموعہ شائع کرنا چاہتا تھا، اور ایک عام اور معمولی جلسے کے بجائے میرے ذہن میں یہ بات آئی تھی کہ

ایک دن کے بجائے ایک ہفتے تک اس کے جلسے ہونے چاہئیں ۔ یہ اسی صورت میں ممکن تھا جب اس موقع پر ماہرین علوم مشرقی کی ایک بین الاقوامی کانفرنس کا ڈول ڈالا جاتا ۔ لیکن اس منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کے لیے رقم کی ضرورت تھی ، اور یہ رقم ہمارے پاس نہیں تھی ۔ پچیس ہزار جو یونیورسٹی نے منظور کئے تھے، ان میں سے بھی اس وقت تک خاصی رقم خرچ ہو چکی تھی ۔ اور یوں سمجھئے کہ ہمارے پاس کچھ بھی نہیں تھا ۔

میری جرأت رندانہ نے اس موقع پر میرا ساتھ دیا ، اور میں نے یہ فیصلہ کر لیا کہ میں جشن صد سالہ کے منصوبے کو ضرور عملی جامہ پہناؤں گا اور انشاء اللہ یہ جشن بہت بڑے پیمانے پر نہایت شان سے منایا جائے گا ۔

مشکل یہ تھی کہ جب اس کام کو میں نے باقاعدگی سے اپنے ھاتھ میں لیا، اس وقت ہماری قومی زندگی ایک عجیب سے بحران کا شکار ہوچکی تھی ۔ مشرقی پاکستان ہم سے الگ ہو چکا تھا ۔ ایک عجیب انتشار اور افراتفری کا عالم تھا ۔ لیکن اس انتشار میں امید کی ایک کرن اس وجہ سے نظر آ رہی تھی کہ بھٹو صاحب کی قیادت میں ہم نے جگر لخت لخت کو جمع کر کے تالیف نسخہ ھائے وفا کا عمل شروع کر دیا تھا ۔ چنانچہ اس عمل کے خوشگوار نتائج برآمد ہونے لگے تھے ۔ ہر روز یہ محسوس ہوتا تھا کہ ہمارے اندر ایک نئی زندگی کی لہر سی دوڑ رہی ہے ۔ بھٹو صاحب وطن عزیز کو اس نئی زندگی سے ھمکنار کرنے کے لئے ان تھک کام کر رہے تھے ۔ انہوں نے اس قوم کی ڈوبتی ہوئی کشتی کو بچا لیا تھا ۔

میں نے یہ سوچا کہ اوریئنٹل کالج اور اس کے جشن صد سالہ کے سلسلے میں بھٹو صاحب کو لکھنا چاہیے ۔ چنانچہ میں نے ان کی خدمت میں ایک ذاتی عریضہ لکھا جس میں اوریئنٹل کالج کی اھمیت واضح کی ، اس کی سو سالہ علمی اور ادبی خدمات کا ذکر کیا، اور جشن صد سالہ کو منانے کے لئے اجازت طلب کی ۔

میری جرأت رندانہ نے یہ عریضہ بھٹو صاحب کی خدمت میں ارسال تو کر دیا، لیکن اس کو بھیجنے کے بعد یہ خلش ضرور رہی کہ میں ایسی شخصیت کو زحمت دے رہا ہوں اور پریشان کر رہا ہوں جو قوم کی تعمیر نو کے اہم کام میں مصروف ہے، اور جس نے اپنی زندگی پوری طرح اس کام کے لئے وقف کر دی ہے، اور جو دن دن بھر اور رات رات بھر اس کے لئے کام کر رہا ہے۔

پھر یہ بھی خیال آیا کہ میرا یہ عریضہ غالباً ان کی خدمت میں پہنچ ھی نہیں سکے گا۔ لیکن میری حیرت کی انتہا نہیں تھی، اور مسرت کا کوئی ٹھکانا نہیں تھا جب اس عریضے کو پیش کرنے کے چوتھے پانچویں روز میرے پاس اسلام آباد سے گھر پر یہ فون آیا کہ صدر پاکستان جناب ذوالفقار علی بھٹو صاحب کو آپ کا خط مل گیا ہے۔ انہوں نے اوریئنٹل کالج اور اس کے جشن صد سالہ کی تقریبات کے منصوبے میں گہری دلچسپی کا اظہار کیا ہے۔ اس موقع کے لئے ایک پیغام بھی انہوں نے لکھوایا ہے اور دس ہزار روپے کی رقم بھی آپ کے لئے منظور فرمائی ہے۔ ٹیلی فون کرنے والے نے یہ بھی کہا کہ آپ بہت ھی خوش قسمت آدمی ہیں۔ بھٹو صاحب نے یہ بھی فرمایا ہے کہ پیغام آپ کو پڑھ کر سنا دیا جائے۔ اگر اس میں اوریئنٹل کالج سے متعلق کوئی بات رہ گئی ہو تو اس کا اضافہ کر دیا جائے۔

یہ سب کچھ سن کر میرے پیروں تلے سے تو زمین نکل گئی۔ میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگا، اور حیرت اور مسرت نے مجھے تھوڑی دیر کے لئے اپنے آپ سے بے خبر کر دیا۔

اس عالم میں پیغام کے الفاظ میں نے سن لئے اور ان کو سن کر میری زبان سے صرف یہ نکلا۔ ”یہ سب کچھ تو میری توقع سے بہت زیادہ ہے۔ بھٹو صاحب کا بڑا احسان اور کرم ہے کہ انہوں نے میرے کالج کے بارے میں یہ الفاظ فرمائے اور اپنی بے اندازہ مصروفیات کے باوجود اس کی طرف توجہ فرمائی، وقت دیا، اور اس طرح فون کرنے کے لئے ہدایات جاری کیں۔ میں ان کا شکریہ کس طرح ادا کروں، میرے پاس تو الفاظ نہیں ہیں“۔

یہ کہہ کر میں نے فون بند کر دیا۔ اور میں یہ سوچتا رہا کہ بھٹو صاحب کتنے عظیم آدمی ہیں اور انہیں مشرقی علوم اور اورینٹل کالج سے کتنی دلچسپی ہے اور وہ ہمارے جیسے عام لوگوں کے معاملات و مسائل کو بھی کتنی اہمیت دیتے ہیں۔

بہر حال بھٹو صاحب کی اس شفقت اور محبت نے میرے اندر ایک نئی زندگی پیدا کی اور اورینٹل کالج کے جشن صد سالہ کو خاطر خواہ اور اورینٹل کالج کی عظیم روایت کے شایان شان منانے کا خواب مجھے شرمندہ تعبیر ہوتا ہوا نظر آنے لگا۔

اور میں نے ایک نئے ولولے اور حوصلے سے سرشار ہو کر جشن صد سالہ منانے کا کام شروع کر دیا۔

رہ وادی خیال

(مشورے اور منصوبے)

صدر پاکستان کی اس شفقت اور محبت کا مجھ پر اتنا اثر ہوا کہ میں نے اس جشن صد سالہ کی تقریبات کو تشکیل دینے کے سلسلے میں بقول غالب رہ وادی خیال کو مستانہ طے کرنا شروع کر دیا ۔ جو کچھ مجھے کرنا تھا، اس کی ایک مکمل تصویر میری آنکھوں کے سامنے آ گئی ۔

اور میں اس تصویر کے دیدار سے لطف اندوز ہونے لگا ۔

اس تصویر میں سب سے زیادہ نمایاں ماہرین علوم مشرقی کی ایک بین الاقوامی کانگریس تھی، جس میں دنیا کی تمام اہم یونیورسٹیوں اور اداروں کے مندوبین شرکت کے لیے آئے ہوئے ہیں ۔ سینٹ ہال حاضرین سے کھچا کھچ بھرا ہوا ہے ۔ خطبات دیے جا رہے ہیں ۔ پیغامات پڑھ کر سنائے جا رہے ہیں ۔ عالمانہ مقالات پڑھے جا رہے ہیں ۔ مندوبین کے اعزاز میں دعوتیں ہو رہی ہیں ۔ استقبالیے دیئے جا رہے ہیں ۔ غرض لاہور اور اورینٹل کالج میں اس کانگریس کی وجہ سے خاصی گہما گہمی ہے ۔

اس کے ساتھ ہی میں نے اس تصویر میں یہ بھی دیکھا کہ اورینٹل کالج کی طرف سے اورینٹل کالج میگزین کا ایک خصوصی جشن صد سالہ نمبر شائع کیا گیا ہے اور جشن نامہ کی صورت میں بھی ایک نہایت خوبصورت سی جلد تیار کی گئی ہے ۔ یہ جلدیں عالمانہ مقالات پر مشتمل ہیں ۔

اور ان جلدوں کو حضرت داتا گنج بخش کی خدمت میں عقیدت کے پیش‌نظر نذر کے طور پر پیش کیا گیا ہے ۔

پھر اس تصویر میں میں نے یہ بھی دیکھا کہ جشن صد سالہ کے موقع پر ہونے والی ماہرین علوم مشرقی کی بین الاقوامی کانگریس کی مکمل روداد بھی ایک ضخیم جلد میں شائع کی گئی ہے ۔ اس میں خطبات، مقالات اور مختلف اجلاسوں کی تفصیلات شامل ہیں، اور کانگریس کے موقع پر کھینچی جانے والی تصویروں کا ایک البم بھی اس جلد کی زینت ہے۔

جشن صد سالہ کی اس خیالی تصویر کے مختلف زاویوں کو سامنے رکھ کر میں نے کام کا آغاز اس طرح کیا کہ سب سے پہلے اس سب کمیٹی کی میٹنگ طلب کی جس کو کالج کمیٹی نے نامزد کیا تھا، جس کا مقصد جشن صد سالہ کے سلسلے میں مشورے دینا، کارکنوں کی مدد کرنا اور ان کے لیے سرمایے کو فراہم کرنا تھا ۔ اس کمیٹی کے ممبر پرنسپل کے علاوہ پروفیسر خواجہ صلاح الدین اور پروفیسر خواجہ محمد اسلم تھے ۔

یہ بزرگ ایک دن مل کر بیٹھے تو میں نے ان کے سامنے جشن صد سالہ کی وہ تصویر پیش کی جس کو میرے تخیل نے بڑی رنگینی اور پرکاری کے ساتھ تیار کیا تھا ۔ اس تصویر کو دیکھ کر یہ بزرگ بہت خوش ہوئے ۔ اس کو پسند کیا اور اس کو عملی صورت دینے کے لیے سرمایہ فراہم کرنے کے منصوبے بنائے ۔

اور اس طرح منصوبے کی ایک منزل طے ہوگئی ۔

اب میں نے یہ سوچا کہ یہ تصویر ذرا کالج کے احباب اور اپنے رفقاء کو بھی دکھاؤں ۔ چنانچہ میں نے اساتذہ کی ایک میٹنگ طلب کی اور یہ پورا نقشہ ان کے سامنے پیش کیا ۔

اس کو دیکھ کر وہ سب کے سب خوش تو ہوئے لیکن ان میں سے بعض کو اتنے بڑے منصوبے نے ذہنی طور پر خاصا پریشان بھی کیا۔

ایک صاحب نے کہا ”کانگریس کے لئے اتنا سرمایہ کہاں سے آئے گا۔“

میں نے کہا ”اللہ تعالیٰ ہماری مدد کرے گا۔ ہم حکومت سے رابطہ قائم کریں گے، انتظامیہ نے ہمیں اس کی اجازت دے دی ہے۔ اور اس کے لئے ایک کمیٹی بھی بنا دی ہے۔“

ایک اور صاحب نے کہا ”باہر سے جو مندوبین آئیں گے، ان کے اخراجات کون دے گا؟ میں نے کہا ”وہ اپنے خرچ پر آئیں گے۔ ان کے ادارے یہ اخراجات برداشت کریں گے۔ یہاں وہ ہمارے مہمان ہوں گے۔“

لیکن میری یہ بات ان کی سمجھ میں نہیں آئی۔

فارسی کے ایک پروفیسر صاحب نے فرمایا ”ایران کے بارے میں تو میں وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ جب تک حکومت پاکستان یا پنجاب یونیورسٹی ان کے اخراجات سفر برداشت نہیں کرے گی وہ نہیں آئیں گے۔“

میں نے کہا ”مجھے کوشش کر کے دیکھ لینے دیجیے۔“

قصہ مختصر یہ کہ خاصی طویل گفتگو کے بعد متفقہ طور پر یہ فیصلہ ہوا کہ پرنسپل حکومت پنجاب سے رابطہ قائم کرے گا، وزیر تعلیم اور وزیر خزانہ سے ملے گا اور بیرونی ممالک کی یونیورسٹیوں اور تحقیقی اداروں کو خط لکھے گا۔

میں نے یہ دونوں کام بہ‌خوشی اپنے ذمے لیے اور یہ وعدہ کیا کہ جو نتائج نکلیں گے، ان سے احباب اور رفقاء کو مطلع کروں گا۔

اب میں نے یہ سوچا کہ بیرونی ممالک کے لوگوں کو خطوط تو بعد میں لکھوں گا، پہلے حکومت پنجاب کے وزیر تعلیم اور وزیر خزانہ سے

ملاقات کرنی چاہیے۔ چنانچہ میں نے ڈاکٹر عبدالخالق صاحب (وزیر تعلیم، پنجاب) اور حنیف رامے صاحب (وزیر خزانہ، پنجاب) سے وقت لیا، اور ان کے پاس جا کر جشن صد سالہ کا پورا منصوبہ پیش کیا۔

وہ دونوں اس کو دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ میری ہمت افزائی کی۔ مجھے مفید مشورے دیے اور یہ وعدہ بھی کیا کہ اس کام کے لیے یونیورسٹی کی مالی امداد بھی کریں گے۔

میں ان سے باتیں کر کے واپس آ گیا، اور احباب کو خوش خبری سنا دی۔

یہ بہت بڑی کامیابی تھی۔ اس یقین دھانی کی وجہ سے یوں محسوس ہوا جیسے ہم وادی، خیال کی مختلف منزلوں کو طے کر کے حقیقت کی سر زمینوں میں داخل ہو رہے ہیں۔

نامہ ہائے شوق

اور اب نامہ ہائے شوق لکھنے کی منزل آئی !

میں نے سب سے پہلے تو پیکجز لمیٹیڈ کے ڈائرکٹر سید بابر علی صاحب کو ایک خط لکھا جس میں اوریئنٹل کالج کے جشن صد سالہ اور اس موقع پر ہونے والی بین الاقوامی کانگریس کا ذکر تھا، اور ساتھ ہی یہ خواہش بھی ظاہر کی گئی تھی کہ بیرونی ممالک سے آنے والے کچھ مندوبین کے لیے ان کے مہمان خانے میں قیام کا بندوبست کر دیا جائے۔ ملاقات کی خواہش بھی اس خط میں ظاہر کی گئی تھی۔

یہ خط اس خیال سے لکھا گیا تھا کہ سید بابر علی صاحب اس طرح کے علمی کاموں میں گہری دلچسپی کا اظہار کرتے ہیں اور حتی الامکان مدد کرنے کے لئے بھی تیار ہو جاتے ہیں۔

دو دن کے اندر اس خط کا جواب آ گیا۔ سید بابر علی صاحب نے لکھا کہ باہر سے آنے والے مندوبین کے قیام کا انتظام ہو جائے گا۔ ملاقات کے لئے وقت بھی دے دیا، اور اپنے ادارے کے ایک صاحب کو خاص

طور پر میرے پاس بھیجا۔ انہوں نے تفصیلات معلوم کیں اور وہ سید بابر علی صاحب کے پاس مجھے لے گئے۔

سید صاحب سے مل کر مجھے بےحد مسرت ہوئی۔ میں نے انہیں تہذیب اور شائستگی، خلوص اور محبت کا مجسمہ پایا۔

کہنے لگے "میں نے ھدایات دے دی ھیں۔ مہمان خانے میں بیرونی ممالک کے کچھ مندوبین کے قیام کا انتظام ھو جائے گا۔"

اور ساتھ ھی یہ بھی پوچھا "کسی اور خدمت کی ضرورت ھو تو بتائیے۔"

میں نے شکریہ ادا کیا اور کہا "ھمیں کچھ کاغذ کی ضرورت ھوگی۔ کیونکہ ھم جشن صد سالہ کے موقع پر جشن نامہ کے نام سے تحقیقی اور تنقیدی مقالات پر مشتمل ایک ضخیم جلد بھی شائع کر رہے ھیں۔ پھر اس کے علاوہ بین الاقوامی کانگریس کی روداد بھی ایک ضخیم جلد میں شائع کی جائے گی۔"

سید بابر علی صاحب نے فرمایا "آپ کو جتنے کاغذ کی ضرورت ھوگی وہ مل جائے گا، تفصیل بتا دیجیے گا، کاغذ اوریئنٹل کالج پہنچ جائے گا۔"

میں شکریہ ادا کرکے واپس آ گیا۔

دوسرے دن میں نے کاغذ کی تفصیل لکھ بھیجی۔ تیسرے دن سید بابر علی صاحب کی گاڑی نے مطلوبہ کاغذ اوریئنٹل کالج پہنچا دیا۔

ان دنوں کاغذ نایاب تھا۔ اس لئے کاغذ حاصل کرکے میری پریشانی بڑی حد تک دور ھوئی۔ سید بابر علی صاحب نے واقعی ایسا کر کے اوریئنٹل کالج پر احسان کیا۔

یہ ایک اور بڑی کامیابی تھی، اور اس کامیابی سے میرے اندر ایک ولولہ اور حوصلہ پیدا ھوا۔ چنانچہ میں نے ایک خط گشتی مراسلے

کے طور پر دنیا کے مختلف ممالک کی یونیورسٹیوں اور تحقیقی اداروں کے نام جاری کیا۔

اس مراسلے کا مضمون یہ تھا کہ اوریئنٹل کالج ایک ایسا ادارہ ہے جس نے گذشتہ سو سال میں علوم مشرقی کی تدریس و تحقیق میں قابل قدر خدمات انجام دی ہیں۔ اس ادارے کے ساتھ پروفیسروں اور پرنسپلوں کی حیثیت سے ڈاکٹر لائٹنر، پروفیسر اسٹرائٹن، سر ٹامس آرنلڈ، سر آرل اسٹائن، پروفیسر وولنر، ڈاکٹر اقبال، پروفیسر مولوی محمد شفیع، پروفیسر شیرانی کے ایسے ماہرین علوم مشرقی کے نام وابستہ رہے ہیں۔ اب چونکہ اس ادارے نے اپنی عمر کے سو سال پورے کر لیے ہیں، اس لئے اس کا جشن صد سالہ منانے کا پروگرام بنایا گیا ہے۔ اس موقع پر ماہرین علوم مشرقی کی ایک بین الاقوامی کانگریس بھی ترتیب دی جا رہی ہے۔ اس میں شرکت کے لئے اپنے نمائندے بھیجیے۔

میں نے یہ مراسلہ دنیا کی تقریباً تمام اہم یونیورسٹیوں اور تحقیقی اداروں کو بھیج دیا۔

دو ہفتے بھی نہیں گذرے تھے کہ اس مراسلے کے جواب موصول ہونے لگے۔ ان میں اوریئنٹل کالج کی علمی اور تحقیقی خدمات کو سراہا گیا تھا، جشن صد سالہ اور ماہرین علوم مشرقی کی بین الاقوامی کانگریس کا خیر مقدم کیا گیا تھا۔ اس موقع پر اپنے نمائندے بھیجنے کے وعدے کئے گئے تھے یا مجبوریوں کے باعث افسوس کے ساتھ معذرت کی گئی تھی۔ پیغامات بیشتر نے بھیجے تھے۔

مجھے اپنے مراسلے کے ان جوابات اور خصوصاً موصول ہونے والے پیغامات سے بے حد مسرت ہوئی، اور یہ سوچ کر اطمینان ہوا کہ اوریئنٹل کالج کا نام ہر یونیورسٹی اور ہر تحقیقی ادارے میں عزت اور احترام کے ساتھ لیا جاتا ہے۔ اسی لیے یہ ادارے اوریئنٹل کالج کے جشن صد سالہ میں کسی نہ کسی حیثیت سے شریک ہونے کے لیے تیار ہو رہے ہیں۔ کوئی نمائندے بھیج رہا ہے، کوئی پیغام پر اکتفا کر رہا ہے اور

معذرت خواہ ہے ۔ لیکن بہر حال وہ اورینٹل کالج کے جشن صد سالہ سے اپنے آپ کو کسی نہ کسی طرح وابستہ کر رہا ہے ۔

جن یونیورسٹیوں سے جواب یا پیغامات وصول ہوئے، ان میں کیلی فورنیا، مشیگن، وسکانسن، پرنسٹن، فلیڈلفیا، مینی سوٹا، اری زونا، کولمبیا، واشنگٹن، ییل، هارورڈ، میک گل، ٹورنٹو، اوٹوا، آکسفورڈ، کیمبرج، لندن، مانچسٹر، اڈنبرا، گلاسگو، ڈرهم، برمنگم، بلفاسٹ، ڈبلن، بون، برلن، فرنیکفرٹ، میونخ ، پیرس، روم، جدہ، مدینہ، عمان، دمشق، بغداد، استنبول، انقرہ، تہران، مشہد، کابل، پشاور، کراچی، حیدرآباد (سندھ)، کوئٹہ (بلوچستان) وغیرہ کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں ۔

یونیورسٹیوں اور تحقیقی اداروں کے ساتھ ساتھ میں نے بعض ایسے اہم پروفیسروں کو ذاتی طور پر بھی خط لکھے تھے، جنھوں نے علوم مشرقی میں اپنی تحقیقی کاوشوں سے اضافے کئے ہیں ۔

ان ذاتی خطوط کے جواب میں جن کے گراں قدر پیغامات وصول ہوئے، ان میں لندن اسکول آف اورینٹل اینڈ افریکن اسٹڈیز، لندن یونیورسٹی کے ڈائرکٹر پروفیسر سر سیرل فلپس، شعبہ اردو کے استاد رالف رسل اور قانون کے پروفیسر اینڈرسن، کیمبرج یونیورسٹی مڈل ایسٹرن سنٹر کے ڈائرکٹر اور عربی کے پروفیسر ڈاکٹر سارجنٹ، مانچسٹر یونیورسٹی کے فارسی کے پروفیسر بوائل، ڈرہم یونیورسٹی کے اورینٹل اسٹڈیز کے ڈائرکٹر جان ہے وڈ، هارورڈ یونیورسٹی کے پروفیسر ولیم کینٹول اسمتھ اور پروفیسر اینی میری شمل، میکگل یونیورسٹی مانٹریال کے پروفیسر چارلس ایڈمنر، آکسفورڈ یونیورسٹی کے پروفیسر بیسٹن، مینی سوٹا یونیورسٹی کے ڈاکٹر بارکر، جرمنی کے پروفیسر وائشر، روم یونیورسٹی کے پروفیسر بوسانی، پیرس یونیورسٹی کے پروفیسر ڈاکٹر حمید اللہ اور آندرے گوئیمبرتیر، ماسکو کی پروفیسر مارا استپانیس، استنبول یونیورسٹی کے پروفیسر ڈاکٹر عبدالقادر قرہ حان، تہران یونیورسٹی کے پروفیسر مجتبی مینوی، پروفیسر سید حسین نصر، پروفیسر مہدی محقق، پروفیسر ناصر الدین شاہ حسینی، پروفیسر مظاہر مصفا، پروفیسر

ضیاء الدین سجادی، مشہد یونیورسٹی کے پروفیسر جلال متینی اور پروفیسر مشکاۃ الدینی، کابل یونیورسٹی کے پروفیسر وصی اللہ سمیعی اور پروفیسر سعید افغانی، قاہرہ کے پروفیسر شیخ الفحام، سعودی عرب کے ڈاکٹر زینی اور ناصر العبودی، کراچی یونیورسٹی کے پروفیسر محمود حسین خان اور ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی، کوئٹہ کے پروفیسر کرار حسین، حیدر آباد سندھ کے پروفیسر نبی بخش بلوچ، پشاور یونیورسٹی کے پروفیسر عبدالہاشم خاں اور پروفیسر دانی اور اسلام آباد یونیورسٹی کی پروفیسر کنیز فاطمہ یوسف کے نام خاص طور پر اہمیت رکھتے ہیں۔

ان نامور دوستوں نے نہ صرف خط کے جواب میں جشن صد سالہ کے موقع کے لیے پیغامات بھیجے، بلکہ مجھے ذاتی خط بھی لکھے جن میں اوریئنٹل کالج کی علمی اور تعلیمی خدمات کو سراہا اور موجودہ زمانے میں اوریئنٹل کالج جس طرح ترقی کر رہا ہے، اس کی تعریف کی۔ ان میں کچھ احباب جشن صد سالہ کی تقریبات میں شرکت کے لیے تشریف بھی لائے۔

یہ بہت بڑی کامیابی تھی اور یہ سب کچھ نتیجہ تھا ان لا تعداد خطوط کا جو میں نے اوریئنٹل کالج کے پرنسپل اور مشرقی علوم کے ایک ادنی خادم کی حیثیت سے یونیورسٹیوں، تحقیقی اداروں اور علومِ مشرقی کے ماہروں کو لکھے تھے۔

آج میں سوچتا ہوں تو مجھے یہ سب کچھ ایک خواب سا نظر آتا ہے۔ مجھے یقین نہیں تھا کہ میں اس حد تک ان سب کا تعاون حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاؤں گا۔

یہ سب کچھ ان نغمہ ہائے شوق کا کرشمہ تھا جن کو میں نہایت خلوص سے لکھتا رہا تھا۔

تالیف نسخہ ہائے وفا

(آغازِ کار)

دنیا کے اتنے اہم اداروں اور ایسے بڑے بڑے پروفیسروں اور محققوں کا تعاون حاصل کرنا آسان کام نہ تھا ، لیکن بہر حال یہ تعاون کسی طرح غیبی مدد سے حاصل ہو گیا ۔

میں نے احباب کو اس سے مطلع کیا ۔ رفقائے کار کو یہ خوش خبری سنائی ۔ بعضوں کو حیرت ہوئی اور بعضے اس خوش خبری کو سن کر مسرت سے ہمکنار ہوئے ۔ کیونکہ اب جشن صد سالہ کی بنیاد پڑ چکی تھی اور علوم مشرقی کی بین الاقوامی کانگریس کا ہیولا تیار ہو گیا تھا ۔ جب اتنے اداروں کے پیغامات موصول ہو جائیں اور ایسے بڑے بڑے پروفیسر اس اقدام کو سراہیں ، اور ان میں سے بعض شرکت کی خواہش ظاہر کریں، بلکہ وعدہ کر لیں تو ظاہر ہے کہ جشن صد سالہ کی تقریبات کی کامیابی میں کس کو شبہہ ہو سکتا ہے ۔

کانگریس کا پروگرام میرے ذہن میں پہلے تشکیل پا چکا تھا ۔ یہی خیال تھا کہ پہلے دن کا اجلاس افتتاحی ہو گا جس میں پیغامات

پڑھ کر سنائے جائیں گے، مندوبین کا استقبال کیا جائے گا اور خطبات دیے جائیں گے۔ دوسرے دن اورینٹل کالج کی ادبی خدمات کے موضوع پر دو اجلاس ہوں گے۔ ایک میں تحقیقی مقالے پڑھے جائیں گے، دوسرے میں اورینٹل کالج کے بارے میں سمپوزیم ہو گا جس میں تقریریں ہوں گی، تیسرے دن کے دونوں اجلاس اسلامیات اور عربی زبان اور ادب پر ہوں گے۔ چوتھے دن کے دونوں اجلاسوں میں ایرانی تہذیب و ثقافت اور فارسی زبان و ادب کا تذکرہ ہوگا۔ پانچویں دن کے دونوں اجلاس برعظیم پاکستان و ہند کی تاریخ و ثقافت اور اردو زبان و ادب کے لیے وقف ہوں گے۔ چھٹے دن پنجابی زبان و ادب کا ایک اجلاس ہو گا اور دوسرے اجلاس میں مشرقی علوم کے مسائل پر تقریریں ہوں گی اور قرار دادیں بھی پیش کی جائیں گی۔ کانگریس کا اختتام اسی شب الوداعی عشائیہ پر ہو گا جو پنجاب یونیورسٹی کی طرف سے مندوبین کے اعزاز میں دیا جائے گا۔

یہ خاصا بھاری بھرکم قسم کا پروگرام تھا۔ میں نے احباب اور رفقائے کار کے سامنے جب اس کو پیش کیا تو سب نے اس سے اتفاق کیا۔

چنانچہ یہ پروگرام باقاعدگی کے ساتھ مرتب کر لیا گیا۔

فیصلہ یہ ہوا کہ ۱۷ دسمبر ۱۹۷۲ء سے پروگرام کا آغاز ہو اور ۲۴ دسمبر تک یہ پروگرام جاری رہے۔ چنانچہ اخبارات میں یہ خبر چھپوا دی گئی۔ اجلاسوں کی تفصیل بھی پریس میں آ گئی۔ دعوت نامے اور پروگرام بھی چھپنے کے لئے پریس کو دے دیے گئے۔ یونیورسٹیوں اور پروفیسروں کو بھی اس پروگرام سے مطلع کر دیا گیا۔

پروگرام کو عملی صورت دینے اور زیادہ سے زیادہ کامیاب بنانے کی کوششیں اپنے شباب پر تھیں کہ دسمبر کے شروع میں اچانک طالب علموں اور پولیس والوں کے درمیان کسی معمولی سی بات پر تصادم ہو گیا۔ خیال تھا دو ایک روز میں حالات معمول پر آ جائیں گے۔ لیکن اس تصادم میں روز بروز شدت ھی پیدا ہوتی گئی اور چھ سات تاریخ تک یہ عالم ہو گیا کہ طالب علموں اور پولیس کے درمیان صبح کو

باقاعدہ لڑائی شروع ہوتی اور دوپہر کے بعد تک جاری رہتی تھی - پولیس آنسو گیس چھوڑتی تھی اور طالب علم اینٹیں چلاتے تھے - اچھی خاصی لڑائی کا منظر تھا۔

یہ صورت حال بعض لوگوں کی نادانی اور حماقت کی وجہ سے پیدا ہوئی -

۱۲ دسمبر تک ہم نے انتظار کیا۔ اس امید پر کہ حالات بہتر ہو جائیں گے اور جشن صد سالہ کی تقریبات پروگرام کے مطابق منعقد ہو سکیں گی - لیکن حالات روز بروز بد سے بد تر ہوتے گئے - چنانچہ ۷ دسمبر کی شام کو ہم لوگوں نے یہ فیصلہ کیا کہ ان تقریبات کو ملتوی کر دیا جائے، کیونکہ ان حالات میں کانگریس کے اجلاس نہیں ہو سکیں گے، اور اگر کسی طرح اجلاسوں کا انتظام کر بھی لیا گیا تو باہر سے آئے ہوئے مندوبین بہر صورت یہ تماشا دیکھیں گے اور اس طرح سبکی ہو گی اور ہمارے قومی وقار کو ٹھیس لگے گی -

چنانچہ ۷ دسمبر کی شام کو باہر سے آنے والے تمام مندوبین کو کیبل کے ذریعے یہ اطلاع دی گئی کہ بعض ناساز گار حالات کی وجہ سے کانگریس کو ملتوی کرنا پڑا ہے، اور اب اس کے اجلاس مارچ میں ہوں گے -

یہ کیبل بعضوں تک پہنچے، بعضوں تک نہیں پہنچ سکے، کیونکہ وہ کیبل پہنچنے سے قبل ہی لاہور کے لیے روانہ ہو چکے تھے، اس خیال سے کہ انہیں کانگریس شروع ہونے سے دو ایک روز قبل لاہور پہنچنا چاہیے -

مجھے اس کا اندیشہ تھا کہ بعض لوگوں کو تار نہیں مل سکیں گے اور وہ ضرور ۱۷ دسمبر سے قبل لاہور پہنچ جائیں گے - اس لیے میں نے یہ سوچ رکھا تھا کہ جو مندوبین پہنچ جائیں گے ان کے لیے معمولی سا جلسہ کر لیں گے اور معذرت کے ساتھ ان کے مقالے پڑھوا دیں گے -

اس کے سوا اور چارۂ کار ھی کیا تھا۔

کیبل کے ذریعے کانگریس کے ملتوی ھونے کی اطلاع دے کر ھم لوگ ذرا اطمینان سے بیٹھے، لیکن یہ اطمینان بالکل وقتی تھا۔

۱۲ دسمبر کو یہ اطلاع ملی کہ سعودی عرب سے جدہ یونیورسٹی کے پروفیسر ڈاکٹر محمود زینی ۱۵ دسمبر کو لاھور پہنچ رھے ھیں۔ ان کے ساتھ مدینہ یونیورسٹی کے شیخ ناصر العبودی بھی ھوں گے۔

مجھے جب یہ تار ملا تو میں نے ھوائی اڈے پر ان کے استقبال کا کام ڈاکٹر رانا احسان الٰہی کے سپرد کیا۔ ڈاکٹر رانا سعودی عرب کے دوران قیام میں ان سے مل چکے تھے، اور انہیں بخوبی جانتے تھے۔

فلیٹیز ھوٹل میں قیام کا انتظام ھم لوگوں نے پہلے ھی کر لیا تھا۔ اس لیے جہاں تک قیام و طعام کا تعلق تھا ، اس سلسلے میں کوئی دشواری نہیں تھی۔

ڈاکٹر رانا نے ۱۵ دسمبر کو لاھور کے ھوائی اڈے پر سعودی عرب کے ان مہمانوں کا استقبال کیا، اور انہیں فلیٹیز ھوٹل میں پہنچا دیا اور یہ بھی اطلاع دے دی کہ وہ ۱۷ دسمبر کو ایک جلسے میں اپنے مقالے پڑھیں گے۔

۱۵ دسمبر کو میں چپ چاپ گھر پر بیٹھا ھوا تھا کہ فون کی گھنٹی بجی۔ ایک خاتون اردو میں بول رھی تھیں۔

''میرا نام مارا استپانیس ھے۔ میں روس سے آئی ھوں۔ ڈاکٹر بریلوی سے بات کر سکتی ھوں؟''

میں نے کہا ''میں بول رھا ھوں، آپ کب پہنچیں؟''

کہنے لگیں ''میں آج ھی کراچی پہنچی ھوں۔ پرسوں سہ پہر کو چار بجے کی فلائٹ سے لاھور پہنچوں گی۔ میں نے سوچا، فون پر آپ کو اطلاع کر دوں۔''

میں نے کہا ''آپ کے آنے کا بہت بہت شکریہ ۔ یہ ہماری خوش قسمتی ہے ۔ میں پرسوں سہ پہر کو ہوائی اڈے پر آپ کا استقبال کروں گا اور خوش آمدید کہوں گا۔ امید ہے آپ کا سفر آرام سے گذرے گا ۔''

پروفیسر مارا استیانیس کے آنے سے مجھے بے حد خوشی ہوئی ۔ ان سے میری پرانی ملاقات تھی ۔ ۱۹۶۰ء میں وہ فلسفہ کی کانفرنس میں شرکت کے لیے لاہور آئی تھیں تو ان سے ملنے کا موقع ملا تھا ۔ فصیح اردو بولتی تھیں ۔ اس وقت ان کی عمر ۲۵ سال سے زیادہ نہیں تھی ۔ خوبصورتی کا یہ عالم تھا کہ لاہور میں لوگ یہ کہتے تھے کہ کوہ قاف سے ایک پری آ گئی ہے ۔ علم کا یہ حال تھا کہ علامہ اقبالؒ کے فلسفے پر خوب بحث کر سکتی تھیں ۔

لاہور کے دوران قیام میں ان سے کئی ملاقاتیں ہوئی تھیں ، اور انہوں نے مجھے اپنی شرافت، شائستگی اور علمیت سے بہت متاثر کیا تھا ۔

اوریئنٹل کالج، اسلام، پاکستان اور علامہ اقبالؒ سے انہوں نے گہری دلچسپی ظاہر کی تھی ۔ اس لیے جشن صد سالہ کے موقع کے لیے میں نے انہیں خاص طور پر دعوت دی اور انہوں نے میرے ایک خط پر لاہور آنے کا پروگرام بنا لیا ۔

اس لیے مجھے ان کے آنے کی بے حد خوشی ہوئی ۔

۷ دسمبر کو چار بجے ہوائی اڈے پر پہنچا ۔ سوا چار بجے کراچی سے فلائٹ آئی ۔ مارا استیانیس جہاز سے باہر آئیں ۔ میں نے انہیں دور سے دیکھ کر پہچان لیا ۔ اگرچہ دس پندرہ سال میں ان کے اندر خاصی تبدیلی ہو گئی تھی ۔ چہرے پر عمر کے نشانات نظر آنے لگے تھے، اور وہ شادابی بھی نہیں تھی جو دس سال پہلے ان کے ایک ایک انداز سے ٹپکتی تھی ۔

وہ ہوائی اڈے سے باہر آئیں تو میں نے ان کا استقبال کیا ۔

فصیح اردو میں کہنے لگیں ، ''بڑی مشکل سے لاہور پہنچی ہوں ۔ بہر حال پہنچ گئی ۔''

سب نے کہا ”آپ کا شکریہ کس طرح ادا کیا جائے ۔ آپ نے ہم سب پر بڑا احسان کیا ہے ۔“

کہنے لگیں ”اس میں شکریہ کی کیا بات ہے ۔ میرا تو خود لاہور آنے اور خاص طور پر اورینٹل کالج میں وقت گزارنے کو جی چاہتا ہے ۔ یہ شہر اور یہاں کا علمی ادبی ماحول مجھے بہت پسند ہے ۔“

میں نے کہا ”جب ہی تو ہم لوگ آپ کو کسی نہ کسی طرح کھینچ بلاتے ہیں ۔“

ہم گاڑی میں بیٹھ گئے اور چند منٹ میں میں نے انہیں فلیٹیز ہوٹل پہنچا دیا جہاں ان کے لیے ایک کمرہ پہلے سے مخصوص کرا لیا گیا تھا ۔

ہوٹل میں ہم نے چائے منگوائی ۔

چائے کی پیالی پی کر ان کی تکان کچھ دور ہوئی ۔ باتیں ہوتی رہیں ، کہنے لگیں ”اس وقت میرا لاہور پہنچ جانا معجزے سے کم نہیں ۔ میں لکچر دینے کے لئے فن لینڈ ، ناروے اور ڈنمارک کے دورے پر گئی ہوئی تھی ۔ آپ کا خط میری عدم موجودگی میں ماسکو پہنچا ۔ واپس آئی تو آپ کا خط ملا ۔ چھٹی کا ملنا مشکل تھا ۔ ٹریول گرانٹ بھی ختم ہو چکی تھی، لیکن لاہور پہنچنے اور اورینٹل کالج کے جشن صد سالہ میں شرکت کرنے کو جی چاہتا تھا ۔ میں نے اپنے شوہر سے مشورہ کیا ۔ چانسلر سے ان کے گہرے تعلقات ہیں ۔ انہوں نے چانسلر سے آپ کے دعوت نامے کا ذکر کیا ۔ اورینٹل کالج کے جشن صد سالہ کے بارے میں انہوں نے مجھے نہ صرف چھٹی دی، بلکہ اخراجات سفر بھی منظور کر دیے ۔ اور اب میں ہوٹل کا خرچ تک ساتھ لے کر آئی ہوں ۔“

اس پر میں نے کہا ”اب آپ ہماری مہمان ہیں ۔ ہم کسی طرح بھی یہ گوارا نہیں کرسکتے کہ ہوٹل کے اخراجات تک آپ کا ادارہ دے ۔ ہم پاکستانی اپنی مہمان نوازی کی روایت پر فخر کرتے ہیں ۔ ہم آپ کے شوہر اور یونیورسٹی کے چانسلر دونوں کے شکر گزار ہیں ؟“

کہنے لگیں "پھر یہ ہوٹل کے اخراجات مجھے ادارے کو واپس کرنے ہوں گے۔"

میں نے کہا "واپس کر دیجیے گا: کوئی بات نہیں۔"

یہ باتیں کر کے میں ہوٹل والوں کو خاص ہدایات دے کر واپس آ گیا تاکہ مارا آرام کر سکیں ۔ وہ بہت تھکی ہوئی تھیں ۔

دوسرے دن صبح دس بجے میں نے اوریئنٹل کالج میں جلسے کا انتظام کیا تھا ۔ اس جلسے میں سعودی عرب کے ڈاکٹر محمود زینی، شیخ ناصر العبودی اور سوویٹ یونین کی مارا استپانیس کو مقالے پڑھنے تھے ۔

صبح نو بجے میں فلیٹیز پہنچا ۔ مارا ناشتہ کر چکی تھیں ۔ انہیں ساتھ لیا اور کالج آ گیا ۔ ڈاکٹر رانا ڈاکٹر محمود زینی اور شیخ ناصر العبودی کو ساتھ لے کر آئے ۔

ٹھیک دس بجے جلسہ شروع ہوا ۔

تلاوت کلام پاک کے بعد سب سے پہلے ڈاکٹر محمود زینی نے اپنا تعارف کرایا، اور یہ بتایا کہ انہوں نے برطانیہ کی سینٹ اینڈ ریوز یونیورسٹی سے اسلامی فلسفے پر پی ایچ ۔ ڈی کیا ہے، اور اب وہ جدہ یونیورسٹی میں پروفیسر ہیں ۔ انہوں نے تقریر بھی کی اور فکر اسلامی پر مقالہ بھی پڑھا ۔ ان کے بعد شیخ ناصر العبودی نے نہایت فصیح عربی میں پاکستان، سعودی عرب، مشرقی علوم کی اہمیت اور اسلامی فلسفے پر نہایت خوبصورت تقریر کی ۔ ان کی تقریر نے عرب فن خطابت کی روایت کو تازہ کر دیا

سعودی عرب کے ان مہمانوں کی تقریروں کے بعد مارا اسپانیس نے "اسلام دور جدید میں" کے موضوع پر اپنا عالمانہ اور فکر انگیز مقالہ پڑھا جس کو بہت پسند کیا گیا ۔

ایک بجے کے قریب یہ جلسہ بخیر و خوبی ختم ہوا ۔

میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ جشن صد سالہ کی تقریبات کا آغاز ہو گیا، اور سعودی عرب اور سوویٹ یونین کے مہمانوں سے آغاز ہوا، جس پر اورینٹل کالج جتنا فخر کرے کم ہے۔

دوسرے دن دس بجے میں نے ایک اور جلسہ ترتیب دیا جس میں پروفیسر مارا استپانیس نے علامہ اقبال کے فلسفۂ اخلاق پر ایک گھنٹے کا مقالہ پڑھا۔ اس کی صدارت جشن صد سالہ کمیٹی کے صدر ڈاکٹر جسٹس ایس۔ اے۔ رحمان نے فرمائی۔ یونیورسٹی کے وائس چانسلر ڈاکٹر اجمل سعودی عرب کے مہمان ڈاکٹر زینی اور شیخ ناصر العبودی کے علاوہ سعودی عرب کے کونسلر اور سوویٹ یونین کے کلچرل اتیشی، اورینٹل کالج کے اساتذہ اور یونیورسٹی کے پروفیسر بھی اس جلسے میں موجود تھے۔

مارا استپانیس کا مقالہ نہایت خیال انگیز تھا۔ فلسفہ اقبال ان کے مطالعے کا خاص موضوع ہے۔ اس لیے اس مقالے میں انہوں نے بعض نئی باتیں پیش کیں اور فکرِ اقبال کے کچھ نئے گوشے تلاش کیے۔

ایک بجے کے قریب یہ جلسہ بخیر و خوبی ختم ہوا۔

سعودی عرب کے مہمان ڈاکٹر زینی اور شیخ ناصر العبودی تو دوسرے دن ہی لاہور سے رخصت ہو گئے۔ ہم نے ان کا شکریہ ادا کیا، اور میں نے عربی کے اساتذہ کے ساتھ انہیں لاہور کے ہوائی اڈے پر الوداع کہا۔ مارا استپانیس نے دو روز مزید قیام کیا۔

مارا نے ان دو دنوں میں لاہور کے تاریخی مقامات کی سیر کی، تحقیقی اداروں کو دیکھا اور کچھ خریداری کی۔

میں یہ دیکھ کر حیران ہوا جب انہوں نے یہ خواہش ظاہر کی کہ وہ جوہریوں کی دکانیں دیکھنا چاہتی ہیں اور پاکستان کی بنی ہوئی ایک انگوٹھی اور گلے کا سٹ خریدنے کی خواہش مند ہیں۔

میری بیوی اور میں انہیں بعض جیولرز کی دوکانوں میں لے گئے۔

میں نے از راہ تفنن مارا سے پوچھا ”آپ تو عالم اور محقق ہیں۔ آپ کو زیورات سے کیوں دلچسپی پیدا ہوئی؟“

مارا نے فوراً جواب دیا ''میں بہر حال بنیادی طور پر ایک عورت ہوں۔''

اس فقرے نے مجھے بہت لطف دیا اور میں ان کی بڑائی کا کچھ اور بھی قائل ہو گیا۔

مارا ۲۰ دسمبر کو ماسکو جانے کے لیے کراچی روانہ ہو گئیں، ہم نے انہیں بڑی گرم جوشی سے لاهور کے هوائی اڈے پر الوداع کہا۔

ابھی ان مہمانوں کو رخصت ہی کیا تھا کہ اسلام آباد سے یہ خبر ملی کہ الازہر کے ریکٹر شیخ الفحام اورینٹل کالج کے جشن صد سالہ میں شرکت کے لیے تشریف لا رہے ہیں اور وہ اسلام آباد سے ۲۱ دسمبر کو لاهور پہنچیں گے اور اورینٹل کالج میں جلسے سے خطاب فرمائیں گے۔

شیخ الفحام کو دعوت تو ہم نے اورینٹل کالج کی طرف سے دی تھی، لیکن ان کی شخصیت کی اہمیت کے پیش نظر حکومت پاکستان نے انہیں اپنا مہمان بنا لیا۔

سرکاری مہمان کی حیثیت سے شیخ الفحام لاہور تشریف لائے۔ ہم نے ان کا استقبال کیا اور ان کے اعزاز میں ایک جلسہ ترتیب دیا۔

اس جلسے میں شیخ الفحام نے اورینٹل کالج کی خدمات کو سراہا۔ جشن صد سالہ کے پروگرام کی تعریف کی، پاکستان کی اسلامی خدمات کا اعتراف کیا اور اسلام اور اسلامی نظام پر روشنی ڈالی۔ ان کی تقریر نہایت ہی دلکش تھی۔ خرابی صحت کے باوجود انہوں نے نہایت جوش اور جذبے کے ساتھ اس جلسے سے خطاب کیا۔

آخر میں محفل قرأت منعقد ہوئی جس میں ان قاریوں نے حصہ لیا جو شیخ الفحام کے ساتھ مصر سے تشریف لائے تھے۔

تیسرے روز شیخ الفحام قاہرہ جانے کے لیے کراچی روانہ ہو گئے۔ حکومت پاکستان کے نمائندوں اور میرے ساتھ اورینٹل کالج کے اساتذہ نے انہیں رخصت کیا۔

اس طرح اورینٹل کالج کے جشن صد سالہ کے جلسوں کا آغاز ہوگیا۔ یہ ایک نیک شگون تھا کہ سعودی عرب، سوویٹ یونین اور مصر کی چند اہم شخصیتیں شرکت کے لیے لاہور آ گئی تھیں، اور ہم نے ان کے لیے مقالوں اور تقریروں کے لیے خاص جلسے ترتیب دے لیے تھے۔

ماہرین علوم مشرقی کی کانگریس تو بہر حال مجبوراً ملتوی کر دی گئی تھی اور اس کی تاریخیں ہم نے ۱۲ مارچ سے ۱۷ مارچ تک مقرر کی تھیں اور اب ہم لوگ مارچ کے مہینے کا انتظار کر رہے تھے۔

طلوع سحر

(تقریبات جشن صد سالہ کا آغاز ، کانگریس کا افتتاحی اجلاس)

دسمبر کا مہینہ ختم ہوا - ۱۹۷۳ء کا نیا سال آ گیا - جنوری، فروری کے مہینے آندھی کے جھونکوں کی طرح آئے اور نکل گئے - اور بالآخر مارچ کا مہینہ آن پہنچا - کانگریس کی تاریخیں ۱۲ مارچ سے ۱۷ مارچ تک مقرر ہوئی تھیں - ایک ہفتے کا پروگرام بنایا گیا - اس ایک ہفتے میں افتتاحی اجلاس کے علاوہ، اوریئنٹل کالج کی ادبی خدمات، عربی اور اسلامی علوم، ایرانی تہذیب اور فارسی زبان و ادب، برعظیم پاکستان و ہند کے مسلمانوں کی تہذیب اور اردو زبان و ادب، پنجاب اور پنجابی زبان و ادب اور مشرقی علوم کے مسائل سے متعلق دو دو اجلاس ترتیب دیے گئے تھے - ان اجلاسوں کی تفصیل پروگرام کی صورت میں چھاپ دی گئی - یہ پروگرام انگریزی اور اردو دونوں زبانوں میں چھپ کر آ گئے اور ان کو تقسیم کر دیا گیا - اخبارات میں بھی یہ تفصیلات آ گئیں -

مارچ کے دوسرے ہفتے سے بیرونی ممالک کے مہمانوں کی آمد کا سلسلہ شروع ہو گیا - پی - آئی - اے کو ہم لوگوں نے پہلے ہی

اطلاع دے رکھی تھی۔ ان لوگوں نے ہمارے ساتھ تعاون کیا اور مہمانوں کے آنے کی ہمیں اطلاع دی۔ حکیم محمد سعید صاحب اور ہمدرد فاؤنڈیشن نے بھی کراچی کے ہوائی اڈے پر اوریئنٹل کالج کے مہمانوں کے استقبال کا انتظام کیا تاکہ انہیں کوئی دشواری نہ ہو۔ پی۔ آئی۔ اے اور ہمدرد کے تعاون سے ہمیں ہر مہمان کے آنے کی اطلاع مل جاتی تھی اور مجلس استقبالیہ کے ممبر اور کانگریس کے کارکن لاہور کے ہوائی اڈے پر ان کا استقبال کرتے تھے۔ مجلس استقبالیہ کے ممبروں نے اپنا دفتر بھی لاہور کے ہوائی اڈے پر قائم کر دیا تھا، اور جشن صد سالہ کے سلسلے میں ہونے والی علوم مشرقی کی کانگریس کے بڑے بڑے بینر بھی لگا دیے تھے، تاکہ مہمانوں کو اس کا علم ہو جائے اور انہیں کوئی دقت نہ ہو۔ کراچی سے آنے والی ہر فلائٹ پر یہ لوگ موجود رہتے تھے۔

۹ اور ۱۰ مارچ کو مختلف پروازوں سے لندن کے رالف رسل، لائیڈن، نیدر لینڈ کے پروفیسر بولجان، استنبول، ترکی کے پروفیسر عبدالقادر قرہحان، تہران، ایران کے ناصر الدین شاہ حسینی، ڈاکٹر مظاہر مصفا اور خانم مصفا، مشہد ایران کے پروفیسر جلال متینی اور پروفیسر مشکاۃ الدینی لاہور پہنچ گئے۔ ان کا شاندار استقبال کیا گیا۔ کابل کے مہمان پروفیسر وصی اللہ سمیعی، اور پروفیسر سعید الافغانی کابل سے پشاور آئے اور پشاور سے بذریعہ ریل لاہور پہنچے۔ ریلوے اسٹیشن پر بھی مجلس استقبالیہ کا دفتر قائم کر دیا گیا تھا، اور ہر وقت استاد اور طلباء مہمانوں کے استقبال کے لیے وہاں موجود رہتے تھے۔ ان کے ساتھ کراچی، پشاور اور حیدر آباد کے مہمان بھی آ گئے۔ بیشتر مہمانوں کے قیام کا انتظام انٹرنیشنل ہوٹل میں کیا گیا۔ رالف رسل میرے ساتھ ٹھہرے۔ کراچی کے مہمانوں نے بھی میرے ساتھ قیام کیا۔ کچھ مہمان نیو کیمپس میں بیچلرز ہوسٹل میں ٹھہرے۔ غرض ۱۱ مارچ کی صبح تک تقریباً تمام مہمان آ گئے اور ان کے قیام و طعام کا معقول انتظام کر دیا گیا۔

بالآخر ۱۲ مارچ کا تاریخی دن آ گیا۔ پروگرام کے مطابق ۴ بجے سہ پہر کو جشن صد سالہ کی تقریبات کا آغاز ماہرین علوم مشرقی کی

بین الاقوامی کانگریس کے افتتاحی اجلاس سے ہوا ۔

سینیٹ ہال چار بجے سے پہلے ہی پوری طرح بھر گیا تھا ۔ دنیا کی مختلف یونیورسٹیوں اور تحقیقی اداروں کے مندوبین کے علاوہ ہائی کورٹ اور سپریم کورٹ کے جج، مشہور ماہرین تعلیم، پروفیسر، ادیب، شاعر، صحافی، اور سرکاری افسر بھی اس افتتاحی اجلاس میں شرکت کے لیے ہال میں موجود تھے ۔ سب سے پہلے بیرونی ممالک سے آئے ہوئے مندوبین ہال میں آئے اور اگلی صفوں میں آ کر بیٹھ گئے ۔ ان میں امریکہ کے ڈڈلے وڈبری، انگلستان کے رالف رسل اور جان ہے ووڈ، ترکی کے عبدالقادر قرہ خان، سعودی عرب کے ناصر العبودی اور شیخ علی مشرف، مصر کے عبدالمقصود شلقامی، ایران کے پروفیسر جلال متینی، مشکاۃ الدینی، ناصر الدین شاہ حسینی، مظاہر مصفا اور خانم مصفا، افغانستان کے پروفیسر وصی اللہ سمیعی اور سعید افغانی، اور پاکستان کے مندوبین میں کراچی کے ڈاکٹر ریاض الاسلام، ڈاکٹر محمد یوسف، ڈاکٹر عابد علی خان، ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی، ڈاکٹر فرمان فتح پوری، پروفیسر ممتاز حسین، حیدر آباد (سندھ) کے ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان اور پشاور کے ڈاکٹر میر ولی خان، ڈاکٹر شمس الدین صدیقی، ڈاکٹر سید مرتضی جعفری، پروفیسر خیال بخاری، (ڈائرکٹر، پشتو اکیڈمی) جناب خاطر غزنوی اور اسلام آباد کی ڈاکٹر کنیز فاطمہ یوسف قابل ذکر ہیں ۔ ان کے علاوہ پنجاب یونیورسٹی کے مختلف کالجوں کے سابق وائس چانسلر پروفیسر حمید احمد خان بھی تشریف فرما تھے اور ڈاکٹر سید عبداللہ اور ڈاکٹر محمد باقر، علامہ علاؤالدین صدیقی اور پروفیسر سید وقار عظیم بھی ان کے ساتھ ہال میں موجود تھے ۔ اگلی صفوں میں ڈاکٹر جسٹس ایس ۔ اے ۔ رحمان اور ڈاکٹر اجمل بھی مندوبین کے استقبال کے لیے موجود تھے ۔ غرض بڑی بڑی شخصیتوں نے اس اجلاس کو رونق بخشی تھی ۔

ان اہم شخصیتوں کی موجودگی میں سوا چار بجے کے قریب کالج کے پرنسپل، اوریئنٹل اینڈ اسلامک فیکلٹی کے ڈین اور بین الاقوامی ماہرین علوم مشرقی کی کانفرنس کے جنرل سکریٹری نے اجلاس کے شروع ہونے کا اعلان کیا ۔

چنانچہ تلاوت کلام پاک سے اس کا آغاز ہوا۔ قاری محمد ظریف صاحب نے کلام پاک کی تلاوت کی ۔ سب سے پہلے کالج کے پرنسپل نے اپنا خطبۂ استقبالیہ پڑھا جس میں اورینٹل کالج کی اہمیت پر روشنی ڈالی، اس کے جشن صد سالہ اور اس موقع پر ہونے والی علوم مشرقی کی بین الاقوامی کانگریس کا ذکر کیا۔ جن یونیورسٹیوں اور تحقیقی اداروں نے اس میں شرکت کے لیے اپنے اپنے نمائندے بھیجے یا پیغامات دیے ان کا شکریہ ادا کیا، مندوبین اور حاضرین کا استقبال کیا اور ان کو خوش آمدید کہا، اور شکریہ ادا کیا ۔ اس کے بعد سب سے پہلے سکریٹری جنرل نے صدر پاکستان، قائد عوام جناب ذوالفقار بھٹو کا پیغام پڑھ کر سنایا جو انہوں نے اس موقع کے لیے ارسال کیا تھا ۔ صدر پاکستان کے بعد دنیا کی مختلف یونیورسٹیوں کے پیغامات پڑھ کر سنائے۔

کیمبرج یونیورسٹی کا پیغام ڈاکٹر چوھدری رفیع محمد اور آکسفورڈ یونیورسٹی کا پیغام پروفیسر سراج الدین نے پڑھا ۔ مندوبین نے بھی اپنی اپنی یونیورسٹیوں کی طرف سے پیغامات پڑھ کر سنائے، جن میں اورینٹل کالج کی خدمات کا اعتراف اور اس کے جشن صد سالہ کی تقریبات کے موقع پر مسرت کا اظہار تھا ۔

آخر میں، پنجاب یونیورسٹی کے وائس چانسلر اور مجلس استقبالیہ کے صدر، اورینٹل کالج کے جشن صد سالہ کی کمیٹی کے صدر ڈاکٹر جسٹس ایس ۔ اے ۔ رحمان نے اپنے اپنے خطبات پڑھے۔ ان خطبات میں اورینٹل کالج کی تاریخ اور اس کی عظیم روایت کو واضح کر کے اس کے جشن صد سالہ کی اہمیت کو واضح کیا، اور اورینٹل کالج کو زیادہ سے زیادہ ترقی دے کر ایک سنٹر آف اکسیلنس بنانے کی طرف توجہ دلائی ۔

اس اجلاس کا افتتاح رسمی طور پر پنجاب کے وزیر اعلےٰ ملک معراج خالد کرنے والے تھے، لیکن وہ ناسازی طبع کے باعث تشریف نہ لا سکے ۔ اس لیے میں نے پنجاب یونیورسٹی کے وائس چانسلر ڈاکٹر اجمل سے درخواست کی کہ وہ رسمی طور پر اورینٹل کالج کے جشن صد سالہ کے موقع پر

ہونے والی اس بین الاقوامی کانگریس کا افتتاح کریں ، چنانچہ انہوں نے افتتاح کیا -

رسم افتتاح کے بعد پرنسپل کے اظہار شکر کے ساتھ یہ افتتاحی اجلاس بخیر و خوبی ختم ہوا -

اس اجلاس کے فوراً بعد پنجاب یونیورسٹی کی طرف سے مندوبین کے اعزاز میں ایک استقبالیہ دیا گیا - سینیٹ ہال سے اٹھ کر تمام مہمان یونیورسٹی ہال کے سامنے سبزہ زار میں جمع ہوئے اور یونیورسٹی کی طرف سے دیے جانے والے استقبالیہ میں شرکت کی ، اور دیر تک ایک دوسرے سے ملتے اور باتیں کرتے رہے - یہ نہایت ہی پر کیف اور دل آویز منظر تھا -

چھ بجے تک اس تقریب کا سلسلہ جاری رہا -

شب کو آٹھ بجے اورینٹل کالج کے صحن میں پرنسپل کی طرف سے معزز مہمانوں کے اعزاز میں عشائیہ دیا گیا - اس میں کانگریس میں شریک ہونے والے مندوبین کے علاوہ پروفیسروں، ادیبوں، شاعروں اور فن کاروں نے بھی شرکت کی -

رات کو دس بجے کے قریب یہ محفل اختتام پذیر ہوئی - مندوبین اپنے اپنے ہوٹلوں کی طرف اور دوسرے مہمان اپنے گھروں کو رخصت ہوئے -

اور ہم سب نے خدا کا شکر ادا کیا کہ آج کے دن جشن صد سالہ کی تقریبات کا آغاز ہو گیا - افتتاحی اجلاس بخیر و خوبی انجام پایا - ہر شخص کو اس سے مسرت ہوئی، اور اس نے اورینٹل کالج کے مہذب ماحول اور اساتذہ اور طلباء کے حسن انتظام کو سراہا - اس طرح مہینوں سے جو کوششیں ہم کر رہے تھے وہ بار آور ہوئیں -

میرے لیے اس سے زیادہ مسرت کی بات اور کیا ہو سکتی تھی؟

میخانۂ مشرق

(اوریئنٹل کالج کی ادبی خدمات)

جشن صد سالہ کی تقریبات کے سلسلے میں ہونے والی کانگریس کا دوسرا اجلاس منگل ۱۳ مارچ ۱۹۷۳ء کو ۹ بجے سینیٹ ہال میں شروع ہوا۔

اس اجلاس کو تین حصوں میں تقسیم کیا گیا تھا۔ پہلے سیشن میں اوریئنٹل کالج کے اساتذہ کے تحقیقی کام کی نمائش کا اہتمام تھا۔ دوسرے میں اوریئنٹل کالج کی علمی خدمات پر تحقیقی مقالے پڑھنے کا انتظام اور تیسرے میں اوریئنٹل کالج سے متعلق ایک سمپوزیم تھا، جس میں چند تقریروں کا اہتمام کیا گیا تھا۔

نمائش کا افتتاح ۹ بجے صبح وزیر خزانہ (پنجاب) حنیف رامے صاحب نے اپنی تقریر سے کیا۔ یہ جلسہ کالج کے چمن میں ہوا۔ اس موقع پر خاصی تعداد میں مندوبین اور اوریئنٹل کالج سے دلچسپی رکھنے والے موجود تھے۔

حنیف رامے صاحب نے اپنی تقریر میں اوریئنٹل کالج کی تاریخ بیان کی، اس کی علمی اور ادبی خدمات کا ایک جائزہ پیش کیا۔ بڑے بڑے

پروفیسروں اور پرنسپلوں کے علمی اور تحقیقی کام پر روشنی ڈالی، اور آج بھی اورینٹل کالج جس طرح اس روایت کو برقرار رکھے ہوئے ہے اور علمی کام کر رہا ہے، اس کو سراہا - آخر میں یہ وعدہ بھی کیا کہ اورینٹل کالج کے مختلف شعبوں میں پی ایچ-ڈی اور ایم-اے کے جو بے شمار مقالے لکھے گئے ہیں، ان کی اشاعت کے لیے حکومت پنجاب امداد دینے پر ہمدردی سے غور کرے گی -

حکومت پنجاب کی طرف سے جشن صد سالہ کے موقع پر انھوں نے یونیورسٹی کے لیے خصوصی گرانٹ کا اعلان بھی کیا -

اس کے بعد انھوں نے کالج کی عمارت میں رسمی طور پر نمائش کا افتتاح کیا -

یہ نمائش بڑے سلیقے سے ترتیب دی گئی تھی - کالج کے پہلے پرنسپل ڈاکٹر لائٹنر سے لے کر موجودہ دور تک کے تمام اساتذہ کی مطبوعات کو پورے کالج میں سلیقے سے پھیلا دیا گیا تھا - اس کے لیے شیشے کے بڑے بڑے کیس استعمال کئے گئے تھے - کالج کی مطبوعات اور اورینٹل کالج میگزین کی تمام جلدیں بھی ایک کمرے میں جمع کی گئی تھیں - اساتذہ کی تصویروں کو بھی نہایت اہتمام سے دیواروں پر آویزاں کیا گیا تھا -

اس نمائش کو دیکھ کر پہلی نظر ہی میں یہ نقش دل پر بیٹھ جاتا تھا کہ اورینٹل کالج نے جتنا علمی کام کیا ہے، پاکستان و ہند کے کسی تدریسی ادارے نے اتنا کام نہیں کیا -

حاضرین اس نمائش کو دیکھ کر بہت خوش ہوئے - یہ نمائش ایک ہفتے تک جاری رہی - اس کام میں ڈاکٹر وحید قریشی، ڈاکٹر سید ناظر حسن زیدی، ڈاکٹر عبیداللہ خان اور ڈاکٹر آفتاب اصغر نے گہری دلچسپی لی اور بڑی محنت سے یہ کام انجام دیا -

دس بجے کے بعد نمائش دیکھنے والے سینیٹ ہال کی طرف گئے - پنجاب کے وزیر خزانہ حنیف رامے اور سابق وائس چانسلر پروفیسر

حمید احمد خان، مندوبین، اساتذہ اور طلبا و طالبات سب چند منٹ میں سینیٹ ہال پہنچ گئے، کیونکہ اس وقت وہاں اورینٹل کالج کی ادبی خدمات کے موضوع پر کانگریس کا خصوصی اجلاس ہونے والا تھا۔

وزیر تعلیم ڈاکٹر عبدالخالق کی عدم موجودگی میں وزیر خزانہ حنیف رامے نے اس اجلاس کا افتتاح کیا اور پنجاب یونیورسٹی کے نامور وائس چانسلر پروفیسر حمید احمد خان نے اس کی صدارت کی۔

ساڑھے دس بجے کے قریب سینیٹ ہال مہمانوں سے پوری طرح بھر گیا، اور تلاوت کلام پاک سے جلسے کا آغاز ہوا۔

پہلے پروفیسر حمید احمد خان صاحب نے اپنی صدارتی تقریر کی۔ اپنی تقریر میں انہوں نے کہا کہ میں کئی سال کے بعد یونیورسٹی کی کسی تقریب میں شرکت کر رہا ہوں۔ اس کے بہت سے اسباب تھے جن کی وضاحت میں اس وقت نہیں کرنا چاہتا۔ اس جلسے میں میرے شامل ہونے کی وجہ اورینٹل کالج سے میری گہری دلچسپی ہے۔ میں اورینٹل کالج، اس کے اساتذہ اور علمی خدمات کو بڑے ہی احترام کی نظر سے دیکھتا ہوں۔ ہماری قومی اور ملی زندگی میں اورینٹل کالج نے نمایاں کام کیا ہے۔ اس کی ان کاوشوں کو کبھی بھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ پنجاب یونیورسٹی کا نام بھی اورینٹل کالج نے روشن کیا ہے، کیونکہ اورینٹل کالج اور اس کے اساتذہ کی مطبوعات اس کے نام کو دور دور لے گئی ہیں، اور دنیا میں علوم مشرقی کے ماہروں نے نہ صرف ان کی اہمیت کا اعتراف کیا ہے، بلکہ ان سے استفادہ بھی کیا ہے۔ یہ سعادت شاید ہی برعظیم کے کسی دوسرے تدریسی ادارے کو نصیب ہوئی ہو۔

اس قسم کے خیالات کو ظاہر کرنے کے بعد انہوں نے حنیف رامے صاحب سے کہا کہ وہ اس اجلاس کا افتتاح کریں۔

حنیف رامے صاحب نے اپنی مختصر تقریر سے اس اجلاس کا افتتاح کیا۔ اس تقریر میں انہوں نے اورینٹل کالج کی خدمات کے بارے میں کم و بیش انہی خیالات کا اظہار کیا جو وہ علمی کام کی نمائش کے موقع پر ظاہر کر چکے تھے۔

وزیر خزانہ کی تقریر کے بعد مندوبین میں سے بعض نے پیغامات پڑھے اور مختصر تقریریں کیں۔ ان میں مشہد یونیورسٹی کے پروفیسر جلال متینی، تہران یونیورسٹی کے پروفیسر ناصر الدین شاہ حسینی، استنبول یونیورسٹی کے پروفیسر عبدالقادر قرہ خان، کابل یونیورسٹی کے پروفیسر وسی اللہ سمیعی، ڈرہم یونیورسٹی کے پروفیسر جان ہے ووڈ اور اسکول آف اورینٹل اینڈ افریکن اسٹڈیز کے پروفیسر رالف رسل کی مختصر تقریریں خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ان سب نے اورینٹل کالج کی علمی خدمات کو سراہا اور جشن صد سالہ کے موقع پر اپنے اپنے اداروں کی طرف سے اس ادارے کو خیر سگالی اور محبت کا پیغام دیا۔

ان پیغامات اور تقریروں کے بعد پرنسپل اورینٹل کالج نے پیرس کے پروفیسر محمد حمید اللہ، بون اور ہارورڈ کی مشہور و معروف محقق پروفیسر ڈاکٹر اینی میری شمل اور روم یونیورسٹی کے نامور پروفیسر الیسندرو بوسانی کے مقالے پڑھ کر سنائے۔ ان مقالوں میں اورینٹل کالج کے ماضی اور حال کا جائزہ لے کر اس کی علمی اور تحقیقی خدمات کو سراہا گیا تھا۔

اس اجلاس میں ڈاکٹر عبدالحمید، پروفیسر سید وقار عظیم، ڈاکٹر محمد باقر اور احمد ندیم قاسمی صاحب نے اورینٹل کالج کے مختلف پہلوؤں پر عالمانہ مقالے پڑھے۔

ڈاکٹر حمید نے اورینٹل کالج کی تاریخ کو ایک مختصر مقالے میں قلم بند کر کے تاریخ کے پروفیسر ہونے کا حق ادا کر دیا۔ اورینٹل کالج کے سابق پرنسپل ڈاکٹر محمد باقر نے اپنے زمانے کے اورینٹل کالج کی نہایت ہی خوبصورت تصویر کھینچی اور اس زمانے کے اساتذہ کا ذکر بڑے دلچسپ انداز میں کیا۔ پروفیسر سید وقار عظیم صاحب نے اپنے گراں قدر مقالے میں اورینٹل کالج کے طلبہ اور طالبات کے تحقیقی کام کی تفصیل پیش کی اور ایم۔ اے اور پی ایچ۔ ڈی کی ڈگریوں کے لیے جو کام ہوا ہے، اس کا مکمل جائزہ لیا۔ احمد ندیم قاسمی صاحب نے اپنے دلچسپ مقالے میں اورینٹل کالج کی خدمات کو سراہا۔ اس کے مخصوص ماحول

کی وضاحت کی اور اس نے علم و ادب کی دنیا میں جو کارنامے انجام دیے ہیں، ان کے بارے میں اپنے تاثرات پیش کیے۔

یہ اجلاس ایک بجے تک جاری رہا۔

اوریئنٹل کالج کی خدمات سے متعلق دوسرا اجلاس کھانے کے بعد دو بجے شروع ہوا۔ اس اجلاس کی صدارت کے لیے فیض صاحب اپنی گونا گون مصروفیتوں کے باوجود میری درخواست پر صرف چند گھنٹوں کے لیے اسلام آباد سے لاہور آئے۔

اجلاس شروع ہونے سے قبل ہی وہ سینیٹ ہال میں پہنچ گئے تھے۔ میں ہال میں پہنچا تو انہوں نے معانقہ کیا۔ میں نے ان سے معذرت کی اور کہا کہ مجھے افسوس ہے کہ جب آپ آئے تو میں استقبال کے لیے موجود نہیں تھا۔

کہنے لگے ''میں ابھی تھوڑی دیر ہوئی ہوائی جہاز سے لاہور پہنچا، سیدھا ادھر آ گیا۔ اس لیے چند منٹ پہلے پہنچ گیا''۔

میں نے شکریہ ادا کیا۔

کہنے لگے ''آج ہی مجھے واپس اسلام آباد جانا ہے۔ ضروری کام ہیں۔ میں اوریئنٹل کالج کا پرانا طالب علم ہوں۔ اس وجہ سے میرا اس اجلاس میں شریک ہونا ضروری تھا۔ پھر آپ کا اصرار تھا۔ یہ دونوں باتیں مجھے یہاں کھینچ لائی ہیں''۔

میں نے ایک دفعہ پھر شکریہ ادا کیا، اور درخواست کی کہ اسٹیج پر تشریف لے چلیے تاکہ اجلاس کی کارروائی شروع کی جائے۔

فیض صاحب نے صدارت کی کرسی سنبھالی، اور جلسے کا آغاز تلاوت کلام پاک سے ہوا۔

پہلے فیض صاحب نے اپنی صدارتی تقریر کی۔ انہوں نے اس تقریر میں یہ بتایا کہ گورنمنٹ کالج سے انگریزی میں ایم۔ اے کرنے کے بعد

وہ عربی میں ایم ۔ اے کرنے کی غرض سے اورینٹل کالج میں داخل ہوئے ۔ اس وقت مولوی محمد شفیع صاحب عربی کے پروفیسر اور کالج کے پرنسپل تھے ۔ انہوں نے ہمیں داخل کر لیا اور ہم نے اورینٹل کالج میں دو سال گزار کر عربی میں ایم ۔ اے کر لیا ۔ اس زمانے میں بھی اورینٹل کالج بہت مشہور تھا ۔ بڑے بڑے اساتذہ یہاں موجود تھے ، اور تدریس اور تحقیق دونوں کی ایک عظیم روایت اس کالج میں موجود تھی ۔ اورینٹل کالج کی اس روایت کو کبھی بھی فراموش نہیں کیا جا سکتا ۔ ان کے نقوش ہماری زندگی پر بڑے گہرے ہیں ۔

فیض صاحب کی اس صدارتی تقریر کے بعد اورینٹل کالج کی خدمات کے بارے میں سمپوزیم شروع ہوا ۔ اس اجلاس میں پروفیسر صوفی غلام مصطفے تبسم، ڈاکٹر عبداللہ چغتائی، ڈاکٹر میر ولی خان، حکیم نیر واسطی، مولانا عبدالقدوس اور ڈاکٹر صابر علی خان نے اپنے زمانے کے اورینٹل کالج کے متعلق تاثراتی تقریریں کیں جن سے گذشتہ ساٹھ ستر سال کے اورینٹل کالج کی مختلف تصویریں سامنے آگئیں ۔ حاضرین جلسہ نے ان تقریروں میں گہری دلچسپی لی اور ان سے بہت لطف اندوز ہوئے ۔

دو عالمانہ مقالے بھی اس اجلاس میں پڑھے گئے ۔ ایک تو کراچی یونیورسٹی کے پروفیسر اردو اور ڈین فیکلٹی آف آرٹس ڈاکٹر ابواللیث صدیقی کا مقالہ جو انہوں نے اورینٹل کالج کے بانی اور پہلے پرنسپل ڈاکٹر لائٹنر کے بارے میں پڑھا ۔ دوسرا کالج کے پرانے طالب علم اور لاہور کے جج چوھدری غلام رسول اظہر نے اورینٹل کالج کے عربی کے سابق پروفیسر اور پرنسپل ڈاکٹر برکت علی قریشی کی شخصیت پر نہایت ھی مفصل، جامع اور مفید مقالہ پڑھا ۔

لیث صاحب نے نہایت عالمانہ انداز میں ڈاکٹر لائٹنر کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں کی وضاحت کی، ان کے علمی اور تعلیمی کام پر روشنی ڈالی اور اورینٹل کالج، مشرقی علوم اور نظام تعلیم کے سلسلے میں ان کی خدمات کا تفصیلی جائزہ لیا ۔ چوھدری صاحب نے ڈاکٹر برکت علی قریشی

مرحوم کی شخصیت کا ایسا خاکہ پیش کیا کہ حاضرین نے انہیں چلتے پھرتے، ھنستے بولتے اور عالمانہ باتیں کرتے ہوئے دیکھ لیا، اور ان کی شخصیت کی مکمل تصویر آنکھوں کے سامنے آ گئی۔

پانچ بجے کے قریب اورینٹل کالج کے بارے میں یہ صحبت اختتام کو پہنچی۔ پرنسپل نے فیض صاحب اور مہمانوں کا شکریہ ادا کیا ، اور چائے کی ایک پیالی پی کر سب مہمان رخصت ہوئے۔

شب کو یونائیٹڈ بنک کی طرف سے مہمانوں کے اعزاز میں فلیٹیز ہوٹل میں پرتکلف عشائیہ دیا گیا۔

اس عشائیے میں مہمانوں کا استقبال یونائیٹڈ بنک کے مہتمم جناب سلطان محمد خان نے کیا۔ پنجاب کے وزیر اعلی جناب ملک معراج خالد بھی اس میں شریک ہوئے اور مہمانوں کے سامنے اردو میں تقریر کی، جس کا ترجمہ انگریزی میں سلطان محمد خان صاحب نے کیا۔

تقریباً گیارہ بجے رات تک یہ پر لطف محفل جاری رہی۔

حدیث حجاز

(مجلس اسلامیات اور عربی زبان و ادب)

پروگرام کے مطابق اورینٹل کالج کے جشن صد سالہ کے سلسلے میں ہونے والی ماہرین علوم مشرقی کی بین الاقوامی کانگریس کا دوسرا اجلاس تیسرے دن بدھ (۲۱ مارچ ۱۹۷۳ء) کو صبح نو بجے سینیٹ ہال میں شروع ہوا ۔ تلاوت کلام پاک سے اس کا آغاز ہوا ۔

یہ اجلاس اسلامیات اور عربی زبان و ادب کے بارے میں تھا ۔ اس کے افتتاح کے لیے پاکستان میں مراکش کے سفیر ہز اکسیلنسی ڈاکٹر السادانی سے درخواست کی گئی تھی ۔ لیکن وہ بعض مجبوریوں کی وجہ سے تشریف نہ لا سکے ۔ پروگرام کے مطابق اس اجلاس کے صدر لائیڈن یونیورسٹی کے اسلامیات کے پروفیسر جے ۔ ایم ۔ ایس بولجان تھے ۔ انہوں نے اس اجلاس کی صدارت بھی کی اور اس کا افتتاح بھی کیا ۔

پروفیسر بولجان نے شروع میں صدارتی تقریر کی جس میں اسلام، اسلامی علوم، اسلامی نظام فکر کا ذکر کیا اور انسانی تاریخ میں اس کی

اہمیت پر روشنی ڈالی ۔ پھر کچھ تذکرہ اورینٹل کالج کا کیا ۔ پھر لائیڈن یونیورسٹی اور اورینٹل کالج کے باہمی رابطے کی وضاحت کی، اور اورینٹل کالج میں جو کام ہوا ہے اس کو سراہا۔ جشن صد سالہ اور بین الاقوامی کانگریس کی اہمیت واضح کی ۔ کانگریس کے منتظمین اور مندوبین کا شکریہ ادا کیا ۔ اور مقالہ پڑھنے والوں سے یہ درخواست کی کہ مقالوں کی تعداد، چونکہ زیادہ ہے ، اور وقت کم ہے ، اس لیے بیس منٹ سے زیادہ وقت نہ لیں ۔

اس پر عمل کیا گیا ۔

سب سے پہلے هارورڈ یونیورسٹی سے آئے ہوئے اسکالر ڈاکٹر ڈڈلے وڈبری نے ''محمد عبدہ'' پر اپنا مقالہ پڑھا ۔ اس کے بعد ڈرھم یونیورسٹی کے پروفیسر اور اسکول آف اورینٹل اسٹڈیز کے ڈائرکٹر جان ہے ووڈ نے اپنا مقالہ پڑھا ۔ پھر مدینہ یونیورسٹی کے شیخ ناصر العبودی اور شیخ علی مشرف نے مقالے پڑھے۔ قاہرہ یونیورسٹی کی پروفیسر ڈاکٹر فاطمہ موسیٰ محمود نے شرکت کا وعدہ کیا تھا اور مقالہ بھی پہلے بھجوا دیا تھا ، لیکن وہ کسی وجہ سے لاہور نہ پہنچ سکیں ۔ اس لیے ڈاکٹر رانا احسان الٰہی نے ان کا مقالہ ''جدید عربی کا افسانوی ادب'' پڑھ کر سنایا ۔ آخر میں ڈاکٹر پیر محمد حسن اور مولانا عبدالقدوس (پشاور یونیورسٹی) نے اپنے مقالے پڑھے ۔

دو بجے کے بعد اس اجلاس کا دوسرا سیشن شروع ہوا ۔ پروگرام کے مطابق اس سیشن کی صدارت الازہر یونیورسٹی کے شیخ الفحام کرنے والے تھے ۔ لیکن وہ دسمبر میں لاہور تشریف لائے تھے اور اورینٹل کالج کے جلسے میں شرکت کر کے واپس چلے گئے تھے ۔ مارچ میں پھر آنے کا وعدہ کیا تھا، لیکن خرابی صحت کے باعث تشریف نہ لا سکے ۔ اس لیے اس اجلاس کی صدارت اورینٹل کالج کے نامور فرزند، لکھنؤ یونیورسٹی کے عربی اور اسلامیات کے سابق پروفیسر اور صدر شعبہ اور فیکلٹی آف آرٹس کے ڈین پروفیسر ڈاکٹر محمد وحید مرزا نے کی ۔ سکرٹری کے فرائض عربی کے پروفیسر ڈاکٹر رانا احسان الٰہی نے انجام دیے ۔

ڈاکٹر وحید مرزا نے اورینٹل کالج کے پرانے طالب علم کی حیثیت سے کچھ اپنے زمانے کے کالج اور اساتذہ کی باتیں کیں ۔ ان کی تدریسی اور تحقیقی کاوشوں کا ذکر کیا، اور اسلامی علوم اور عربی زبان و ادب میں جو کارنامے انہوں نے انجام دیے ہیں، ان کی وضاحت کی ۔ پھر جشن صد سالہ منانے پر اطمینان کا اظہار کیا اور علوم مشرقی کی بین الاقوامی کانگریس کو سراہا ۔

ڈاکٹر صاحب کی صدارتی تقریر کے بعد مقالے پڑھے گئے ۔ سب سے پہلے لائیڈن یونیورسٹی (نیدر لینڈ) کے پروفیسر اسلامیات پروفیسر بوآجان نے شاہ ولی اللہ پر اپنا مقالہ پڑھا ۔ اس کے بعد کراچی یونیورسٹی کے پروفیسر ڈاکٹر محمد یوسف نے اپنا مقالہ پڑھا ۔ پروفیسر قدرت اللہ فاطمی نے حجاج کی جہاز رانی پر اپنا تحقیقی مقالہ پیش کیا ۔ قاہرہ کے پروفیسر عبدالمقصود شلقامی نے بھی اس اجلاس میں اپنا مقالہ پڑھا ۔ آخر میں ملتان کی اسماء رشید صاحبہ نے فلسطین کی شاعری پر اپنا نہایت دلچسپ مقالہ پیش کیا ۔ مقالے تعداد میں زیادہ تھے، اس لیے بعض مقالے پڑھے نہ جا سکے ۔

یہ اجلاس پانچ بجے تک جاری رہا ۔

میں اس اجلاس میں صرف تھوڑی دیر کے لیے شریک ہو سکا کیونکہ ڈھائی بجے کے قریب مجھے ہوائی اڈے جانا پڑا ۔

رات کو اورینٹل کالج میں فارسی کے وزیٹنگ پروفیسر ڈاکٹر پناہی نے یہ اطلاع دی تھی کہ سفیر کبیر شاہنشاہ ایران جناب آقای منوچہر ظلی ۳ بجے کی پرواز سے لاہور پہنچیں گے ۔

میں نے انہیں خاص طور پر فارسی کے اجلاس کے افتتاح کے لیے دعوت دی تھی، اور انہوں نے از راہ نوازش اس کو قبول فرمایا تھا ۔ اس لیے ظاہر ہے کہ میرے لیے ہوائی اڈے پر ان کا استقبال کرنا ضروری تھا ۔

چنانچہ میں اس اجلاس کے صدر سے اجازت لے کر اپنے بعض رفقاء کے ساتھ ہوائی اڈے پر پہنچا ۔

سوا تین بجے کے قریب اسلام آباد سے جہاز آیا ۔ آقای منوچہر ظلی اس جہاز سے تشریف لائے ۔ ہم نے جہاز کے قریب جا کر ان کا استقبال کیا ۔ خوش آمدید کہا، گلے میں ہار ڈالے، انہیں وی، آئی، پی روم میں لائے ۔ تھوڑی دیر باتیں ہوئیں ۔

پھر پناہی صاحب انہیں اپنی جائے قیام پر لے گئے اور ہم واپس سینیٹ ہال آ گئے ۔

اس وقت ساڑھے چار بج چکے تھے، اور عربی کا دوسرا اجلاس ختم ہونے کے قریب تھا ۔ میں مشکل سے بیس منٹ ہال میں بیٹھا ہوں گا کہ پانچ بجے کے قریب یہ اعلان ہوا کہ اجلاس ختم ہوتا ہے ۔

اجلاس کے ختم ہونے کے بعد ہم لوگ مہمانوں کے ساتھ اٹھ کر سنڈیکیٹ روم میں گئے جہاں چائے کا انتظام تھا ۔ مہمانوں کے ساتھ چائے پی اور باتیں کیں ۔

چند منٹ میں چائے پی کر سب لوگ رخصت ہوئے ۔

شب کو آج عشائیہ خانہ فرہنگ ایران کی طرف سے ترتیب دیا گیا تھا ۔

ہم لوگ آٹھ بجے کے قریب خانہ فرہنگ، گل برگ پہنچے تو دیکھا آقای فرزانہ‌پور مہمانوں کا استقبال کر رہے ہیں ۔ خانہ فرہنگ کی عمارت بڑی خوبصورتی سے سجائی گئی ہے ۔ روشنی کا بھی نہایت عمدہ انتظام ہے ۔ ہر طرف رنگ و نور کی بارش ہے ۔

اس دلکش اور دلاویز ماحول میں مہمانوں نے کھانا کھایا، اور دس بجے کے قریب رخصت ہوئے ۔

خیابان ایران

جمعرات ۱۵ مارچ ۱۹۷۳ء

آج ۹ بجے صبح ایران کی تاریخ و ثقافت اور فارسی زبان و ادب کا اجلاس شروع ہونے والا تھا۔ میں ۸ بجے صبح کالج پہنچ گیا اور آج کے اجلاس کے لیے کچھ ضروری کام کر رہا تھا کہ فون کی گھنٹی بجی۔

میں نے فون اٹھایا۔

لاہور کے ہوائی اڈے سے پی آئی اے کے عملے کے کوئی صاحب بول رہے تھے۔

کہنے لگے ''آپ کے جشن صد سالہ میں شرکت کے لیے ایک مہمان ان سے تشریف لائے ہیں۔ مجتبی مینوی اپنا نام بتاتے ہیں۔''

میں پروفیسر آقای مجتبی مینوی کا نام سن کر کچھ حیران و پریشان ہوا۔ میں نے انہیں چند روز ہوئے تار دیا تھا اور فارسی کے اجلاس میں شرکت کی درخواست کی تھی۔ انہوں نے کرم فرمایا اور لاہور تشریف لے آئے۔

حیرت اور مسرت کے عالم میں میں نے پی۔آئی۔اے والوں سے کہا "پروفیسر صاحب ہمارے بڑے ہی محترم مہمان ہیں۔ آپ ان کا استقبال کیجئے۔ خوش آمدید کہیے اور فی الحال فون انہیں دے دیجیے، میں بات کروں گا۔"

"اقبال لاہوری" کے مصنف پروفیسر آقای مجتبی مینوی انگریزی میں بول رہے تھے۔ "میں لاہور آ گیا ہوں اور آج فارسی کے اجلاس میں شرکت کروں گا۔"

میں نے کہا "آپ نے بڑا کرم فرمایا۔ ہم سب آپ کے ممنون احسان ہیں۔ آپ نے جو لطف فرمایا ہے اور جو نوازش کی ہے اس کو ہم کبھی بھی فراموش نہیں کر سکتے۔ آپ کی پرواز کا صحیح علم نہیں تھا، ورنہ میں آپ کے استقبال کے لیے ضرور ہوائی اڈے پر موجود ہوتا۔ اب صرف چند منٹ میں فارسی کے پروفیسر آپ کے پاس پہنچ رہے ہیں۔"

میں نے ٹیلی فون بند کیا۔ شکور صاحب، آفتاب اصغر اور ڈاکٹر میاں بشیر حسین کو بلایا، ان کو یہ خوش خبری سنائی اور کہا "گاڑی حاضر ہے۔ زحمت کیجیے اور ہوائی اڈے تشریف لے جائیے۔"

شکور صاحب آفتاب اصغر اور میاں بشیر حسین خوش ہوئے اور پروفیسر مجتبی مینوی کو لینے کے لیے ہوائی اڈے پہنچ گئے، اور تھوڑی دیر میں انٹرنیشنل ہوٹل پہنچ کر مجھے فون کیا کہ پروفیسر صاحب کو ہوٹل پہنچا دیا گیا ہے۔ تیار ہونے میں انہیں کوئی آدھ گھنٹہ لگے گا۔"

میں نے کہا "آپ اطمینان سے آئیے۔ ہم اجلاس کی کارروائی ذرا تاخیر سے شروع کریں گے۔ پروفیسر صاحب کی موجودگی سے اجلاس کی رونق دوبالا ہو جائے گی۔"

ساڑھے نو بجے کے قریب پروفیسر مجتبی مینوی ڈاکٹر جسٹس ایس۔اے رحمن اور اساتذۂ فارسی کے ساتھ سینیٹ ہال میں پہنچے۔ اس وقت تک سینیٹ ہال پوری طرح بھر چکا تھا۔ سب نے کھڑے ہو کر پروفیسر

صاحب کا استقبال کیا ۔ مندوبین میں ڈاکٹر ناصر الدین شاہ حسینی، ڈاکٹر مظاہر مصفا، ڈاکٹر سجادی، اور ڈاکٹر جلال متینی نے ان سے معانقہ کیا ۔

یہ منظر دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا ۔

ابھی پروفیسر مجتبی مینوی کا استقبال ہو ہی رہا تھا کہ سفیر کبیر ایران هز اکسیلنسی آقای منوچہر ظلی کے آنے کی خبر ملی ۔ ہم لوگ ان کے استقبال کے لیے ہال سے باہر گئے، اور انہیں ہال میں لا کر مہمان خصوصی کی نشست پر بٹھا دیا ۔

اب اجلاس شروع ہوا ۔ سکرٹری کے فرائض شکور احسن صاحب نے انجام دیے ۔

اس اجلاس کے صدر پروگرام کے مطابق تہران یونیورسٹی کے پروفیسر ڈاکٹر سید ناصر الدین شاہ حسینی تھے ۔ جب ان سے کرسی صدارت پر تشریف لانے کی درخواست کی گئی تو انہوں نے اپنی نشست پر جا کر یہ فرمایا کہ ''میں صدارت کے اعزاز کے لیے تہ دل سے شکر گزار ہوں ، لیکن اس جلسے میں استاذ الاساتذہ پروفیسر آقای مینوی تشریف فرما ہیں ۔ میں ان کی موجودگی میں صدارت کس طرح کر سکتا ہوں ۔''

یہ کہہ کر انہوں نے پروفیسر مینوی سے درخواست کی کہ وہ تشریف لائیں ۔ چنانچہ وہ کرسی صدارت پر تشریف لائے ۔ دونوں نے معانقہ کیا ۔

اور اس طرح دونوں کی صدارت میں اس اجلاس کا آغاز ہوا ۔

پہلے قاری ظریف صاحب نے کلام پاک کی تلاوت کی ۔ اس کے بعد پروفیسر مجتبی مینوی نے اپنی صدارتی تقریر شروع کی ۔ انہوں نے پاکستان اور ایران، ان دونوں برادر ملکوں کے تعلقات، علامہ اقبالؒ، اورینٹل کالج اور اس کی اہمیت پر روشنی ڈالی اور پھر علامہ اقبالؒ کی زبور عجم سے ایک غزل اور ایک نظم کے کچھ اشعار اپنے مخصوص والہانہ انداز میں پڑھے ۔ ان کے پہلے مصرعے یہ ہیں :

چون چراغ لالہ سوزم در خیابان شما

اے غنچۂ خوابیدہ چو نرگس نگران خیز

اور پھر اس اجلاس کے مہمان خصوصی سفیر کبیر شاھنشاہ آریا مہر آقای منوچہر ظلی سے درخواست کی کہ وہ ایرانی تاریخ، ثقافت اور فارسی زبان و ادب کے اجلاس کا افتتاح فرمائیں ۔

چنانچہ ہز اکسیلنسی نے اس اجلاس کا افتتاح فرمایا ۔

اپنے افتتاحیہ خطبے میں انہوں نے ایران اور پاکستان کے برادرانہ تعلقات کا ذکر کیا ۔ دونوں برادر ملکوں کے ثقافتی رشتوں پر روشنی ڈالی ۔ اورینٹل کالج کی تدریسی اور تحقیقی روایت کو سراھا اور اس کے جشن صد سالہ کے موقع پر ہونے والی بین الاقوامی کانگریس کا خیر مقدم کیا ۔

اس تقریر کے بعد تہران یونیورسٹی کے پروفیسر ڈاکٹر مظاہر مصفا نے لاھور کی تعریف میں اپنا قصیدہ پڑھا، جس کو سن کر حاضرین جھوم جھوم اٹھے اور ان پر ایک سرخوشی کا عالم طاری ھو گیا ۔ یہ شاہکار قصیدہ اس جشن نامے میں اپنے مقام پر درج ہے ۔

اب مقالات شروع ھوئے ۔

اس اجلاس میں مشہد یونیورسٹی (ایران) کے پروفیسر ڈاکٹر جلال متینی اور ڈاکٹر عبدالمحسن مشکاۃ الدینی، کابل یونیورسٹی، افغانستان کے پروفیسر وصی اللہ سمیعی، تہران یونیورسٹی کے پروفیسر ڈاکٹر ضیاء الدین سجادی، ڈرھم یونیورسٹی، انگلستان کے پروفیسر جان ہے ووڈ، استنبول یونیورسٹی (ترکی) کے پروفیسر ڈاکٹر عبدالقادر قرہ خان نے اور اورینٹل کالج میں فارسی کے وزیٹنگ پروفیسر ڈاکٹر احمد علی پناھی نے اپنے اپنے مقالے پڑھے ۔

ایک بجے یہ اجلاس ختم ھوا ۔

ایران اور فارسی زبان کا دوسرا اجلاس ظہرانے کے بعد ڈھائی بجے کے قریب شروع ھوا ۔ اس کی صدارت کابل یونیورسٹی کے پروفیسر وصی اللہ سمیعی نے کی ۔

سمیعی صاحب نے پہلے سیشن میں اپنا مقالہ فصیح عربی زبان میں پڑھا تھا۔ اب صدارتی تقریر نہایت فصیح اور رواں فارسی زبان میں کی اور کلام پاک کی آیتوں کے حوالے سے عالم اسلام کی یک جہتی اور اتحاد کی اہمیت کو واضح کیا۔ فارسی زبان و ادب پر بھی روشنی ڈالی اور اورینٹل کالج کی خدمات کو بھی سراہا۔

ان کی تقریر فن خطابت کا نہایت عمدہ نمونہ تھی۔ ان کی ہر بات دل سے نکلی ہوئی آواز معلوم ہوتی تھی اور ان کا ہر خیال خلوص اور صداقت میں ڈوبا ہوا محسوس ہوتا تھا۔

اس اجلاس میں تہران یونیورسٹی کے پروفیسر ڈاکٹر ناصر الدین شاہ حسینی، کابل یونیورسٹی کے پروفیسر ڈاکٹر سعید افغانی، کراچی یونیورسٹی کے پروفیسر ڈاکٹر عابد علی خان اور پشاور یونیورسٹی کے ڈاکٹر کے۔ بی نسیم نے مقالے پڑھے۔

پانچ بجے تک یہ اجلاس جاری رہا۔ چائے کے بعد مندوبین اور دوسرے مہمان رخصت ہوئے۔

آج کے عشائیے کا انتظام پیکیجز لمیٹڈ نے اپنے کارخانے میں فیروز پور روڈ پر کیا تھا۔ اور قوالی کی محفل بھی ترتیب دی تھی۔ آٹھ بجے کے قریب مہمان پیکیجز لمیٹڈ میں پہنچ گئے، عشائیے میں شرکت کی اور قوالی کی محفل سے محظوظ ہوئے۔

یہ پر کیف محفل رات کے بارہ بجے تک جاری رہی اور ہر گوشۂ بساط کو دامان باغبان و کف گل‌فروش بناتی رہی۔

محفل آردو و ثقافت اسلامیان پاکستان و ہند

ماہرین علوم مشرقی کی بین الاقوامی کانگریس کا پروگرام بنانے وقت یہ طے کیا گیا تھا کہ اردو کے اجلاس کو صرف اردو زبان اور ادب کے مختلف پہلوؤں ہی تک محدود نہ رکھا جائے، بلکہ اسلامیان پاکستان و ہند کی تاریخ، ثقافت اور ادب کو بھی اس میں شامل کر لیا جائے تا کہ اس اجلاس کا دائرہ ذرا وسیع ہو جائے۔

یہ اجلاس جمعہ کے دن ۱۶ مارچ ۱۹۷۳ء کو ۹ بجے صبح سینیٹ ہال میں شروع ہوا۔

اس اجلاس کے افتتاح کے لیے میں نے مولانا کوثر نیازی صاحب کو زحمت دی تھی۔ انہوں نے وعدہ کیا تھا کہ وہ انشاء اللہ ضرور ۱۶ مارچ کو اس اجلاس کا افتتاح کریں گے، اور اس موضوع کے لیے خاص طور پر ایک خطبہ بھی تیار کریں گے۔ لیکن وہ نیشنل اسمبلی میں اپنی بعض مصروفیات کی وجہ سے صبح لاہور نہ پہنچ سکے۔ فون پر انہوں نے یہ اطلاع دی کہ وہ دوپہر کی پرواز سے لاہور پہنچیں گے۔ اس لیے ان کا پروگرام دوسرے اجلاس میں رکھا گیا۔

صبح کے اجلاس کی صدارت اسکول آف اورینٹل اینڈ افریکن اسٹڈیز لندن کے استاد اردو پروفیسر رالف رسل نے کی۔ افتتاح بھی انہیں کے ھاتھوں ھوا۔

رسل نے مختصر تقریر میں اسلامیان پاکستان و ھند کی ثقافت پر روشنی ڈالی اور اردو زبان اور ادب کی اھمیت کو واضح کیا۔ فصیح اردو میں انہوں نے یہ بھی بتایا کہ انہیں اردو زبان اور ادب سے کب کیوں اور کیسے دلچسپی پیدا ھوئی اور یہ کہ انہوں نے اب تک کیا کام کیا ھے۔ انہوں نے اورینٹل کالج کو جشن صد سالہ منانے پر مبارک باد دی اور اس اھم ادارے کی علمی ادبی خدمات کو سراھا۔

اس صدارتی تقریر کے بعد مقالات پڑھے گئے۔ سب سے پہلے پنجاب یونیورسٹی کے سابق وائس چانسلر اور اردو زبان کے نامور ادیب اور ماھر تعلیم پروفیسر حمید احمد خان نے مولانا حالی کی نادر و نایاب تالیف ''سفر نامہ حکیم ناصر خسرو'' پر مختصر لیکن دلچسپ مقالہ پڑھا۔ ان کے بعد لائیڈن یونیورسٹی کے پروفیسر بولجان نے شاہ ولی اللہ دھلوی کے فلسفۂ حیات پر نہایت خیال انگیز مقالہ پڑھا۔ ان کے بعد پشاور یونیورسٹی کے ڈاکٹر محمد شمس الدین صدیقی نے کلام سودا کے اھم قلمی نسخوں پر، کراچی یونیورسٹی کے پروفیسر ڈاکٹر ریاض الاسلام نے وسط ایشیا اور برعظیم پاکستان و ھند کے روابط پر اور ڈاکٹر منظور احمد نے علامہ اقبالؒ پر، پشاور یونیورسٹی میں چینی زبان کے استاد خاطر غزنوی نے اردو، پنجابی اور چینی زبان کے تعلق پر، اور کراچی یونیورسٹی کے ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے اردو اور علاقائی زبانوں کے موضوع پر اپنے اپنے مقالے پیش کئے، جو بہت پسند کئے گیے۔ سوویت یونین کی پروفیسر ڈاکٹر مارا استپانیس دسمبر میں لاھور آ کر اپنا مقالہ علامہ اقبالؒ کے فلسفہ اخلاق پر پڑھ چکی تھیں۔ اس اجلاس میں اس مقالے کا خلاصہ پڑھ کر سنا دیا گیا۔ مشیگن یونیورسٹی امریکہ کے ڈاکٹر کارلو کپولا، جو اپنے رسالے ''محفل'' کی وجہ سے اردو دنیا میں مشہور ھیں، بعض مجبوریوں کے باعث لاھور نہ پہنچ سکے، لیکن انہوں نے اپنا گراں قدر مقالہ اردو کی ترقی پسند تحریک اور یورپ کے موضوع پر ھوائی ڈاک سے مجھے بھیج دیا۔ ایک دن پہلے

ان کا پارسل مل گیا ۔ اس لیے ان کا یہ مقالہ بھی اس اجلاس میں پڑھ کر سنا دیا گیا ۔

یہ اجلاس ڈیڑھ بجے کے قریب ختم ھوا ۔

ظہرانے کے بعد اس سلسلے کا دوسرا اجلاس ڈھائی بجے شروع ھوا ۔ اس کی صدارت سندھ یونیورسٹی کے پروفیسر اور صدر شعبہ اردو ڈاکٹر غلام مصطفے خان صاحب نے کی ۔

اجلاس کو شروع ھوئے ابھی آدھ گھنٹے سے زیادہ نہیں ھوا تھا کہ مولانا کوثر نیازی ھوائی اڈے سے سیدھے سینیٹ ھال پہنچ گئے اور اپنی نشست سنبھال لی ۔ انہوں نے حاضرین سے معذرت کی اور کہا کہ نیشنل اسمبلی میں ان کی موجودگی ضروری تھی ، اس لیے وہ صبح لاھور نہ پہنچ سکے ۔ افتتاحی اجلاس میں شریک نہ ھونے پر انہوں نے اظہار افسوس کیا ۔

اس مختصر سی تقریر کے بعد مولانا نے اپنا خطبہ پڑھا، جس میں اردو زبان کی وسعت، ھندی مسلمانوں کی جدو جہد آزادی میں اس کی اھمیت اور قیام پاکستان کی تحریک میں اس کے کارھائے نمایاں پر روشنی ڈالی ۔ موجودہ دور میں اس زبان اور اس کے ادب کے لیے جو کچھ کیا جا رھا ھے، خاص طور پر عوامی حکومت نے اس کو جو اھمیت دی ھے اور قومی تعمیر میں اس کی ضرورت کو جس طرح محسوس کیا ھے، اس پر تفصیل سے اظہار خیال کیا ۔ اردو کی خدمت کے لیے انہوں نے اورینٹل کالج کی کوششوں کو بھی سراھا ۔

مولانا کے خطبے کے بعد مقالات کا دور شروع ھوا۔ سب سے پہلے لندن یونیورسٹی کے استاد پروفیسر رالف رسل نے انگلستان میں اردو کی تعلیم کے موضوع پر پر از معلومات مقالہ پڑھا ۔ اس کے بعد کراچی یونیورسٹی کے پروفیسر فلسفہ ڈاکٹر منظور احمد نے علامہ اقبالؒ کے فلسفیانہ خیالات کے موضوع پر، ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی نے ڈاکٹر لائٹنر اور اورینٹل کالج کے

موضوع پر، اور ڈاکٹر افتخار احمد غوری نے دکنی اردو کے موضوع پر اپنے اپنے مقالے پڑھے۔

پانچ بجے یہ اجلاس ختم ہوا تو مولانا کوثر نیازی اور تمام مندوبین سنڈیکیٹ روم میں گئے جہاں چائے کا انتظام تھا۔ اس موقع پر مندوبین نے مولانا کوثر نیازی سے بھی باتیں کیں، اور مختلف موضوعات پر آپس میں تبادلۂ خیال کیا۔

چھ بجے کے قریب سب مہمان رخصت ہوئے۔

میں نے مولانا کوثر نیازی کا ذاتی طور پر شکریہ ادا کیا اور انہیں اسلام آباد رخصت کیا، کیونکہ نیشنل اسمبلی کے اجلاس کی وجہ سے ان کی واپسی اسی شب ضروری تھی۔

آٹھ بجے شب کو حبیب بینک کی طرف سے فلیٹیز میں عشائیہ کا انتظام تھا۔ مندوبین اور دوسرے مہمان آٹھ بجے کے قریب فلیٹیز پہنچ گئے۔ عشائیے میں شرکت کی اور دس بجے تک باتیں کرتے رہے۔

آج عشائیے کے بعد تقریریں نہیں ہوئیں۔ غیر رسمی سا ماحول رہا، اور مہمانوں نے اس غیر رسمی ماحول کو بہت پسند کیا۔

شاید اس وجہ سے کہ لوگ تھک کر چور ہو چکے تھے۔

بہار آخر شد

ہفتہ ۱۷ مارچ ۱۹۷۳ء

آج کانگریس کا آخری دن تھا۔

کل رات ہی سے مجھے جشن صد سالہ کے ختم ہونے کا احساس ہونے لگا تھا۔ کئی سال سے ہم جس کی منصوبہ بندی کر رہے تھے، اور کئی مہینے جس کو کامیاب بنانے کے لیے ہم سب شب و روز محنت کر رہے تھے، وہ پروگرام آج ختم ہونے والا تھا۔

اس احساس سے میرے اندر مسرت اور اداسی کے ملے جلے جذبات پیدا ہو رہے تھے۔ مسرت اس بات کی تھی کہ ہماری محنت بار آور ہوئی اور جو کچھ ہوا خوش‌اسلوبی سے ہوا اور احساس غم اس بات کا کہ ایک ہفتے تک جو رونق اس شہر اور اس کالج میں رہی وہ آج ہماری آنکھوں سے اوجھل ہو جائے گی۔ دور دور سے آئے ہوئے مہمان رخت سفر باندھیں گے، اور اپنے اپنے ملکوں اور شہروں کو واپس چلے جائیں گے۔

اور پھر یہ احساس بھی تھا کہ جو آئندہ سو سال تک زندہ رہے گا وہی آئندہ اوریئنٹل کالج کا دوسرا جشن صد سالہ دیکھ سکے گا۔ ایک صدی

تک اب اس کالج کا جشن صد سالہ نہیں منایا جا سکتا ۔ لیکن ایک صدی کی مہلت بھلا کس کو نصیب ہوتی ہے؟ ۔

ان احساسات اور خیالات کے سائے میں آج کے اجلاس کا آغاز ہوا ۔

حسب معمول ۹ بجے مندوبین اور مہمان سینیٹ ہال میں جمع ہوئے ۔ پروگرام کے مطابق آج پنجابی زبان اور ادب کے دو اجلاس ہونے والے تھے ۔

پہلا اجلاس ۹ بجے کے بعد شروع ہوا ۔ اس کی صدارت علامہ علاؤالدین صدیقی صاحب نے کی اور اس میں پنجابی زبان و ادب کے مختلف پہلوؤں پر ڈاکٹر لئیق بابری، مرزا مقبول بیگ بدخشانی، جناب اسلم قریشی اور بیگم رضیہ مدد علی نے مقالے پڑھے ۔

علامہ صاحب نے اپنی صدارتی تقریر میں پنجابی زبان اور ادب کی اہمیت کو واضح کیا اور اس اجلاس کی ترتیب پر اچھے خیالات ظاہر کیے ۔

پنجابی کا دوسرا اجلاس، کافی کے بعد، ۱۱ بجے شروع ہوا ۔ اس کی صدارت پنجابی اور اردو کے مشہور شاعر جناب صوفی تبسم صاحب نے کی اور جناب جیلانی کامران، عین الحق فرید کوٹی، قیوم نظر اور اسمعیل بھٹی صاحب نے پنجابی زبان اور ادب پر اپنے مقالے پیش کیے ۔

ایک بجے کے قریب یہ اجلاس ختم ہوا ۔

ظہرانے کے بعد دو بجے پھر مندوبین اور دوسرے مہمان سینیٹ ہال میں جمع ہوئے اور کانگریس کا آخری اجلاس شروع ہوا ۔

استنبول یونیورسٹی کے پروفیسر ڈاکٹر عبدالقادر قرہ خان نے اس اجلاس کی صدارت کی ۔ انہوں نے اپنی صدارتی تقریر میں اس اجلاس کی اہمیت واضح کی اور کہا کہ آج مختلف ملکوں سے آئے ہوئے مندوبین اپنے اپنے ملکوں میں علوم مشرقی کے مختلف شعبوں کی ترقی کے موضوع پر اجلاس میں تقریریں کریں گے اور آخر میں علوم مشرقی کی ترقی کے متعلق چند قرار دادیں پیش کی جائیں گی ۔

چنانچه رالف رسل اور جان ے ووڈ نے انگلستان میں مشرقی علوم کی ترقی کی وضاحت کی ۔ لائیڈن (ہالینڈ) میں جو کام ہو رہا ہے اس پر پروفیسر بولجان نے روشنی ڈالی، ایران میں جو کام ہو رہا ہے اس کی تفصیل ناصر الدین شاہ حسینی نے پیش کی ۔ افغانستان میں جو کام ہو رہا ہے اس کے بارے میں کابل یونیورسٹی کے پروفیسر وصی اللہ سمیعی نے معلومات بہم پہنچائی ۔ امریکہ میں بر عظیم پاکستان و ہند اور جنوبی ایشیا سے متعلق جو کام ہو رہا ہے اس کے بارے میں ڈاکٹر کارلو کپولا کا مقالہ پڑھ کر سنایا گیا جو انہوں نے خاص طور پر مشیگن سے اس اجلاس کے لیے تیار کر کے بھیجا تھا۔ جرمنی میں جو کام ہوا ہے اور اب ہو رہا ہے اس کی تفصیل پروفیسر اینی میری شمل کے مقالے سے معلوم ہوئی جو انہوں نے خاص طور پر اجلاس کے لیے لکھ کر بھیجا تھا ۔ اس کے کچھ حصے بھی اس اجلاس میں پڑھ کر سنائے گئے ۔ آخر میں اس اجلاس کے صدر پروفیسر قرہ خان نے ترکی میں جو کام ہو رہا ہے اس پر تقریر کی ۔

غرض یہ مذاکرہ بہت ہی معلومات افزا اور دلچسپ رہا ۔

آخر میں مشرقی علوم کی ترقی، ان کے مسائل کو حل کرنے، پروفیسروں اور محققوں کے آپس میں تعاون بڑھانے، اورینٹل کالج کی خدمات کو سراہنے اور اس کو سنٹر آف اکسیلنس بنانے کے لئے بیرونی ممالک سے آئے ہوئے مندوبین نے قراردادیں پیش کیں، جن کو متفقہ طور پر منظور کیا گیا ۔

اس کے بعد سیکرٹری جنرل نے مجلس استقبالیہ کی طرف سے مہمانوں کا شکریہ ادا کیا اور کانگریس کے ختم ہونے کا اعلان کیا ۔

پانچ بجے یہ اجلاس ختم ہوا ۔

شب کو آٹھ بجے پنجاب یونیورسٹی کے وائس چانسلر کی طرف سے اورینٹل کالج کے مینارڈ ہال میں الوداعی عشائیہ دیا گیا جس میں ملکی اور غیر ملکی مندوبین کے علاوہ یونیورسٹی کے پروفیسروں اور شہر کے ادیبوں اور شاعروں نے بھی شرکت کی ۔

اس موقع پر مینارڈ ہال کو بڑی خوبی سے سجایا گیا تھا۔ میزیں اور کرسیاں بڑے سلیقے سے لگائی گئی تھیں، اور برتن بڑے سلیقے سے چنے گئے تھے۔ آٹھ بجے سے مہمان آنے لگے۔ ساڑھے آٹھ بجے سب اپنی اپنی نشستوں پر بیٹھ گئے اور کھانا شروع ہوا۔ اس عشائیے میں کھانے کے بعد کئی الوداعی تقریریں بھی ہوئیں۔

سب سے پہلے کالج کے پرنسپل اور کانگریس کے سیکرٹری جنرل نے اپنی تقریر میں اورینٹل کالج کے جشن صد سالہ کی تقریبات کو کامیاب بنانے پر مہمانوں، استادوں اور طالب علموں کا شکریہ ادا کیا۔ اس کے بعد وائس چانسلر ڈاکٹر اجمل اور جشن صد سالہ کے صدر ڈاکٹر جسٹس ایس۔ اے۔ رحمن نے بھی تقریریں کیں۔ ان تقریروں میں جشن صد سالہ کی تقریبات کی تعریف کی گئی، کارکنوں کو مبارکباد دی گئی اور مہمانوں کا شکریہ ادا کیا گیا۔

مندوبین اور مہمانوں کی طرف سے ترکی کے پروفیسر ڈاکٹر عبدالقادر قرہ خان نے، ڈرہم یونیورسٹی انگلستان کے پروفیسر جان ھے ووڈ نے اور تہران یونیورسٹی کے استاد بزرگ پروفیسر مجتبی مینوی نے تقریریں کیں۔ پروفیسر قرہ خان کی تقریر ترکی میں تھی جس کا ترجمہ اردو میں کیا گیا۔ انہوں نے اپنی تقریر میں ترکی اور پاکستان کے برادرانہ تعلقات کا ذکر کیا۔ لاہور اور استنبول میں رشتے کو تلاش کیا، اورینٹل کالج کی روایات کی تعریف کی۔ جشن صد سالہ کی تقریبات کے انتظام کو سراہا، اور کہا کہ ایسے جلسے انہوں نے آج تک نہیں دیکھے۔ پروفیسر جان ھے ووڈ نے اپنی تقریر میں اورینٹل کالج کی اہمیت کو واضح کیا، اس کے علمی کام کی بہت تعریف کی اور جشن صد سالہ کی تقریبات کے متعلق کہا کہ ایسے شاندار جلسوں کو دیکھنے کا اتفاق انہیں کبھی نہیں ہوا۔ یہاں ہر چیز اپنی جگہ مکمل تھی۔ اس سے بہتر انتظام کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ انہوں نے جلسوں کے منتظمین کو مبارکباد دی اور شکریہ ادا کیا۔ پروفیسر مجتبی مینوی کی پرخلوص تقریر بڑی فصیح انگریزی میں تھی۔ انہوں نے اپنی تقریر میں لاہور اور پاکستان اور علامہ اقبالؒ کے ساتھ اپنے جذباتی تعلق کا ذکر کیا۔ ایران اور پاکستان کے تہذیبی رشتوں پر روشنی

ڈالی، اوریئنٹل کالج کے ممتاز دانشوروں کی خدمات کو سراہا اور جشن صد سالہ اور کانگریس کی کامیابی پر منتظمین کو مبارکباد دی۔

آخر میں اوریئنٹل کالج کے پرنسپل اور کانگریس کے سیکرٹری جنرل نے تمام مہمانوں، اور جشن صد سالہ کی تقریبات کے کارکنوں، کالج کے استادوں اور طالب علموں، پنجاب یونیورسٹی کے عہدیداروں اور وفاقی اور صوبائی حکومتوں کے سربراہوں اور متعلقہ وزیروں کا شکریہ ادا کیا جن کے تعاون سے جشن صد سالہ کے جلسے کامیاب ہوئے۔

شب کو گیارہ بجے کے قریب یہ محفل ختم ہوئی۔

اور اس کے ساتھ ہی اوریئنٹل کالج کا جشن صد سالہ اور اس سلسلے میں ہونے والی تمام تقریبات بخیر و خوبی ختم ہو گئیں۔ خصوصیت کے ساتھ اس موقع پر ہونے والی ماہرین علوم مشرقی کی بین الاقوامی کانگریس نے تو وہ رنگ اختیار کیا کہ وہ واقعی صحیح معنوں میں بین الاقوامی کانگریس بن گئی۔ بلکہ شاید یہ کہنا زیادہ صحیح ہے کہ اس کانگریس نے جو ماحول پیدا کیا وہ کہیں اور مشکل ہی سے پیدا ہوا ہوگا۔

اور میں اس رات یہ سوچتا رہا اور اب بھی سوچتا ہوں کہ یہ سب کچھ اتنے بڑے پیمانے پر اتنی خوش اسلوبی سے کیسے ہوا؟ خصوصاً ان حالات میں کہ اس وقت ہمارے آس پاس اور گرد و پیش ایک انتشار کی کیفیت تھی اور جب ہم جگر لخت لخت کو ایک بار پھر جمع کرنے کی کوشش کر رہے تھے اور ابھی یہ عمل پوری طرح مکمل بھی نہیں ہوا تھا۔

ان حالات میں دور دراز ملکوں سے اتنے بڑے بڑے پروفیسروں اور محققوں کا ایک درس گاہ کے جشن صد سالہ کی تقریبات میں، اپنے اپنے اداروں کے خرچ پر ہمارے وطن عزیز میں آنا، پورے ایک ہفتے تک، دن دن بھر جلسوں کا جاری رہنا، ہال کا کھچا کھچ بھرا رہنا، خاموشی کے ساتھ لوگوں کا علمی مقالات کو سننا، اور مقرروں کے علاوہ کسی کی آواز کا سنائی نہ دینا، مجھے ایک معجزے سے کم نہیں معلوم ہوتا۔

یقیناً اس میں غیبی مدد شامل تھی ۔ اللہ تعالٰی کے فضل و کرم اور بزرگانِ دین کی مدد کے بغیر ایسے کام اس طرح انجام نہیں پاتے ۔

تدریسی اداروں کی تاریخ میں شاید ہی کبھی ایسا ہوا ہو کہ اس کے سربراہ کے صرف خط لکھنے پر اتنے بڑے بڑے لوگ، ہزار ہا میل کا دور دراز سفر طے کر کے ایک جگہ جمع ہو جائیں اور صبح سے لے کر شام تک علمی اور تحقیقی کاموں کی باتیں کریں ۔ عوام اس کو پسند کریں اور حکومت اس سے متاثر ہو ۔

یہ اورینٹل کالج کے نام اور اس کے کام کی برکت تھی، ورنہ اس قسم کے جلسوں کو ترتیب دینے کا تو کوئی خواب بھی نہیں دیکھ سکتا ۔

جشن صد سالہ کے مناظر

یونیورسٹی اورینٹل کالج لاہور



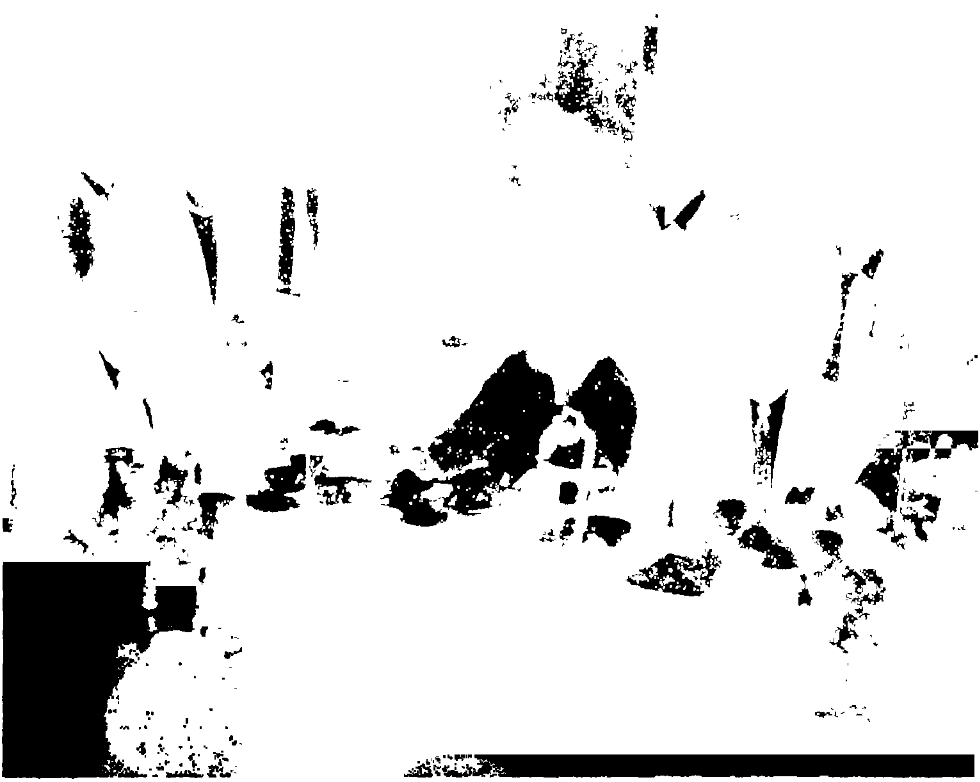
آقائی منوچہر ظلی، استاد مجتبوا مینوی، پروفیسر شاہ حسینی اور ایس۔ اے رحمٰن



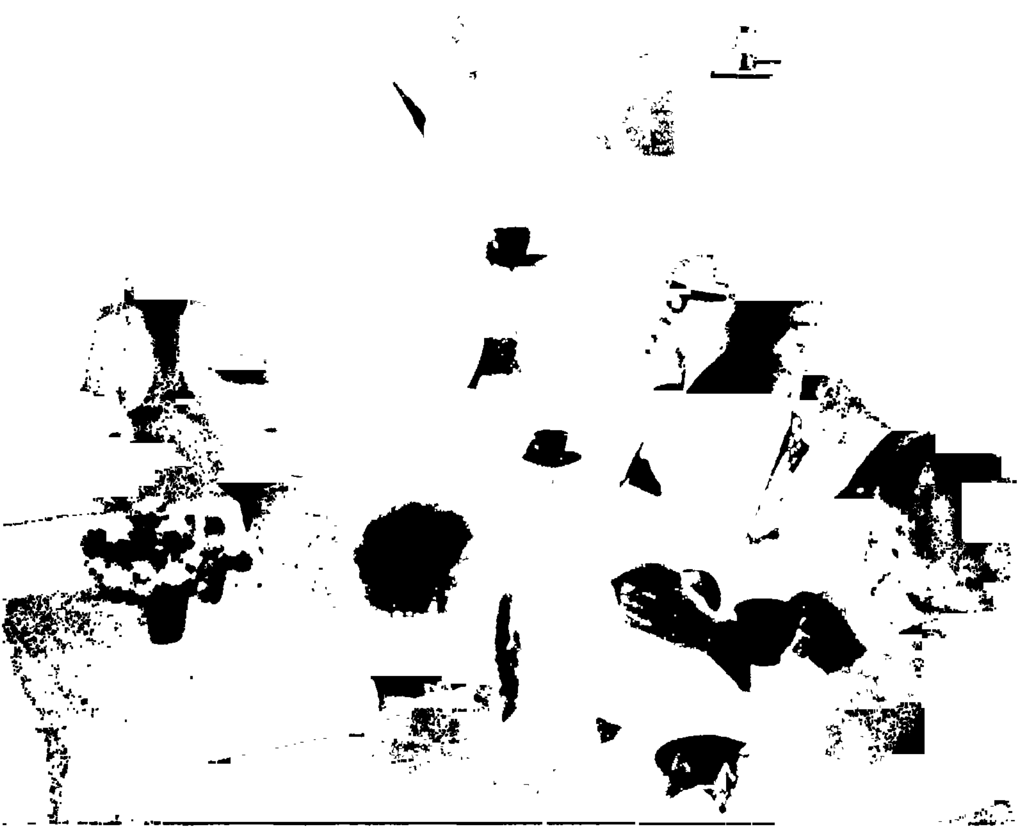
جشن صد سالہ کا ایک منظر



مولانا کوثر نیازی مرکزی وزیر حج و اوقاف
پروفیسر شاہ حسینی (تہران) اور ڈاکٹر عبادت سے مصافحہ کر رہے ہیں



سنڈیکیٹ روم میں چائے
(بیٹھے ہوئے) الشیخ ناصرالعبودی، پروفیسر عبدالمقصود شلقامی، مولانا کوثر نیازی،
ڈاکٹر ناصرالدین شاہ حسینی، ڈاکٹر عبادت بریلوی



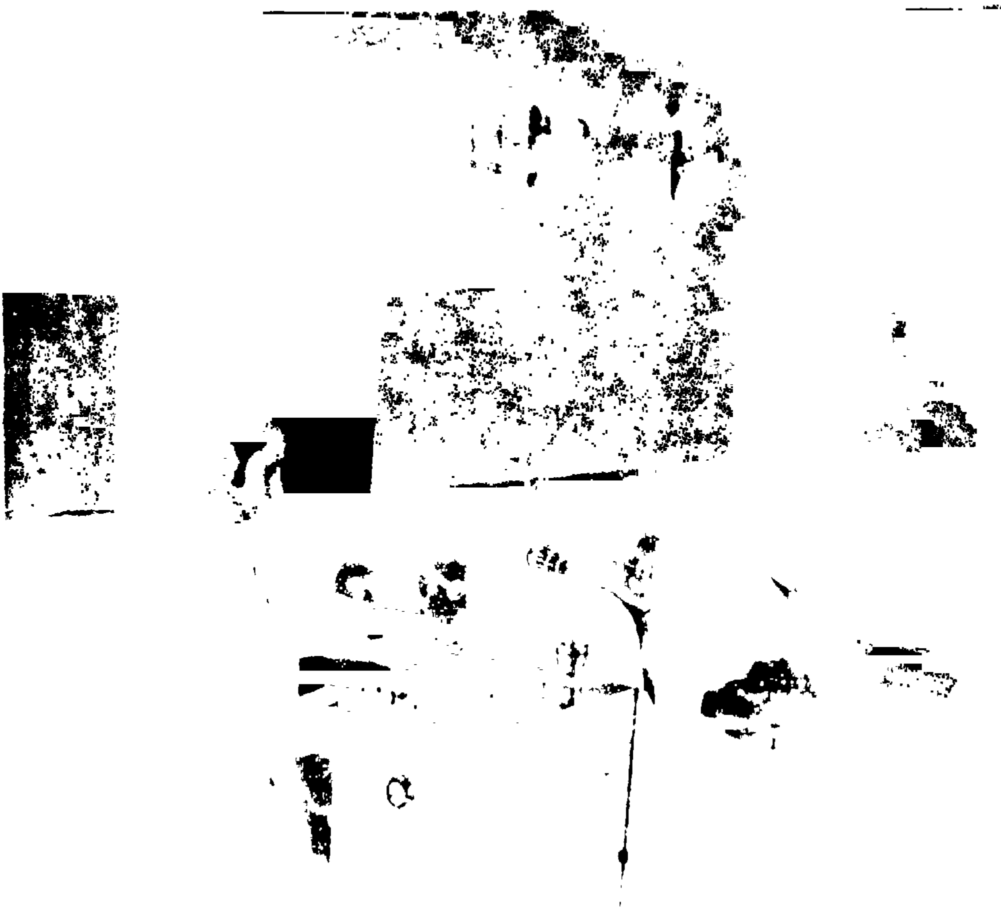
ڈاکٹر عبادت بریلوی
غیر ملکی مندوبین کے ساتھ



ڈاکٹر جلال متینی (مشہد یونیورسٹی) ۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی



پروفیسر مجتبیٰ مینوی، پروفیسر ناصرالدین شاہ حسینی، آقائی منوچہر ظلی،
سفیر کبیر شہنشاہ آریا مہر



پروفیسر ڈاکٹر جلال متینی (مشہد) ایک اجلاس میں تقریر کر رہے ہیں
اس اجلاس کی صدارت پروفیسر مجتبوا مینوی نے کی ۔

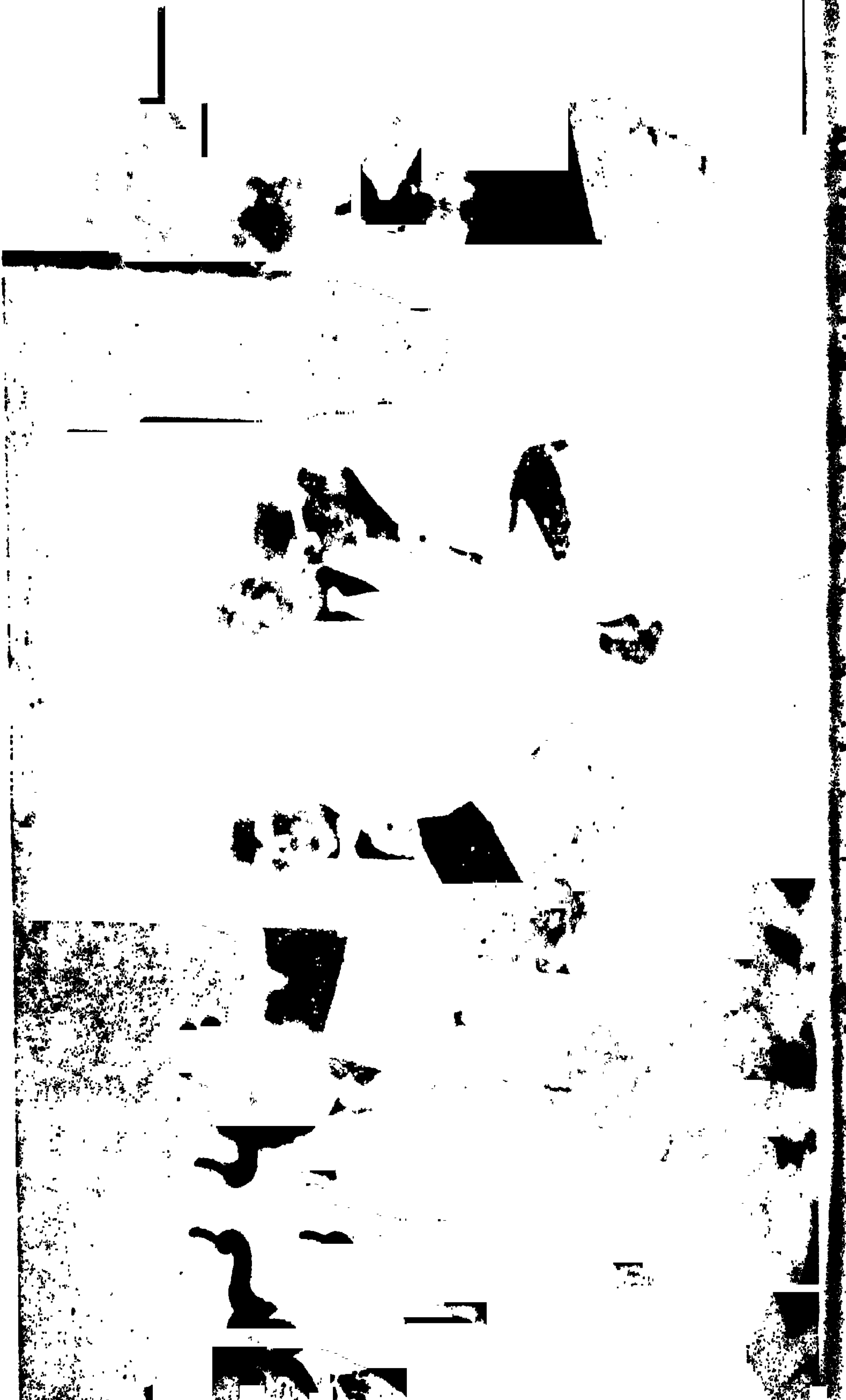


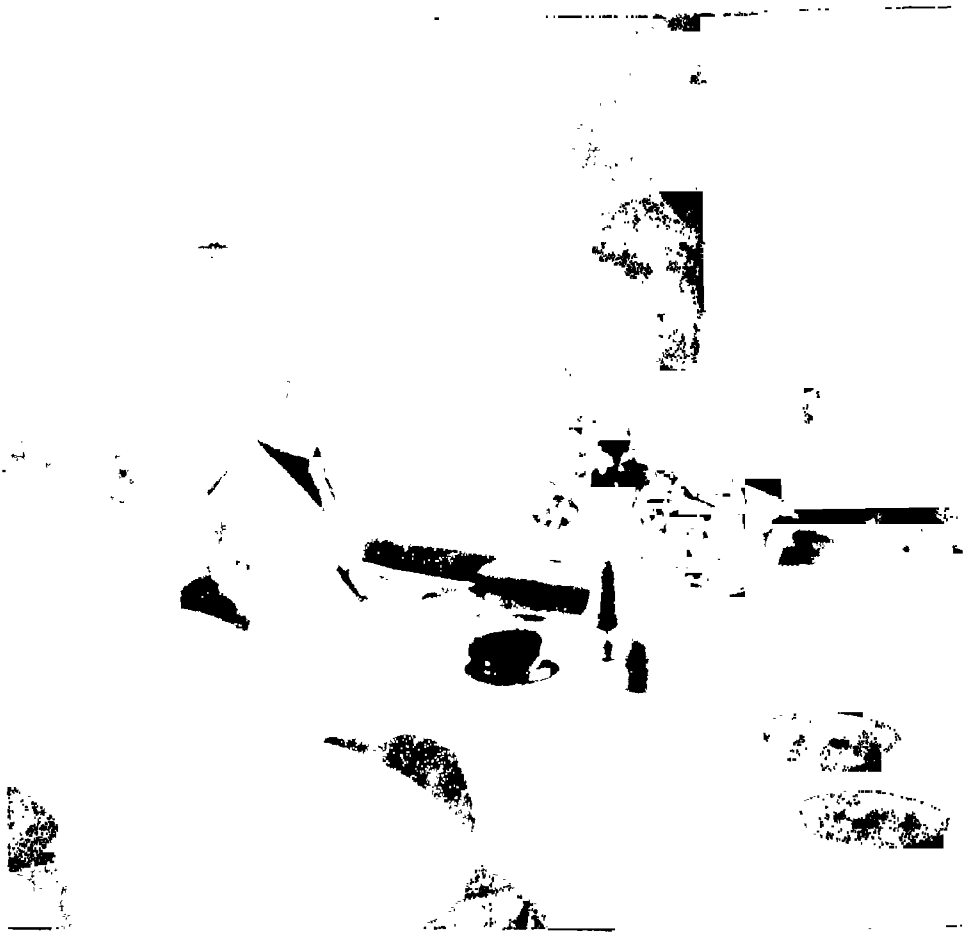
(دائیں طرف سے)
ڈاکٹر عبادت بریلوی، آقائے پروفیسر مجتبیٰ مینوی، پروفیسر جلال متینی، ڈاکٹر ناصرالدین شاہ حسینی، سفیر کبیر ایران آقائے منوچہر ظلی





جسٹس ایس اے رحمان، ڈاکٹر عبادت بریلوی، غیر ملکی مہمانوں کے ساتھ ایک عصرانے میں





ڈاکٹر مظاہر مصفا، ڈاکٹر عبادت بریلوی، پروفیسر مجتبیٰ مینوی، پروفیسر صوفی تبسم



(دائیں طرف سے) استاد مجتبی مینوی' پروفیسر جلال متینی' ڈاکٹر مظاہر مصفا اور خانم مصفا



پروفیسر ممتاز حسین، ڈاکٹر فرمان فتح پوری، رالف رسل، پروفیسر حمید احمد خاں



فیسر رالف رسل　　　ڈاکٹر عبادت بریلوی　　　ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں

مندوبين

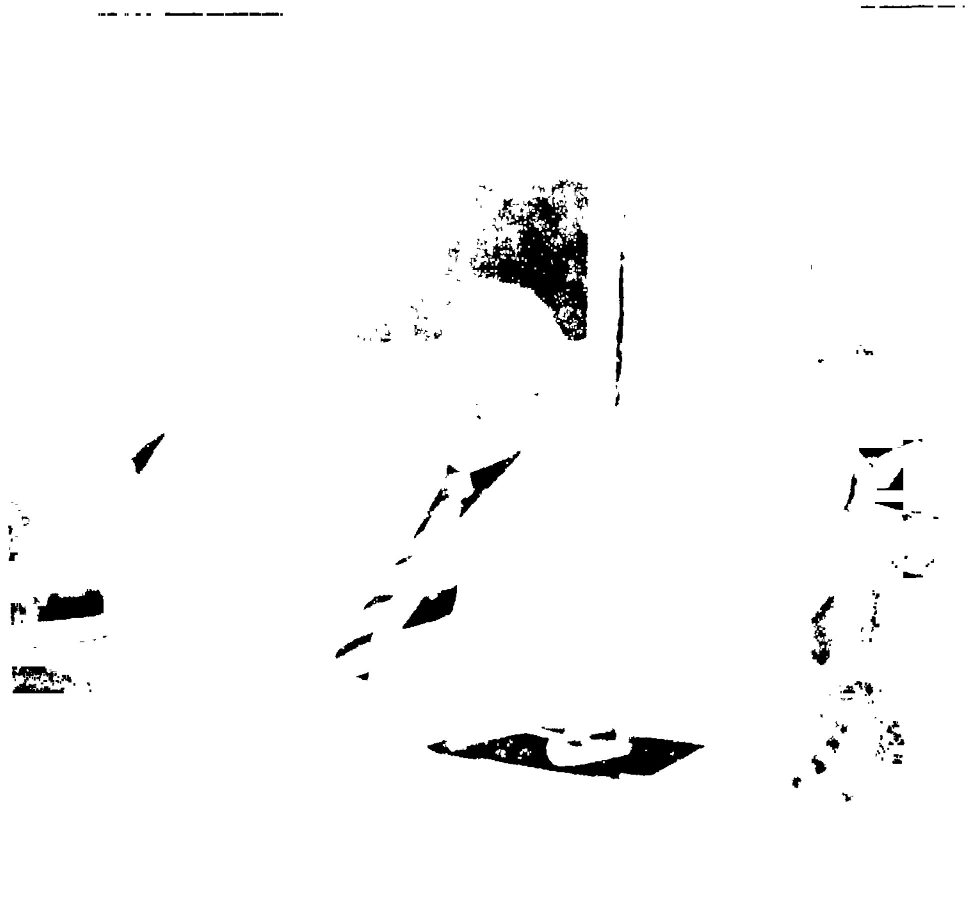
DELEGATES



کانفرنس کا ایک منظر
ڈاکٹر مجتبیٰ مینوی، ڈاکٹر ناصرالدین شاہ حسینی، ڈاکٹر رانا احسان الہی



پروفیسر ڈاکٹر عبدالقادر قرہ خان (استنبول ترکی)



کٹر عبادت بریلوی'

پروفیسر ولی اللہ سمیعی
(کابل افغانستان)

ڈاکٹر عبدالشکور احسن



الوداعی عشائیہ منجانب پنجاب یونیورسٹی

جسٹس ایس۔اے رحمان، ڈاکٹر محمد اجمل، استاد مجتبوی مینوی اور دوسرے حضرات عشائیہ میں

SCENES
FROM
THE CENTENARY CELEBRATIONS

geçici ve görünüşte yenilgi havasini veren olaylar, geçirilmesi hattâ bir bakima rarli bir imtihan niteliğindedir. Pakistan ve onun kardeş halki, bu imtihadan-yarinlari için- daha tecrübeli ve daha dinamik olarak çikmistir. Uyanan upgenç, bu gelecegi ümit verici, bu bilgiye, kültüre susamiş ve yeniliğe âşik ülke büyuk Asya Kit'asinda lâyik olduğı mutlu istikbale kavuşacaktir, inanendayim. Onun bir dostu ve Türkiye-Pakistan Kültür Derneğinin uzun yillardir Baskani olan bir ilim adami sifatiyle, buradaki Pakistanlilarin şahsiyetinde, yarinlarin şafağinda, bütün dost ve kardeşlerimizi selamlarim . . . .

PROF DR ABDÜLKADIR KARAHĀN

DOST VE KARDEŞ PAKISTAN'IN SAYIN BILGINLERI, MILLETLERARASI MÜSTESRIKLER KONGRESININ DEGERLI ÜYELERI.

Günlerdenberi devam eden kongrede Pakistan'ın ünlü ve önemli Pençap Universitesi idareci ve öğretim üyeleriyle aydinlarindan göregeldiğimiz dostluk ve konukseverlik, gerçekten, her türlü takdirin fevkindedir Bu son gecenin samimî toplantisinda, arkadaşlarimiz, değişik dillerde konuştular, duygularini dile getirdiler. Ben de, hoş görürseniz, Türk dili ile konusacağim. Cünkü Pakistan topraklari, kültürü, tarihi Türkler: yabanci değildir. Yüzyillar boyunca Türklerle Pakistanlilar birbirini tanımış, sevmiş, karşilikli kültürel bağlantilar kurmuştur. Gazneli Mahmud devrindenebri sürüp gelen bu münasebetlerin, özellikle Babur ve oğullari zamanlarinda ne kadar canli siki ve sürekli olduğu meçhul değildir.

Himayala eteklerinin bu Müslüman ülkesinde Pakistan Devleti kurulur kurulmaz da Türkiye Cumhuriyeti ve onun halki, kendini candan seven bu dost millete ve onun davalarina sicak ve samimî bir ilgi göstermiştir ve göstermektedir. Bir çok memleket görmuş ve bir çok millet tanimis bir insan olarak diyebilirim ki Türkiye ile Pakistan halklari arasındaki yakinlik, dostluk, sevgi ve bağlilik yeryüzünde kolayca tesadüf edilir olmaktan uzaktir. Halklarinin inançlarinda, yaşamlarinda müslümanliktan gücünü alan, kahramanliği ve fedâkarligi amaç bilen öyle bir üstün yeyenilmez yaratiliş vardir ki, bu onlari bir çok bakiman birbirine yaklaştiran kaynaklardandir. Vefaya, fazilete man viyata, ideala, insan sevgisine ve milli izzet-i nefse gönülden bağlanan bu kardeş milletlerin, bilginleri, sanatkârlari, sairleri, öğrencilleri ve işçileri yakin bir gelecekte daha da kopmaz bağlarla âdetâ bir bütün olarak kültür ve medeniyet alanlarinda birbirini daha da çok taniyacak, sevecek ve güzel ve mutlu günlere doğru ilerleyecektir.

Muhterem arakadaslar, Allah'a inanan ve idealini kaybetmeyen milletlerin gelecekleri daima parlak, zaferlerle taçlanmiş olarak tarihe geçer. Ümidini kaybetmeyen halkin, kisa süreli ve geçici talisizliklerden gelecek üzgünlukleri yendiğini de bilmemek mümkün değildir. Ben kongrede, çarşşda, pazarda, asil hakk yiğinlarinin bulunduğu yerlerde Pakistanlilarda gördüğüm ve gözlerinden okuduğum, sözlerinden dinlediğim izlenimlerimi bir sözle belirtmek istesem diyeceğim su olur : Aziz Pakistan. kolayca mağlûp edilemez. Gelip

No. 6

TURCO-PAKISTAN BROTHERHOOD AND THE SUCCESS OF THE CONGRESS OF ORIENTALISTS (FAREWELL SPEECH BY PROFESSOR DR. ABDULKĀDIR KARAHĀN)

The International Congress of Orientalists that took place in friendly and brother Pakistan, at the historical city of Lahore, has come to an end. The Congress took place in an atmosphere of learning and we were received with the greatest hospitality.

Members of the Congress expressed their feelings in various languages; with your permission I will speak in Turkish, because the land of Pakistan and its dear Moslem population are very close to the Turkish people. The course of history and the cultural ties existing between the two countries have shown that Turkey and Pakistan have loved one another all along centuries and that they carry the same ideal in their heart.

These days I am most excited when I see lights of hope shining in the eyes of the people of Pakistan. Indeed, I do believe that people who share the ideal of Islam and love of humanity can never be defeated. People who do not attach too much importance to the vanity of this world and work for a happier future in the world of learning or fight at the front for the same purpose are candidates to eternal life. I visited Pakistan six times as the President of the Turco-Pakistani Cultural Association and I was happy to meet such worthy idealists. Friendly and brotherly ties axisting between the people of Turkey and Pakistan will become stronger through similar meetings. May God give to the people of Pakistan and Turkey and to humanity at large the possibility to achieve victories.

No. 5

This Congress resolves to request the Punjab University authorities to allot those buildings to the Oriental College which will fall vacant when other colleges and departments will be shifted to the New Campus.

Moved by : PROFESSOR SUFI TABASSUM
(Lahore)

Seconded by : PROFESSOR RALPH RUSSELL
(S.O.A.S.,
University of London)
DR. A. S. AHSAN
(Oriental College, Lahore)

No. 4

This Congress resolves to draw the attention of the Government of Pakistan and the Government of the Punjab to the necessity of granting special funds to the Oriental College for publication of all those research monographs and theses that are still unpublished, so that all interested persons become able to benefit from them.

Moved by : PROFESSOR A. S. AHSAN
(Oriental College, Lahore)

Seconded by : SYED KHAYĀL BUKHĀRI
(Pashto Academy,
Peshawar University)

PROFESSOR ABDULKĀDIR KARAHĀN
(Istambul, Turkey)

No. 3

Recognizing the fact that the Oriental College is an important centre of Oriental learning and research in the sub-continent, this Congress resolves to suggest that the scope of the College should be expanded further to cover more Pakistani and South Asian Languages and Cultures so that it becomes a unique institution of West Asian and South Asian studies in the whole of Asia.

Moved by : PROFESSOR NĀSIRUDDIN SHAH HUSAINI
(Tehran, Iran)

Seconded by : PROFESSOR WAFIULLAH SAMIYEE
(Kabul, Afghanistan)

PROFESSOR DR. ABDULKĀDIR KARAHĀN
(Istambul, Turkey)

No. 2

This Congress resolves to propose that the International Congress of Orientalists which was arranged in connection with the centenary celebrations of the Oriental College should be made a permanent feature to be repeated every five years so that the Orientalists of the world give the benefit of their knowledge and research to the Pakistani scholars and students directly and personally, and in the meantime Conferences of Pakistani Scholars of Oriental learning should be held annually so that research work could be coordinated and consolidated on the national level.

Moved by : PROFESSOR MUJTABA MEENAVI
(Tehran, Iran)

Seconded by : PROFESSOR JOHN HAYWOOD
(Durham, England)

PROFESSOR ZIA-UD-DIN SAJJĀDI
(Tehran, Iran)

PROFESSOR ABDULKĀDIR KARAHĀN
(Istambul, Turkey)

No. 1

This International Congress of Orientalists resolves to place on record its sincere appreciation of the valuable services rendered by the Punjab University Oriental College, Lahore, to the cause of Oriental learning and literature, especially in the spheres of teaching, research, editing, compilation, translation and criticism. The Congress is also impressed by the use of modern methods and techniques employed by this College in linguistic, literary and historical research, and by the individual and collective efforts of its scholars in establishing a tradition of intellectual and academic excellence which is responsible for the assignment of a place of dignity and reverence to the Oriental languages and literatures in the country. The Congress considered the *Oriental College Magazine* as a precious link between the College and the Orientalists of the world.

Moved by : PROFESSOR RALPH RUSSELL
(School of Oriental & African Studies,
University of London)

Seconded by : PROFESSOR DR. JALĀL-E-MATĪNI
(Meshad, Iran)

PROFESSOR NĀSIRUDDIN SHAH HUSAINI
(Tehran, Iran)

PROFESSOR ABDULKĀDIR KARAHĀN
(Istambul, Turkey)

RESOLUTIONS

so abruptly abandoned by the United States government. In so doing, these universities have opted to serve as a vital link between a generally Asia-ignorant American public and the great civilizations and traditions of South Asia, a link whose importance, gravity and seriousness in light of the present world condition cannot be underestimated.

the authors have sensed this situation and have been fully sympathetic and cooperative with us in this ma ter.

And finally, the editors are always aware that they are unable to pay either the writers or the translators for their work. Hence, the magazine has had to subsist for nine and a half years on large doses of good will from authors, translators and scholars. Sometimes the good will runs very high and all goes well; at other times it is sluggish and problems arise: a translation crucial to a given issue is delayed or lies incompleted because of new commitments the translator has taken on; book reviews are slow in coming; other scholars, displeased with what they consider is a narrow circulation, prefer to publish their articles in more widely circulating or prestigious journals, etc., etc. Such are the ways of writers and editors; they seem to exist everywhere, not just with *Mahfil*, and are not likely to change. However, in spite of these problems and shortcomings, the journal will continue to publish. All indications point to a healthy and active second decade of existence.

The editors have sent with this paper a number of back issues of *Mahfil* for the perusal of the esteemed participants in these centenary celebrations. The copies have been entrusted to the care of Dr. Ibadat Brelvi; he will be glad to show them to anyone who is interested. The editors would like to receive your comments about the journal.

D. Conclusion.

From the foregoing it is quite clear that South Asian Studies in the United States has gone through three distinct stages. The first stage, prior to 1957 when the field was considered recondite and obscure, was one of quiet and unobtrusive scholarship in those large universities which could afford the luxury of such a program, no matter how limited it might have been. The second phase was essentially artificially stimulated by, first, Sputnik, and second, by the money of the United States government. This period, 1958 to 1968, was one of laying down some effective and solid bases upon which to build a visible tradition of South Asian Studies in the United States. The third stage, dating from 1968 to the present, is one in which a number of American universities, both large and small, have chosen to pick up the banner of South Asian Studies

various vernacular literatures in South Asia. To this end, the editors investigated the possibilities of publishing an Indian edition of the journal. Because of various complicated, but understandable, restrictions which are operative in that country, it would be impossible to have it published in India. At the moment, the editors are contemplating publishing a tenth anniversary edition of *Mahfil* in the form of a book for distribution in South Asia. This anniversary issue would contain what the editors consider the best pieces from *Mahfil's* first decade of existence. Any profits accruing from the sale of this book would be evenly distributed among the authors whose works appear in the anniversary edition.

A third problem is built into the very nature of the magazine. Since the magazine deals for the most part in translations, the question of accuracy looms large and foreboding over every line of poetry, every sentence of prose. Every issue has its own difficulties in this respect, and in the succeeding issue we invariably publish a short erratum stating that verb x in such-and-such a translation on such-and-such a page should be past perfect rather than simple past tense. Authors have been tolerant of us in this regard and, given the wide range of possible translation mistakes, the actual number is relatively small.

Another problem lies in the fact that *Mahfil* deals with *all*, or nearly all, the literary languages of South Asia. Hence, it is very difficult for the editors to give an accurate picture of the most recent avant-garde developments in each of them. Because of the distance it is nearly impossible to print the latest examples of, say, Urdu poetry or the Telugu short story. By the time a piece is translated and printed there may be a lapse of a year or two, The issue devoted to the writings of Umashankar Joshi, the noted Gujarati poet, was started in 1964 and will finally see print in 1973; similarly, the G. Sankara Kurup number (Vol. VIII, No. 1) was begun in 1965 and finally published in 1972. As a corollary to this point, the interviews with various authors, for example, might seem rather elementary, particularly to someone who is *au courant* in a given literature. However, because the magazine deals with so many literatures (note the plural), and because the editors are often working from a position of ignorance, such questions are in fact asked from a naive point of view and *are* elementary. On the whole,

the following special issues are in various stages of completion:

1. English poetry from South Asia, to be published in December 1972.
2. Umashankar Joshi number, selected for publicatton in March 1973.
3. Folk literature from South Asia.
4. Mohan Rakesh number.
5. Yashpal number.
6. Contemporary Bengali poetry number.
7. Qurratulain Hyder number.
8. Iqbal centennial number.
9. Marathi number.
10. Women in South Asian literature.
11. University of Chicago Poets Meet (a collection of talks by five South Asian poets on the subject of the poetry of their language since 1968; also a sampling of the poetry of each of these poets will be presented: languages represented will include English, Gujarati, Malayalam, Marathi and Urdu).
12. Annada Sankar Roy number.
13. Contemporary Urdu poetry anthology.
14. The literature of Ceylon.

These issues are, for the most part, under the guest editorship of individual scholars. As a general policy, the editors attempt to print two miscellanies and two special issues each year.

In spite of its various successes, the editors are crucially aware of the journal's many shortcomings. First, the format is something we wish very much to change; in this context we also recognize the problem of typos and misprints which, in spite of what seem like endless proofreadings, still continue to find their way into the texts. Second, there is a problem of distributing the magazine. Clearly, *Mahfil* has a limited appeal; however, the magazine has not had its full distribution potential exploited. Because of currency regulations it is very difficult for libraries or individuals in South Asia to subscribe; yet the editors realize the service which an English-language literary magazine such as *Mahfil* can perform among the

	Nos. 2-3 (Summer-Fall 1970)	Miscellany (154 pp.)*
	No. 4 (Winter 1970)	Miscellany (106 pp.)*
Volume VII,	Nos. 1-2 (Spring-Summer 1971)	Pakistan number (170 pp.)*
	Nos. 3-4 (Fall-Winter 1971)	Sanskrit number; guest-edited by Barbara Stoler Miller (257 pp.)*
Volume VIII,	No. 1 (Spring 1972)	G. Sankara Kurup number (124 pp.)*
	No. 2 (Summer-Fall 1972)	Miscellany (264 pp.)*

*Printed by the photo-offset process.

To date, over 1,000 short stories, poems, essays and reviews have been published in the pages of *Mahfil*. Other interesting features include a number of interviews with various writers, as well as bibliographies of English sources for the study of a particular literature, literary movement or author. Every two years the contents of *Mahfil* are indexed in the journal, and its contents are annually listed in the bibliographies of the *Journal of Asian Studies* (*JAS*) and the International Bibliography of the *Publication of the Modern Language Association (PMLA)*, two major scholarly journals in America, the former concerned with Asian studies in general, the latter with literature.[1]

At present most of the subscribers to *Mahfil* are concentrated in the United States and Canada and number about 500. With the current issues, the editors have had an additional 500 copies printed for distribution to major libraries in South Asia, Europe and Australia. If additional subscriptions are forthcoming, the editors hope to see their way clear to have the magazine printed as a regular journal rather than in its present photo-offset format.

Since *Mahfil's* inception, the editors have always worked far in advance, planning future issues several at a time. As of this writing,

1. This author is Associate Bibliographer of Asian Literature for *PMLA*; as such, he catalogues all South Asian literature for this publication.

As one can observe, the length of the issues increased, as did the participation in the tasks of editorship, notably by such outstanding experts in Indian literature as Edward C. Dimock, Marry M. Lago, and Kamil Zvelebil. A this time, the fall of 1968, I contacted the Asian Studies Center at Michigan State University, directed by William R. Ross who had instituted, among other things, an active publication program in Asian Studies. These publications were in monograph form, neatly typed, meticulously edited and printed by the photo-offset process. Desiring to expand Michigan State's Asian Studies publications beyond the pale of social sciences (where nearly all had lain to date), Professor Ross generously offered to publish *Mahfil* from Michigan State University, allowing the editorial offices to remain at the University of Chicago. Thus, starting with Volume V, Nos. 1 and 2, *Mahfil* was published at Michigan State University, with all issues done by photo-offset. This change of venue proved a godsend to the editors, for they no longer had to type up the journal, nor did they have to take care of subscription lists or the mailing of the journal. As a result, more time could be spent on editorial matters. With the assistance of a managing editor, *Mahfil* was eventually put on a firm quarterly basis; that is, it now appeared each quarter, four times a year, something the editors had been unable to do in the past. In addition, a large backlog of manuscripts were edited and published, thus dramatically increasing the size of the publication. Prior to this time, the editors had to be very careful of the size of the magazine, for all printing costs were being met through subscriptions and small subsidies. Often we were forced to limit the number of items in a given issue because of the printing costs involved. Now, with the Asian Studies Centre's subsidy, we were able to draw upon this material and print a large portion of it. Since that time, the following issues have been published :

Volume	V, Nos. 1-2 (Fall 1968-Winter 1969)	*Miscellany (152 pp.)**
	No. 3 (Spring 1969)	Amrita Pritam number (135 pp.)*
	No. 4 (Fall 1969)	Ghalib number (134 pp.)*
Volume	VI, No. 1 (Spring 1970)	Symposium on the teaching of Asian literature; guest-edited by Steven Poulos (63 pp.)*

Kabir, and a short bibliography of English sources for the study of Urdu literature. The last page contained a coupon to enable readers to subscribe to the journal for $ 2.00 a year.

In retrospect, one can only say that *Mahfil* left much to be desired in terms of professional typing, layout and editing. However, the translations were very well received, as was the idea of providing bibliographical material for students and teachers. Between 1963 and 1968 fourteen issues of *Mahfil* were published, most of them in cyclostyled form but several in a new kind of relatively inexpensive print known as photo-offset. Funds for these offset issues were generously provided by the Committee on South Asian Studies of the University of Chicago, together with a small subsidy from the Asia Society of New York. Among these issues were miscellanies, as well as issues devoted to the work of an individual author or an individual language. A run-down of these is as follows :

Volume I,	No. 1 (Summer 1963)	Miscellany (29 pp.)
	No. 2 (Fall 1963)	Hindi poetry and short stories (29 pp.)
	No. 3 (Winter 1964)	English writing from South Asia (65 pp.)
	No. 4 (Spring 1964)	Miscellany (37 pp.)
Volume II,	No. 1 (Summer 1964)	Poetry and short stories of S. H. Vatsyayan (58 pp.)*
	No. 2 (Spring 1965)	Pakistan issue (69 pp.)*
	No. 3 (Summer 1965)	Miscellany (50 pp.)
	No. 4 (Winter 1965)	Miscellany (52 pp.)
Volume III,	No. 1 (Spring 1966)	Tagore number; guest-edited by Edward C. Dimock (83 pp.)*
	Nos. 2-3 (Fall 1966)	Miscellany (94 pp.)
	No. 4 (Winter 1967)	Contemporary Bengali poetry; guest-edited by Mary M. Lago (119 pp.)*
Volume IV,	No. 1 (Summer 1967)	Miscellany (64 pp.)
	No. 2 (Winter 1968)	Miscellany (59 pp.)
	Nos. 3-4 (Spring 1968)	Tamil number; guest-edited by Kamil Zvelebil & Donald Nelson (121 pp.)*

*Printed by the photo-offset process.

Western civilization, they now realize that of their undergraduate training the non-Western civilization course—be it Chinese or Indian—was one of their most vivid experiences at Oakland. They added that they would be reluctant to have this requirement deleted.

C. The Establishment of *Mahfil, A Quarterly of South Asian Literature*.

On a hot summer afternoon in 1963, this author, then a graduate student at the University of Chicago, had just completed an Urdu class with his *ustād*, C. M. Naim. During the ensuing discussion, we lamented the paucity of quality translations of modern South Asian literature and the total lack of exposure which South Asian literature had in American periodicals and journals. With these points in mind, we hit upon the idea of establishing a magazine devoted exclusively to publishing South Asian literature in English translation to acquaint Western readers with this heretofore untapped literary source. We set to work translating and asked several colleagues to provide translations: we pooled $ 35.00 between us to purchase paper, stencils and ink, and set about typing and collating the first volume of the magazine, which we decided to name *Mahfil*. Several people suggested using the Sanskrit term *sāhitya* but we were resolute and retained our first choice. We eventually chose for our motto a quotation from the Latin poet Virgil: "Silvestrem tenui musam meditaris avena" ("We shall court the muse with a handful of wheat"), a statement we thought exemplified two important aspects of *Mahfil*: first, that the major thrust of the magazine was to enlighten Western readers vis-a-vis South Asian literature; and second, that the editors were undertaking this project as a non-profit venture. We would charge a modest price for the journal simply to cover costs of production, but we could not pay translators, reviewers or, most importantly, authors whose works we published.

The first issue of *Mahfil* appeared in the late summer of 1963, cyclostyled and twenty-nine pages long. The contents included translations by the editors of poems by Faiz Ahmed Faiz, together with Faiz's introduction to *Dast-i-sabā*, Saadat Hasan Manto's controversial short story "Thandā gosht", under the title of "Cold, Like Ice." Intizar Husain's story "Kāyā kalp" was titled "Metamorphosis." The volume also contained some new translations of poems by Kabir, a bibliography of English sources for the study of

published next year in *Mahfil*; the other has translated works by Saadat Hasan Manto and Rajinder Singh Bedi, which are also slated for publication.

One of the problems facing Oakland's Hindi-Urdu program is clearly that of getting students to go beyond the first year of language study. There are several reasons for this problem. First, in order to graduate from the university the student does not need a foreign language, as was the case prior to curriculum revisions instituted in 1970. As a result, there has been a dramatic drop in the number of students in all languages, Hindi-Urdu among them. Second, students at an undergraduate institution such as Oakland are not sophisticated enough to opt for languages such as Hindi and Urdu (or Chinese, for that matter) until they are well along in their academic career. Hence, it is not until the student's third or fourth year at the university that he is aware of the advantages of studying a language such as Hindi or Urdu. By that time, he is almost ready to graduate and has been able to fit in only a single year of language study. At present, however, there seems to be a trend among incoming first-year students to opt for Hindi and Urdu; for of the six members in the current elementary class, three are in their first year, while the rest are second—and third-year students.

Because Oakland University's South Asian program has never been dependent on federal money for support but has been underwritten by the university, it has not suffered the setbacks experienced by other institutions of comparable size (8,100 students). Both the administration and the faculty remain resolutely committed to both South Asian and East Asian Studies. In fact, when in 1970 a committee on curriculum revision wished to abolish the non-Western civilization requirement for all graduates from Oakland and suggested that it be made an elective subject (i.e., one which the student would choose to take), reactions to the suggestton were emphatically negative from administration and faculty alike. As a result, this requirement was retained in the curriculum and is likely to remain there permanently.

Alumni reaction to the proposal to drop the non-Western civilization requirement is likewise indicative of the support such courses enjoy at Oakland University. Many alumni have stated that, although they initially resisted the requirement of studying a non-

and Reader in Persian at Aligarh Muslim University, is presently on leave in this country teaching courses in advanced Urdu, as well as establishing courses in Moghul art, Persian literature and Islamic religion. This author introduced the study of Hindi and Urdu at Oakland in 1968. In addition, I have taught courses in Sanskrit literature in translation and one in the novel in South Asia.

A word about language teaching methodology might be of interest at this point. All students begin at the elementary level, for thus far none has had any exposure to or training in Hindi or Urdu prior to his Oakland experience. Classes, usually with an enrollment of two to eight students, meet five hours a week. Three days a week are spent on the study of grammar; a fourth day is spent with a native speaker of the language, who concentrates on imparting correct pronunciation to the students; the fifth hour each week is a "cultural hour", during which the teacher shows slides of South Asia from the university's extensive collection of colored slides or from his personal collection. Sometimes this fifth hour is used for discussion of a group of Hindi or Urdu short stories read in English translation. or for a novella or parts of a novel. In addition to the regularly scheduled classes, students are expected to use the facilities of the language laboratory a minimum of two hours a week.

A unique feature of Oakland's language program is that both Hindi and Urdu are taught during the first year, whereas in most programs both languages are taught separately on the elementary levels. The first semester of fifteen weeks concentrates on basic sounds and grammatical structures through the medium of Devanagari script. In the second semester of fifteen weeks students continue to study grammar but are also taught Nastaliq script. They are urged to memorize couplets from Urdu poets, a different one each week, which they are then asked to reproduce before the class. During this time the teacher requires the students to write out their assignments twice, once in Devanagari and a second time in Nastaliq.

Thus far only two students have opted to do intermediate or advanced work in Urdu; none has thus far chosen to go beyond the elementary level in Hindi. These two Urdu students read and translate modern Urdu fiction as the basis of their language study. One has produced an excellent annotated English translation of Qurratulain Hyder's novella "Housing Society", which will be

being prepared in Bengali literature, one on *jātra* and another on the modern poet, Jibananda Das; two in Hindi are in the offing, including one on the poetess Mahadevi Varma and another on Hindi *lok gīt*; two are also under way in Urdu, includidg one on the progressive movement and one on the poetry of Ghalib. Another particularly ambitious student is preparing a dissertation comparing the writing of women in both Hindi and Urdu literature.

However, the major thrust of the Chicago program—in fact, for nearly all the programs in South Asian Studies throughout the country—has been in the social sciences. As a result, a number of young Chicago Ph. D.'s have produced a large amount of high-quality scholarship, especially in the area of political science. For example, Punjab specialist Baldev Raj Nayar has written two major books in his area of specialization; similarly, Bengal expert Marcus Franda has published two first-rate studies on modern political movements in Bengal; as another example, Robert Hardgrave, who has written extensively on the politics of the DMK Party of South India, has also written what has now become a standard introductory text for the study of the Indian political system.[1]

Since 1968, however, there has been a diminution of interest in South Asian Studies in universities throughout the United States, as witnessed by the fact that that a number of centers have been closed down, especially among the second-rank colleges and universities. The main reason for these cutbacks is lack of money, particularly federal money which has been cancelled in the area of South Asian Studies and directed into other projects. With fewer scholarships available, there are fewer students; with fewer students, fewer teachers are needed; with fewer teachers, there are fewer courses, etc., etc. As a result, all programs, including such a distinguished one as that at Chicago, have reduced their numbers considerably. However, what such programs now lack in quantity, especially as compared to their numbers five or ten years ago, they

1. Baldev Raj Nayar, *Minority Politics in the Punjab* (Princeton: Princeton University Press, 1966); Marcus Franda, *West Bengal and the Federalizing Process in India* (Princeton: Princeton University Press, 1968), and *Radical Politics in Bengal* (Cambridge: M. I. T. Press, 1971); Robert L. Hardgrave, Jr., *The Dravidian Movement* (Bombay: Popular Prakashan, 1965), and *India: Government and Politics in a Developing Nation* (New York: Harcourt, Brace & World, 1970). There are, of course, other scholars in political science, history, anthropology and education whom we cannot mention here due to the exigencies of space.

students into their program. Under the National Defense Education Act, students could receive large grants for graduate study, with the stipulation that they study a South Asian language in addition to their other courses. Hence, a typical graduate student at the University of Chicago would usually take nine courses throughout a year, of which three would be devoted to a South Asian language. It should be pointed out that these languages were not only studied because a student would receive financial aid. Degree requirements at the Ph. D. level at Chicago, for example, demand a proficiency in at least one modern South Asian language, in addition to French or German (and in some instances, particularly in humanities specializations, *both* French and German in addition to one modern and one classical South Asian language).

Bengali and Hindi have been the most popular South Asian languages studied at Chicago. The reason is the strong program initiated by Professors Dimock and Zide in Bengali and Hindi, respectively. Tamil has also enjoyed some popularity as a result of the excellent teaching of Professor Ramanujan. Urdu has had only limited appeal, primarily because most students study these languages in order to use them as research tools. Because of the inherent difficulty Americans experience with Urdu script, non-language specialists prefer to acquire something "easier" than Urdu as their language tool. Ironically, the professor of Urdu, C. M. Naim, is readily acknowledged to be the best teacher of Indian languages in the country. He is famous for his teaching methods, one of which is to demand from his students a little more than they are capable of giving, thus stretching their capacities to the fullest. While the student may not feel entirely comfortable in the classroom situation, he immediately realizes in retrospect the wisdom of such a demanding approach to language learning.

The foregoing is not to imply that there are no language or literature specialists in the Chicago program, for there certainly are. Several Ph. D. disserations have been completed in linguistics; most notable among them are two in Tamil linguistics by Harold Schiffman and E. Annamalai. However, these are linguistic, not literary. No purely literary Ph. D. in a South Asian modern language has yet been completed in the decade and a half of the existence of the Chicago program, though several are near completion. Two are

period which treats in depth the development of one of the schools of Indian philosophy each year. He is presently engaged in a ten-year project: a new translation of the *Mahabharata*.

In addition to the regular South Asian staff, foreign scholars are invited to teach as visiting faculty in the Department of South Asian Languages and Civilizations. In this way, the Chicago South Asian program has been able to provide its students with exposure to many of the major scholars in the field, as well as to give the program an international breadth and comprehensiveness it could not otherwise enjoy. Among the visiting scholars has been W. H. Morris-Jones, a specialist in Indian government and an aide to Lord Mountbatten at the time of Independence. Anil Seal, the eminent anthropologist from Oxford, regularly teaches at Chicago every few years. J. Duncan M. Derrett, a specialist in Indian law and jurisprudence presently associated with the School of Oriental and African Studies (SOAS) of the University of London, has also taught in the Chicago program, as has his colleague Peter Hardy, a specialist in Moghul history. Various South Asian scholars have also been invited to teach, including P. T. M. Meenakshisundaram and K. M. George, both authorities in Malayalam literature, and Āl-i-Ahmad Suroor, the distinguished Urdu critic and professor of Urdu at Aligarh Muslim University. These scholars represent but a small number of the many who regularly participate in the South Asian Studies program at the University of Chicago.

Library holdings in South Asian Studies at the Regenstein Library of the university is one of the most extensive and complete in the West, second perhaps only to the collections at SOAS and the British Museum. Publications on South Asia in the form of books, periodicals and pamphlets number in the millions and are looked after by Maureen L. P. Patterson, the nation's foremost expert on South Asian bibliography and one of the first persons to publish a comprehensive bibliography for South Asian Studies in the United States.[1]

Rather than the handful of students who dealt with South Asian Studies prior to 1957, all of the centers throughout the country, including Chicago of course, were admitting large numbers of graduate

1. Maureen L. P. Patterson and Ronald B. Inden, *South Asia: An Introductory Bibliography* (Chicago: University of Chicago Press, 1962).

Oakland University, Rochester, Michigan. The magazine is *Mahfil, A Quarterly of South Asian Literature*.

A. The Graduate Program in South Asian Studies at the University of Chicago.

As we mentioned earlier, the University of Chicago did have a limited commitment to South Asian Studies prior to 1957. Sanskrit had been offered within the university as early as the 1890's. Anthropologist Robert Redfield, as we remarked, had done extensive work in South Asian anthropology after World War II. Primarily through his efforts and those of his colleague, Milton Singer, a center for South Asian Studies was set up at Chicago with money provided by both the United States Office of Education and the Ford Foundation. This center, which leaned heavily toward the social sciences—anthropology, political science and sociology—also included among its members Sanskritist George V. Bobrinskoy, a protégè of Franklin Edgerton, and historian of religion Mircea Eliade, as well as a number of young linguists and literary scholars. This latter group included Edward C. Dimock, a specialist in Bengali language and literature, Norman Zide, a linguistic specialist in Hindi and also in Indian tribal languages, C. M. Naim, a teacher of Urdu and linguist who co-authored a number of works with the prominent American socio-linguist John Gumperz, and A. K. Ramanujan, a specialist in Dravidian languages, especially Tamil and Kannada. These linguists immediately set out to write a series of modern, up-to-date text-books for teaching South Asian languages, particularly Bengali, Hindi and Urdu. These books have been published and are standard texts in their particular areas.[1]

In addition to these language classes, a large number of courses in various other disciplines were established, including ones in South Asian history, South Asian geography, political science, education, and literature. With the arrival of the young Dutch Sanskritist, J. A. B. van Buitenen, a number of courses in the cultural history of South Asia prior to the coming of the British were established, as well as courses in Indian philosophy. For example, Professor van Buitenen has set up a cycle of courses completed over a six-year

1. Edward C. Dimock *et al.*, *Introduction to Bengali;* Norman Zide *et al.*, eds., *A Premchand Reader;* C. M. Naim, ed., *Readings in Urdu: Prose and Poetry* (Honolulu: East-West Center Press, 1965).

However, such studies were in the main philological, with only incidental concern in applying the findings of scholarship in this area to other disciplines. A few courses in South Asian anthropology were also taught, as. for example, those of the University of Chicago's Robert Redfield, whose extensive writing on the so-called "Great Tradition" and "Little Tradition" has been one of the major contributions of American scholarship to the field of South Asian Studies. Similarly, Professor Stella Kramrisch of the University of Pennsylvania in Philadelphia had regularly taught courses in South Asian art and architecture. However, South Asian Studies was a small, recondite field with a relatively few specialists whose advanced level students never numbered more than a handful. There was no well-planned, systematic program of South Asian Studies in any American university prior to the revelation of 1957.

In an attempt to make up for past insufficiencies, American academic institutions, together with the United States government, acted quickly. One of the first moves was to pass the National Defense Education Act in 1958, a piece of legislation which by its very title belies the basic reasoning and rationale behind its existence. Among other things, this act provided extensive funding for the establishment of South Asian Studies centers at various major universities in the United States, including those at the universities of Pennsylvania, Chicago, Wisconsin, Minnesota and California, Berkeley, which today have become the foremost, in the field. In addition, another piece of governmental legislation, Public Law 480, made money available to stock American libraries with all the publications from South Asian countries. In return for grain from the United States, each South Asian country would, in return, send to the twenty or so institutions designated as South Asian Studies centers copies of every commercially available publication produced in that country. Thus, South Asian Studies in the United States sprang up after 1957 as a result of both pure and impure motives on the part of both American universities and the American government. In this paper we shall limit ourselves to a discussion of two academic programs, each acknowledged as the best in its area of concentration, and of an American South Asian literary magazine. The academic programs are, first, the graduate studies program at the University of Chicago; and second, the undergraduate studies program at

SOME ASPECTS OF SOUTH ASIAN STUDIES IN THE UNITED STATES

DR. CARLO COPPOLA

Assistant Professor of Hindi-Urdu and Linguistics,
Oakland University,
Rochester, Michigan 48063,
U.S.A.

When, on October 4,1957, Sputnik I burst upon the heavens as man's first artificial satellite launched into space, the United States government was faced with a series of what it considered grim realities. The first of these was, of course, that the Russians were more technologically advanced in the science of space flight than was the United States. Upon subsequent investigation, the United States government discovered its deficiencies as compared to the Russians in a number of other important areas, one of these being the study of modern languages of the so-called "underdeveloped" countries of Asia and Africa, an area in which the Soviets had been doing extensive work prior to World War II. Of course, the government had its Foreign Service Institute, a subsidiary of the State Department, where diplomats were taught these "exotic" languages; and the United States Army did maintain its famous language school in Monterey, California, where, for better or worse, Russian and Chinese were the major language offerings. The reason for this is quite obvious.

American academic institutions also reflected the neglect of their government in these areas of study. Many Russian and Chinese Studies centers, such as those at Harvard, Princeton, Yale and Chicago, did exist. Beyond these, however, there were no American universities which offered any systematic course of study in the languages and cultures of other parts of Asia and Africa. South Asian Studies, which is our major concern in this paper, were practically nonexistent. A few universities did offer courses in Sanskrit language and literature. The strong tradition of such studies at Harvard University, for example, is traced to the efforts of the eminent American Sanskritist and philologist, Charles Lanman; Yale University boasted the presence of Franklin Edgerton, and the University of California, Berkeley of translator Arthur Ryder.

Germany during the early Middle Ages as edited by Jacob delighted generations of students. The scholar also edited a series of publications called *Turkische Bibliothek* in which the first studies into the Bektashi order were published; Richard Hartmann's analysis of the *risāla al-qushairiyya* (*al-Kuschairis Darstellung des Sufitums*) in 1914 is still an indispensable work for the student of Sufism.—Jacob's successor, *Theodor Menzel* continued in elaborating some aspects of Jacob's teaching, concentrating mainly upon Turkish literature. The chair was vacant for many years after the war; for a while W. Hoenerbach occupied it before being called to Bonn. The new professor, *Heribert Busse* (b. 1926) was until now teaching Islamics at Bochum, the new university in the industrial Ruhr area where a proper tradition in our field has still to grow. Busse, a disciple of B. Spuler, has published an extensive study of the Buyids (*Kalif und Grosskönig, Die Buyiden im Irak*, 1965) after a number of studies into early Islamic diplomatics and documents.

Even this short survey in which of necessity many names are lacking and which is restricted to West Germany shows that almost every aspect of Islamic culture can be studied in German universities. The study of Persian and Ottoman poetry and that of Sufism is not well represented; the scholarly work in these fields is at present mainly carried out in Switzerland and the Netherlands. Islamic Art is likewise under represented, and so is the study of Muslim India and Pakistan.

Still, keeping in mind the desolate situation of German universities after 1945 we are happy to witness the growth of a new generation of orientalists, among them many highly promising young men and women.

January 1974.

field of B. Flemming together with *Manfed Götz* (Cologne) and *Hanna Sohrweide* are the Turkish mss., the Arabic section works under the guidance of R. Sellheim, the Persian one under W. Eilers. A few volumes of these catalogues which will also comprise Sansrit, Tibetan, Chinese etc. Manuscripts have already appeared in print. They are indispensable for every student of Islamics since the ancient valuable catalogues of Berlin, Münich, Gotha, etc, had to be brought up-to-date, for many important manuscripts had been acquired from the beginning of our century. The contribution of our young and well trained scholars in this project fills us with pride.

Besides the centre of Islamic historical studies in the University, Hambürg is fortunate enough to possess a centre for modern research, e.g. the *Deutsche Orient-Stiftung* where the development of Middle Eastern countries along with its political, economic, and social implications is being observed. The journal *Orient* contains relevant information, and so do most of the publications which mainly deal with socio-economical problems, and thus fill a gap in German orientalist literature. Among the publications we would like to mention the late *K. H. Pfeffer's* study on Pakistan: *Pakistan, Modell eines Entwicklungslandes*, 1966, the two-volume bibliography on Afghanistan (1968-69) and the just published bibliography of German theses and studies written in connection with universities and learned societies about the Near and Middle East: *Deutsche Hochschulschriften über den modernen islamischen Orient*, 1973. This work, like the Afghanistan-bibliography, was prepared in connection with the *Dokumentations-Leitstelle Moderener Orient*, the Middle East Documentation Centre; here, a bibliography of German studies connected with Pakistan is at present in preparation, compiled by *Dr. Munir Ahmad* who also teaches at the University of Hambürg.

Between the two world wars, the University of Kiel was a place where one important aspect of German scholarship developed: it was the seat of *Georg Jacob* (1862—1937) who introduced into Islamic studies what is called *Realienkunde*, e.g. the knowledge of not only grammar and external political history but of the details of cultural life as well. Jacob disliked the dry, exclusively philologically oriented methods of many of his colleagues and devoted his interest to problems like the daily life of the Bedouins as told in ancient Arabic poetry, or to, the history of the shadow play and similar histherto neglected topics: travel account of Arab merchants to

not only wrote an introduction into the Syrian Arabic dialect but also a fine study on the cultural importance of the bath, *ḥammām*, in medieval Islamic culture (*Das Bad im arabisch-islamischen Mittelalter*, 1970). *Gotthard Jäschke* (b. 1894) once member of the Berlin Oriental Seminar, is still active in publishing his painstaking researches into modern Turkish history from Ataturk's revolution onwards The Professor of Ancient history, *Ruth Stiehl*, has published, together with her teacher *F. Altheim*, several books on pre-Islamic Arabia and the neighbouring areas.

As to Göttingen, we mentioned already A. Dietrich's activities; he rerpesents the classical approach to Arabic studies; the role of the Iranologist W. Hinz (b. 1906) was also previously mentioned.

The two northernmost universities in Germany have a good tradition in Islamics. That in Hambürg was founded by C. H. Becker (1876—1933) who introduced Islamics proper into the philological campus of German scholars; the names of H. Ritter who started his career in Hamburg, and of *W. Björkman* (b. 1896), later in Berlin, are worth mentioning among the 'early' scholars of Islamics in Hamburg. *A. Schaade* (1883—1972) taught, at that time, Semitics and classical Arabic, while *R. Strothmann* (1877—1960) for the first time discussed the Shia, and particularly the Zaidiyya, in his numerous publications, thus opening a long neglected area of research. His work in this field was continued successfully by *Wilferd Madelung* (b. 1930), who is now teaching in the USA. The chair of the Near Eastern Studies has been held, for many years, by *B. Spuler* (b. 1911) whose interests are primarily historical; every scholar is acquainted with his voluminous studies about Iran in early Islamic times, about the Mongols in Iran, the Golden Horde, etc. As editor of the noted journal *Der Islam*, which was founded by C.H. Becker 'as the first journal devoted to Islamology proper. Spuler has greatly contributed to the development of Islamic studies; the same is true for his editorial activities in bringing out the *Handbuch der Orientalistick*. The tradition as Persian and Turkish is strong in *Barbara Flemming* (b. 1930) is a fine representative of Ottoman studies. She is also involved in a project in which a number of orientalists have been engaged for the last eight or ten years, i.e. with the cataloguing of Oriental manuscripts in Germany. The

Islam, devoted mainly to modern Islamic problems. His many-sided interests which resulted in a large output of writings and in the training of students from various fields have turned during the last years towards Arabic medicine and Pharmacology.

It should be mentioned here that the interest in Arabic classical Medicine has grown remarkably during the last decade. The greatest authority in this field had been *Max Meyerhof* (1874-1975) who spent long years as an opthalmiologist in Cairo. The Professor of Arabic in Göttingen, *Albert Dietrich* (b. 1912) has done research in classical medical texts after publishing his interesting study of the trade in drugs in the Egyptian Middle Ages (1954). Two of his former disciples and now colleagues have been working in the same filed: one is *Peter Bachmann* (b.1936), the successor of Stefan Wild in the Oriental Institute in Beirut, the other one *Christoph Bürgel* (b. 1931) now Professor of Islamics in Bern, Switzerland. *H. Schipperges* has, as well as other colleagues, contributed to our knowledge of history of Arabic Medicine.

After O. Spies had retired the chair in Bonn was given to *W. Hoenerbach* (b. 1911) who is no doubt the greatest German specialist in Spanish and North African Islam as can be witnessed from his publications (Das *Spanisch-arabische Urkunden*, 1965, and *Islamische Geschichte Spaniens*, 1970). The younger colleagues in the Bonn institute minly concentrate on classical Arabic and problems of early Islamic history and theology. The Islamic East is no longer represented after the present writer left Bonn for Harvard.

In the neighbouring university of Cologne *Erich Graef* (b. 1914) an authority on Islamic law, but widely interested in contemporary problems as well, has succeeded *Warner Caskel* (1896-1969) the learned scholar whose special field was pre-Islamic Arabia and Bedouin tradition; Turkish and Persian are also represented.

In Münster where once *Franz Taeschner* (1888-1967) taught Islamics (his studies about the *futuwwa* are well-known) *Hans Wehr* (b. 1909), the author of the indispensable Arabic-German Dictionary, is Professor of Arabic. Although he himself has published only little during the last years his disciples have worked in different fields of Arabic studies, to mention only the exploration of Arabic dialects; as an example we single out *H. Grotzfeld* (b. 1933) who

is at present barely worth mentioning for its Oriental studies ; except Indology in the neighbouring Giessen, a university formerly more involoved in science, a Center for Islamic and African Studies has developed during the last years. Its head, ***Ewald Wagner*** (b. 1927) has not only contributed to Ethiopian studies but has edited the dīvan of Abu Nuwas, a poet to whom he has devoted a very learned monograph in 1964 which does not leave unexplored any aspect of the cultural background of this gay Abbasid poet. Wagner has a number of excellent disciples ; the thesis by ***Wolfhart Heinrichs*** on al-Qarṭajānni and the application of Greek rhetorics to Arabic literary criticism (***Arabische Dichtung und griechische Poetik, 1969***) is admirable. ***Peter Dressendörfer*** has made a case-study of the situation of the Moriscos in Spain under the inquisition (***Islam unter der Inquisition***, 1971) and given a model of sober analysis which could serve as a starting point for the investigation into the situation of other Muslim groups under foreign oppression. Along the Rhine, Bonn used to be one of the centres of German orientalist studies. It was here that the first chair of Indology was founded in 1818 ; here ***G.W. Freytag*** (1788—1861) wrote his famous ***Arabic-Latin Dictionary*** and published many other useful studies. Later, ***Paul Kahle*** (1875—1964) was the Director of the Oriental Institute for many years before he had to leave Germany in 1938. The activities of ***Max Horten*** (1874—1945) in the field of Islamic philosophy are probably better known outside Germany than in his own country ; his introductions into the thought of Muslims and into Muslim religious beliefs which were published during World War I are still useful.

After World War II ***Otto Spies*** (1901) took over the Islamic section. He is well known to many scholars in the Subcontinent for his teaching activities in Aligarh in the early thirties, and we owe him, in collaboration with ***E. Bannerth***, the only comprehensive ***Grammatik des Hindustani*** (1942) in the German language, a book which would deserve a revised edition. On the other hand Spies, being a jurist himself, has contributed by his own studies and by some theses written under him to our knowledge of Islamic Law (cf. his contribution in the ***Handbuch der Orientalistik***) ; he was further very interested in modern Turkish literature to which he devoted a number of studies, and also in the study of folkloristic problems and 'Oriental motives in European literatures'. Besides he has been editing for many years the useful journal ***Die Welt des***

In the course of the last years, the Frankfurt seminar was enlarged by a chair of Turkish studies, held by *W. Brands* (b. 1922) who specializes in modern Turkic languages all literatures.

Following the river Main we reach Würzburg, once the seat of *Hand Bauer* (1878—1937) whose translations from Ghazzālī's *Iḥyā*, are the first steps in a long line of translations from this book into different languages of the world. At present, *W. Eilers* (b. 1917) represents the tradition of Iranian studies; his field comprises the whole range from Old Persian to modern dialects, without neglecting poetry. One of his younger colleagues, *W. Heinz*, has just finished writing a thesis about the 'Indian Style'. Other students of Eilers work in the field of Persian semantics etc. Arabic is mainly taught by *Susanna Diwald-Wilzer* who once wrote a fine exegesis of Ghazzālī's *kitāb at-taubā* in the *Iḥyā'*, and has edited Arabic theological texts, thus about the Classes of the Mu'tazilites.

Slightly more to the north we find the University of Erlangen, once the home of Friedrich Rückert (1788—1866), the great German orientalist poet to whom we owe the finest translations of Arabic, Persian, Sanscrit and other poetry into German literature, among which his translation of the *maqāmāt al-Ḥarīrī* surpasses even the original in wittiness and abundance in puns and yet remains as faithful as possible to the original meaning.

For a short while the lamented *Jörg Kraemer* (1917—1961) was professor of Arabic in Erlangen; he belonged to the most promising Arabic scholars from whose pen we had expected some fundamental books on Arabic and Islamic culture. At present the chair is held by *Wolfdietrich Fischer* (b. 1928) whose study on the names of colours and forms in classical Arabic (1965) contains interesting philological material; his method applies the modern linguistic approach to Arabic, and his recently published Grammar of classical Arabic (1972) shows the development of grammatical analysis very well and will certainly replace some of the older grammars.

Returning to Frankfurt once more where R. Sellheim is also engaged in the redaction of important journal *Oriens*, founded after the war by H. Ritter as a medium of international exchange, we now take a turn towards the north where two more universities of the province of Hessen are more or less engaged in Oriental studies. Marburg, once a centre of Assyrian studies and History of Religions

mention the presence of *Matthias Schramm*, one of the few specialists in the history of Islamic sciences and author of an outstanding book on Ibn al-Haytham (*Ibn al- Haythams Weg zur Physik*, 1963).

A former member of the Tübingen school and disciple of Littmann, *Anton Schall* (b. 1920), is teaching Islamics and Semitics at Heidelberg University ; in this place the South East Asia Institute is also worth mentioning, since it is supposed to work in the field of the culture of the Subcontinent. Yet the field of Urdu and Pakistaniyat proper would deserve more accentuation.

In Mayence the chair of Islamics was founded after the war by *H. Scheel* (1895—1967), an Ottomanist and for decades administrator of the *Deutsche Morgenländische Gesellschaft*. His successor, too, is a Turcologist, *H. Benzing* (b. 1913) who masters the most exotic Turkic and Ugrian languages and thus represents the traditional German Turcological school which reached from W. Bang Kaup through the learned lady *A. von Gabain* (b. 1901) to a group of younger scholars who are now teaching all over the world (thus *O. Pritsak* at Harvard). Historical research is also carried out in Mayence.

Across the river Main, in Frankfürt (once the domain of *J. Horovitz*, 1874—1931, an authority on Qur'anic exegesis) *Rudolf Sellheim* continues the classical tradition of Arabic philology. He is a disciple of *Helmut Ritter*. H. Ritter's death (1892—1971) deprived the learned world of a most fascinating and manyfaceted scholar, and I think all of us would agree that he was the last truly great master in our field. His numerous editions of classical Arabic and Persian works, his almost fabulous insight into philological and literary problems, and the immense knowledge of manuscripts, which he had acquired during his twenty years' stay in Istanbul shows his erudition. His sometimes harsh criticism for which he was dreaded by many of his students had to be accepted as a fatwā. Ritter's book *Das Meer der Seele*, 1955, contains the finest appreciation of Attar's poetry and mysticism ever written, and sums up the numerous articles he had devoted to Sufism. It shows Ritter's wide range of interest that he did not hesitate to edit and translate Turkish puppet plays, *Karagöz*, in an ingenious way, and during the last years of his life which he spent in his house in the Taunus he published three big volumes about the language of a Christian Syrian ethnic group.

Qur'an. — Paret has trained a good number of orientalists among whom two ladies are especially worth mentioning; one is Rotraut Wieland whose book on the concept of history in modern interpretation of the *Qur'an* belongs to the finest studies written on modern Islam (*Offenbarung und Geschichte im Denken moderner Muslime*, 1971); the other one is *Remate Jacobi* (b. 1936), now teaching at Saarbrücken University, the author of a book on the poetical evaluation of classical Arabic *qaṣīdas* (*Studien zur Poetik der altarabischen Qaside*, 1971). This book opens new vista in the aesthetical appreciation of Arabic poetry.

As to Saarbrücken, where R. Jacobi is working, the full professor is *H. Gätje* (b. 1927), again from the Tübingen school, who specializes in classical Arabic and has dealt with intricate problems of the transmission of Greek into Arabic. His latest book is an introduction into *Qur'an* (*Koran und Koranexegese*, 1971). In the edition of the great Arabic dictionary which is based on the collections of A. Fischer, Th. Nöldeke and other masters of Arabic H. Gätje was helped first by *J. Kraemer* (v. below) and then succeeded by *Manfred Ullmann* (b. 1931). Ullmann's book about the development and meaning of Rajaz-poetry (*Untersuchungen zur Rajaz-Poesie*, 1966) is a fascinating study into a neglected field of poetry; during the last years he has contributed learned volumes on Arabic science and medicine to the comprehensive *Handbuch der Orientalistik*, edited by B. Spuler.

Ullmann lives in Tübingen where R. Paret was succeeded, a few years back, by *Josef van Ess* (b. 1934) who is regarded as the best autority on Islamic dogmatics and the history of early Islamic theological movements; a number of smaller editions of rare Mu'tazilite treatises and his comprehensive book on al-Ijī's *mawāqif* (*Die Erkenntnislehre des 'Aḍud ad-dīn al-Īǧī*, 1966) have gained him a foremost place in this field, and his thesis about al-Muhāsibi, written in Bonn (*Die Gedankenwelt des Hārit al-Muḥasibī*, 1961) is an excellent study of this early mystic of Bagdad and supercedes M. Smith's studies.

To the Tübingen seminar belong a number of younger scholars who are, partly, involved in a very useful project, e.g. an atlas of the Islamic world which will be accompanied by learned books and articles to show the internal and external expansion of different facets of Islamic civilisation. We should also like to

languages and religions. Under Roemer's guidance a remarkable out-put of theses on different problems of early Safavid, Ottoman, and Mamluk history has been produced during the last years, of which the studies in Mamluk historiography (*Haarmann, D. P. Little*) seem, to me, particularly interesting. Besides, Freiburg is fortunate enough to have an Islamologist as Professor of Hhistory of Religions; it is the Jesuit Father *R. Gramlich*, a disciple of *Fritz Meier* (b. 1912) in Basle, and like him an autority in the history of Sufism. Gramlich's small but weighty book on the Shi'a Sufi orders, the second part of which is now in the press, is an excellent introduction into this complicated subject and touches, with the affiliations of the Khaksariyya, also Pakistani Sufi traditions.

The most famous university in south-western Germany is, no doubt Tübingen. Once a center of Protestant theology and the home of many outstanding Arabic scholars. For many years, *Enno Littmann* (1875—1958) occupied the chair of Arabic; a scholar of both Arabic and Ethiopian, Littmann is known to the large public by his translation of the Arabian Nights in six volumes which appeared in the twenties, He was also among the first to draw attention to the expressions of daily life and folklore particularly in Egypt, and published many small contributions to popular Arabic literature. Together with August Fischer, Littmann was a member of the Arabic Academy in Cairo, and has trained many a scholar from the Arab world. His successor was *Rudi Paret* (b. 1901) who, about forty years ago, developed the idea of a new German translation of the *Qur'an*, accompanied by a little commentary. This translation appeared in Stuttgart from 1963 onwards, the concordance and commentary in 1971. As much as the patience and painstaking accuracy of Paret are admirable in themselves the translation lacks some eloquence and does not inspire to the reader a feeling of the *I'jaz al-Qur'an*, of its linguistic beauty and the great waves of inspiration out of which it was born and which have shaped the whole Islamic culture. But this topic would lead us inevitably to a detailed discussion of the problem in how far a translation of a sacred book into a language of different dimensions is possible at all . . . . . For my feeling the incomplete translation of *Rückert*, although in philological neatness scarcely comparable to that of Paret makes the Western reader at least feel the inspired character of the

application of religio-philosophical concepts (*Der islamische Orient zwizchen Vergangenheit und Zukunft*, 1960) is F. Steppat (b. 1923). Formerly director of the German Institute in Beirut and specialist in modern Arabic educational and political problems. He has trained a number of students among whom *B. Johansen* with his penetrating analysis of M.H. Haikal's ideas may be singled out (*Muhammad Husain Haikal, Europa und der Orient im Weltbild eines ägyptischen Liberalen*, 1968).

Berlin is, however, almost the only German university where modern problems are discussed. Most of the universities still prefer the classical approach and embrance the study of modern Islam only reluctantly. Let us start in geographical order from the south. Münich, once the seat of *G. Bergsträsser* (1886—1933) and his successor *O. Pretzl* (1893—1941) was meant to become the center of research into the *Qur'an* and its exegesis; but unfortunately the institute was destroyed by bombs during the war. *A. Spitaler* (b. 1910) continues the strictly philological research of his predecessors and is probably in today's Germany the best authority on pre-Islamic and classical Arabic and its grammatical intricacies. Among his few but distinguished pupils we mention *Stefan Wild* (b. 1937) whose thesis on the relation between the *kitab al-'ain* and Indian lexicography, 1965, is highly interesting. Wild who was the director of the Orient Institute in Beirut for the last years is like-wise interested in dialectology and in some aspects of modern Islamic thought; he has recently joined the University of Amsterdam. The chair of Turcology, once represented in Münich by *F. Babinger* (1891—1967) is now directed by his former disciple *H. J. Kissling* (b. 1912), a specialist in Ottoman History and particularly in the history of the dervish orders in the Ottoman Empire. Kissling's students continue his research so that we now possess a number of important detail-studies in a field which is generally regarded as not too attractive, i.e. the history of *tariqas* in Turkey, Albania, and the adjacent areas.

The Oriental Institute of the University of Freiburg/Breisgau has developed into a veritable center of historiography. Its head is *H. R. Roemer* (b. 1915). He was mainly trained under the Iranologist *Walter Hinz* (b. 1906) in the university of Göttingen, who has now completely concentrated upon problems of pre-Islamic Iran, its

Ernst Kühnel (1882—1964), the master of Islamic Art, never left post-war Berlin but for study journeys; he, the grand old man of the history of Islamic arts, wonderful teacher, learned scholar, and author of numerous readable books about every aspect of Islamic arts succeeded by his untiring labour in rebuilding once more an Islamic Museum in the western part of Berlin without neglecting the superb collections which were preserved in the old Museum, which belongs now to East Berlin, as long as communication between the two parts of the divided city was easy. After his retirement which Kühnel mainly devoted to writing his magnum opus about Islamic Ivory-work (*Islamische Elfenbeinskulpturen*, 1971) his former assistant *Kurt Erdmann* (1901—1964) returned from Istanbul to Berlin to succeed him in the directorship of the Museum. An untimely death summoned Erdmann (specialist in oriental rugs, Sasanian silver and early Turkish architecture) only a few months after Kühnel had passed away. Notwithstanding this twofold loss the Berlin tradition of Islamic art, representatives of which are found in many parts of the world, (*R. Ettinghausen*, *K. Otto-Dorn*, *W. Grube* . . .) remained alive; eventually the new Museum of Islamic Art in Berlin-Dahlem was inaugurated in 1968 under its director *K. Brisch* who specialized with a treatise about some architectural-decorative devices in the Mosque of Cordoba. The custodian, *Johanna Zick*, is an expert in Islamic ceramics. Inspired by Brisch's studies, the German Archeological Institute in Spain is at present engaged in a study of the complex of al-Jaferiya in Saragosa, the complicated epigraphic research being carried out by *Gisela Kircher*. The German Institute in Cairo likewise devotes parts of its activities to Islamic Art; the studies of Michael Meineke about Ottoman tilework and about cross-relations between Turkey and Egypt are worth mentioning in this connection. Another young German art historian, *Dorothee Duda*, has published an interesting study about a private museum in Beirut, e.g. the house of H. Pharaon (*Innenarchitektur syrischer Stadthäuser des 16. bis 18. Jahrhunderts*, *1971*); her book could serve as a model for similar research into some historical private houses in Pakistan, notably in Lahore and Peshawar.

The West-Berlin school of Islamic Studies in the Freie Universität as it stands at present is primarily interested in contemporary Islam and the Arab world. The successor of *W. Braune* (b. 1902) who once tried to analyze the situation of the Islamic world by the

felt that the heritage of men like *Th. Nöldeke* (1839—1930) or *H. L. Fleischer* (1801—1888) had to be preserved, and hoped once more to return to the glorious days of the past. Certainly inspiring was the presence among us of people like *August Fischer*, the last great representative of the famous Leipzig school, who died in 1949 at the age of 84 shortly before leaving for Egypt where he hoped to find the remnants of his thousands of cards for the Arabic dictionary to which he had devoted so many years of his life. . . *C. Brockelmann* was still alive (1868—1956), known all over the world as the author of the *Geschichte der Arabischen Literatur*. He was likewise remarkable for his Arabic Grammar, his studies on Turkic languages and his comprehensive historical work *Geschichte der islamischen Völker*, 1939. In his university, at Halle, *J. Fück* (b. 1895) maintained the classical Arabic tradition in impeccable purity; his book *'Arabīya* (1950) belongs to the most important studies into the growth of Arabic language. Fück's successor, *M. Fleischhammer* continues this tradition. But since Halle is part of the DDR scholarly exchange, much needed because of the treasures contained in the library of the *Deutsche Morgenländische Gesellschaft* is not always as easy as one would like it.

In Berlin, *Richard Hartmann* (1881—1965), the master of solid historical research into Arabic and Turkish and author of one of the finest books on modern Turkey (1926) continued his teaching for a couple of years after the war and tried to build up, once more, an orientalist center at Berlin. Even after his retirement and upto his last days he showed a living interest in the publications in our field and never hesitated to contribute by his reviews to a deeper knowledge of a wider range of subjects, always willing to encourage younger colleagues. The other master of the Berlin school before and during the war, *H. H. Schaeder* (1896—1957) later continued his teaching activities in Göttingen; his stupendous knowledge of Iranian and Islamic subjects (not to mention the European literatures, music, general history, theology etc.) found, unfortunately, no outlet in major publications; his untimely death deprived the admirers of this truly ingenious scholar of a comprehensive work on Iran and Islam. His former disciples who are scattered over several continents remember his fascinating personality and ever-inspiring teaching with deep gratitude.

A short survey of Islamic Studies in present-day Germany

PROFESSOR DR. ANNEMARIE SCHIMMEL
(HARVARD UNIVERSITY)

Much has been written about the activities of German orientalists in the past and present; we need remind the reader only of *J. Fück's* excellent study about the development of Arabic Studies in the West *(Die arabischen Studien in Europa, 1955)* from their very beginning to this century, or of *R. Paret's* short but impressive booklet about the present situation of Islamic studies *(Arabistik und Islamkunde an deutschen Universitäten)* which appeared in a survey series produced in cooperation with Inter Nationes in 1966. Collections of biographies like *E. Littmann's Der deutsche Beitrag zur Wissenschaft vom Vorderen Orient* 1942 und *Hundert Jahre Orientalistik*, 1955, provide the reader with many data about oriental scholars in Germany, and in our Arabic journal *Fikrun wa Fann* we have tried from 1964 to 1972 to give at least some information about a number of our great scholars who contributed to the knowledge of Islamic subjects. That is why I intend to concentrate in this small article on the situation of Oriental Studies in present-day Germany and on giving a mere enumeration of some of the most important study fields as they are represented in the universities without aiming at a complete survey.

One should never forget that World War II caused a tremendous gap in every field of learning or, to put it more correctly, that the whole period between 1933 and 1945 deprived us of a great number of scholars who partly had to leave Germany for their Jewish origin or their political convictions, or fell victims to war, bombing, and imprisonment. The generation that grew after the war, or returned from the battlefields viewed things completely differently from the scholars in the thirties who were sometimes too much entangled in ideological problems and partly left aside objective scholarship for specific political views. The orientalists after 1945 had to start afresh; many of them turned towards the strictly philological method for which German scholarship had been famous in the past. They



پروفیسر ڈاکٹر انی میری شمل (هارورڈ یونیورسٹی)

SIXTH SESSION

☆

South Asian Studies

☆

Professor Dr. Annemarie Schimmel

Dr. Carlo Coppola

The second Congress of the International Association of Writers for the Defence of Culture was held in Madrid, July 1937 ; but because of the Spanish civil war and the attack on Madrid only a few writers could attend. As a result, most of the sessions were held in Paris. Because this was an open meeting, and due to the events surrounding the locale where it was to be held, it received considerable press coverage. This was the final meeting before the outbreak of the war. For reports, see Malcolm Cowley, *New Masses*, August 10, 1937, p. 16, and *Bulletin*, August 1937, p. 1 ; Edgell Rickword, *Left Review*, II (1936), 381-383, including an abridgment of speeches by Benda, Bates, Last, Guillen and Gergamin. Michael Koltsov's speech appeared in *New Masses*, July 21, 1937, pp. 14-15. Stephen Spender's notes on this conference are in *New Writing*, ed. John Lehmann, No. 4 (Autumn 1937), pp. 245-251. A report of the meeting was also in *Daily Worker* (London ed.), July 21, 1937, p.7.

94. Zaheer, "Reminiscences," p. 55.

95. Stead, "The Writers Take Sides," p. 459.

96. Zaheer, "Reminiscences," p. 55.

97. Ibid

98. See Andre Gide, *Back from U.S.S.R.* and *Afterthoughts, A sequel to Back from the U.S.S.R.*, trans. Dorothy Bussy (London: M. Secker & Warburg, 1937 and 1938, respectively).

99. Zaheer, "Reminiscences," p. 55.

100. Ibid.

101. Ibid., pp. 51-52.

102. Ibid., p. 55.

103. Ibid., p. 56.

104. Ibid.

105. Ibid , p. 57.

75. Ibid., p. 328.

76. The book had in fact been published four years earlier.

77. Forster, "Liberty in England," p. 330.

78. In her report of the congress, Christiana Stead gives excerpts from speeches by Alfred Kantorowicz, Michael Gold, P. Gerome, Lion Feuchtwanger, ZAndie Chamson, Henri Barbusse, Waldo Frank, Heinrich Mann, John Strachey, Aldous Huxley, Louis Aragon, Luc Duratain, Paul Nizan, Julien Benda, J. Guehenno, Amabel Williams-Ellis, Jean Cassou, Ilya Ehrenberg and Andre Malraux. Frank's speech, "The Writer's Part in Communism," appeared in *Partisan Review*, February 1936, pp. 14-17. Jean-Richard Bloch's speech, "Literary Creation and Human Society," appeared in *Left Review*, II (1936-37), 464-468. For Ehrenberg's speech, see p. 51, n. 59. Other reports on the congress were made by Michael Gold in *New Masses*, July 30, 1935, pp. 9-11 ; August 6, 1935, pp. 13-15 ; and August 13, 1935, pp. 18-21. Gold also reported on the congress in *Pacific Weekly* (San Francisco), November 9, 1936, p. 308. Malcolm Cowley reported in *New Republic* July 31, 1935, p. 339. Oakley Johnson's piece in *International Literature* has been cited (see p. 51, n. 59) ; he also wrote one for *Daily Worker*, July 22, 1935, p. 5. The speech entitled "Rejoinder to the Sixty-four," which Lee Baxendall attributes in his bibliography to Malraux on the occasion of this June meeting, was actually presented before the French chapter of the International Association of Writers for the Defence of Culture in November 1935. See Baxendall, *Marxism and Aesthetics*, p. 40. For remarks about the organization set up following this congress, see pp. 34-36 of this paper.

79. Johnson, "World Congress of Writers," p. 72.

80. Sophia Wadia, "The International Writers' Congress," *Indian P. E. N.*, No. 3 (November 17, 1935), p. 7.

81. Ibid.

82. Ibid.

83. Ibid., p. 8.

84. Ibid.

85. Ibid.

86. Ibid.

87. Ibid.

88. Ibid., p. 9

89. Zaheer, "Reminiscences," p. 53. Note that Zaheer is not only incorrect about Madame Wadia's ethnic background but also about her marital status.

90. Ibid.

91. "The International Organization," *Left Review*, I (1935), 462.

92. Ibid., p. 463.

93. The most comprehensive coverage of this meeting was Derek Kahn's report in *Left Review*, II (1936-37), 481-490. His piece also included the full text of Malraux's speech, "Our Cultural Heritage," pp. 491-496. Kahn wrote a less detailed report for *Daily Worker* (London ed.), June 25, 1936, p. 3.

state that Rolland attended. See Jafri *Taraqqi pasand adab*, p. 183 ; Azmi, *Tahrik*, p. 34. Forster makes special mention of the fact that many of the writers who were supposed to attend did not, among them Thomas Mann, Karel Capek, Selma Lagerloef, Jules Romain and Romain Rolland. See "Writers in Paris," p. 9.

59. Oakley Johnson, "The World Congress of Writers," "*International Literature* (Moscow), No. 8 (1935), p. 74. Johnson had recently been expelled from an American university for his communist opinions : he was living in Moscow at the time and was writing a book on education. See Daniel Aaron, *Writers on the Left* (New York : Avon Books, 1965), p. 450, n. 24 Ehrenberg's speech to the congress was printed in *Daily Workers*, July 10, 1935, p. 5. Commenting on Babel's sense of humor and wit (cf Forster, 'Writers in Paris,' p. 9), Ehrenberg recalled in his introduction to Babel's selected works (Moscow, 1957) the enthusiastic reception given his speech at the congress:

> "For fifteen minutes he entertained the audience with several unwritten stories. The listeners laughed (he spoke fluent French), but at the same time they understood that, under the guise of amusing stories, the speaker was dealing with the essential nature of our people and our culture." (Quoted in Vera Alexandrova, *A History of Soviet Literature* (Garden City: Doubleday & Co., 1963), pp. 152-153).

60. Maxim Gorky, "Gorki's Message," *Daily Worker*, July 18, 1935, p. 5.

61. Michael Gold, under the alias of Irwin Granich, fled to Mexico in 1917 to escape the draft ; there he met M. N. Roy, with whom he became friendly. Both men started writing for Mexican radical publications during this period. SeeOvers treet and Windmiller, *Communism in India*, p. 23 ; also M. N. Roy, *Memoirs* (Bombay : Allied Publishers, Private Ltd., 1964), pp. 106-113.

62. Stead, "The Writers Take Sides," p. 460.

63. Forster, "Writers in Paris," p. 7.

64. Zaheer, "Reminiscences," p. 52.

65. Ibid.

66. This speech is printed under this English title in *Life and Letters* (September 1935), pp. 12-18 ; trans. Edmund Stevens, it is in *International Literature* (Moscow.) No. 10 (1935), pp. 81-85. The *Left Review* text, which I use, is titled "The Individual", (I (1935), 447-452). In his *Marxism and Aesthetics : A Selective Bibliography* (New York : Humanities Press, 1968), p. 38, Lee Baxendall comments that this speech is "the basic text for his (Gide's) idea of relations of Communism and literature."

67. Gide, "The Individual," p. 447.

68. Ibid., p. 448. Cf. this statement with Zaheer's comments on p. 38.

69. Ibid., p. 450.

70. Ibid., p. 451.

71. Ibid.

72. Ibid., p. 452.

73. Ibid.

74. E. M. Forster, "Liberty in England," *London Mercury*, XXXII (August 1935), 327.

(April 1934), pp. 385-394. Dimitrov later addressed the Seventh Comintern Congress in 1935 on the subject of the Indian Communist Party's taking an active part in the Indian National Congress, "facilitating the process of crystallization of further developing the national liberation movement" in that country. See Georgi Dimitrov. "The Offensive of Fascism and the Tasks of the C.I. in the Struggle for the Unity of the Working Class against Fascism," *Imprecor*, XI (August 20. 1935). 971. For a comprehensive study of the French Popular Front, see Maurice Thorez, *France Today and the People's Front* (New York : International Publishers, 1936), pp. 155-207; and Peter J. Lamour, *The French Radical Party in the 1930's* (Stanford : Stanford University Press, 1964), pp. 103-176. The authoritative study of the situation in Austria at this time is Charles A. Gulick, *Austria from Hapsburg to Hitler* (Berkeley : University of California Press, 1948), II, 1133-1359'. See Zaheer, "Reminiscences," p. 52.

49. *Left Review*, I (1935), 346.

50. Quoted in Azmi, *Tahrik*, p. 34.

51. Translated into English by W. Fitzwater Wray as *Under Fire : The Story of a Squad* (London : J. M. Dent & Sons. 1919).

52 See Overstreet and Windmiller, *Communism in India*, pp. 74-75.

53. "The Declaration of Independence of the Spirit," dated Sring 1919, is a call to "Workers of the mind," thinkers, artists, writers, to strench their forces against all social and political divisions among men, such as those that caused the war just past, and to reestablish firm ties witn "the people who suffer, and who always advance along a rough road drenched with their blood." This document appeared in *L'Humanite*, June 26, 1919, and was eventually signed by several hundred of Europe's and America's major writers and intellectuals, including Bertrand Russell, Benedetto Croce, Heinrich Mann, Georges Matisse, Upton Sinclair and Stefan Zweig. The only two non-Westerners who signed were Rabindranath Tagore and art critic and author Ananda Coomaraswamy. See Romain Rolland, *I Will Not Rest*, trans, K. S. Shelvankar (New York : Liveright Publishing Co. (1935), pp. 91-95. For an interesting controversy between Henri Barbusse and Rolland on the subject of this declaration, see *I Will Not Rest*, pp. 127-145. Shelvankar, the translator of this volume, later became an editor of the short-lived journal, *Indian Writing* (London) ; one of his co-editors was Ahmed Ali.

54. See Krishna Kripalani, *Rabindranath Tagore, A Biography* (New York : Grove Press, 1962), pp. 276-277. The long association between these two writers is depicted in *Rolland and Tagore*, ed. Alex Aronson and Krishna Kripalani (Calcutta : Visva-Bharati, 1945).

55. Zaheer, *Roshanai*, p. 52, states that the meeting took place in Baloulille, "a famous hall of Paris." Azmi incorrectly states that the meeting was in July. See *Tahrik*, p. 34.

56. E. M. Forster, "Writers in Paris," *New Statemesman and Nation*, July, 6, 1935, p. 9. Reprinted in *Living Age*, September 1935, pp, 63-65.

57. Christina Stead, "The Writers Take Sides," *Left Review*, I (1935), 462.

58. Indian accounts, drawing from Zaheer's inaccurate account of this meeting,

42. Suniti Kumar Chatterji (b. 1890 in Sibpur, Howrah District, Bengal) was educated at Calcutta University and the universities of Paris and London. Between 1922 and 1951 he served as Khaira Professor of Indian Linguistics and Phonology at Calcutta University ; he also taught at the University of Pennsylvania in 1951. A member of the Official Language Commission, he has published over twenty books in both Bengali and English, of which a number are standard studies in linguistics. Chatterji was not, of course, the originator of the idea of Roman script for Indian languages. Pioneering work in this area was done by a Mr. A. Latiff, I.C.S., who did extensive work in developing a romanized Urdu script earlier in the century. See R. C Majumdar *et al.*, *An Advanced History of India*. 2nd ed. (London : The Macmillan Co., 1960), p. 1963.

43. Zaheer, "Reminiscences," p 51.

44. Ibid.

45. Nazrul Islam (b. 1899 in Churulia, Burdwan District, Bengal) has published over twenty-five volumes, mostly poetry. On November 1, 1925, he organized the Labour Swaraj Party of the Indian National Congress. one of the activities of the Communist Party of India, in an attempt to gain control of the Congress. See Overstreet and Windmiller, *Communism in India*, p. 79. An excellent critical evaluation of Nazrul's poetry, written much in the spirit of the newly emerging progressive Urdu criticism, is in Akhtar Husain Raipuri, "Bengāl kā baghī shāir, Nazrul Islam" (Bengal's Revolutionary Poet, Nazrul Islam,) in *Adqab aur inqilab* (Literature and Revolution) (Bombay : National Information and Publishers Ltd., n. d.), 'pp. 132-154. The article is originally dated London, November 10, 1938. English studies of this poet include Serajul Islam Choudhury, *Introducing Nazrul Islam* (Karachi : Pakistan Publications, 1965) ; and Mizanur Rahman, *Nazrul Islam*, 3rd ed. (Dacca : Tarun Pakistan Publishers, 1966).

46. Zaheer states incorrectly that this story was subsequently published in *Asia* magazine. See "Reminiscences," p. 51. A check through the back files of *Asia* from 1930 to 1946, the year it ceased publication, shows that this story did not appear in its pages. The story is currently available in *The Barber's Trade Union and Other Stories* (London : Jonathan Cape, 1944) ; rpt. Bombay : Kutub-Popular, 1959), pp. 106-116.

47. Originally published Lucknow : Halqah-i-Adab, 1937 ; recently reprinted in paperback in Delhi : Hind Pocket Books, n.d. It is interesting that the world *landan* in Hindi and Urdu is not taken into these languages with a retroflex ḍ, as are all words in English ; it is a rule of Hindi-Urdu phonology that all alveolar *t*'s and *d*'s of English are transformed into retroflex ṭ's and ḍ's. One reason why the alveolar *d* of "London" is shifted to a dental non-aspirate *d* of Hindi-Urdu might be due to the fact that *landan* has too close a clang association with *lānḍā*, the colloquial Hindi-Urdu word for "penis".

48. For a good article on the Reichstag fire, see K. Martin, "Reichstag Fire ; or, An Expreriment in Psychological Anarchy." *Political Quarterly* (October 1933), pp. 587-594). Concerning Dimitrov, see H. Brown, "Georgi Dimitrov, "" *Fortnightly Quarterly*

Nanking Restaurant meeting are the same. In addition, it should be noted that Zaheer, for whatever reason, makes no mention of the fact in *Roshnai* or in his reminiscences that Ahmed Ali and Mahmuduzzafar announced the formation of the PWA in the *Leader* as early as 1933. Nor do the other Urdu commentators make any statement about this announcement. It would seem, then, that while an exact date for this meeting cannot be pinpointed, it is possible that the earlier date of 1934, rather than Zaheer's date of 1935, is more accurate.

34. *Left Review*, II (1936-37), 240.

35. *Hans* (October 1936), quoted in Azmi, *Tahr I.*, pp. 35-37. It is interesting that Premchand's English biographer, Madan Gopal, states that Premchand "published a summary of the Manifesto and the aims of the Association" in *Hans*, when in fact the entire manifesto, together with its aims, were presented. Such a distortion is indicative of a Hindi writer's attitude toward Urdu writers. See Madan Gopal, *Munshi Premchand : A Literary Biography* (Bombay : Asia Publishing House, 1964), p. 413.

36. Sophia Wadia was born in 1901 in Bogotá, Colombia, of French parentage. She was educated at the University of Paris and Columbia University and is married to a Parsi. She is the founder and editor of the *Indian P. E. N.*, which began publication in 1934, and editor of the *Aryan Path*, a journal with theosophical leanings. Both publications are from Bombay. For further information about Madame Wadia and her participation in the International Congress for the Defence of Culture, as well as for for Zaheer's remarks concerning her, see pp. 33-34.

37. Kanaialal Maneklal Munshi (b. 1887 in Broach, Gujrat) was co-editor with Gandhi of *Young India* and has been very active in both Gujraati literature and Indian politics. Until recently, he was president of the Bharatiya Vidya Bhavan. He has written over seventy books in both English and Gujarati, including novels and autobiographical pieces.

Dattatraya Balkrishna Kalelkar, or "Kaka Sahab" (b. 1885 in Satara, Maharashtra) was a close follower of Gandhi. He has written over thirty books, mostly in Gujarati but some in Hindi, including essays, travelogues, and some autobiographical pieces.

38. There is no term in Urdu for "radical" as such. An approximate synonym is *intahā pasand*, or "extreme". The word "radical" could have been used in Hindi in much the same way as "pamphlet" is used in resolution

39. Gopal, *Munshi Premchand*, p. 413

40. Premchand to Zaheer, may 10, 1936. "Some Unpublished Letters of Premchand," p. 32.

41. For an excellent discussion of this point, see Anjani Kumar Sinha, "Socialist Realism in Modern Hindi Poetry," a paper read before the panel on Socialist Realism in the South Asian Context at the 24th Annual Meeting of the Association for Asian Studies, New York, March 29, 1972. This paper and others in this panel will be published in the Occasional Papers Series of the Asian Studies Center, Michigan State University, and will appear in Spring 1973.

31. *Coolie* was written in 1933 but was not published in England until 1936 by the Wishart Co. of London, a year after *Untouchable*, Anand's second novel *Coolie* was subsequently reprinted in several editions : American (New York : Harmonsworth 1945) ; British (London . Hutchinson International Authors. 1947) ; and Indian (Bombay : Kutub-Popular (1951).

32. To date, Anand has published nearly forty volumes, mostly novels, but also critical works on Indian art and civilization. His latest novel. *Morning Face* (Bombay : Kutub-Popular, 1968), a sequel to the autobiographical *Seven Summers* (London . Hutchinson Co., 1951), received the Sahitya Akademi Prize in English in 1971.

33. Zaheer, "Reminiscences," p. 50. It is difficult to establish the exact date of this first meeting. In writing about the establishment of the London group, Zaheer states : "Some Indian students held the first meeting of the Progressive Writers' Association in London in 1935'". See Sajjad Zaheer, *Roshnāi* (Illumination) (Delhi : Azad Kitab Ghar, 1959), p. 11. Ali Sardar Jafri states that the first meeting of the group took place a few months prior to the first meeting of the International Congress for the Defence of Culture, held in Paris, June 21-26, 1935. See his *Taraqq' pasand adab* (Progressive Literature), 2nd ed. (Aligarh : Anjuman-i-Taraqqi Urdu, 1956), p. 183. Similarly, Khalilur Rahman Azmi, building on the data of Zaheer and Jafri, states that the association was started in 1935. See Azmi, *Tahr.k*, p. 33.

It should be noted. however, that critic Philip Henderson, writing in *Left Review*, quotes copiously from what appears to be a preface or foreword to *New Indian Literature*, I (Spring 1936), a quarterly containing essays and criticism by Jawaharlal Nehru, M. D. Taseer, Mulk Raj Anand, Raja Rao, Jyotirmaya Ghosh, and K. S. Shelvankar, among others. The following is an extract from this preface/foreword :

> "During the years following the Economic Crisis of 1931 and the consequent collapse of most of our accepted values, a number of young Indian writers were to be seen talking over cups of tea in the cafes and garrets of Bloomsbury.
>
> *On November 24th*, 1934 (italics added), these little groups joined together and formed the Indian Progressive Writers Association.
>
> In the course of a year they had built up a body of members with a panel consisting of poets, novelists, scholars and artists, who were either voluntary exiles from their own country or had been forced out by threats of violence." (Quoted in Philip Henderson, "Indian Writers," *Left Review*, II (1936-37), 410).

Given the fact that a number of details provided by Zaheer regarding the early phases of this association are inaccurate or imprecise (noted in footnotes where possible), it would seem that the datum in the Henderson review regarding the first meeting, being written closer in time to the actual event, might be more accurate. Zaheer published no memoirs about the early phases of the organization until his "Yaden" (Reminiscences), published in *Nayā adab* in1941. The Pakistan edition of *Roshnāi* appeared in 1956 (Lahore : Muktabah-i-Urdu) ; the Indian edition, which I have used for this article, appeared in 1959. Such inaccuracies might be attributed to the passage of time and to inexact recollection. One cannot assume that the November 24, 1934, meeting and the

thus : "The greatest defect of *Angāre* was the circumspection of absence and unprincipled extremism," which makes no sense. The compound *ehtiyāt-i-fiqdān* ("circumspection of absence") must be read as *fiqdān - ehtiyāt* ("absence of circusmspection"). A calligrapher's error is doubtless involved here.

18. Ahmad, *Taraqqī pasand adab*, p. 45.

19. Ibid.

20. Khalilur Rahman Azmi, *Urdū men taraqqī pasand adbī tahrīk* (History of Progressive Literature in Urdu) (Aligarh : Anjuman-i-Taraqqi Urdu (India), p. 30.

21. Ibid.

22. Quoted in Ahmed Ali, "Progressive Writers' Movement and Creative Writers," p. 1, unpublished article in English completed August 1972 ; to be published in Occasional Papers, South Asia Series (Michigan State University : Asian Studies Center) in a volume of papers prsesented, in the main, at the 24th Annual Meeting of the Association for Asian Studies, New York, March 29, 1972, in the panel, "Socialist Realism in the South Asian Context." The panel was organized and chaired by this author, who will also edit the papers for publication in Spring 1973.

23. Ibid.

24. Ahmed Ali to me, August 16, 1972.

25. Zaheer, "Reminiscences," p. 49.

26. Ibid., p. 47.

27. Ibid., p. 49.

28. Ibid., p. 48. As it turned out, Fox never visited India ; he was killed in a battle for the village Lopera at the siege of Madrid during the Spanish Civil War, December 28-29, 1937. At the time of his death he was thirty-six and was commissar of the British Company of the XIVth International Brigade. See Hugh Thomas, *The Spanish Civil War* (New York : Harper & Bros., 1961), p. 350.

29. Zaheer, "Reminiscences," p. 50. Jyotirmaya C. Ghosh (b. 1896 in Ghasiara, Bengal) was educated at both Calcutta and Edinburgh universities, receiving his Ph.D. from the latter institution. He is retired Principal of Presidency College, Calcutta, and has written fifteen books, mostly short stories and essays, in both Bengali and English.

30. K. R. Srinivasa Iyengar erroneously implies that Anand received his Ph.D. from Cambridge. See *Indian Writing in English* (Bombay : Asia Publishing House, 1962), p. 258. He devotes a chapter to Anand's work. An interesting portrait of Anand is in Jack Lindsay, *Mulk Raj Anand : A Critical Study* (Bombay : Hind Kitabs, 1948). An expanded, updated version of this essay appears as "Mulk Raj Anand : A Study," *Contemporary Indian Literature*, V (December 1965), 21-33. This whole issue commemorates Mulk Raj Anand and also contains a piece by Sajjad Zaheer entitled "Mulk Raj Anand," pp. 11-12. A recent book-length study of Anand is Margaret Berry, *Mulk Raj Anand : The Man and the Novelist* (Amsterdam : Oriental Press, 1971). A well-balanced and highly critical article on Anand's fiction is R. K. Kaushik, "From Potter's Wheel to Dragon's Teeth," *Mahfil*, IV, No. 4 (Winter 1970), 17-31.

6. S. Sajjad Zaheer, "Reminiscences," *Indian Literature* (Bombay), II (1952), 51. This essay, trans. and ed. Khalique Naqui and written in 1940 while Zaheer was imprisoned in the Deoli detention camp, appeared first in *Nayā adab* (New Literature), January-February 1941.

Bimār, Zaheer's play, appeared in an English translation by the author as "The Living and the Dead", *Indian Writing* (London), I (August 1941), 191-203. Premchand (Dhanpat Rai Srivastava, 1880-1936), the great doyen of Hindi and Urdu fiction and a close associate of the young Zaheer toward the end of his life, wrote to Zaheer from Benares, June 12, 1936 :

> "I read *Bimār*. The sick man is your hero, but his character has not emerged anywhere, except that he is sick and lying in the home of relatives for whom he is a burden. If he does not accept the ways of society and wants to create a new one in place of the old and considers himself the messenger of a new era, then these ideas must find expression through his action. Mere lip-service to communism means nothing. I know many such young men who are socialists and communists in the company of friends, but who escape to the harem (as women do) when the time for displaying their manly talents arrives. The sick man should be presented in such a way that people have sympathy for him. We can only sympathize with Aziz and feel that Salima (characters in the play) is unfair. The language has clarity and the dialogue between the husband and wife is quite natural." ("Some Unpublished Letters of Premchand," *Naya adab*, January-February-March 1940, p. 33).

7. Ahmed Ali to me, August 16, 1972. Zaheer and Zahir are alternative spellings in English ; the former is used by the author himself.

8. Ibid.

9. Ibid. We noted (see p. 3) that Rashid Jahan had published pieces in her college magazine ; the *Angāre* pieces were her first to be published in book form.

10. "In Memoriam Rashid Jehan," *Indian Literature* (Bombay), I (1952), 1. 1. The author of this tribute might well be Ali Sardar Jafri, editor of *Indian Literature* and a major poet of the progressive movement. Jahan and Jehan are alternative English spellings of this name.

11. Ibid.

12. Ahmed Ali to me, August, 16, 1972.

13. Aziz Ahmad, *Taraqqī pasand adab* (Progressive Literature) (Delhi : Caman Book Depot, n.d. p. 44. Ahmad's major works in English include *Studies in Islamic Culture in the Indian* English include *Studies in Islamic Culture in the Indian Environment* (Oxford : Clarendon Press, 1964) ; and *Islamic Modernism in India and Pakistan*, 1857-1964 (London) : Oxford University Press, 1967).

14. Ibid.

15. Ibid.

16. Ibid., p. 45.

17. Ibid. The opening sentence reads in Urdu : "*Angāre* kā sab se barā naqs ehtiyāt-i-fiqdāN aur be-asūlī inhatā pasandī thī." As the sentence stands, it translates

period had not yet started. Hopes and yearnings, schemes and plans were agitating my mind.[105]

Zaheer returned to India in late 1935 where he embarked upon organizing the AIPWA, a group which, in spite of its shortcomings and various lapses, produced perhaps the most powerful literary effect in Urdu literature since the 1857 Sepoy Rebellion (or the First War of Indian Independence, as it is more fashionable to call it in some circles these days). This movement remained a viable, productive force in Urdu letters well into the middle of the 1950's, after which time, because of a large number of complex reasons, it lost the majority of its following. Viewed in the larger South Asian context, this movement in Urdu literature served as a model for writers in other vernacular literatures to emulate, thus putting Urdu literature for a period of about twenty years in the vanguard of literary production throughout South Asia.

FOOT NOTES

1. Gene D. Overstreet and Marshall Windmiller, *Communism in India* (Berkeley : University of California Press, 1960), p. 432.

2. Erroneously dated in *Who's Who of Indian Writers* (Honolulu : East-West Center Press, 1964), p. 410.

3. The best known collections are *Shole* (Flames) (Allahabad : Naya Samsar, 1934) ; *Hamāri galī* (Our Lane) (1936) ; *Qaid xānah* (Prison) ; and *maut se pehle* (Before Death). The last three are published by Insha Press, Delhi. For Ahmed Ali's translation of the title story from *Hamāri galī*, see "Our Lane", *New Writing*, No. 4 (Fall 1937), ed. John Lehmann (New York : Alfred A. Knopf, 1937), pp. 77-88 ; for *Maut se pehle*, see "Before Death", trans. by the author, *New Directions*, No. 15, International Issue (1955 ; rpt. New York : Kraus Reprint Corp., 1967), pp. 132-147. Two Indian pieces in the *New Directions* anthology are Khushwant Singh, "Posthumous," pp. 9-21, and Raja Rao, "Akkayya", pp 274-283. For a good article on Ahmed Ali, see David D. Anderson, "Ahmed Ali and *Twilight in Delhi*," *Mahfil, A Quarterly of South Asian Literature*, VII, Nos. 1-2 (Spring-Summer 1971), 81-86.

4. Hamida Saiduzzafar to me, October 5, 1972.

5. Biographical information supplied by Dr. Hamida Saiduzzafar, younger sister of Mahmuduzzafar, presently chief ophthalmologist at Gandhi Eye Hospital, Aligarh, U.P., and Professor of Ophthalmology, School of Medicine, Aligarh Muslim University, in the same letter.

Zaheer, recalling Aragon's organizational talents, asked how he should go about organizing the Indian writers. Aragon's answer was realistic ; he pointed out the difficulties he had faced in this context, but was still encouraging. Zaheer reports :

> I asked Aragon about his organisation experience in connection with the French and the International Writers' Associations. I still remember his laughter and the peculiar French way in which he shrugged his shoulders and said : "Don't ask that. No other group is more difficult to organise than the writers,."[103]

The reason for this difficulty--a difficulty we have touched on earlier and one which Zaheer would have to face in India eventually--was because, according to Aragon, "Every writer wants an exclusive path for himself. Even then we must continue our efforts. The conditions of the modern world are forcing the writers to organise themselves for the defence and progress of their art."[104]

With these thoughts firmly in mind, Zaheer left Paris for India ; but he did keep in contact with Aragon and the International Writers' Association. Later, when the All India Progressive Writers' Association was formed on the subcontinent, the group, under the leadership of Sajjad Zaheer, maintained an affiliation with the International Writers' Association as the foreign branch of that group in India, until its demise with the coming of the war. The AIPWA represented Indian literature in foreign countries according to the instructions of this central organization, as Anand did in London in 1936.

Zaheer describes his departure from Paris in poetic as well as prophetic terms :

> When I left Paris for India autumn had set in. The trees were no longer green, their leaves were already yellowish red. A cold breeze was blowing. It appeared as if someone had extracted the heart out of the sunshine leaving only its light. It was the best season for leaving Europe.
>
> A period of life came to an end, and like every end it was poignant, carrying a pathos of its own. The second and more important

Aragon's observation later proved to be substantive; for Gide, after rushing to the bedside of the dying Maxim Gorky, toured Russia and, on his return to France, disavowed communism.[98] As Zaheer put it, "What a pity that Aragon proved to be correct and within a year André Gide left the ranks of the progressive writers, imprisoning himself in the dark abyss of individualism."[99]

In addition to finding Aragon an excellent poet and an effective public speaker, Zaheer was also impressed with his "excellent organizational ability."[100] By this time—the summer of 1935--Zaheer had finished his law course and was intent on returning to India.

> We knew from the very beginning that living in London we could neither influence Indian literature nor create any good literature ourselves. Side by side with our realising the advantages of forming the association in London, this feeling was strengthened. A few exiled Indians could do little more than draw up plans among themselves and produce an orphanlike literature under the influence of European culture. *The most important thing that we learnt in Europe* was that a progressive writers, movement could bear fruits only when it is propagated in various languages and when the writers of India realise the necessity of this movement and put in practice its aims and objects. The best that the London Association could do was to put us in contact with the progressive literary movements abroad, to represent Indian literature in the West and to interpret for India the thoughts of Western writers and the social problems which were profoundly influencing Western literature.[101]

The idea of an All India Progressive Writers' Association was thus firmly in his mind. He gave up his London apartment and moved to Paris for a few months before returning to India. Most of his time was spent in writing *Landan kī ek rāt*, which he completed there. It was in Paris that he finally met Aragon :

> A common friend introduced me to Aragon. Within a few minutes we were talking freely and without reserve. Aragon talked to me for a long time about Indian literature. I told him about the Progressive Writers' Association and said that we proposed to start this movement in India also.[102]

are unfamiliar with the people. The reason for the spiritual paralysis of a large part of modern literature lies in the distance that separates them from the source of life, the life of the labouring classes."[94]

Certainly one would not venture to say that Zaheer has plagiarized from Gide, nor that Gide has said something original here. The fact is that such sentiments as expressed by both writers were pretty much the standard line taken by all leftist critics of this period. Consider also the problems brought up in Forster's speech, particularly those of censorship, sex in literature, and pornography. These will all become burning issues for the Progressive Writers' Association in India.

Ideas aside, the real impact of the Paris meeting is succinctly stated by Christina Stead : "It is an advantage to a young writer to brush elbows with those known to fame, to make his private speeches and gestures the corollary to his writing."[95] In this sense, then, Zaheer and Anand profited greatly from this meeting.

In addition, Zaheer could now count Louis Aragon as his mentor. Zaheer's first personal contact with Aragon came at a literary gathering which both attended though they did not meet at that time. The subject of the gathering was a paper on Gide's most recent writings and the general trend in that author's literary corpus presented by critic Albert Saroux. Zaheer summarizes Saroux's comments, stating that "it was natural for Gide to lean towards socialism, for the man who had devoted all his literary efforts to show the path of emancipation to man through ego and sin, if he is honest, would certainly protest against the suppression of individualism in a modern capitalist society, and hence would necessarily embrace the philosophy of socialism."[96]

To these comments by Saroux, Aragon added his own. "He (Aragon) emphasized, however, that Gide's support for socialism was mainly emotional," Zaheer states. "He (Gide) was still away from Marxist socialism, the only socialism with a scientific basis. Aragon said it was natural for an artist to approach socialism in this way, but if he did not secure a sound intellectual foundation for his socialist thought he could fall into the mire of conservatism at a crucial time."[97]

Such encouragement was forthcoming from individuals such as Premchand and Louis Aragon. Through their help, the intellectual commitment of these young writers was transformed into activism beyond the bounds of the association, with several visible results. Mulk Raj Anand, for example, presented an address to the Conference of the International Association of Writers for the Defence of Culture, which held its second meeting in London, June 19-23, 1936. This meeting was organized by the International Bureau of the International Association of Writers for the Defence of Culture, which was set up after the Paris meeting. This formal organization was to "maintain and develop those contacts that the (first) Congress made possible."[91] The bureau was also to stimulate translations between countries and to seek publication of works of distinction which were "interdicated" in the country of the author. Another function of the organization, which was quite effective, particularly in Paris, right up to the outbreak of World War II, was to assist writers in travelling to various countries, to make lists periodically of distinguished works in all countries, to set up a foundation for the award of a world prize in letters, and, finally, "to fight on its own ground, which is culture, against war, fascism, and generally speaking, against everything that menaces civilization."[92]

The London meeting at which Mulk Raj Anand spoke was not an open meeting as was the 1935 Paris gathering ; it was by invitation only. As a result, this meeting had fewer luminaries than the Paris meeting, nor did it receive as much coverage in the press and in literary magazines.[93]

But it was only through having attended the first meeting that Anand's participation the following year could have taken place. All young writers who attended the Paris meeting were affected. In terms of the Indian on-lookers, Anand and Zaheer, much of what was said by the various speakers was internalized by them ; in other instances, the speakers at the congress gave concrete expression to many of the sentiments which these young writers felt but were unable to verbalize. Consider, for example, Gide's demand that literature be brought closer to the masses. Writing in 1940, Zaheer says : "In the present-day capitalist society writers as a group have been separated from the people, a little afraid of them, entertaining contempt for them in their hearts. In any case, they

unfortunate that Madame Wadia, with all the enthusiasm of a foreign bride with theosophical propensities, to call upon the stereotypic notion of the spiritual and mystical East, an idea which would meet with immediate consternation by anyone with the slightest Marxist leanings. In addition, Madame Wadia identifies herself, consciously or unconsciously, as an Indian, which she was by marriage rather than by heritage. Hence, she has misrepresented herself. It is interesting to note that this piece of misinformation is carried over in Sajjad Zaheer's comments on Madame Wadia, whom he identifies as a Parsi, and on her speech. "It is regrettable that while Chinese, Japanese, Persians, Turks, Arabs, Tatars, and so on were adequately represented at the conference Indian writers should have been represented by Miss Sophia Wadia, a Parsee lady from Bombay. It would have been better to leave India unrepresented than send her to represent the country."[39]

Even though the London branch of the Progressive Writers' Association had been organized some time earlier, Zaheer and his associates were apprehensive about representing India at such a meeting. "As for ourselves, few of us could labour under the misapprehension that we could represent the grand literature of India at this conference. Further, we were not authorised by any Indian literary organisation to represent Indian writers there."[90] This last smacks a bit of rationalization. Certainly either Anand or Zaheer or both could have been appointed delegates to this congress, particularly with their connections with Ralph Fox and E. M. Forster. The fact is that these young men probably felt inferior to the task ; Zaheer states in a letter to this author, dated July 10, 1971, that he was a "mere student at the time" and served "only as an on-looker in this Conference." What is significant in Zaheer's reluctance to participate actively in the congress is the fact that he and the members of his group were at the time unsure of themselves ; they seemed unaware of their collective and individual potential. Prior to the Paris meeting, their commitment was, in the main, intellectual, not one of action. It existed in their minds and on paper. They realized that because most of them were students or recent Ph.D.'s they had very little status, particularly in India. It was incumbent upon them to put their commitment into a program of action, the catalyst for such a shift to come from this meeting and from encouragement by older, established writers.

> ing of humiliation of the man whom others are pleased to treat as inferior and subordinate.[84]

However, this situation, while it did exist in India for a time, has begun to change :

> The facts themselves have forced us in India to recognize that Western civilization is not suited to us and that in trying to destroy our spiritual traditions in order to become a poor imitation of the West we were not only harming ourselves but, what is even more serious, we were impoverishing the whole world to which we ought to make our contribution.[85]

Madame Wadia then touches on the "much exaggerated" disunion between Hindus and Muslims, which she considers minimal, then opines : "From the point of view of true culture there is no distinction between Hindu and Muslim authors ; they are, above all, the sons of the spiritual India who aspired to serve all humanity."[86] Although there are fanatics in both the Muslim and Hindu literatures of India who advocate the a priori abandonment of everything Western, Madame Wadia offers a compromise, one which is in fact the entire basis for her speech : she demands for India the freedom of choice in determining the course which Indian culture will take :

> . . . we reserve the right of choice and we do not want to be submerged, for we have understood that we must remain ourselves so as to be able to make our maximum contribution. This is why the indigenous literatures are now in full bloom. And what is more, as India does not want to talk only to herself, the undertaking is bound to be in full swing in India of translating into English the most important vernacular writings in order thus to be able to speak to others.[87]

India, Madame Wadia concludes, seeks to cooperate with the West, but refuses to be dominated by it. "Our ideal then is not competition but collaboration ; it is not the exploitation of one class by another but the mutual cooperation of all classes ; it is not fratricidal strife but international peace."[88]

There are, obviously, several problematic points in this speech, points which have provoked unflattering remarks from Sajjad Zaheer. It is

> well in it. What is true for the education of the child holds true for that of the nation, which is after all but a collectivity of individuals, of grown-up children. Already modern education is feeling the effects of the almost artificial regime which forces all individuals to follow the same line of development instead of helping each of them to find his own way.[81]

In other words, British domination in India, particularly in the area of education, is causing an undesirable homogeneity in the complex and variegated cultural life of India. Madame Wadia continues : "The wealth of a culture consists of the varied contributions of genius and talents which, viewed from different angles, differ one from the other, and humanity can progress only by the collaboration of all nations, each having its own distinct donation to make to the common good "[82] Hence Britain, by its domination of India, is not collaborating for the common good of humanity. In fact, Britain is impeding the cultural growth of India to the extent that such domination is having a deleterious effect on the country.

> To impose abruptly the civilization of the fighting, trading and sporting West upon the meditative, philosophical and disinterested Indian people could not but produce a frightful clash which was bound to shake the sensitiveness of the entire Indian culture. The Indians, subjected in spite of themselves to the regime of a purely Western education, got out of their depth for a moment and then like true philosophers they made a sincere effort to adapt themselves to this strange culture. It was a long and painful struggle in which some lost their balance for the lack of the spiritual sustenance which they required, in which others became artificial products, bad copies of Westerners, in which still others withdrew into themselves, abandoning all creative activity.[83]

Indian literature, however, is one area in which this cultural aggression has not been entirely successful or long-lived :

> The Indian literature of this epoch furnishes a faithful mirror in which we find the record of all these conflicts. For a long time the Indians let themselves be hyponotized by the so-called prestige of the white race and suffered from a genuine sense of inferiority. Nothing so impoverishes and debilitates the literature of a country as the feel-

this latter aspect of it is usually ignored by speakers when they get on to platforms, so I don't wish to miss it out. As for criticism, I want to maintain the right of public comment—in England here we are fortunate, because we possess it still, whereas from some of you it has been withdrawn. But public comment is negative, if nobody hears it, and so I want publicity for all sorts of comment—and that in England as elsewhere is being lost, chiefly owing to the governmental control of broadcasting. And I want the maintenance of culture.

How would I bring this about ? By an attempt in my own country to utilize the existing apparatus, and to extend to all classes and races what has hitherto been confined to a few wealthy and white-coloured people.[77]

Nearly all the other delegates gave speeches as well.[78] None of the other commentators except Zaheer and Oakley Johnson noted the presence of the Indian delegation. Johnson states that such a delegation was in fact present, and that the speaker "denounced British rule as a gross obstacle to cultural advance in India."[79] This delegate was Madame Sophia Wadia, whom we mentioned earlier in connection with the founding of the *Indian P.E.N.* (see n. 36).

Addressing the congress in French, Madame Wadia spoke to the "problem of colonisation," which to her thinking "is by no means local or national in a narrow sense, as it appeals to the very conscience in man, to his innate sense of justice and to the generosity of his heart ; and hence no one who believes in the unity of the whole human family and the reality of universal brotherhood can refuse to interest himself in it."[80] Madame Wadia then recalled the many glories of India's past, a past which the British as rulers in that country have preferred to overlook, in fact to ignore :

The *avowed* aim of all colonisation is to carry after the benefits of an allegedly superior civilization. Invevitably the conquerors arrogate to themselves the right of imposing their civilization upon the vanquished. They forget the first principle of true culture, which consists in bringing out the best which is in the soil and not in forcibly planting in that soil that which is foreign to it and can never grow

> I cannot agree that he deserves our sympathy only in so far as he is wretched. It is true that suffering often enhances our spiritual stature. If it does not lay us low, it anneals us and bronzes us. All the same, I like to think of, to long for, a social condition in which joy will be accessible to all; and to expect the coming of men whom joy, rather than suffering will ennoble.[73]

Later in the evening of July 21, English novelist E. M. Forster gave his speech, entitled "Liberty in England." According to him, freedom in England is "limited". "It means freedom for the Englishman, but not for the subject-races of his Empire. If you invited the average Englishman to share his liberties with inhabitants of India or Kenya, he will reply 'Never,' if he is a Tory, and 'Not until I consider them worthy' if he is a Liberal."[74] The threat of fascism in Britain, claims Forster,

> . . . is negligible. We're menaced by something much more insidious —by what I might call "Fabio-Fascism," by the dictator-spirit working quietly away behind the facade of constitutional forms, passing a little law (like the Sedition Act) here, endorsing a departmental tyranny there, emphasizing the national need for secrecy elsewhere, and whispering and cooing the so-called "news" every evening over the wireless, until the opposition is tamed and gulled. Fabio-Fascism is what I am afraid of, for it is the traditional method by which liberty has been attacked in England. It was the method of King Charles I—a gentleman if ever there was one—the method of our enlightened authoritarian gentlemen to-day.[75]

As an example of such insidious sedition, Forster discusses the recent proscription of James Hanley's novel *Boy* (London : Boriswood, 1931) under the newly passed Sedition Act. Why should policemen in a provincial town such as Lancashire, Forster asks, be given the prerogative to ban a book that had been published five years earlier?[76] Forster states that he wants

> . . . greater freedom for writers, both as creators and critics. In England, more than elsewher, their creative work is hampered because they can't write freely about sex, and I want it recognized that sex is a subject for serious treatment and also for comic treatment;

to prove the newly established relationship between the writers and the people, to strengthen which was the special purpose of this conference."[65]

Gide's opening address was entitled "In Defence of Culture."[66] In it, the author was essentially offering a paean to the individual human being, to the individual writer, but with a particularly Marxist twist. According to Gide, it is in the individual that what is universally and essentially human resides. As a corollary, he says that "individuals and their peculiarities can best flourish in a communist society ; or that (as Malraux writers, in a recent preface which has already become famous [i.e., to *La Condition humaine*]) 'Communism restores fertility to the individual."[67] In speaking of the relationship between art and society, Gide comments that "Art lapses into artificiality when it gets out of touch with the realities of life." "With the exception of Latin literature which (in this respect) outdoes that of France in its classical phase, I know of no section of European literature more anaemic, more remote from hard facts, than the French, which is continually lapsing into dreamland."[68]

Repudiation of the past, however, is futile and absurd, according to Gide ; yet "however hateful the capitalist system may seem, we cannot deny that it has been a necessary stage on the way to the communism we desire."[69] The function of literature is to communicate ; its sole function is not to "mirror," as is believed in the USSR. That literature which communicates best is the most worthwhile ; it is a literature which "informs, propounds, creates."[70] Such literature "must . . . inevitably be a literature of opposition" to the shames and conventions of culture.[71]

In looking at the great literature of the past solely for "the lessons we should draw from their words" is, according to Gide, a mistake. He further asserts : "For first of all, a work teaches by the sole fact of its beauty, and I see some disdain, some ignorance of beauty in the too careful search for a lesson to learn, in the single-minded examination of motifs, the shunning of the *quiétifs* (appeasements)."[72] Gide concludes :

> To-day all our sympathy, all our longing to communicate goes out towards a mankind that is oppressed, humbugged, and suffering. But I cannot accept the view that man will cease to be interesting when he is no longer hungry, tormented, and oppressed.

Among the American contingent were Waldo Frank and Michael Gold, who got his picture in the newspapers and literary journals a good deal.[61]

The following vivid picture—patched with too much purple for reportage, perhaps—is offered by Christina Stead :

> It is a world of energetic poses. Malraux, youthful, fatigued, indefatigable, bowed, gets admirers with the whites of his eyes ; Barbusse calls up romance with his coiffe of Cochin-China cock; Waldo Frank takes the shine out of them all with his plump, new-world shine ; E. E. Kisch with his stick, thick-set, sunburnt, pungent, limps about smouldering with silenced oratory ; Feuchtwanger, little, tanned, bowed, mild, with thick shoulders and a head like a grapeseed; Huxley, one would say an emanation in a test-tube, elongating indefinitely like the filaments of Bacillus Vulgaris ; Gide Brahma (Brahma is usually represented as red) with his consort Eloquence, naked ivory, an affable mask in glory, in ex-Huguenot rectitude ; splenetic Anna Seghers, with the face of a Russian heroine, restless, lonely, dejected in exile ; Aragon, knight-errant. face and figure of perennial adolescent, the ardent converted converting, filling the hall with the splendid emphasis of his harangues.[62]

Witnessing this scene were some 3,000 to 4,000 individuals in the audience, "for the most part youthful and (who) had paid to come in."[63] Among these youthful onlookers were Sajjad Zaheer and Mulk Raj Anand of the Indian Progressive Writers' Association. Zaheer makes the following observation, one also echoed by several other commentators on this congress :

> At the conference were writers of different beliefs and persuasions. On one issue, however, all were united. All believed that writers should with every means in their power defend their right of freedom of thought and opinion. Wherever fascist or imperialistic forces attempt dictatorially to impose restrictions on writers or adopt repulsive measures on account of their views, a powerful agitation should be launched against it.[64]

One point which Zaheer emphasizes, but which many other commentators missed, was "the presence of workers in large numbers as if they were there

dated to 1919 when he read Rabindranath Tagore's lectures on nationalism delivered in Japan in 1916 (published by Macmillan as *The Message of India to Japan*). He wrote Tagore asking him to sign the Declaration of Independence of the Spirit in June 1919, which Rolland had drafted on behalf of European writers and intellectuals.[53] The two men met in Paris in March 1921.[54] Later, in 1924, Rolland wrote his book *Mahatma Gandhi* (Paris : Delmain Boutelleau). Another organizer, André Malraux, did not then have a direct connection with India ; however, his novel *La Condition humaine* (Paris : Gallimard, 1933) did concern itself with the Chinese civil war. The meeting organized by these writers was called the International Congress for the Defence of Culture and met in Paris, June 21-26, 1935, in the Palais de la Mutabilité.[55]

Some two hundred writers attended ; the number of countries represented varies according to whom one reads. In his generally temperate but appreciative review of the meeting, novelist E. M. Forster, a member of the British delegation, claims that fifteen countries were represented.[56] In her enthusiastic and committed report, novelist Christaina Stead, member of the Australian delegation, claims that thirty eight countries attended.[57] In any event, the list of participants was indeed impressive. In addition to the conveners—except for Rolland, who did not attend[58] —the French delegation included Jean-Richard Bloch, Louis Aragon, Julien Benda and Jean Cassou. In addition to Forster, the British contingent consisted of Aldous Huxley, John Strachey, Ralph Fox and Herbert Read. From Germany, mostly writers in exile attended, including Heinrich Mann, Anna Seghers and Ernst Toller ; Thomas Mann was supposed to attend but did not. The Soviet delegation had fifteen members, led by Elya Ehrenberg, who was accompanied by such writers as Boris Pasternak, Alexy Tolstoy and Isaac Babel, who was something of a show-stopper when he spoke before the congress.[59] Maxim Gorky was also expected, but he became ill en route and was forced to return to Russia. He did send a message to the congress, in which he commended the participants, "those men and women who feel the approach of fascism as a real personal injury" and who were directing their efforts against "the present national combination of bankers, munitions-makers, and other parasites (who) are preparing themselves for the new battle for power, for the liberty of ravaging colonial territories and for the freedom to exploit the working class."[60]

Dimitrov, who was accused of burning the Reichstag, and the subsequent protest against the charges by many of Europe's leading intellectuals; the formation of the United Front in France and the workers' strikes: and the unsuccessful workers' rebellion which took place in Austria.[48] All of these events bespoke, in one way or another, the growth of fascism in Europe. It was finally the French writers who acted. The *Left Review* (London) carried an announcement of an International Congress of Writers to be opened in Paris on June 21, 1935, "which has been called by a committee of French writers who believed that the perils confronting cultural freedom in a number of countries to-day are such that measures should be taken for its defence."[49]

Similar announcements from the organizational committee for this congress were sent to many writers and journals throughout the world. In India an appeal from this committee was printed in the journal *Saverā* (Dawn) of Karachi:

> Fellow writers! Support life against death. Our pens, our art, our knowledge should not relent against those forces which invite death, which choke mankind, which rule with the power of money, which establish the dictatorship of industrialists and tyrants and finally appear in the various guises of fascism. And these are the very forces which suck the blood of innocent human beings.[50]

The organizational committee for this congress was comprised of some of the most distinguished names in French letters, some of whom had direct connection with India and/or Indians. André Gide, for example, was one; his avowal of communism in 1933 was just as sensational in literary circles as was his disavowal of it in 1936. He had also been the French translator of Nobel Prize winner Rabindranath Tagore's *Gitanjali* (*L'Offrande lyrique* [Paris: Nouvelle Revue Francaise, 1913]. Another convener was Henri Barbusse, whose powerful anti-war novel, *Le feu: Journal d'une escouade* (Paris: Flammarion, 1916), won the Prix Goncourt in 1917.[51] In 1925 Barbusse assisted Evelyn Roy, wife of the then deported M. N. Roy, to form the Comitè pro-Hindou to agitate for a reversal of the expulsion order which forced Roy to seek refuge in Luxembourg. The Comité, however, was ineffective.[52] The third major organizer was Romain Rolland, whose long and varied contacts with India

Hindi and Urdu speaking people, Madrasis, Bengalis, Gujaratis, in short, young men from every part of India, were present there and all of them unanimously decided that the Progressive Writers' Association should propagate for Roman script.[43]

Two particular points should be noted here. First, the sense of solidarity among these young writers, especially among the Hindi-speaking and the Urdu-speaking, who seem able to put aside their individual linguistic, provincial and communal dispositions for the greater good—in the London setting, of course. Second, the fact that Zaheer says nothing about Hindustani as the national language of India; he speaks only of Indo-Roman script. If one recalls that he wrote these memoirs in 1940, it is apparent that he wishes to avoid discussion of this particular controversy ; after all, he was on the losing side.

A final point of interest is in resolutions 5 and 6 of the London version. These items are reversed in the *Hans* manifesto. More important, however, is the fact that the *Hans* version qualifies the word "author" with the adjective *awāmi*, or "people's" thus giving "people's authors." This is perhaps the only instance in the entire manifesto where the *Hans* version is more specific and perhaps more radical in its wording than the London manifesto.

Meanwhile, the Indian Progressive Writers' Association in London would meet once or twice a month. "Our custom was to discuss and criticise every article or story read before the meeting," Zaheer comments.[44] In addition to the discussion of Indo-Roman script by Suniti Kumar Chatterji already alluded to, other talks included a critique of the Bengali revolutionary poet, Qazi Nazrul Islam, and the significance of his poetry.[45] Mulk Raj Anand presented his story "The Terrorist" to this group.[46] As stated earlier, Zaheer read his play, *Bīmār*, to the association. Shortly afterward, he began writing his novel, *Landan kī ek rāt* (A Night in London), which he eventually finished in Paris and which is his major literary production.[47]

Political events during this period made their immediate impact on literary works. Zaheer himself cites three major events to which he and his group reacted strongly: the trial of the communist organizer Georgi

the fourth point—the one concerning Hindustani and Indo-Roman script in the London version-in the sixth, or last, position and, in addition, reduces the resolution, which in Azmi's version is "(4) To propagate the acceptance of Hindustani as the national language and Indo-Roman as the national script" to "(6) to work for the acceptance of Indo-Roman script for use by all Indian languages."[39] No mention is made of Hindustani as the national or common language of the country. The point to be made here is the fact that Hindi writers were deeply sensitive about the relative immaturity and lack of prestige of their language and literature vis-à-vis Urdu. In fact, later in 1936 when Sajjad Zaheer was trying to muster support for the AIPWA among Hindi writers and was not succeeding very well, Premchand wrote him that "Hindi writers are pressed with feelings of inferiority."[40] In addition, many of the Hindi writers of this period were orthodox Hindus and were not about to relinquish their privileged position in Hindi literature.[41] If presented with the London manifesto, they most probably would have rejected the AIPWA outright. Sajjad Zaheer, or Premchand, or whoever altered the London manifesto for publication in India realized this point; hence, the relatively moderate tone the *Hans* version assumes. Such alterations were made in order to make the association more palatable to this more conservative group. One should note too that the Lucknow manifesto of 1936, the one finally adopted by the PWA in its first All-India meeting and which was considerably changed from both the London manifesto and the *Hans* version, and is the version which most Urdu commentators quote from, goes even further to accommodate dissident groups; for nothing at all is said of either a national language or a national script. In additoion, Sajjad Zaheer, in speaking of a national script in his "Reminiscences," offers a number of interesting observations. The suggestion for incorporating a resolution on Indo-Roman script might be traced to Dr. Suniti Kumar Chatterji, who presented before this group a lecture in support of this innovation for all Indian languages.[42] Zaheer remarks :

> We believed in Roman script ourselves, and his (Chatterji's) lecture convinced us so thoroughly that we became strong supporters of this reform. The idea of one script for the entire country was very attractive and in London the fire of prejudice and sentiment which blazes at the mention of this problem in India was completely absent.

meaning.[38] Similarly, statement 3 of the London manifesto, which speaks of "spiritual reaction," is not included in the *Hans* version, nor is the statement regarding Indian literature's "furtive and sentimental attitude towards sex" in statement 7 of the London version included in the *Hans* version. Similarly, the term "obsession," as used in statement 7 of the London version, is certainly not conveyed in the *Hans* translation "bhar mār," or "excess." Again, the "rigid formalism" and "banal and perverse ideology" of statement 6 of the London version are watered down to the ambiguous terms of "lifeless" (*be-rūh*) and "ineffective" (*be-asar*).

Again, in statement 10 of the London manifesto the authors speak of using "both native and foreign resources" in achieving the new life for which India is striving. The *Hans* version makes no mention of these "foreign resources" and subsumes all of the London statement under the vague and pallid rubric of "all those things with which we may arrive at our destination." This particular deletion suggests an attempt to avoid allusion to things foreign and to set things Indian in the foreground.

Statement 12, which does not appear in the London version, seems to be an attempt on the part of the authors to widen the term "progressive" to be as all-inclusive as possible, and suggest to this author a reason for the general restraint of the wording at various other points in the *Hans* version. It appears that the authors of the London manifesto, being away from India in the relatively liberated atmosphere of Bloomsbury and English universities, could afford the luxury of rather pointed and powerful statements in their document. However, in order to gather more support in India, particularly among Hindi writers, these organizers had to temper their language. This period is a particularly sensitive time for relationships between Hindi and Urdu writers, for the question arises as to which language, Hindi or Urdu, shall be the national language of free India. This question was hotly debated by politicians and writers and took on unattractive communal and political aspects. In fact, a bit of the Hindi chauvinism which was so prevalent in this period can be seen even today in the treatment of the *Hans* manifesto by Premchand's biographer, Madan Gopal. In addition to stating incorrectly that Premchand printed a "summary" of the manifesto (see n. 35), Madan Gopal also gives a rundown of the six resolutions in this document, placing

When one considers the very small amount of effort on the p
Indian writers to organize themselves prior to 1936, one must app
the practical set of resolves offered to the writer in order for him
his craft : the publication and translation programs, help in pr
ing freedom of expression and opinion, and even a hint of financial s
in resolution 8. Prior to this time, there had been no concerted effo
a countrywide level to look after some of these practical aspects of w
Very little literature was translated from one language to another ;
was done to keep writers from one part of the country apprized of
was being written in the literature of another part of the nation.
to the Progressive Writers' Association, the only other literary orga
tion set up on a national scale was the Indian chapter of the Internat
P. E. N., organized in London in 1933 by Madame Sophia Wadia, tog
with British playwright and critic Hermon Ould.[36] In 1934 a grou
Indian writers, among them K. M. Munshi and Kaka Sahab Kal
together with direct assistance from Mahatma Gandhi, undertook
task of organizing the Bharatiya Sahitya Parishad, an all-India lit
forum.[37] After several false starts and initial problems, this organiz
held its first meeting several weeks after the first meeting of the PW
more correctly, the AIPWA) in April 1936. The Indian P. E. N. c
tinues to exist today, and the Bharatiya Sahitya Parishad is the
forerunner of the Sahitya Akademi, the Indian national academy of le

A comparison of the two versions of the manifesto also offers
interesting insights into the thinking of the organizers of the AIF
It must be stated from the outset, however, that because one is working
translations, one can judge only in approximations, for translating
matter of approximations. The most fruitful comparisons of these
versions, then, would come from noting significant departures in wor
additions and deletions from the text.

The first line of the manifesto offers a change which is symptor
of a slackening of tone and temperance of purpose between the two
sions, the London manifesto being the more direct and uncompromi
The term "radical changes" of the London version is translated into H
as "bari bari tabdiliyān," which suggests large and numerous change.
does not convey the sense of "radical," nor does it approximate

17.	(4) To strive for the acceptance of a common language (Hindustani) and a common script (Indo-Roman) for India	(4) To propagate the acceptance of Hindustani as the national language and Indo-Roman as the national script.
18.	(5) To protect the interests of authors; to help authors who require and deserve assistance for the publication of works.	(5) To struggle for freedom of thought, opinion and expression of ideas.
19.	(6) To fight for the right of free expression of thought and opinion.[34]	(6) To protect the interests of authors; to assist people's authors who may want help in order to publish their books.[35]

Several points are very apparent in both versions of this manifesto. First, the writers who drafted it handle very well the jargon of leftist-liberal writers of the period. Such phrases as "a new society is arising," "spirit of progress," "bring the arts into the closest touch with the people," "spirit of reaction," etc., are all part and parcel of the vocabulary of leftist-liberal criticism of the period. Certainly the aims of the association as set forth in the manifesto are broad enough to subsume a large spectrum of political thinking and literary attitudes.

Another striking feature of the manifesto is the fact that, right from the outset, these writers were very involved with and committed to using their literary endeavours as a means to secure freedom for India from England. Hence, their thinking is necessarily tainted with aspirations for freedom of their country; the cause of Communism—such as it is stated in the manifesto—and their nationalistic hopes are not distinguished here. If anything, Communism, at least according to Zaheer, seems to be one of the best alternatives to British imperialism and domination. This point is particularly important to note, not because it is unique among writers in India, for certainly writers in other colonial areas have expressed and continue to express such sentiments. Rather, this attitude changes substantially after India and Pakistan gain independence in 1947. In fact, the thrust of the AIPWA after 1947 offers a stark contrast to this first manifesto of 1936, a point which should be emphasized.

All those things which take us towards confusion, dissension, and blind imitation is conservative ; also, all that which engenders in us a critical capacity, which induces us to test our dear traditions on the touchstone of our reason and perception, which makes us healthy and produces among us the strength of unity and integration, that is what we call progressive.

13. With the above aims in view, the following resolutions have been adopted :

Keeping these objectives in mind, the association has passed the following resolutions;

14. (1) The establishment of organisations of writers to correspond to the various linguistic zones of India ; the co-ordination of these organisations by holding conferences, publishing of magazines, pamphlets, etc.

(1) To establish organizations of writers in the various linguistic provinces of India; to establish contact and cooperation among these organizations by means of meetings, pamphlets, etc. ; to produce a close relationship among the organizations of the provinces, the center and London.

15. (2) To co-operate with those literary organisations whose aims do not conflict with the basic aims of the Association.

(2) To establish an association with those literary organizations which are not opposed to the aims of this organization.

16. (3) To produce and to translate literature of a progressive nature and of high technical standard; to fight cultural reaction; and in this way, to further the cause of Indian freedom and social regeneration.

(3) To create and translate progressive literature which should be healthy and powerful, with which we may be able to erase cultural backwardness and advance to the path toward Indian freedom and social progress.

9.	It is the object of our association to rescue literature and other arts from the priestly, academic and decadent classes in whose hands they have degenerated so long; to bring the arts into the closest touch with the people; and to make them the vital organ which will register the actualities of life, as well as lead us to the future.	The object of this association is to take our literature and other art forms from the monopolistic control of priests, pundits and other conservatives. It (the association) should bring them (literature and other art forms) nearer the people. They should be made to reflect life and reality so that we may be able to light our future.
10.	While claiming to be the inheritors of the best traditions of Indian civilisation, we shall criticise ruthlessly, in all its political, economic and cultural aspects, the spirit of reaction in our country; and we shall foster through interpretative and creative works (both native and foreign resources) everything that will lead our country to the new life for which it is striving.	Preserving the best traditions of India, we will comment pitilessly on the decadent aspects of our country and will depict in a critical and creative manner all those things with which we may arrive at our destination.
11.	We believe that the new literature of India must deal with the basic problems of our existence to-day the problems of hunger and poverty, social backwardness and political subjugation, so that it may help us to understand these problems and through such understanding help us act.	It is our belief that the new literature of India must respect the basic realities of our present-day life, and these are the questions of our bread, plight, our social degradation and political slavery. Only then will we be able to understand these problems and the revolutionary spirit will be born in us.

the changes taking place in Indian life and assist the spirit of progress in the country.	of words and forms to the existent changes in Indian life and should assist in putting the country on the path of construction and progress.
5. Indian literature, since the breakdown of classical lit erature. has had the fatal tendency to escape from the actualities of life. It has tried to find a refuge from reality in spiritualism and idealism.	After the destruction of the ancient civilization, Indian literature, having run away from the realities of life, had hidden in the protection of asceticism and devotionalism.
6. The result has been that it has produced a rigid formalism and a banal and perverse ideology	The result is that it has become lifeless and ineffective.
7. Witness the mystical devotional obsession of our literature, its furtive and sentimental attitude towards sex, its emotional exhibitionism and its almost total lack of rationality.	Today in our literature. in both form as well as in content, there has come an excess of devotionalism and asceticism. There is a general exhibition of emotion ; reason and thought have been totally ignored-nay!—rejected!
8. Such literature was produced particularly during the past two centuries, one of the most unhappy periods of our history, a period of disintegrating feudalism and of acute misery and degradation of the Indian people as a whole.	In the preceding two centuries, which have been the declining period of our history, most literature which has been produced has been of this very sort.

again altered, were sent to India for circulation among various writers, among them Premchand, who printed a Hindi translation of it eight months later in his journal *Hans* (October 1935). Because this manifesto is the most basic document in the development of socialist realism in India, and because it attempts to set forth some basic definitions of terms, the manifesto is quoted here *in toto* in both its London and *Hans* forms. There are significant differences between these two versions which, upon close analysis, demonstrate certain problems which the group would have to face when it took the movement to India the following year. Hence, we shall quote both versions side by side. In order to mark the contrasts between the two more clearly, the texts are broken down in parallel fashion so that a given statement in one is juxtaposed with approximately the same statement in the other. When a statement does not occur in both texts, the opposite column has been left blank. The marginal numbers, 1 through 19, do not occur in the original texts, but are added here as reference points to facilitate the subsequent discussion. The translation has deliberately been made as literal as possible.

	London Version	*Hans* Version
1.	Radical changes are taking place in Indian society.	Great changes are taking place in Indian society.
2.	Fixed ideas and old beliefs, social and political institutions are being challenged. Out of the present turmoil and conflict a new society is arising.	and the foundations of old ideas and beliefs are being shaken and a new society is being born.
3.	The spiritual reaction, however, though moribund and to ultimate decay, is still operative and is making desperate efforts to prolong itself.	
4.	It is the duty of Indian writers to give expression to	It is the duty of Indian writers that they should give the dress

With Fox's help the group of about six or seven individuals set to organizing an association. A committee was formed, and, as could be expected in instances where a committee is involved, the beginning was very slow. "But soon all of us took greater interest," Zaheer remarks. He continues :

> It was decided that a manifesto be drafted to formulate the aims and objects [of the group]. Four or five persons were commissioned to do this job. [Mulk Raj] Anand prepared the first draft, which was very long. Later this work was entrusted to Dr. [Jyoyirmaya] Ghosh, who presented his draft before the committee. I was asked to rewrite the drafts of Anand and Ghosh (which we had discussed repeatedly for hours together) and prepare a final draft. After many disputes and long discussion about every sentence and every word, the committee finally approved the draft.[29]

Here Zaheer introduces the second most important individual in the development of the AIPWA, Dr. Mulk Raj Anand, who is best known as an English novelist and, at present, editor of the prestigious Indian arts journal *Marg* (Path), published in Bombay. He was born in Peshawar in 1905, the son of a silversmith turned sepoy. Thus, his background offers a stark contrast to that of Zaheer. He was educated at Lahore and received a Ph.D. from the University of London, with a specialty in Indian art.[30] His first novel, *Coolie*, was written in 1933.[31] In 1935 his second novel, *Untouchable*, was published with an introduction by E. M. Forster, whom Anand knew through his associations with the Bloomsbury Group.[32]

Zaheer, together with Anand and other members of the group, "Very ceremoniously . . . held the first regular meeting" of the association in the back room of the Nanking Restaurant, lent for the occasion by the proprietor.[33] The room was small and unventilated and bulged with the total of between thirty and thirty-five persons who attended, nearly all of them students from London, Oxford and Cambridge. Mulk Raj Anand was elected president of the group, and the manifesto which the committee had prepared was presented to the group for further revision. A final form of the manifesto was eventually published in the *Left Review* of February 1935. In addition, mimeographed copies of this manifesto,

> refugees who had escaped or were exiled from Germany. Everywhere one could hear the painful stories of fascist repression. Fascist ruffians were torturing the freedom-loving people and the communists in a thousand different ways. The ghastly picture of the beloved leaders of the people with the blue weals of whips on their backs and seats ; the terrible acts of beheading of well-known communist leaders periodically published in the newspapers ; the painful darkness which, spreading from the bright world of art and learning that was Germany, was throwing its fearful shadow on Europe—all this had shattered the inner tranquility of our hearts and minds.[26]

According to Zaheer, the exposure to Marxism, the political situation in Germany, the fact that they were, for the most part, students, and their desire to become writers, all contributed in varying degrees to a sense among them that they should form some sort of literary association in London. Writing, claims Zaheer, was probably the only avenue left open to them. "Most of the members of our small group wanted to become writers. What else could they do? We were incapable of manual labour. We had not learnt any craft and our minds revolted against serving the imperialist government. What other field was left?"[27]

Acting as a catalyst to bring about the formal organization was the British leftist writer Ralph Fox. Zaheer had met Fox through their connection with the various leftist literary groups found in London at the time. Zaheer describes one of his meetings with Fox, who offered the enthusiastic young writer a warning :

> One day I invited him [Fox] to a dinner at my room to talk about the Progressive Writers' Association. A Bengali friend of mine cooked a dish which was something between *khichri* and *pulao*. Fox ate it with great relish. Till late he talked about his plan to visit India. In the course of the discussion regarding literature, he again and again warned us that our enthusiasm for progessivism must not degenerate into sectarianism and prejudice. When a Bengali friend of ours criticised Tagore for being a representative of [the] Indian capitalist class and a reactionary, Fox was upset. He characterised such talk as a caricature of Marxism. No poet or writer could be tied to any imaginary category so easily.[28]

> the problems of poverty and exploitation, complete inanity to progress and life. It was the outcome of the desire to revive literature and the arts and to relate them to life, and assert the belief in man's ultimate destiny as a free and civilised being. The ideological interpretation was superimposed on the Movement after the first formal Conference on an all-India basis in 1936, by the political section which has remained in control ever since, but was not part of it when it was originally started in 1932.[23]

Ahmed Ali further asserts that it was not the intention of these young writers to start this movement as "a deliberate ideological effort, but (with) the spontaneity of (a) creative urge and youthful enthusiasm that went beyond all conscious bounds."[24] All writers of like mind were asked to correspond with the organizers, with Ahmed Ali's address given as the group's headquarters.

In the meantime, Sajjad Zaheer had returned to England via Switzerland ; he completed his studies at Oxford and went on to his law studies. Like many other English-educated Indians before him, he acquired a thorough grounding in Marxism, a point which he stresses in his accounts of the early phases of this movement. Contrary to the contention of Ahmed Ali, who insists on the non-ideological aspect of the movement at this time, Zaheer states that he and members of his group —

> ... were gradually drifting towards socialism. Our minds searched for a philosophy which would help us to understand and solve the different social problems. We were not satisfied with the idea that humanity had always been miserable and would also remain so. We read Marx and other socialist writers with great enthusiasm, the historical and philosophical problems through mutual discussion, our minds became clear and our hearts contented.[25]

Like many writers in Western Europe and America during this period, Zaheer was deeply concerned with political events in Germany and their consequences on the lives of people, especially communists.

> The political effect of the economic crisis that engulfed the world took in Germany the shape of the dictatorship of Hitler and his Nazi Party. In London and Paris we daily came across the miserable

A younger critic-poet, Khalilur Rahman Azmi, whose work in the area of progressive literature in Urdu is the most analytic and comprehensive to date, describes these young authors as "hot-blooded," then states :

> Revolutionary and rebellious ideas had burst forth in these stories like a storm. These authors showed that youthful enthusiasm, lack of moderation, boldness and rebelliousness which were common among the young students of the period. For this reason, the tone of satire and scorn against the prevalent morality and religious doctrine had become very prominent in these stories. The publication of this book produced a great stir among the traditionalists and protest against it was so great that the Government confiscated this collection.[20]

While the collection has dubious literary merit per se, Azimi is of the opinion that the book's importance lies in the fact that it was a harbinger of things to come in Urdu literature : "The publication of this collection was indicative of the fact that certain intellectual and emotional changes were taking place among Indian youth which our literature would have to contend with very soon."[21]

Shortly after the publication of *Angāre*, the formation of the Progressive Writers' Association was announced in *The Leader* of Allahabad of April 5, 1933, in a letter signed by Mahmuduzzafar on behalf of the authors of *Angāre*. According to Ahmed Ali, the only ideology which this association would espouse was "the right of free criticism and free expression in all matters of highest importance to the human race in general and to Indian people in particular."[22] He further elaborates on what he claims was the non-ideological aspect of the movement in its incipient stages :

> In spite of what has been written so far (by other commentators on the PWA), the Progressive Writers' Movement was essentially an intellectual revolt against the outmoded past, the vitiated tendencies in contemporary thought and literature, the indifference of people to their human condition, acquiesecence (*sic*) in foreign rule, enslavement to practices and beliefs both social and religious based on ignorance,

Another view of this book and the resulting proscription is offered by Aziz Ahmad, the distinguished historian of Islam in India, Urdu novelist and critic He states that *Angare* was "the declaration of war by the youth of the middle class" against the prevailing social, political and religious institutions.[13] He also calls *Angare* "the first ferocious attack on society" in modern Urdu literature.[14] The importance of this volume, in spite of its "thousand defects," is that it exposed "the stink of familial and sexual life" in modern Indian society.[15] The book also attacked certain religious aspects of Muslim society. "The age-old false enamel of the past civilization was exposed in various places. The false religiosity of *mullahs* (in which faith had no part, which deceived itself and others, and of which Iqbal had also complained in many places) was exposed with great force."[16]

The book, according to Aziz Ahmad, sought only to destroy rather than create ; hence, it lacks true literary merit :

> The greatest defect of *Angare* was the absence of circumspection and unprincipled extremism. For this reason, the destructive objective of the book was fulfilled. But it could not achieve anything constructive It is certainly reactionary to screen capitalism behind religion. but there is nothing to authorize [the authors'] unprincipled attack on religion, which even socialist rationalism cannot condone, and (their) insults to the Divine Being (whom the philosophers are generally obliged to acknowledge, and who is not denied by non-transcendentalism [*lā-avariyat*] ; and even if he is not accepted by atheism or materialism, he is not to be showered with abuses and other people's views [regarding him] are to be respected).[17]

He further asserts that the progressive movement would have flourished in Urdu earlier than it did, had not the Angare Group struck as strident and radical a chord as it did.[18] In addition, he suggests that many more writers would have rallied to the progressive cause than actually did had the Angāre writers been more positive and constructive in their outlook. As it happened, many writers rejected the movement because of *Angāre's* "departure from the limits of moderation (which was unnecessary), and lack of balance."[19]

wife out of the compartment he meets an old friend. He tells his wife to mind the luggage and goes off with his friend. The wife, wrapped in a *burqā*, sits perched on the luggage in the heat of the day. Passing young men make rude remarks to her, such as asking her to lift her veil and show her face. After several hours her husband returns and informs her that he has already had lunch with his friend but that he will get her something to eat if she wishes. She refuses food and asks to be taken home, for she has seen enough of Delhi. He is surprised at her remark, saying that if she does not want to see Delhi he cannot help it. They return home on the next train. Rashid Jahan's second contribution to the volume, a one-act play entitled *Parde ke nīche* (Behind the Curtain), deals with two women talking about their life in their particular household.

"A Friend" describes the results of the publication of this volume as follows : "The intensity of the scandal created by *Angaray* (the book was banned by the U. P. Government and the Mullahs wanted to burn it) was a measure of the fact that the protest had struck deep in the layers of the congealed hearts of the feudal order."[11]

The reactions to the collection among middle-class Muslims were very strong and quite beyond the authors' anticipation, as Ahmed Ali notes :

> We knew the book would create a stir, but never dreamt it would bring the house down. We were condemned at public meetings and in private; bourgeois families hurried to dissociate themselves from our us [*sic*] and denied acquaintance with us, especially Rashid Jehan and myself, and even Sajjad Zahir's mother (a dear old lady) accused me of spoiling her son. People read the book behind closed doors and in bathrooms with relish but denounced us in the open. We were lampooned and satirized, condemned editorially and in pamphlets (I have many of the original cuttings and articles). Our lives were threatened ; people even lay in wait with daggers to kill us. The Provincial Assembly created a furor of denunciation ; deputations were sent to the Governor and officials of the Province. The book was banned eventually by the Government of U. P. [United Provinces] and the orthodox and God-fearing heaved a sigh of relief.[12]

duced her, had taken to her with all his heart immediately, as did Mahmuduzzafar when he met her. For a young woman in those days Rashid Jehan was emancipated with few inhibitions, and came of a family which by precept and example had stood for the liberation of women. As the two writers of the group, Sajjad Zahir and I had already discussed the project of publishing an anthology of our short stories and, wanting to enlarge it, we decided on an evening to write a story each within a day. My story "Baadal naheen aatay" (The Clouds Do Not Come) was written on the occasion and included in "Angaray." Sajjad Zahir wrote (perhaps) his "Jannat ka Khwab" (Dream of Heaven).[8]

The contributions from Rashid Jahan and Mahmuduzzafar came out in the following way :

Rashid Jehan wrote her first story whose title I now forget ("Dilli ki sair" : Delhi Excursion), which, as her maiden attempt was received with youthful appreciation. Mahmuduzzafar's only story included in the anthology ("Javān mardi") (Young Manhood) was translated from the English by Sajjad Zahir, as Mahmuduzzafar was educated in English right from the school stage ; moreover his ambition never was to be a writer. Thus, "Angaray" was born and published in 1931-32. The cover was designed by Oyama, an old class-mate of mine, thus a friend of the group.[9]

In writing a memorial tribute to Rashid Jahan, an author calling himself "A Friend" states the following about "Dillī kī sair," the first of her two contributions to this collection :

For, apart from the boldness of the stories by the male writers who defied religion and poked fun at their elders, the direct protest against the male sex, particularly the Indian husband, which Rashid Jehan delivered did a great deal to provoke the males and concentrated their ire against the authoress.[10]

This story is very simply told in a direct, colloquial language which is one of Rashid Jahan's major literary assets. A husband and his wife live in Faridabad near Delhi. One day in a mood of generosity he offers to take his wife to see the city. They go by train, and just as he is helping his

his B.A. (Honours), he refused to sit for any competitive exams such as the Indian Civil Service, and he discarded European dress in favour of Indian-style clothing made of homespun material. In addition, he set about learning Urdu, which, because of his English education, was almost nonexistent.[5]

Angāre holds a special place in the history of the progressive movement and in modern Urdu literature. This place is amply described in various commentaries on the movement, such as allusions to the volume made by Sajjad Zaheer, who speaks of the anthology in connection with his play, *Bīmār*, (The Sick Man), which he wrote in London and read to the study group of Indian students which he helped organize and which eventually developed into the Indian Progressive Writers' Association. "After the stories published in the anthology *The Embers*, this (play) was my first work . . . The fame of *The Embers* had reached the Indians in London. I was happy that my first literary effort had shocked the old, bearded fogeys."[6] Here Zaheer refers to the fact that the United Provinces State Government proscribed the book after its publication, due to pressure directed against it by older religious and political leaders.

Ahmed Ali describes the beginnings of the PWA in the following vivid terms :

> It was in 1930-31 that Sajjad Zahir came back from England to Lucknow where I was just completing my studies at the University. The very first meeting led to the establishment of a bond of friendship, for we shared love of art and literature and our tastes were common. Aestheticism of a creative kind was not common in the India of those days and the meeting of akin souls was not without its fulness and gratification. We were both at that time full of enthusiasm for the best in European art and culture, shared love of beautiful things and were filled with a deep desire to change the face of things and mould it to our hearts desire.[7]

With the return of Mahmudduzzafar from Oxford, the twosome became a trio :

> . . . and the venue of our meetings shifted to Rashid Jehan's room in the Lady Dufferin Hospital, as Sajjad Zahir, to whom I had intro-

Hogarth Press. 1940) ; he has also published a second novel, *Ocean of Night* (London : Peter Owen, 1964), as well as numerous short stories and poems in English. After the establishement of Pakistan he was that country's first ambassador to China and has held numerous other diplomatic posts in various capaitals throughout the world. He is presently living in retirement in Karachi.

Rashid Jahan, the single most important woman in the progressive movement and the sole woman to contribute to *Angāre*, was the daughter of Sheikh Abdullah, a Kashmiri Brahmin who converted to Islam and was attracted to the educational ideas of Sir Syed Ahmad Khan, founder of the Aligarh Movement. The sheikh eventually founded the Women's College at Mohammaden Anglo-Oriental College, Aligarh, in 1906. Rashid Jahan received her early education in the primary and secondary schools attached to her father's college, then went to Isabella Thorburn College, Lucknow, where, according to her sister, Mrs. Mumtaz Haider, retired principal of the Women's College, Aligarh Muslim University Rashid Jahan published her first writings in the college magazine.[4] She received her M.B.B.S. degree with a specialization in gynecology and was eventually posted as a dotctor with the Provincial Medical Service in Lucknow when she was introduced to Mahmuduzzafar, another member of the Angāre Group, whom she eventually married. The play *Aurat* (Woman) and a number of her short stories are collected in *Aurat aur dīgar afsāne* (Women and Other Stories), 2nd ed. (Aligarh : Aligarh Muslim University Press, 1963) ; this volume was first published in Karachi by Hashmi Book Depot about 1941. Rashid Jahan died of cancer in 1951 in Moscow, where she had gone in hopes of being cured.

Mahmuduzzafar was born in Agra in 1908, the son of Sahibzada Saiduzzafar Khan, a prominent member of the royal family of Rampur, descendants of Rohilla Pathans. The Sahibzada received his medical degrees from Edinburgh and eventually became Professor of Anatomy at King George's Medical College, Lucknow. Mahmuduzzafar was schooled exclusively in English at a private school in Nainital, and at the age of twelve was sent to Sherbourne School, Dorset, England, and eventually to Oxford. There he received his initial exposure to both Marxist and Indian nationalist ideologies. Upon returning to India after receiving

Some European Aspects of the progressive Movement in Urdu

DR. CARLO COPPOLA
Oakland University, Michigan, U.S.A.

The All India Progressive Writers' Association (AIPWA), which spearheaded nearly all of the Marxist-Oriental literary activities in South Asia, has been described as the "most important front organization created for a specific professional group" by the Communist Party of India.[1] The time was the early 1930's, the places, India, London and Paris.

The major figure in the development of this movement and organization has been and continues to be Syed Sajjad Zaheer. His importance is not so much as a creative writer—for he is seriously wanting in this respect —but rather in various subsidiary capacities : first, as a focal point or pivot around which the AIPWA developed ; second, as a liaison between this organization and the Communist Party of India ; and third, as a chronicler of the AIPWA, particularly in its earliest phases Born in Lucknow in 1905. Sajjad Zaheer is the son of the late Sir Syed Wazir Hasan, a judge of the High Court of Judicature, Allahabad. His brothers were Syed Ali Zaheer, the prominent nationalist leader, and Dr. Hussain Zaheer, one of India's foremost scientists. Sajjad Zaheer was educated at both Lucknow and Oxford Universities, receiving a bachelor's degree from the latter institution in 1932. During his Oxford days, he returned to India briefly, but because of a case of tuberculosis returned to Switzerland, then on to Oxford, then to London where he studied law at Lincoln's Inn. While in India he and a group of his friends collected their stories into a history-making anthology entitled *Angāre* (Embers), which was published in 1932 by United India Press, Lahore.[2] The writers contributing to this collection came to be known as the Angāre Group, which also included Ahmed Ali, the author of several volumes of short stories in Urdu, as well as works in English.[3] His major piece is the novel, *Twilight in Dehli* (London :

that the Ottoman court also recognized the special position enjoyed by Nizam ul-mulk in the Mughul empire.

As discussed in the present writer's *Indo-Persian Relations*, the relations between the Mughuls and the Ottomans had never the potentiality of becoming politically or diplomatically effective. Other things apart, the element of distance alone was a great hindrance to making these relations effective. Thus it happened more than once that by the time an embassy returned home, the reigning monarch of one or the other empire was dead. This happened in the case of Haji Yusuf's own embassy. Moreover, by the middle of the 18th century the Mughul as well as the Ottoman empire was in a state of disintegration. There was never any question of any one of them being able to offer effective help to the other.

FOOTNOTES

1. Topkapi Museum, Istanbul, Persian Manuscript, Cat. No. 329, Shelf No. 1128.

2. Yusuf Hussin, *The First Nizam*, New York, 1963, p. 185, siting/s Khafi Khan.

3. For details, see Riazul Islam, *Indo-Persian Relations*, Tehran, 1970, pp. 153.

4. *Tarikh-i 'Izzi*, B. M. Or. 9318, f. 14 a *et seq.*

5. *Tarikh-i 'Izzi*, ff. 225b-26b.

6. Ibid.

7. *Munsha'at-i Radi b. Nur-ud-din*, National Museum, Karachi, MS. No. 1958/202/24, ff. 2a—4b.

8. *Tarikh-i 'Izzi*, ff. 225b—226a.

9. *Munsha' at-i Radi b. Nur ud-din*, ff. 4b—11a. Hasan Pasha was Grand Vizier of the Ottoman Empire during the years 1156-59/1743-46.

10. Riazul Islam, *Calendar of Documents on Indo-Persian Relations*, No. Ott. 408. (Unpublished).

11. Hikmet Bayur, *Hindistan Tarihi*, III, pp. 43 and 51.

12. Intizam ud-daula Khan Khanan, second Bakhshi and later governor of Ajmer. See Sarkar, *Fall of the Mughal Empire*, 1964 edition, pp. 213, 224, 302.

13. For Safdar Jang, see *Ma'athir ul-umara*, Eng. Tr., I, pp. 137-40.

14. Qamar ud-din Khan died 1161/1748. *M.U.*, Eng. Tr., II, 489, 489n.

15. Nizam ul-mulk Asaf Jah died 4 Jumada II 1161/21 May 1748. Yusuf Husain, *The First Nizam*, 1963, p. 241.

16. *Tarikh-i 'Izzi*, f. 224a-b.

17. 'Izzi, f. 226 b. Also see Riazul Islam, *Calendar of Documents on Indo-Persian Relations* (unpublished), No. Ott. 411.

reached back Surat, he was moneyless. The orders that had been issued by Nizam ul-mulk for payment of all the envoy's expenses at Surat and of his freight expenses were not carried out. Haji Muhammad Yusuf complains about this in several letters and says that the officials concerned were demanding a bribe for implementing the orders. He had to live on the charity of the Malik ut-tujjar and had to raise loans He also complains that a certain mahsul (duty, tax) had been levied on him despite the late Nizam ul-mulk's orders that no taxes were to be levied on the Ottoman envoys. Another recurring complaint in the envoy's letter is this that an Armenian merchant named 'Abdullah had defalcated the money which the envoy had deposited with him. Mentioning these pecuniary problems, Haji Muhammad Yusuf wrote to several officials at Dehli and at the Deccan court to help him out of his difficulties and to secure the redress of his grievances against 'Abdullah Armani and others. The various points involved in these transactions and affairs are described at length in the letters. It is not clear as to what steps were taken in response to the repeated entreaties made by Haji Muhammad Yusuf. We know from 'Izzi that the royal letter he brought back was issued in the name of the late Muhammad Shah. 'Izzi gives a detailed account of the Haji's return and presentation ceremony at the court of Istanbul. As noted earlier he brought back letters from both Nizam ul-mulk and his his son Nizam ud-daula Nāsir Jang. 'Izzi gives 6th Rabi' II as the date of the Haji's entry into Istanbul,[15] but does not seem to cite the year The year was probably 1162 or 1163/1749 or 1750. The Haji also brought a large number of presents from the Emperor of Dehli for the Ottoman Sultan. A complete list of these presents is given in 'Izzi.[16]

We have no means of knowing as to what came out of Haji Muhammad Yusuf's mission. The numerous letters and *'aridas* that the Haji sent to various officials regarding his personal pecuniary problems do not put him in a good light. His conduct in this respect certainly did not correspond to his position as an Ottoman envoy. In any case he was a substitute envoy.

The various letters from Haji Muhammad Yusuf to Nizam ul-mulk and the frequent references to the latter in the other letters in the MS, show that Nizam ul-mulk took a special care of the Ottoman envoys and

letters, we learn that the Ottomon envoys Haji Muhammad Sālim Efendi and Haji Muhammad Yusuf Efendi disembarked at Surat and set out from there on 10 Dhu'l-H. 1158/23 December 1745 for Aurangabad. At Aurangabad Haji Muhammad S.lim died of diarrhoea. But before he breathed his last, he appointed Haji Muhammad Yusuf as his *wakil-i-mutlaq*, in effect his attorney and his deputy with full powers. An affidavit to this effect made by a number of witnesses appears in the correspondence. Haji Muhammad Yusuf travelled to Balenda to have an audience with Nizam ul-mulk and then returned to Aurangabad from where he left for Dehli. After his conge from the court of Dehli, he again came to Aurangabad, and thence travelled to Surat where he reached in Jumada I 1161 with the intention of sailing for Jedda by the ship due to leave on 25th Shawwal 1161/7 October 1748. By the time he reached Surat, the sailing of the ship to Jedda was postponed because of some trouble in the Surat area and also because of the passing off of the sailing season (at least so in the letters).

Some of the over forty letters in the Topkapi Manuscript were written before Haji Muhammad Yusuf arrived back at Surat, but a larger number of them were written at Surat after his arrival there. Some of the letters are dated Shawwal 1161, while others are dated Dhu'l-Q. and Dhu'l-H. of the same year. There are two main themes in these letters. First, Haji Muhammad Yusuf entreats his addressees to get a new royal letter issued in the name of the new Emperor Ahmad Shah, as the Ottoman court would not accept the royal letter from the deceased Emperor Muhammad Shah [died Rabi' II 1161/April 1748]. This theme appears mostly in letters addressed to the high officials at Delhi.

Second, Haji Muhammad Yusuf writes to almost all his correspondents about his pecuniary troubles, with some variation of detail from letter to letter. The story of the Haji's pecuniary problems and needs can be summed up as follows. During the course of his entire stay in the Mughul empire, he spent in all Rs. 1,03,194, but the total amount received by him from the court of Dehli and the court of Nizam ul-mulk, and raised by him from the sale of the silver and copper goods of the late Haji Muhammad Sālim, amounted to Rs. 49,985, only, that is less than half of what he had to spend. By the time Haji Muhammad Yusuf

the part of Nizam ul-mulk and other ministers, and that the Su
thereupon sent a message to Nizam ul-mulk impressing upon him the
of obeying the Emperor.[11] This alone makes Nizam ul-mulk's poi
assertion of loyalty understandable.

It is one of the ironies of historiography that sometimes ther a distressing paucity of evidence on a highly important matter on the other hand there is plenty of evidence on a matter not so im tant. But in history it is not safe to pronounce anything unimpo with finality. For what appears to be lacking in importance today, turn out on the discovery of further material to be a link in a highly portant sequence. The substitute envoy Haji Muhammad Yu mission does not appear to have produced any worthwhile result. it so happens that in connection with this mission I have been ab discover over forty pieces of correspondence. Haji Muhammad Yu name already appears in the authentic *Tarikh-i 'Izzi* as well as i *Munsha' at-i Radi b. Nur ud-din*. But the bulk of material cen on him is found in a Persian Manuscript preserved in the Top Museum, Istanbul. Most of these letters belong to 1161/1748. letters are either written in the Haji's name or deal with his affairs addressees of the Haji's letters include Emperor Ahmad Shah Niza mulk Asaf Jah, his sons Nizam ud-daula Nasir Jang and Nawwab C ud-din Khan, a son of the late Wazir ul-mamalik Qamar ud-din (prob. Intizam ud-daula Khan Khanan,)[12] Safdar Jang[13]. Faulad *kotwal* of Dehli; Sayyid Hashmatullah Khan *wakil* of Nizam ul-mu the court of Delhi; Mahram Khan *khwajasara* of the *Wazir ul-mam* Nawwab 'Abd ul-Majid Khan Diwan-i Khalisa of the Empire, and other high officials of the court of Delhi and of the Deccan-Nizamat.

These letters include certain formal communications, for inst a letter of condolence on the death of Nizam ul-mulk to Nizam ud- Nasir Jang, another letter on the death of Muhammad Shah to successor Ahmad Shah, another condolatory letter on the same ti to Ghazi ud-din Khan son of Nizam ul-mulk, and a letter of condo on the death of Wazir Qamar ud-din Khan[14] to his son.

But the bulk of the remaining letters deal with Haji Muham Yusuf's pecuniary problems. Putting together the evidence of

dorial functions. Besides a royal letter for Emperor Muhammad Shah, the envoy also brought a message from the Ottoman Sultan for Nizam ul-mulk[5], but the contents of the message are not mentioned. When Haji Muhammad Yusuf prepared to leave for Istanbul, Nizam ul-mulk entrusted him several letters. One of these was an *'arida* addressed to the Ottoman Sultan Mahmud Khan[6]. The original of this letter was in Persian a copy of which is given in the *Munsha'at* of Radi b. Nur ud-din who claims to have composed the text of the letter.[7] A Turkish translation of the letter is given in the *Tarikh-i 'Izzi* (ff. 225b-26b). Both al-Hajj Yusuf Agha (i.e., Haji Muhammad Yusuf) and Sayyid 'Ataulla are mentioned in the text of the letter as carrying a special message from Nizam ul-mulk to the Sultan. 'Izzi gives the Turkish translation of another letter brought by Haji Muhammad Yusuf and addressed to the Sultan, ascribing the letter to Nizam ul-mulk.[8] Professor Hikmet Bayur opines that this letter, though ascribed by 'Izzi to Nizam ul-mulk, was actually from the latter's son Nizam ud-daula Nāsir Jang (1748-50)5. The Munsha'at-i Radi b. Nur ud-din gives the text of two more letters from Nizam ul-mulk that were carried by Haji Muhammad Yusuf : one of these was addressed to Hasan Pasha, the Grand Vizier of the Ottoman Empire, and the other one to Bashir Aqa Khwajasara, a trusted servant of the Sultan.[9]

The very multiplicity of these letters shows Nizam ul-mulk's keen interest in foreign affairs. His letter to the Ottoman Sultan is specially important. Alluding to the Sultan's message for him brought by Yusuf Agha (Haji Muhammad Yusuf), Nizam ul-mulk asseverates that he had been in every way loyal to Emperor Muhammad Shah. He goes on to say : Now that he has received the Sultan's command (amr-i wahi mithal, order as binding as the divine revelation), he would strive all the more assiduously in the loyal service of the Emperor. This statement of Nizam ul-mulk has to be examined (as Professor Hikmet Bayur has very ably done) in the light of Muhammad Shah's own letter to the Ottoman Sultan.[10] Putting together Nizam ul-mulk's protestation of loyalty to Muhammad Shah and Muhammad Shah's assertion that 'Ataullah had *not* been assigned any matter beyond what was stated in the Wazir's letter, Professor Bayur has surmised that 'Ataullah had conveyed to the Ottoman Sultan, Emperor Muhammad Shah's complaint of lack of obedience on

helplessness by saying, "Whom have I got to send to Iran for this matter?", Nizam ul-mulk offered himself for the difficult assignment. Muhammad shah, however, was not the kind of king who could take such a bold decision.[2] Next, Nizam ul-mulk showed his acumen in diplomacy when he arranged remarkably favourable terms with Nadir Shah after the battle of Karnal. But the internal feuds of the Mughul court nullified Nizam ul-mulk's diplomatic achievement.

Sometime after the exit of Nadir Shah from India, the Mughul government found an opportunity to reestablish diplomatic relations with the Ottoman court. Circumstantial evidence leaves little doubt that it was on the advice of Nizam ul-mulk that the Emperor decided to revive Mughul-Ottoman relations which had been in a state of suspension since 1690. Evidently the main motivation behind this decision was the need of finding an ally against the much hated Nadir Shah who had snatched from the Mughul empire all its trans-Indus provinces and who was still sending from time to time missions demanding money from Muhammad Shah.[3] The opportunity to reestablish relations with the Ottoman court was provided by the arrival at Delhi of a Bukharan traveller named Sayyid 'Ataullah who after performing hajj had gone to Istanbul whence he came to Delhi with a letter from the Grand Vizier Ibrahim Pasha addressed to the Mughul Emperor.[4] Sayyid 'Ataullah was again sent from Delhi with a letter from Muhammad Shah to Sultan Mahmud Khạn I (1730-54) wherein the Sayyid is alluded to as an 'ilchi" or ambassador. The envoy also carried a letter from Nizam ul-mulk Asaf Jah to the Sadr-i A'zam (Grand Vizier) of the Ottoman Empire.[5] 'Izzi mentions the presentation of this letter to the Sadr-i A'zam in the month of Sha'ban 1157/September 1744. Without mentioning specifically the letter of Nizam ul-mulk, 'Izzi remarks that the letters of the Indian ministers (*wukulai- Hindiya*) spoke of the need of revenge on Nadir Shah and of liberating the provinces grabbed by him. It may be presumed that this allusion also covers the contents of Nizam ul-mulk's letter.

In Shawwal 1157/October 1744 Sayyid 'Ataullah was dismissed and an Ottoman envoy named Sālim Muhammad Efindi was appointed to accopmany him. The Ottoman envoy died after reaching India and it was his companion Haji Muhammad Yusuf who took over the ambassa-

A Note on Nizam ul-Mulk Asaf Jah's Relations with the Ottoman Court

By

Dr. RIAZUL ISLAM
Professor of History, University of Karachi

(This brief paper outlines a long article which the present writer is preparing on the subject. The article which is now in an advanced state of completion discusses the state of Mughul relations with the Ottomans, the political career of Nizam ul-Mulk Asaf Jah, his share in the formulation of Mughul foreign policy, and his contacts and correspondence with the Ottoman court. The article also gives a full account of the two main sources virtually unknown and certainly thus far unutilized—on which the article is based. One of these is a Persian Manuscript of the Topkapi Museum, Istanbul,[1] while the other is a manuscript of the National Museum, Karachi. It is remarkable that there is not even an indirect mention of the subject in the authoritative work on Nizam ul-mulk by Dr. Yusuf Husain Khan. Even the revised edition of the work is silent on the subject).

Nizam ul-mulk Asaf Jah was undoubtedly the most distinguished minister and statesman of the Late Mughul period. His early training under Emperor Aurangzeb and his association with the great Emperor over a period of twenty-five years in the formative period of his life proved a great asset to him. In the stormy period that followed the death of Aurangzeb, Nizam ul-mulk showed something of the extraordinary courage, tenacity and resourcefulness that characterised the great monarch.

Though the great landmarks of Nizam ul-mulk's career are all related to the domestic history of the Mughul empire, he had a strong flair for foreign policy matters. He showed his boldness of vision in this field when within a year of his appointment as *wazīr* of the Mughul empire, he advised Muhammad Shah to send an expedition to help Safawid Iran then reeling under Afghan invasion. When the Emperor pleaded his

have become a prophet, Nietzsche never became one because, firstly, he relied entirely on his own faculties without seeking "external guidance in his spiritual life", and secondly, because he entrusted the realisation of his philosophical principles only to the elite, whom he contrasted to the common "herd".[19] This atheism and cynical aristocratism made Nietzscheism unacceptable to Iqbal, whose philosophy was inspired by belief in an indivisible bond between man and God, man and society.

FOOT-NOTES

1. See S. A. Vahid. Thoughts and Reflections of Iqbal, Lahore, 1964, pp. 101—102.
2. Kamali A. H., The Heritage of Islamic Thought, — in "Iqbal, Poet — Philosopher of Pakistan", N. Y.—London, 1971, p. 223.
3. Ibid., p. 221.
4. Ibid.
5. M. Iqbal. The reconstruction of Religious Thought in Islam, p. 198.
6. Ibid., p. 198.
7. Ibid., p. 31.
8. M. Iqbal. The Secrets of the Self, Lahore, 1961, p. 16.
9. Ref. Dar B. A. Inspiration from the West, in "Iqbal, Poet—Philosopher of Pakistan", p. 193.
10. Ibid., p. 193.
11. M. Iqbal. The Reconstruction of Religious Thought in Islam.
12. Ibid., p. 54.
13. Ibid., p. 53.
14. Ibid., p. 54.
15. Ibid., p. 80.
16. Ibid., p. 85.
17. M. Iqbal. The Reconstruction of Religious Thought in Islam p. 85.
18. S. A. Vahid, Iqbal, His Art and Thought, p. 112.
19. M. Iqbal. The Reconstruction of Religious Thought in Islam, p. 95.

Its admission of the objective character of evil impressed the intellectuals. It enabled them to account for all social troubles not by any subjective causes, but by the real live evil, which was colonialism and feudalism.

In insisting on such a close relation between the two ethical categories, even on their mutual interchangeability, Iqbal was stressing the necessity and propriety of taking action against the established social order, which h.d degenerated into an evil. Disobedience, protest, even violence, all acts condemned by the prevailing morality, were held up as virtues to those engaged in the anti-colonial struggle.

According to Iqbal there are three stages in the development of the ego. These three stages remind sufi "tarikat" as well as Nietzsche's ideas of the development of superman. However they are not the same. Opposite to sufis Iqbal saw the purpose of the development of ego not in "fana"—self-negation, but in self-affirmation, in transformation into the perfect man "insan-i kamil", who fulfils the divine will, who is a divine vice-regent. Iqbal's views differ from Nietzsche. For the latter the super-man is a man who does not follow any moral forms. For Iqbal "the perfect man" is a strong personality, who uses his will and energy not for his own desire for power, but for the sake of fulfilment of the divine will. "Insan-i-Kamil" is supposed to be able to overcome the vices of the society and to act according to the moral forms ordered by God.

Iqbal undoubtedly felt the influence of Nietzsche, but was not one of his followers. His interest in the German Philosopher sprang from a desire to create a Muslim philosophy of action that would suit the aims of the national-liberation movement. He was attracted by Nietzche's ideal of a superman, a man of will, capable of heroic living. He was impressed with his rejection of Christian asceticism, which condemns man to slavish passivity, for he himself strongly denounced the asceticism preached by the Muslim mystics. He borrowed some of Nietzsche's imagery, for instance the allusions to diamond and coal as symbols of firmness and lack of will.

But while he admired the vision and literary gifts of the German philosopher, Iqbal rejected the basic premises of his philosophy. In his opinion, despite his "vision of the divine' thanks to which he might

Iqbal followed the Sufi teaching on good and evil. The *Qur'an* says, "Whatever good visits thee, it is of God; whatever evil visions thee is of thyself" (4.81). In contradiction to this, the medieval Sufists (Abdul Karim al-Jili and others) said that both the good and the evil of the universe came from God. In their opinion, evil was a necessary objective condition for the realisation of good. Just as the bird must overcome the resistance the air to fly, so man can only be good by overcoming evil, and therefore he has no right to complain about the existence of the latter.

In adopting this Sufist principle, Iqbal modified it somewhat. The pessimism and passivity of the medieval mystics had no place in the philosophy of one who spoke for the middle class at a time when it was rousing itself to political action. His affinities were much more with the romanticism and dynamism of 17th and 18th-century European philosophy.

Iqbal explained his ideas by interpreting the biblical legend of man's fall from grace and expulsion from the Garden of Eden (cf. the *Qur'an*, 7, 10-24) as a manifestation of "free choice", a view entirely out of keeping with religious tradition. "Man's first act of disobedience was also his first act of free choice," he said.[17] Furthermore, if good was the result of free choice, one might say that evil created good. Iqbal's Iblis-Satan like Goethe's Mephistopheles, was part of the eternal force that always desired evil but worked only good. Without it life would have no dynamism and deathly passivencess would triumph in the universe. The figure of Satan in one of his poems, like in Milton's *Paradise Lost*, is more attractive than that of God, because it symbolises the spirit of creativity. Addressing the Lord, Iblis says :

> Thou hast created the starry spheres : I cause them to move
> I am the life of all in the World, the life latent in everything.
> Thou gives life to the body : I infuse warmth into life.
> Thou showest the way to peaceful rest : I lead towards restless strife.
> The man of earthly origin, foolish and short-sighted,
> Is born in Thy lap, but attaineth maturity in mine.[18]

The revolutionary spirit of Iqbal's conception suited the mood of the radical intelligentsia at that time of active struggle against colonialism.

that it was useless to oppose this play of blind forces. The pessimism of the social conclusions out of Bergson's philosophical premises could not be accepted by Iqbal. Opposing of Bergson, the muslim philosopher stated : "Reality is not blind vital impulse wholly unilluminated by idea. Its nature is through and through teleological".[11]

M. Iqbal realized vulnerability of his position as affirmation of "teleological" character of nature lead to negation of free will. "The world,—Iqbal recognized,—regarded as a process realizing a pre-ordained goal is not a world of free, responsible agents: it is only ast age on which puppets are made to move by a kind of pull from behind".[12]

Thus Iqbal did not want to accept voluntarism which liberated from responsibility, lead to pessimism and desire to step away from the participation in this life. He also rejected supernaturalistic determinism of orthodox muslim philosophy which did not recognize free will. Iqbal made an attempt to solve the antimony of freedom and necessity, God's will and man's free will, Development of the world, the acts of men are not aimless, they are submitted to the teleological purpose. But this purpose is not understood statically, as a predeterminated plan of development. "The notion of purpose cannot be understood except in reference to the future".[13] There is no rigid aim system, in every period of life, people mould and develop themselves according to the spirit of new ideals. Teleological purpose is understood by Iqbal in the sense that

> "... there is no far-off distant goal towards which we are moving, there is a progessive formation of fresh ends, purposes, and ideal scales of value as the process of life grows and expands".[14]

The muslim reformer recognized that if "ego" selfdevelops, it is able to will and act, then freedom and omnipotence of God is doubtful. How man's free will can be reconciled with God's omnipotence? In Iqbal's view God himself limits his power. This limitation "is born out of His own creative freedom whereby He has chosen finite egoes to be participators of His life, power and freedom".[15] By giving freedom to man God takes risk, for "the freedom to chose good involves also the freedom to choose what is the opposite of good".[16] God takes this risk because He believes in man and man is to justify this faith.

objects is not something different from our "self", it is some part of us. "The world is nothing but the manifestation of ours,—said Iqbal,—For without us there would be no scenes of lights and sound".[8]

Iqbal believed that affirming by this way the unity of object and subject, he solved the problem of free will and found the golden middle way between absolute determinism and voluntarism. But it seems he has failed to solve the problem. One of the weakest point of this dualistic system is: how "non-ego" appears out of "ego". In Fichte's view the theoretical reason cannot give the answer to this question. This can be done only by practical or moral reason, according to which this 'creation" is an act of free will. M. Iqbal also considered that ordinary thought cannot appreciate this unity, the essence of which is the creative activity of self.

In "Asrar-i Khudi" Iqbal says :

"It [the Self] makes from itself the forms of others,

....

....

Subject, object, means and causes—

All these are forms which it assumes for the purpose of action.[9]

In Iqbal's view "In great action alone the self of man becomes united with God without losing its own identity and transcends the limits of space and time. Action is the highest form of contemplation".[10]

This identification of contemplation with creation reminds Henri Bergson's thesises that "the act of cognition coincides with the act which creates reality" and that "the difference between *who* cognizes and *what* is cognized disappears". In his lectures on the "Reconstruction of religious thought in Islam", M. Iqbal a number of times refered to Bergson's ideas, in particularly while interpreting intution as the highest form of intellect and also when considering the problem of time and space. However the Muslim poet-philosopher did not accept a number of Bergson's notions, which contradicted the spirit and social trend of his own world outlook. Being a mouthpiece of anticolonial social forces of his society M. Iqbal propagated creative activity and struggle. Bergson's ideas about aimless wave impulses, which are chaotic and non-regulated, lead to the conolusions

creator, as a partner of God and Maker. In his poem "Muhawarah Ma-Bayen Khuda wa Insan" ("God's Conversation with Man"), man speaks to his maker as an equal :

"You made the night, and I the lamp,
And you the clay and I the cup ;
You—desert, mountain-peak, and vale ;
I--flower-bed, park and orchard ;
Who chisel a mirror out of stone,
Who brew from poison honey-drink".

Individual "ego" strives to come closer to the divine "Ego". But Iqbal understood this striving not as a dissolution on account of man's refusal from his own "khudi", but just opposite, as his self-affirmation. "The ultimate aim of the ego, Iqbal wrote,—is not be *see* something, but to *be* something . . . The end of the ego's quest is not emancipation from the limitations of individuality; it is, on the other hand, a more precise definition of it . . .[5]

Approaching God or Ideal, was regarded by the poet rather as a vital than an intellectual act. He considered it a vital act, on which "depends the whole being of the ego, and sharpens his will with the creative assurance that the world is not something to be merely seen or known through concepts, but something to be made and re-made by continuous act on".[6]

M. Iqbal in his concept of "ego" tried by his own way to synthesize the ideas of Muslim and European philosophy. His concept of "ego" has much in common with some of ideas of Fichte. Iqbal was particularly attracted by Fichte's immanent philosophy regarding objects and subject in their indissolubility. Like Fichte Muslim poet-philosopher affirmed the unity of object and subject, being and thought, non-ego and ego. "It is possible to take thought not as a principle which organizes and integrates its material from the outside, but as a potency which is formative of the very being of its material. Thus regarded thought or idea is not alien to the original nature of things; it is their ultimate ground and constitutes the very essence of their being . . . ".[7] The real world of "non-ego" is the expression of creative activity of "ego". Thus the world of

Being critical to mysticism Iqbal at the same time borrowed quite a lot from sufi philosophers and used a number of sufi terms and notions. The sufi doctrine "wahdat-al-wujud" which expresses the pantheistic idea of the unity of God and nature was interpreted by M. Iqbal in the spirit different from that one of the traditional islamic mysticism. Sufism laid the emphasis on the distinction of "zahir" and "batin" (Appearance and Reality) where God is Reality and nature is appearance. Accordingly this world and the human beings are the appearance of the Reality—God. This point of view logically leads to the total ignoring of world problems as temporal, not important, and to the understanding of the role of man as a passive conductor of God's will. The unity, the melting of individual ego in Cosmic ego, Iqbal understood not as the refusal of man from his own ego but rather as participation in the creative activity of Supreme Being.

In his time M. Iqbal by his own way developed the ideas which had been early expressed by "non-orthodox" sufis like Mansur Hallaj and Abdul Qadir Beidil. The name of Hallaj to whom belongs the famous exclamations : "Ana'l-Haq", which brought him to death, was a number of times mentioned in Iqbal's poems.

Iqbal even called himself "the second Mansur".

A H. Kamali, who acknowledges "departure" of Iqbal "from the traditions of emanationalism and idealism, which reduce human existence to a phenomenal shape in the development of the absolute", considers that this departure was due to the fact that "the radical elements of Beidil's thought came to full bloom in Iqbal's philosophy of self".[2] In contrast to the traditional sufi symbolics, which compares the relation between God and man as that one of ocean and waves, river and bubbles, Beidil used in his poetry metaphors which radically modified the concept of man "Just like a pearl, which though hardened in the bosom of a river, is thrown ashore, I am thrown out, because I could not be absorbed, melted, or dissolved".[3] Beidil looked at man as "the pinnalcle of creation, the shaper and the maker, the knower and the doer".[4]

Mohammed Iqbal continued this line of thinking and developed it in a comprehensive concept of "khudi", in which man was regarded as a

Problems of Ethics in Mohammed Iqbal's Philosophy

PROF. MARA T. STEPANYANTS

University of Moscow (U.S.S.R.)

The tendency to the personal interpretation of the relation between God and man eliminating any ecclesiastic or secular meditation, the tendency which is so much typical for the Reformation explains the attention of the religious reformers to pantheism of mysticism.

Pantheism, which unites God and the world, sometimes identifying them, allows to interpret this unity both ways : as dissolution of nature in God or, just opposite, of God in nature. In the latter case pantheism contains the elements of naturalistic philosophy. In XVI-XVII centuries these very elements of pantheism made it the most important methological foundation of the majority of natural-philosophic theories in West Europe (Kampanella, Bruno etc.).

In Islam, too, the mysticism of sufism sometimes served as a form for naturalistic conceptions.

Sufism looks at the pray as a way to the personal contact with God. Muslim mystics believe that it is possible by merging in God not only to contact with Him but even to comprehend the Absolute truth. The achievement of "fana" is considered to be the aim of "tarikat". "Tarikat" stipulates the elimination of human will, the acknowledgement of personal insignificance, the belief in God as the only real being. Iqbal justly considered that mysticism "supresses personal initiative" and that is why" . . . the decadents in all ages tried to seek shelter behind self-mysticism and nihilism." "Having lost the vitality to grapple with the temproal. Iqbal said,--these prophets of decay apply themselves to the quest of a supposed eternal, and gradually complete the spiritual impoverishment and physical degeneration of their society by evolving a seemingly charming ideal of life which reduces the healthy and powerful to death" [1]



ڈاکٹر ماریٹا استپانینس
Dr. Marietta Stepaniants (U.S.S.R.)

vision of livelihood (being an activity of the *nafs*!) people were allowed to ride animals, ...to eat their meat, to drink their milk and to use their wool for clothing. Of this epoch our prophet Mohammed became the closer, and at the same time he became the inaugurator of a new period which was an expansion of the foregoing. And in that (new) era the gracious eyes (of God) turned to the *rūḥ* and the *sirr*. Hence in that time was the beloved, the perfect and the favoured he, in whom both of these *laṭīfa's* were alert . . . Next, at the time of Ibn al-'Arabi the gracious eyes (of God) turned to the *laṭīfa*, called *khafī* . . . and the spiritual leaders of that age were inspired with knowledge of divine Unity (*tawḥīd*) and concerning the world's vanishing into one Reality (the theory of *wahdat al-wujūd*) . . .Finally, in our days the gracious eyes (of God) turned to the *laṭīfa's*, named *ḥajar-i baht*[1] and *anā*".

Accordingly, many prerogatives, like a full command of all facets of mysticism, and an all-encompassing knowledge of the *Sharī'a* and of all that pertains to prophecy, has been bestowed on Shāh Wāli Allāh, being himself a chosen one of this last epoch,[2] since both of these *laṭīfa's* operated upon him. And in this period it was that "up to the West rays of light were reflected, and the earth was irradiated by the light of its Lord" (*Tafh*,. I, 299).

And in the *Fuyūḍ al-Ḥaramayn* (11th Vision) our author asserts that, in-as-much as the growth in number of the *al-malā al-a'lā* will continue to the end of time, the knowledge of God in this earth will become increasingly penetrating and intimate with the course of history. The Prophet himself has hinted at this subtle point in his statement : "When the Time of Resurrection gets near, the visions of the believers will be rarely hallucinatory".

---

1. Original meaning of it is : "Eagle-stone which is valued for its magic properties". By our divine it is used as a self-devised technical term for "the center (*nuqṭa*) which is the model (*namūna*) of the *tajallī-i-a'ẓam* (*Sat*., p. 29). And "from it (divine) knowledge infiltrates upon the '*aql* and *qalb*".

2. Cf. *Tafh*. II, 120 : "My Lord conveyed to me that......after me there would not be found anyone having attained nearness to God but would have had a hand in his moral education and spiritual training, until the moment that Jesus will come down (from heaven)".

revelation as such the latter will never enter. In orthodox Islam the same is true : The advent of Mohammed is viewed as the terminative point of an extended revelatory period, in which the former prophets equally officiated as agencies of God. But the events *after* the blessed times of the Messenger of God are of a considerably lesser religious significance. This is implicative of the well-known doctrine of Mohammed's being the seal of prophet.

In a complete agreement with the traditional views is Shāh Walī Allāh's exposition of the five *taghayyurāt*, alterings for the worse, as can be pointed out in the history subsequent to the death of the Prophet. The first *taghayyur* is the transfer of power to Abū Bakr; the second the death of 'Umar who was the bolt on the door of *fitna*; the third, the murder of 'Uthmān. was the worst, since it turned out to be the dividing line between the age of order that preceded and the age of chaos and anarchy that followed. The fourth *taghayyur* is the establishment of Abbasid caliphate in Iraq; and the fifth the end of Arab dominion and the arrival of the sway of non-Arabs, of Turks, whose rule is like that of the *majūs* with this difference that the former, observe the *ṣalāt* and confess with their tongues the *shahāda*. "I myself", so our author complains, "being born in the final stage of this (fifth) altering for the worse do not know now what after this God has in mind (for the future)". This theory of the five alterings for the worse—and that is important to mention—is set forth in the *Izāla al-khafa'ān khilāfat al-khulafa'* (I, p. 148 ff)., in which the Sunni standpoint is expounded over against the Shī'a principles. In many other writings of this scholar, however, a close reader can readily trace a lot of unorthodox opinions, and this also holds true with respect of the matter now under consideration.

The argumentation in *Tafhimāt* (I., pp. 123 f.) for the existence of progressive phases in God's revelation to humanity is based upon a demonstration of a coming into operation of 'perceptible' and 'concealed' *laṭifa's* in a sequence of increasing subtleness and quality. "The human form", so Shāh Walī Allāh states, "is founded upon the completion of the *laṭifa's* of *qalb*, *'aql* and *nafs*. And the human race, with Adam as the first produced, came into existence. In the following epoch the *'aql* and *qalb* of man were charged with getting to know the truth of God. For the pro-

sciences pursued were astrology, medical art, and *siḥr*, black magic. Thus some time elapsed.

Then. angels begin to appear gradually. And at the moment that they had become numerous and their knowledge and their will-power had developed harmoniously, the laws of astrology became more and more in operative. From now on the 'restraint' and 'letting loose' of causal processes were the business of the *al-malā al-a'lā*, the Supreme Assembly (of angels). Accordingly, Abraham the inaugurator and exponent of this second epoch, awakened to the insight that he did better to divert from the stars and to concentrate henceforward upon the *al-mala al-a'la*. In the course of time men fell into the tight grip of the angels, and they got devoted to God by *ṣalāt*, ritual purity, belief in the angels, heavenly books, and messengers of God. In this age the *millat-e-ḥanīfa* was established.

On account of steady adherence of the will-power of succeeding prophets to the angels, the influence and moment of the *al-'ālam al-mithal*, the world ofprefiguration where the *al-malā al-a'lā* reside, continuously in· creased. And when at last Mohammed appeared on earth, the sky, heaven and earth were completely filled with *mithālī* form of the *tajallī*,. Consequently, if at present somebody wishes to acquire *'ilm*, *ma'rifa*, or a divine perfection this *mithālī* form, *i.e.* the spiritual shape of Mohammed, is for him the most appropriate source (*Lamḥa*, 50; *Tafh.*, I. 66 ff).

So far the era of prophecy, of which Mohammed is the apex and conclusion. But how is the time afterwards valued in Shāh Walī Allāh's philosophy of history?

For a proper apprehension of this question some preliminary remarks have to be made before. In the so-called historic religions the hour of birth, the era of the founder's appearance, is taken for the most crucial event in the history of mankind. It is the *pleroma tou chronou*, the fulness of times. A somewhat illogical issue of this belief is that by the adherents of these religions in general the prenatal period is evaluated much higher than the postnatal ages. The Christians, *e.g.*, will without hesitation acknowledge a Moses or Isaiah as conveyors and exponents of authentic divine revelation; but the office with which they want to credit an Augustine or Luther is that of 'father of the church' at the most, and in the process of

A third progressive line, symbolized by the succeeding prophets is the evolution of what is qualified as *dawā'ir*, or *dawrāt*, spheres, fields of activity which are successively to be traversed by a mystic. The first *dawra* is that of *īmān*. faith. Here Adam functions as *imām*. The second is that of the *sharḥ al-ṣadr*, expansion of the breast, the state in which the gnostic has turned away from the world and its amenities. This is the territory of Idrīs. Next comes the *dawra* of the *qurb al-nawāfil*, *i.e.* of seeking God's nearness through works of supererogation. That is the domain of Noah. The fourth *dawra* concerns *ḥikma*, widsom. It is, as is easily guessed, the sphere of the prophet Yūsuf. Then the *dawra* of the *qurb al-farā'iḍ*, *i.e.* of seeking God's nearness through a painstaking observance of the obligatory religious precepts. This is the field of the lawgiver Moses. The sixth *dawra* pertains to the *qurb al-malakūt*, *i.e.* of obtaining nearness to that he was, so to say, an angel walking on the earth (*Ta'wil*, p. 76). The final *dawra* is that of *kamál*, of striving after perfection. That is the ground of Mohammed. (*Tafh.* II., 63-70).

For a classification of history in a more proper sense of the word we have to turn up the monograph *Lamaḥāt* and volume I of the *Tafhimāt*. The question at issue is to describe the effects produced by God's *tadjalli*. In Shāh Wali Allāh's terminology *tajallī*, is the last of the four fundamental qualities (*kamālāt*) of God, which are the ways to discern among the countless divine attributes. They are : *Ibdā'*, the effusion of a thing from nothingness into actuality; *khalā*, creative activity where matter is already available; *tadbīr*, *i.e.* the divine management in the worked which cares for a good order so that everything be in accordance with universal expediency; and finally *tajallī* which regulates the affairs between God and the human individuals. It results in the disclosure of knowledge, of right guidance, or of perfection of souls. It is of many *adwār*, periods, and *aṭwār*, phases. In the beginning of our history events were determined by the powers of celestial spheres and of elements only. Inaugurator of this epoch is said to be Hermes Trismegistus, the Greek name applied to the Egyptian god Thot. To him are ascribed works on astrology, medicine, alchemy and magic. It is in this age that knowledge of the movements of the stars and of their pecularities welled up in the heart of Idrīs. And in this era the *milla* of the *majūs*, the 'fire-worshippers', came into existence, and the

the milieu of the court of the Pharaoh. "To that end God 'stirred up' a *taqrib*", *i.e.*, He procured a device to organize his departure from the pagan surroundings. Thus we get the event of Moses' killing an Egyptian which forced him to flee from the country and to settle in the land of Shu'ayb.

Let us now proceed to what I would like to call an interpretation of history along sociological lines. Its foundation is Shāh Walī Allāh's famous theory of the four *irtifāqāt*. *Irtifāq* means literally 'to gain benefit by'. Our Delhi divine school coined of its feminine plural a technical term denoting the ways and means people have at their disposal to raise cultural and social standards, while he terms the stages reached at by their efforts of making a continuous progress simply as the first, second, third and fourth *irtifāq*. In the *al-Budūr al-bāzigha* this process of social evolution is connected with specific prophets. Typical of the first stage that relates to regulative nomadic life is the personage of Adam, the first prophet. Mohammed, the seal of prophethood, is a representative of the final stage in which supernationalism is the basis of human society. Urban life the second stage, is to be credited to Noah, while Jesus for the third stands stage of man's social condition. In it the state is born in order to secure an organic unity (*B.B.*, p.p. 185-9).

Besides functioning as fitting typifications of social development the prophets serve as well another purpose in Shāh Walī Allāh's philosophy of historical evolution. An essential concept in his mystic thought are the so-called *laṭīfa's* psychic centres of a spiritual substance. They can be figured as five or six concentric circles, the outmost standing for the *laṭīfa* of the *qalb*, heart; the innermost for the *laṭīfa* of the *akhfā*, *i.e.* 'the most hidden'. With this symbolism is given of the journey of a gnostic, *'ārif*, who starting from the *qalb* and passing along the even more inward *laṭīfa's* of *rūḥ*, *sirr* and *khafī*, progresses to the *akhfā*. At this terminal point he will receive information from the *al-tajallī al-a'ẓam*, the source of all divine epiphanies (*Khizāna*, 9).

Here again, as we are told in one of his *rasā'il* Adam is at the beginning of the series and Mohammed at the end. Adam, so is explained, had fastened his grip on the *qalb*, Abraham on the *rūḥ*, Moses on the *sirr*, Jesus on the *khafī*, and Mohammed on the *akhfā*'.

term events are meant which were designed by God to reward the obedient and to punish the wrong-doer (*F.K.*, p. 3). They are recorded in the Koran. In this Word of His, God has actually made a prudent choice, selecting from those *ayyām*, 'Days' the accounts which the people, for whom they were intended, had already heard before. They are related in a summarized form, and concerned the lives of Abraham and of Israelite prophets. With these stories the contemporaries of Mohammed had become familiar through an ages-long intercourse with the Jews. To this end God had not made use of curious and uncommon tales from Iran, nor of Persian or Indian legends. The divine wisdom of it was that, if curious narratives are told to simple-minded folk their attention is immediately focussed on the extraordinary, and not on the essence of the stories (*F.K.*, p. 13 f.). In the last observation, I think, we have a clue for understanding Shāh Walī Allāh's dislike of the *'ilm bi'l-ta'rīkh* : in his opinion the occupation with histories, as are given in the *Shāh nāma* and so on, is likely to withdraw the interest of the students from Ultimate Reality and its concerns. And occasionally he points at the degenerating effects Culture and Arts have produced on the courts of the Roman and Byzantine Empires.

Of the capability to study the lessons of history, as is offered by God to man, Shāh Walī Allāh himself has taken a proper advantage. For he has published a book on the hidden features of the prophetic stories found in Koran and Ḥadīth, more or less after the pattern of Ibn al-'Arabī's *Fuṣūṣ al-ḥikam*. Regarding himself an 'expansion' of the prophet Yūsuf who was equally a Walī Allāh, as is hinted at in the end of the *Sūra Yūsuf*, our author has given this writing of his the title *Ta'wīl-aḥadīth*, being the personal prerogative of this prophet. The *ta'wīl*, (elucidation) given in it, is based upon the presupposition that the things which happened to the prophets have had two sources: (a) the *isti'dād* (pre-disposition) of a messenger and his people ; (b) God's providential rule which is tuned to the situation of the moment. A good example of this is the exposition of Moses' flight out of Egypt. The disposition, *isti'dād*, of this prophet, so we read on page 43 of the *Ta'wīl al-aḥādīth*, was that his *fiṭra*, his religiosity so to say, could only come to a full development in an environment of co-religionists. Hence he had to be detached from

Shah Wali Allah Dihlawi's Philosophy of History

PROFESSOR J.M.S. BOLJÖN
(University of Leiden, Netherlands)

The attitude of Muslims in the classical past towards history seems to Western scholars at first sight self-contradictory. On the one hand it is true that Muslims, in an even more strict sense than Christians, consider history to be the workshop and exponent of Divine Will. For them, as W.C. Smith puts it very briefly but tellingly in his *Islam in Modern History* (Princeton 1959), p. 40 : "History confirmed faith". On the other hand, and that we read in F. Rosenthal's study *A History of Muslim Historiography* (Leiden 1952), it is also a fact that on the whole historical investigation as such received little esteem from Muslim scholarship. By kings and rulers some benefit could be taken from it, but for the rest scholarly efforts could be much better concentrated upon other subjects.

Shāh Walī Allāh takes a similar view, and he condemns severely people who occupy themselves with research other than is needed for the explanation of Koran and Ḥadīth. And he who dedicates his energies to sciences like the *'ilm bi'l-ta'rīkh*, belongs "to the *'ulamā* being bent on worldly gain" (*Tafh.*, I. 37). "With true faith it has nothing to do!"

However, it is precisely this very Delhi scholar who presents us an indeed glorious panoramic view of all possible meanings derivable from the course of historic events and who refutes most convincingly the thesis also found in the above-mentioned work of W.C. Smith that the Ṣūfī seems "little interested in the historical process" (p. 45). And it is the purpose of this paper to intimate you with exceedingly creative thinking this fellow-countryman of you had demonstrated in discovering unexpected aspects in historic evolutions.

In his monograph *Saṭa'āt* our author mentions among the seven sciences granted by God to mankind the knowledge of the 'Days of God', *i.e.*, occurrences which provide lessons of history (*Sat.*, p. 26). By this



پروفیسر جے ۔ ام ۔ ایس ۔ بولجان (لائیڈن)

the subjects of really extensive writing : yet many others deserve, if not equal, at any rate comparable attention. I know very well that in recent years organisations and individuals in Pakistan have contributed much in both the respects I have mentioned. The series Urdu ka klasiki adab, published by the Majlis i Taraqqi - Adab (largely, if I am not mistaken, under the inspiration of the late. Imtiyaz Ali Taj, whose tragic murder was so grievous a loss to Urdu-letters) is something to bring joy to all who wish to see the literary heritage of Urdu adequately cared for. And the work of Aslam Farrukhi on Muhammad Husain Azad of Zahir Fatehpuri on Rusva, and of Ifthikhar Ahmed Siddiqi on Nazir Ahmad—to name only three works that come readily to mind, provide examples of the kind of attention that needs to be given to every major Urdu writer before we can even begin to be satisfied that Urdu and its literature are being served as they should.

The Oriental College and its Principal, my friend Ibadat Sahib, have performed a service in organising this conference- a fitting step to be taken by an institution which has for a full century played a distinguished part in the promotion of the studies which are dear to the hearts of all of us assembled here.

RALPH RUSSELL

March 1973

This was recently the subject of a very fierce review by Mohammad Mian in the Pakistani paper *Outlook*, issue dated 24 February 1973, published from Karachi. May I just say in passing that of course I do not wish to deny any man his right to express his honest opinion, no matter how strong it may be, and Mohammad Mian Sahib has as great a right as the next man. But I would suggest that this degree of hostility is not soundly based. The two editors have indeed made foolish mistakes, largely because they have overestimated their ability and failed to draw adequately upon expert help from Urdu speakers which would very willingly have been given. But they are nevertheless the friends of Urdu, not its enemies, and the efforts of a friend, however faulty and inadequate, should be received with appreciation even while frank criticism is expressed.

Other work—useful, arduous, and for a long time necessarily provisional, is also in progress at SOAS. Most of the Urdu texts currently prescribed in our Urdu B.A. syllabus are now provided with notes and vocabulary in duplicated form—this too, being largely the work of David Matthews and Christopher Shackle, and one for which they deserve great praise. When checked, revised, and tested in the light of repeated techning experience, they will form the basis of properly edited texts, and the tradition of Kempson will be revived and continued.

May I conclude by suggesting to my Pakistani friends and colleagues that the work which British scholars have done, are doing, and will continue to do, is deserving of their attention and support. The interests of Urdu demand that every effort be made to show its worth to the non-Urdu speaking world, and every effort, no matter who makes it, and no matter how inadequate it may be, to expand the audience for Urdu and its literature, deserves the support of all who love the language and its literature. And who should love Urdu more than the people of this country whose national language it is? It is no criticism of Urdu scholars here to say that Urdu studies, even in the continent of its birth, are still hardly out of their infancy. Think of all the major poets and prose writers of whose works no full, reliable, soundly-edited text has yet been published. Sauda, one of the greatest of Urdu poets, is but one of many possible examples. Think too how few and far between are adequate studies of the lives and works of the major writers. Only Ghalib and Iqbal have been

Ghalib, produced for the centenary year in 1969, and we are at work on a third in which we are attempting the very difficult task of presenting a comprehensive selection of Ghalib's Persian and Urdu verse to the English-speaking world. Meanwhile I have completed the Urdu language course to which I made reference earlier, and am adding to a collection of rapid-reading passages and another collection of newspaper extracts which will in due course from the basis of two elementary readers.

In 1969 Khurshid Sahib took leave from Aligarh to undertake full time work for the Oxford University Press. The project, in which I too cooperate, is to revise and supplement Platts' Urdu-English dictionary and to produce also a new, comprehensive English-Urdu dictionary designed (unlike all previous English-Urdu dictionaries that I have seen) to meet the needs both of English learners of Urdu and of those who have Urdu as their mother tongue. It may take twelve years or more to complete the project, but work is going steadily ahead, and we trust that the resources of time and money and patience will last through until completion.

We also plan to write first, a concise, and later a comprehensive, history of Urdu literature, and if in the fifteen years or so of life which I can reasonably hope are left to me I can, with Khurshid Sahib's constant help, bring these projects to completion. I shall die content that I have well served the language and literature that I love.

It gives me great satisfaction that in recent years other British scholars have entered the field and made valuable contributions to this work. At one level, the work of Victor Kiernan must be mentioned. His *Poems from Iqbal*, first published shortly after the end of the Second World War, was the first, and still the only substantial selection of Iqbal's Urdu verse—his Persian has been much better served by western translators —to appear in English. In this, and in his recent *Poems of Faiz*, he has had the indispensable help of his friend—a well known figure in your Lahore—Nazir Ahmad, former Principal of the Government College. More recently my junior colleagues David Matthews and Christopher Shackle have published—or rather Oxford University Press has published, with a generous subvention from the School of Oriental and African Studies, *An Anthology of Classical Urdu Love Lyrics* that is, of Urdu ghazals.

For myself, I considered it necessary for the rest of my academic life-time—a life-time that had been shortened by six years of military service—to adopt an ambitious series of aims. I already committed these to writing in January 1951, when I ultimately became responsible for the teaching of Urdu in the University of London. I thought it necessary to create a general interest in Urdu in the British public by publishing studies and translations of some of the best of its literature, to compile a proper course in the language, suited to present day needs, to supplement this with a substantial amount of rapid-reading materials, with full vocabularies, notes and translations, enabling the student very rapidly to increase the range of his vocabulary, to edit and annotate a whole range of texts, both in prose and verse, and finally to produce up to date Urdu-English and English-Urdu dictionaries. Such a programme could not have been, and cannot be, carried out by a British scholar working on his own, and I owe much to the colleagues and friends whom I named a moment ago. I must however single out one of them Khurshidul-Islam, now Reader in Urdu in the Muslim University of Aligarh, and for the last twenty-two years the closest friend that I have in this world. It is, thanks to him above all, that I have developed such understanding of Urdu poetry as I possess. Our tastes and interests and judgements, and the range of reading in literature in general are so similar that a more ideal collaboration should hardly be imagined. In collaboration with him I have produced two books, published over our joint names.

Some people would say that they are not 'scholarly' books, and, taking the word in the sense in which they mean it, Khurshid Sahib and I would gladly accept that this is so, because we did not write them just for other scholars to read : we wrote them for ordinary men and women who respect their fellow men, are interested in their culture, and have a desire to understand it better. The first was *Three Mughal Poets.* I am happy to say that it won the admiration and praise of men and women who before they read it did not even know what Urdu was—including an economist, a mathematician, a school-teacher and a housewife and mother of a young family—and no scholar's praise could bring us such satisfaction as their praise does. Our second book was the *Life and Letters of*

firing range with others like—and these are actual examples—'Sinners keep on sinning' 'Some rams have four horns' 'We met the raja's elephant on the metalled road' and 'Village girls get confused easily and cry'.

And the result was that when I came into the field of Urdu studies almost everything for the English speaking student of the post-independence era (1947—1966) still remained to be done.

I should preface what I am going to say next with the information that from 1949 to 1966—a period of 18 years—I was the only full-time permanent British teacher of Urdu in a British university. You will understand therefore, if I speak for a moment or two of the contributions to Urdu studies which I myself have attempted to make. During that period I have attempted, with the invaluable and indispensable help of a succession of Urdu-speaking colleagues, Khurshidul Islam, Aziz Ahmad, the present Principal of the Oriental College, Dr. Ibadat Barelvi, whom I have had the honour and the pleasure of knowing both as a colleague and a friend since 1950, and finally, of Khalid Hasan Qadiri to produce a basis for the study of the Urdu language and its, in my view, very great literature in the spirit appropriate to the new relations of equality and mutual respect which were not possible so long as the ruler and subject relationship continued to exist. I will not weary you with more than a very general account of what I have attempted. The most gratifying tribute to my efforts came from the Spanish wife of an Urdu speaker who, after vain attempts to learn her husband's language from the books available in the market, was introduced to the course I was then writing and exclaimed, 'I can learn from *this* course.' It is written for human beings'! No tribute could have made me feel more adequately rewarded. Studies of Urdu and of its literature should indeed be written for human beings, and in a way which stresses the equal claims to respect of Urdu-speakers and English-speakers alike as fellow-members of the human race.

It is not in my brief to speak of Candadian and American work, but I must pay a passing tribute to the work of Professor M.A.R. Barker and his Urdu-speaking collaborators, whose work is inspired by a similar spirit. I know, and share, some of the criticisms of his work which have been expressed in Pakistan, but none of us is without fault, and Barker deserves both my respect and yours for the care and devotion with which he has worked in the service of Urdu.

is a rather later contribution in the same field. Their choice of Nazir Ahmad for such treatment shows, in my view, very sound judgement, for he was (again, in my view) and still remains, one of the incomparable masters of Urdu prose, and a writer of sustained power that none of his contemporaries could match.

Since that time little British work of this kind has been done. With the British scholars based in India between the two world wars it was increasingly the most narrowly practical needs that prevailed and determined the character of their work. Language courses designed to teach the memsahib to manage the servants and the British officer in the Indian army to manage his sepoys dominate the scene from the time of Holroyd (of Punjab fame) to that of D.C. Phillott, whose *Hindustani Manual* and *Hindustani Stumbling Blocks* show an excellent command of the language but are full of syces and horses and of conversation suited to the needs of men who had never read a work of literature. It is amusing to note that Phillott's one excursion into Urdu literature was to produce an English translation of Rangin's treatise on the horse. Phillott's generation no longer commissioned works of literature, as Gilchrist had done a century before them, but works specifically written to meet military needs, so that in my day in the Indian Army the two standard textbooks for the use of British officers in their studies were (for the Lower Standard) *Hamare Sipahi aur Sawar* and (for the Higher Standard) *Khwab o Khayal*, a retranslation into Urdu of an English version of a lost Urdu original of the autobiography of a 19th century soldier who rose, as the sub-title tells us, 'from sepoy to subedar'. After Phillott his work was largely taken up by army munshis the once famous Sahgal, the much better Munshi Siddiq ul Hasan Khan—works which have their merits, but abound in the language of complaint and command—'This is not fresh'—'You are not very smart' and so on—and in sentences about jawans going on sick leave, or on active service or to the firing range, or about Jemadar Sahibs going to draw rations from Kasauli.

The approach of independence might have been expected to produce a welcome change, but it did not. The munshi style was replaced by the old British public school style, which treats every living language as though it was a dead one, and replaces sentences about jawans on the

in this period was in the field of lexicography. First Fallon, and later Platts, to mention only the two most important, produced really outstanding work in this field. It has always puzzled me that the work of Platts is so little appreciated here as against that of his predecessor Fallon. If my memory serves me aright, he is not even mentioned in the late Maulvi Abdul Haq's survey of Urdu lexicography which he gave in the preface to the Standard English-Urdu dictionary produced under his editorship on the basis of the Concise Oxford English Dictionary. Platts, like other scholars, had his weaknesses. He seems to have concealed to an unjustifiable extent his debt to his predecessors, and even more characteristically, he seems to have felt that he had the right to appropriate the contributions of the Urdu-speaking subjects of the British Raj and not to acknowledge their assistance any more than he would have acknowledged the assistance of the bearer who served him his field. I would assert without fear of contradiction that no Englishman who ever lived, or ever will live, could complete so comprehensive and, for its time, so excellent an Urdu-English dictionary without the copious help of men who had Urdu as their mother tongue, and it is a matter of shame that Platts' dictionary gives no record of who these men were. For all that, the work of Platts and his nameless collaborators is an outstanding one--so much so that if I was asked to name the one British contribution to Urdu that outweights all others -- and this is a considered judgement—it is Platts' Dictionary that I would name. It is curious that his *Hindustani Grammar* is a far less impressive book.

Another name that deserves mention among the British scholars of this period is that of Kempson, of the Department of Public Instruction of the North-Western Provinces, later to become part of U.P. Kempson's role as the discoverer of Deputy Nazir Ahmad's genius for Urdu prose narrative fiction is well known. Less well known is his work as the editor of *Taubat un Nasuh* for English readers—a somewhat abridged, but still very good edition. (A still better, revised edition of the first five chapters appeared later). This too I still recommend to my students, though to the present generation, no longer versed in Latin grammar as my generation was, some of the terminology he uses present difficulties. G.E. Ward's Romanised edition and English translation of *Mir'āt ul Arus*

T. Grahame Bailey, more strongly influenced perhaps by British patriotic feeling than by a scrupulous regard for the true facts of the situation, have tended to overemphasise this impact. Muhammad Sadiq on the other hand goes too far in the other direction. It is quite clear that the impact of (for example) *Bagh o Bahar* was neither so immediate nor so forceful as one would be led to believe by Grahame Bailey's account But it is equally clear that Rajab Ali Beg Sarur would not have singled it out for attack in the way he did had it been a completely obscure and uninfluential work. A proper, detailed study of the growth of the influence of the Fort William writers could produce interesting results.

Thirdly, I should speak of the contribution made by British scholars who produced editions and translations of the Fort William works. These are quite numerous, and are of a standard which should command respect even today. For example, I still recommend to my students the edition and translation of *Bagh o Bahar* which bear the name of Duncan Forbes, though my friend Mr. S. M. Shah tells me that Forbes has for the most part merely appropriated without acknowledgement the work of a predecessor whose name I cannot at present recollect. I may remark in passing here that the academic morality of British Indian scholars in that period seems to have been very little higher than the commercial morality of their contemporaries in the field of trade. The virulence with which they assailed each other in print--from Gilchrist's time onwards--is reminiscent of the tone of Sauda's satires.

After the end of the Fort William period the British did not again contribute anything very remarkable until about the sixties and seventies of the nineteenth century. Here again, the political climate was the decisive factor. In the great uprising of 1857-9, as one might expect, mutual contempt, or, if not mutual contempt, mutual hostility and distaste between the British and the Urdu-speaking section of their subjects prevailed, and it was not until men like Hunter on the British side and the much greater figure of Sir Sayyid Ahmad Khan on the Muslim side pioneered a policy of, in the then prevailing conditions, reconciliation, and of acceptance of, and participation in, British policies, that the kind of rapport could again arise in which British interest in Urdu could again develop. It is a strange fact that the outstanding British achievement

the ironies of history that measures so motivated should have produced results of such lasting importance. John Gilchrist and his contemporaries quickly saw the key importance of Urdu as a medium of communication between the British administrators and their subjects, and they set about taking the measures which would make it possible for British officials to acquire an adequate command of the language. What has been traditionally called the Fort William school of Urdu prose was the direct outcome of this, and to most of you here the Fort William writers and their works are too well known to make either necessary or desirable any attempt on my part to give a substantial account of them. I should, however, like to stress one or two points about them. The first is that both the writers and their British employers who commissioned their works were primarily concerned not with literature but with language. The British concern with the content of what was written was, it seems, a purely pedagogical one, a concern, in other words, that the book should tell an interesting story because a student learns more easily from an interesting story than he does from any other kind of writing. The writers too know that it was simple unadorned *language* that their employers were interested in, and since they knew that they wanted it in the form of an interesting story, they turned to the only kind of story that, in their understanding, had any pretensions to rank as literature, and wrote tales like Mir Amman's *Bagh o Bahar*, the five tales of King Azad Bakht and of the four darweshes. Back in Britain, such tales had long ago been ousted from the main stream of prose fiction, and writers like Defoe, Swift, Richardson, Fielding, Smollett and Sterne, to name only the most prominent of the eighteenth century novelists and proto-novelists, had developed modern realism in prose fiction to a very high standard. None of this was reflected, or indeed could have been reflected, in the Urdu literature of the early nineteenth century. The Fort William writers, as far as we know, did not even know of this development, nor, even if they had known of it, could their literary canons have comprehended it. It is not until seventy to eighty years later that this kind of writing even begins in Urdu literature, reaching a still unsurpassed height of achievement in Rusva's *Umrao Jan Ada*, first published in 1899.

Secondly, the impact which these writers made upon the history of Urdu literature is still a matter of controversy. British writers like

deliberate ignorance of the country and its culture on the part of my fellow-Britishers. Times have changed now, and the climate of cultural relations has changed with them; and in what I shall have to say I want to dwell less on the past than on the present and the future. But I must begin with the past, and for a proper understanding of the past it is essential to bear in mind the considerations I have just outlined.

British interest in Urdu began in the late eighteenth century, and was of two quite different kinds. The more admirable, but, as we shall see, less productive kind, was that of the many Englishmen who virtually abandoned their own culture for that of the country where they lived--men who composed verse in Persian and Urdu, took part in mushairas, and received their due of praise from poets of Urdu mother tongue. Men of this kind continued to appear throughout the last fifty years of Mughal Delhi, where at least the surface relationship between the Mughal Court and its *de facto* British overlords was one of mutual respect. This is clear from the testimony of men like Sleeman, and from the friendship between Ghalib and the controversial, unorthodox figure of William Fraser, whose murder brought Ghalib, as he wrote to Nasikh, a grief more keen than any he had felt since his father's death in his own childhood. That there were not a few of such bi-cultural, or even culturally assimilated men, is already evident from references in the letters of Ghalib-in the famous letter in which he laments the death of his friends in the great uprising of 1857, and speaks of Englishmen who were his friends and *shagirds*, and the letters in which he writes, for example, of Alexander Heatherley and John Jacob. And the more recent researches of Ram Babu Saxena have shown how numerous are those of whom some written record survives. At the same time it must be admitted that the contribution of these English poets of Urdu to Urdu studies is really nil. It was not after all their object to bring about a meeting of the two cultures, but to absorb, or be absorbed into one of them. And not surprisingly, none made, or could be expected to have made, so great a contribution to the culture of his adoption as to be remembered among the major, or even among the minor, writers.

The other kind of British interest in Urdu was that which developed from a recognition of the necessities of British Imperial rule, and is one of

The British Contribution to Urdu Studies

RALPH RUSSELL
School of Oriental and African Studies
University of London (U.K.)

When one considers that Britain ruled vast areas of this subcontinent and, in the end, nearly the whole of it—for the best part of two hundred years, it is not surprising that the British contribution to the study of its languages, its culture, its history and other aspects of its life has been considerable ; and the British study of Urdu forms a part of this wider contribution. Indeed what is at first sight *more* surprising is that the British contribution has not been much *more* considerable than it has. Only at first sight, however—because when one reflects on the position one realises that there is nothing very surprising about it. When the relationship between two peoples is not that of independence and equality, but of ruler and ruled, sympathetic interest in the culture of the subject people never flourishes in the ruling nation, and the fact that this *was* the relationship between your people and mine has meant that the British contribution to Urdu studies has been relatively limited. Some of you, remembering the achievement of John Gilchrist and his successors both at Fort William and at Haileybury College in England, and the later perhaps even greater achievements of the British lexicographers of Urdu like Fallon and Platts, may feel some surprise at this judgement. But I think it a fair one nevertheless. Consider for a moment some of the elementary facts of the case. How many hundreds of thousands of British people must have lived and worked in the subcontinent during the nearly two centuries of British rule ? And of all those hundreds of thousands what proportion ever achieved any really deep sympathy with—let alone any substantial knowledge of—the culture of the peoples over whom they ruled, despite the fact that, according to what I was solemnly assured when I was a British schoolboy, it was in the interests of these same peoples that British rule was maintained. When I first set foot here in 1942, to stay continuously for nearly three and a half years, one of the things that struck me most forcibly was the almost universal, quite



پروفیسر رالف رسل (لندن)

FIFTH SESSION

☆

Urdu Language, Literature, History and Culture of the Muslims of Indo-Pakistan Sub-continent

☆

Ralph Russell
Professor J.M.S. Boljon
Professor Mara T. Stepanyants
Dr. Riaz ul Islam
Dr. Carlo Coppola

of finding a solution when the Persian works of the seventeenth and eighteenth century Turkish poets are carefully studied.

Before I conclude my words I would like to make a brief remark on another point. Though *Sebk-i Hindî* seems to have lost its fire and importance in Indo-Pakistani world and in the lands which were once under the Ottoman ruli since the end of the eighteenth century, now and then some of its characteristics can be seen to find a new life in the works of some famous poets. Mirza Galib in the Indo-Pakistani world and Yahya Kemal Beyatli (1884-1958) in Turkey have written poems which bear the signs of this revival. When you consider *Sebk-i Hindî* as a style based on vastness of imagination, providing a link between unrelated worlds with its powerful associations and helping man to free himself from the yoke of technology and also in finding a means of living according to his own heart, it is only natural that it should go on living by changing and adapting itself to the age.

a complete divan. But in the second part of this paper we shall only attempt to deal with the most famous poets who produced Persian works of considerable interest starting with Fuzulî.

Fuzulî wrote almost as many works in Persian as he did in Turkish (seven) in Turkish and six in Persian. Here we shall only mention their titles: *Divan*, *Haft-Djam* (also called *Sâkînâme*), *Enisü'l-kalb*, *Mu'ammeyat*, and in prose *Rind u Zâhid* and *Husn u Ashk* (also called *Sihhat ve Maraz*). That he should have written these works in Persian is a proof of his mastery and fluency in that language. On the other hand, the fact that the historian Mustapha Ali should include fifty-three Persian gazels written in imitation of Hafiz in his work called Medjma' ul l-Bahreyn and should have the temerity of considering himself the Hafiz Shirâzî of his age is an interesting phenomenon. In the seventeenth century which followed other Turkish poets and particularly Nef'î among them could use Persian well enough to produce a divan in that language. This was proof of the self-confidence and the mastery of the *Sebk-i Hindî* of the Turkish poets of that period. Nâbî who belonged to the second half of the century also had a *Dîvanche-i Gazaliyat-i Fârisî* and was another example of the Turkish poets' mastery of Persian and *Sebk-i Hindi*.

The eighteenth century classical Turkish poets have also written in Persian. When we examine the divans of that period, in many of them we come across poems and especially gazels written in Persian. Nedim and Galib, the two great masters who mark the beginning and the end of the century have a few Persian poems in their divans included in the sections called *Fârisî esh'âr* or *Be-zebân-i Fârisî*. It should not be forgotten that each of these poets were famous in different verse form. For instance, Nef'î excelled in *kasida* and *satire*, Nâilî in lyrical *gazel*, Nabi in didactic and lyrical *gazel* as well in *masnavi*, Nedim in erotic *gazel* and *sharki* and Galib in passionate and symbolic *gazel* and *masnavi* forms. One can observe the traces of *Sebk-i Hindî* taking a different colour in according to the social and psychological make-up of each poet as well as according to the historical setting. Another factor which should be taken into consideration in this respect is the nuances between the masters of *Sebk-i Hindî* who influenced the Turkish poets as well as the subtle differences of style used by these poets. This problem will no doubt have greater chance

Sözlerim oldu hased-kerde-i yârân-i Irâk
Belki resk-i sühan-i Muhtasham-i Kashani

(My words have caused the envy of the words of the friends in Irak and perhaps those of Muhtasham-i Kashani.)

Urfi-i Rûm Enverî-i asr u Hâkanî-i ahd
Feyzî i nm cis-dem-i vahy-iktisâb-i rûzagâr

(I am the Urfî of Rûm, the Enveri of the century, the Hakanî of the age and Feyzî of this world who was blessed with the divine inspiration).

The real development of *Sebk-i Hindî* in the Ottoman Turkish Literature, however, can be observed in the works of Mustapha Nâilî (d. 1666), Yusuf Nâbi (1642-1712), Ahmed Nedim (d. 1730) and especially Sheyh Galib (1757-1799) in whose hands it reaches its maturity. It should also be pointed out that not all the representatives of *Sebk-i Handî* had the same influence on the Turkish poets. The most widely read and favoured masters were Sâib, Shevket and Bîdil. In Nâbî's poetry it is Sâib's influence, in Galib's both Shevket's and Bîdil's influences play an important part. These great masters, however, have never been mere imitators, they are more than anything else creative adapters inspired by certain qualities of the former poets because they have shared the same sensations and experiences with them. For the great masters of the seventeenth and eighteenth century Turkish Poetry have never been uninspired people who repeated what they had read and reproduced what they had admired. On the contrary, the fact that they should write in this style was determined by their own environment, their own tradition and their own inner world, finds its best evidence in their works.

In our opinion, it was the realization of their self-confidence in their mastery of the Persian language, i.e. in their belief that they could use it as well as the Persian poets, that initiated the Turkish poets to compose in Persian—a process which began in mid-sixteenth century and reached its maturity in the seventeenth and eighteenth centuries. This tendency may be said to have its beginning in the years of Shah Ismail, the founder of the Safevîds State who ruled in 1520-1524 and who wrote Turkish poems under the pen-name of Hatâ'î and Yavuz Sultan Selim who ruled in 1512-1520 and whose Persian poems were successful enough to make

Muhtasham-i Kashanî (d. 1588) and Urfî-i Shirazi (d. 1591) are among the founders of this new mode of poetry. But among its real representatives and most successful masters we must name the following: Feyzî-i Hindî (1547-1595), Talib-i Amulî (d. 1626), Abu Tâlib Kelîm (d. 1651), Sâib-i Tebrîzî (d. 1671), Selim-i Tehranî (d. 1647), Ganî-i Kashmiri (d. 1688), Shevket-i Bukhârî (d. 1699). To these we could add the names of Zohûrî and Abdulkadir Bîdil (1644-1721) who was considered the greatest genius of the Indian style as well as that of Mirzâ Esedullah Khan Galib (1797-1869) who with his best poems proved that this literary style went on living in the nineteenth century.

The well-known masters of the Classical Persian Poetry had a considerable influence on the Ottoman Turkish Literature from the fourteenth century onwards. Foremost among them were such poets as Firdevsî (d. 1020), Senâî (d. 1150), Attâr (d. 1192), Nizâmî (d. 1206) and especially Sadî (d. 1294), Hafiz (d. 1390), and Djâmi (1414-1492). We must also note that because he produced his work in Konya and also because he was the leader of an important religious order the influence of Maulana (1207-1273) which manifested itself already in his lifetime went on being a great force until our own period. From the end of the Anatolian Seljukid period until the beginning of the seventeenth century when *Sebk-i Hindî* first made its influence felt, i.e. from Ashik Pasha (1222-1272) and Gulshehri (d. after 1317) until the age of Fuzulî (d 1556) and Âli (1541-1600) all the well-known writers adopted the techniques and esthetics of classical Persian poetry and produced works using many of its conventions, without being losing the originality and characteristics of their own creative genius. As from the beginning of the seventeenth century the Turkish poets used this new Persian style known as *Sebk-i Hindî* without failing to express their self-confidence, their national feelings and their local characteristics.

Omer Nef'î (d. 1635) in whose poems we observe the first signs of *Sebk-i Hindî* as well as some of the characteristics of the classical Persian poets, often compares himself with the great masters of the Persian language and literature and expresses his confidence in his art as in the following couplets :

Iran-zemine tuhfemiz olsun bu nev gazel

İrgürsün İsfahan'a Sitanbul diyarini

Irgursun Isfahan'a Sitanbul D diyarini

(Let this new gazel be a gift to the land of Iran and thus join Istanbul to Isfahan.) Nedim

If we point out that here the word "zemin" could also mean "style", we could perhaps establish a closer relation between the two verses. In any case, when we think of the many instances of the achievements of Ottomen poetry, we could easily claim that as from the beginning of the seventeenth century Ottoman poetry was not inferior to contemporary Persian poetry and that the Ottoman poets considered themselves as worthy and sometimes even superior to their Persian colleagues.

The masters of *Sebk-i Hindî* chose to live in the territories of the Turco-Indian Empire either for reasons of acquiring material wealth or with the aim of breaking through the limited confines of the Safevids world which was hardly suitable for poets who wanted to exercise their imagination in a more liberal atmosphere and to write in a style that made use of more sophisticated and more unsual conceits. Under the social and political circumstances, they were justified in believing that the colourful images in the Indian style could be given shape only by poets who lived in India as illustrated in the above quotation from Selim. *Sebk-i Hindî*, which could be considered a literary school using elaborate imagery, original and exagerrated associations, rare conceits and riddles, took also special care in reflecting the natural and social phenomena in a characteristic manner. The representatives of this style in the Ottoman Empire associated the different natural phenomena which they perceived consciously or unconsciously and reflected them as if they were giving comparative evidence on them.

The influence and power of *Sebk-i Hindî* on the Ottoman Literature makes itself felt at the beginning of the seventeenth century and goes on to exert this power through the eighteenth century. It is well known that in the Persian Literature *Sebk-i Hindî* had quite a number of poets who lay its foundations starting with Baba Figanî-i Shirazi (d. 1519) who was chronologically its first important forerunner. Such famous poet as

favour more to those poets who chose to praise the *Tewelve Imams* in their "*kasidas*" and "*terkibs*" while remaining within the limits and conventions of their sect. Under such circumstances, poets who were not inclined to follow similar rules in their creative efforts, may not have been favoured by the palace and had to face economic difficulties. The idea of material reward, then, must have become rather an attractive goal for some poets of the period who are known as the masters of *Sebk-i Hindi* in literary history to immigrate to the lands of the Turco-Indian Emperors who were rich and had great interest in the arts and especially in literature. The fact that some fifty poets should have immigrated from Iran to the Indo-Pakistani Peninsula during Ekber' Shah's time (1556-1605) is sufficient proof of our point. This flow of poets from Iran to Turco-Indian territories went on until Shah Djhan's time (1628-1658) and thus *Sebk-i Hindi* which did not find the favour and interest it deserved in the country of its origin, managed to attain its real fame and possibilities of development in its country of adoption. On the other hand, leaving aside a few exceptional cases, we see no such immigration to the Ottoman Empire because of the difference in religious belief and as also because of the fact that the Turkish rulers and artists transcended their great admiration for the Persian culture and felt no urge to imitate it during the fourteenth and fifteenth centuries and were more inclined to discover the spirit of national and local art and literature. Besides, there were quite a number of Turkish poets and scholars who could read the works of Persian poets in their originals and for this reason there may not have been a need for such an immigration of poets from Iran. But the works of the masters of *Sebk-i Hindi* were noticed and studied by the most eminent practitioners of Classical Turkish Poetry who had attained the same level of artistry and who felt the same inclinations. Thus the refinement and other characteristics of the same style found its way to the Turkish divans.

To illustrate our point we could compare a couplet of Selim-i Tehrani (d. 1647) with that of Nedim's (1689?-1730):

Nist der Iran-zemin saman-i tahsil-i Kemal
Ta neyamed suy-i Hindistan hena rengin nesud

(There is no more possibility of achieving perfection in Iran; hena will not show its brilliant colour unless it comes to India.) Selim.

Sebk-i Hindi In The Turkish Literature and Turkish Poets who have written in Persian

PROF. DR. ABDÜLKADIR KARAHAN

(Professor of Classical Turkish Literature, University of Istanbul)

Though *Sebk-i Hindi* (the Indian style) made its first appearance and had its early youth on the plains of Iran, a land which could boast of its poetically and culturally rich heritage, it has found a more suitable climate for its development on the Indo-Pakistani Peninsula, and particularly in Lahore, New Delhi and Kashmir; it has also made its influence felt on the vast Ottoman territories and made a considerable impact in Istanbul. So far this subject has been dealt with in its different aspects, but it can be argued that as a literary school of exceptional imaginative power and refined mode of expression it deserves further attention and more meticulous study.

This graceful and intricate style, also known as Sebk-i Isfahani in Iran, and the origin of which goes as far back as the Timurids, had its first flowering during the reign of the Safavids, but soon spread over to other countries enjoying the esteem it deserved in the Turco-Indian Empire and the Ottoman centers of culture producing the fruits of its maturity in those countries.

The reason why this literature of intricately woven and extremely obscure conceits, this style of wit and symbols which gives so much satisfaction once the intellectually taxing passion of the artist for riddles is overcome, should leave its country of origin and spread to the other two great Islamic countries can only be explained by the socio-economic circumstances of the period.

The most important of these factors is that the Safavids rulers belonged to the Shiite sect and therefore paid special attention in showing their



پروفیسر ڈاکٹر عبدالقادر کراحان (ترکی)

FOURTH SESSION

☆

PERSIAN LANGUAGE, LITERATURE
AND
IRANIAN STUDIES

☆

Professor Abdul Kadir Karahan

According to Ibn-al-Muḳaffa', the caliph is responsible for the administration of the state. He says that the guidance to correct conduct and beliefs is more important for a people than the provision of food. The caliphs should rectify their distinguished people and those distinguished people should correct the common people who are uneducated, persons of poor knowledge and opinion.

ZARINA AKHTER KARDAR

knowledge and military service Their only importance was that they served as secretaries or chamberlains and used their offices for acquiring power. This type of entourage caused corruption in the state. Ibn-al-Muḳaffa' explaine to the caliph in very strong terms that while choosing a companion he should consider only the qualifications of each person and his usefulness to the community.

There are three types of men who recommended themselves for the companionship of the caliph.

1. The deserving officers from the military service should be promoted to the companionship of the caliphate.

2. Learned Fuqahā, whose knowledge would be beneficial to the community deserve the honour of caliph's company.

3. The prominent men of noble birth also suit for the companionship of the caliph. Because they do not create disturbance themselves.

According to Ibn-al-Muḳaffa', these sincere companions should enjoy full authority, and the bureaucrats (scribes and chamberlains) should have neither the executive power, nor the honour of the caliph's company conferred on them. These sincere companions would be beneficial to the community and to the caliph too.

Ibn-al-Muḳaffa' discusses the most important matter of the collection of the land-tax, the main source of revenue of the state. He denounces the cruelty and high handedness of the tax-collectors, which have the effect that the landowners, who led their fields lie fallow, are rewarded for their laziness, while the hard working farmers are penalized for their zeal. He suggests that the sums to be paid in respect of each particular stretch of land be fixed once for all. Everybody should know exactly what is due from him otherwise nobody would put much work into his farms knowing that the tax-collector would rob him of the fruit of his labour. According to him, this method is more conducive to the prosperity of the state and the subject, than the yearly fluctuating muqāsama. He seems to have anticipated the latest developments of his age.

Ibn-al-Mukaffa' suggests to the caliph to organize an efficient intelligence service to keep him informed about all that was going on among his troops as well as in the whole country. Moreover he says that the beliefs of the army certainly need supervision through this means.

Codification of Muslim Law.

Ibn-al-Mukaffa' entreats the caliph that he should examine into the diverging doctrines of the various schools of Muslim Law in the great cities and that he should look into the actual administration of justice. He finally advises the caliph to enact his own decisions based on the *Qur'ān* of Allāh and undertake a codification of law in the interest of uniformity. This code shall continue to be revised by the succeeding caliphs.

In his proposal, he expects the caliph to become the ultimate authority in the codification of Muslim Law and Creed (belief). His suggestion reflects the expectations of the generation which witnessed the sweeping victory of the Abbasids and believed that the Caliphs from the Prophet's own family would enjoy an authority almost comparable to that of the founder of Islam itself, but his idea was never materialized. And this subordination of the "Sharia" to the political authority, advocated by Ibn-al-Mukaffa' was not to be realized and the development of Muslim Law followed the opposite path of ijmā', in theory shielded from any intervention by the caliph.

Courtiers of the Caliph.

The unsatisfactory position of the Iraqian with regard to employment in the service of the Abbasid Government gives Ibn al-Mukaffa' the opportunity to discuss the main topic of his book, *Ṣaḥāba*, the courtiers of the caliph. He lays a particular emphasis on this task : Friendship with the best men of the state appears to him as the highest virtue of the caliph.

Before the caliphate of Al-Manṣūr, the entourage of the caliph was composed of underserving persons who had succeeded in obtaining access to the caliph and precedence over the old Muslim aristocracy (Muhājirūn and anṣār), the scions of the caliph's own family and the noble people of Arab houses. Moreover, substantial grants and favours were showered on them without having qualifications of literary refinement, religious

their requirements and training, it is necessary that they should be given physical and mental training as they suffer from scepticism. The caliph should issue a letter of peace and security for their guidance, giving all details as to what is essential for them and what is to be avoided. This document as Ibn-al-Mukaffa' thinks will correct their views by the grace of Allāh.

According to him, most of the army commanders firmly believe that if the caliph orders the people to turn their backs towards the a Qibla while saying their prayers, it ought to be done. In order to overcome this danger Ibn-al-Mukaffa' issues a short but complete catechism supported by proofs in respect of obedience to the rulers. According to him, the caliph has no right to interfere with the major duties of religion, and a wrongful order coming from him must not be obeyed. But he possesses sovereignty and has the privilege of giving binding orders according to his own judgement on military and civil administration and generally on all other matters for which there is no precedence basing himself on the Holy *Qur'ān* and the Sunna. The Caliph deserves this type of obedience as long as he obeys the orders of Allāh and follow the practice of the prophet Mohammad (peace be upon him).

Ibn-al-Mukaffa' strongly advises the caliph that the army officers should not be appointed to collect the land-tax which is likely to affect their moral adversely and it is incompatible with the dignity of the military profession. He further thinks that this would mark the beginnings of Muslim feudelism.

According to him, the unknown deserving soldiers who are actually superior to some of their commanders, should be searched out and favoured. They will become power for the state.

Ibn-al-Mukaffa' seems to have foreseen some very important developments. He suggests to the caliph to discipline his army through a systematic training in the teachings of the Holy *Qur'ān*, in making them well-acquainted with the Sunna, in inculcating in them sincerity and piety, and in keeping them apart from persons having low desires, so that they should develop in them the characteristics of moderateness, submissiveness, and abstention from luxurious habits. In this way, the army will gain the highest standard of moral.

In the name of Allah, The Beneficient, The Merciful.

An Abstract Ibn-al-Mukaffa''s Treatise on the Courtiers

By

ZARINA AKHTER KARDAR

Ibn-al-Mukaffa''s Treatise on the courtiers is a document of unique value. Every sentence in this remarkable treatise bears the marks of strict authenticity and utmost actuality. This is a topical pamphlet of the highest importance. In the treatise, Ibn-al-Mukaffa' submits to the Caliph of his time a series of reflections on certain political, religious and social problems arising from his time and millieu examined by him with a breadth and originality of mind. Only a strong and genuine interest in political matters could have induced the experienced courtier to put himself, in a manner of speaking in the place of the ruler of the empire, despite his position as a member of a subject race. To the historians, of course, this attitude only enhances the value of the *Kitāb al Ṣaḥāba.*

The introduction of this book seems to indicate clearly that Ibn-al-Mukaffa' wrote the book on his own accord. He addresses the caliph whose name is not expressly mentioned but as Al-Saffāḥ is referred to as dead, the caliph addressed must be Al-Manṣūr and therefore, this treatise must have been written between A.H. 136/754 the year of Al-Manṣūr's accession to the throne, and A.H. 142/760 the year of Ibn-al-Mukaffa''s death. Joseph Schacht estimates that this treatise can be dated about A.H. 140. However this treatise was presented to the caliph in a spirit of profound loyalty.

However we turn to the analysis of this remarkable pamphlet. The first and main subject dealt with by Ibn-al-Mukaffa' is the army which maintains the Muslim Empire. He describes with certainty that the Khurasanian army of the Abbasids is unique in the history of Islam due to their obedience, innocence, piety and sense of discipline. As regards

Another poet, al-A'mā, came in for sharp criticism at the hands of al-Shimshāṭī, maybe because of the former's undisguised pro-Umayyad and anti-Shī'ite proclivities. Al-Shimshāṭī was also particularly interested in Dīk al-Jinn, whose *Dīwān* he compiled and edited.

Time has spared to us s a unique copy of al-Shimshāṭī's *Kitāb al-anwār wa maḥāsin al-ash'ār* preserved in the library of Aḥmad III in Turkey. It consists of 205 folios, is dated Muḥarram, 639 A.H. and belonged to the library of al-Musta'ṣim bi'llāh. The title page also bears the handwriting of Khalīl b. Aibak al-Ṣafadī, who possessed it at one time. On the whole it is a good copy, water stained only at a few places. The copyist is attentive to vocalisation and does not make many mistakes.

The book has a great value inasmuch as it contains new material which is not found in the sources hitherto available to us. It has a chapter on Ayyām al-'Arab in which 30 Days, only those which are comparatively less known, are described in a detailed and coherent manner full of relevant poetical citations. Al-Shimshāṭī relies mainly on the narrative of Abū 'Ubaida, which is quoted only in fragments elsewhere. The book contains a wealth of additional verses, hitherto unknown, of modern poets such as Dīk al-Jinn, al-Ḥusain b. al-Ḍaḥḥāk, Ibn Ṭabāṭabā, al-Ṣanūbarī, and al-Nāmī. This is no surprise in view of the fact that al-Shimshāṭī relies on al-Ṣūlī, who compiled the diwāns of most of the modern poets. Also in the *Kitāb al-anwār* we get a better acquaintance with al-Maryamī and Abū Ṭālib al-Ḥusain b. 'Alī al-Anṭākī among the contemporary poets. The book is also rich in additional verses of old poets such as al-Nābigha.

I have recently completed a scholarly edition of the *Kitāb al-anwār* which is already in the press.

al-udabā' of Yāqūt (quoted from al-Shimshāṭī's own *al-Tanazzuh wa 'l-Ibtihāj*) and the *Ḥamāsa* of Ibn al-Shajarī.

Whatever the stature of al-Shishmāṭī as a poet, his preeminence as a scholar and author is in no doubt. In the *Kitāb al-Anwār* he derives directly from such stalwarts as Ibn Duraid (d. 321 A.H.). al-Ṣūlī (d. 335 A. H.) Abu 'l-Ḥasan al-Akhfash (d. 315 A.H.), al-Sharīf al-Murtaḍā (335-436) and Jaḥẓa (224-326 A.H.). This fact of his contacts with the masters who died in the first quarter of the fourth century A.H. coupled with our knowledge that he was alive in 377 and entered Wāsiṭ in 394, confirms greater part of the fourth century as the period of his bloom. We further know that he enjoyed the esteem of Saif al-Dawla, whom he addressed ornate epistles and served by making a collection of the best euologies recited at the court of the Amīr. He shows a strong sense of rivalry towards the Khālidī brothers, whose *al-Ashbāh wa 'l-naẓā'ir* was edited by me a few years ago. The Khālidī brothers learnt from the same tutors and at the same time as al-Shimshāṭī, i.e., Ibn Duraid, al-Ṣūlī and Jaḥẓa in the early part of the fourth century. Later they competed with al-Shimshāṭī in the same field: both the Khālidī brothers and al-Shimshāṭī have to their credit a book each on the history of al-Mawṣil. As the Khālidī brothers enjoyed special favour with Saif al-Dawla, al-Shimshāṭī would naturally make an effort to run them down.

Al-Shimshāṭī was a prolofic and versatile writer. No less than 37 of his works are listed. The most important of them are: *al-Tanazzuh wa 'l-Ibtihāj* quoted by Yāqūt and al-Suyūṭī in his *al-Ashbāh wa 'l-naẓā'ir*; *Kitāb al-adyira wa 'l-a'mār* comparable to *al-Diyārāt* of al-Shābushtī; a commentary on the *Ḥamāsa* of Abū Tammām, questioning the comments of the first commentator, Abū Riyāsh. Other works of al-Shshimāṭī fall into the categories of al-Adab, al-Naḥw, al-Lugha and the Shī'ite creed. Some of the titles provide us with a clue to his stand vis-a-vis the merits of some rival poets. He holds Abū Nuwās in high esteem and quotes a large number of his verses on hunting themes. He prefers al-Nāmī to Abū Naḍla Muhalhil b. Yamūt. Maybe he neglected Abū Naḍla because the latter slighted Abū Nuwās while al-Shimshāṭī extolled him.

Al-Shimshati and his *Kitab al-anwar*

By

DR. S. M. YUSUF

Abu 'l-Ḥasan 'Alī b. Muḥammad b. al-Muṭahhar al-'Adawī al-Shimshāṭī is a scholar of the fourth century A. H., who deserves better recognition than has been accorded to him so far. Both Yāqūt and Ibn al-Nadīm have acknowledged his worth in their short notices of him. The author of the *Fihrist* was not only a contemporary of his but also knew him personally. The greatest tribute to his eminence, however, is paid in the *Rijāl* of al-Najāshī. On the testimony of Abu 'l-Khair Salāma b. Dakkā al-Mawṣilī, the authority relied upon by al-Najāshī, al-Shimshāṭī was reputed for his excellence, erudition and deep insight into the Shī'a creed and theology. According to Yāqūt, he was an extremist Rāfiḍī and narrated in his books strange things about his coreligionists. Actually, Shī'ism is writ large at many places in the *Kitāb al-anwār*, which concerns us in this paper, and in the titles of his other works which are known to us only by their titles. Ibn al-Nadīm makes a general reference to some unworthy traits in his personal character. He says: I have known him for a long time. It is said that he corrected his manners and improved his character with the advancement of his age. He is alive at this time, i.e., 377 A.H., the year of the compilation of the *Fihrist*.

Shimshāṭ, to which our author is ascribed, is a district of Armenia, to be contradistinguished from Sumaisāṭ, a district of al-Shām. Naturally, al-Shimshāṭī spent his early life in al-Maṣwil. He became tutor and companion to Abu-Taghlib (Faḍlallah known as "al-Ghaḍanfar") and his brother, the sons of Nāṣir al-Dawla, the governor of al-Mawṣil, who, by the way, was a brother of the famous Saif al-Dawla.

Ibn al-Najjār describes al-Shimshāṭī as a poet who eulogised the rulers, adding that from al-Mawṣil he shifted to Baghdād and entered Wāsiṭ in the year 394 A.H. As for his poetry, we have a few pieces in the *Kitāb al-anwār* and, beside them, some verses in *al-Yatīma*, the *Mu'jam*

7. Ibn Nadīm, *Kitāb al-fihrist*, Cairo n.d., 151.

8. *Al-Bayān wa 'l-tabyīn*, *op. cit.*, II. 303.

9. C. Brockelmann. article on Madā'inī in *Encyclopaedia of Islam*, 1st Ed.

10. G. Van Beek, 'Pre-Islamic South Arabian shipping in the Indian Ocean—A Surrejoinder', *Journal of the Oriental Society of America*, Vol. 80, No. 2 (1960), p. 137.

11. 'The Pictorial Aspects of Ancient Arabian Poetry', *Journal of the Royal Asiatic Society*, (1912), p. 136.

12. An attempt has been made by this writer to collect and interpret these pieces of Arabian literature in his hitherto unpublished Marine Anthology of Classical Arabic Prose & Poetry.

13. *Lisān al-'Arab*., s.v. دسر

14. W. Ahlwardt, *Sammlungen alter Arabischer Dichter*, Band II, Berlin 1930, 28 (XV : 69-70). For medieval planking holdfasts (the Arabian '*ḍabba*'), see *The Mariner's Mirror*, Vol. 42, No. I, 1956, pp. 82-84.

15. Ibid., XV : 79.

16. *The New Dictionary of the Bible*, s. v. 'Nail'.

17. Ahlwardt, *op. cit.*, 34 (XVII : 18).

18. 'Abd Allāh Isma'īl al-Ṣāwī, *Sharḥ Dīwān al-Farazdaq*, Cairo 1936, 12.

19. Ibid., 252.

20. Ibid., 388.

21. Idid., 623.

22. Al-Ṣāwī, *Sharḥ Dīwān Jarīr*, Cairo 1352, 441-42.

23. Al-Bukhārī, *Kitāb al-ta'rīkh al-kabīr*, Haydarabad-Dakan 1363, Vol. II. Pt. 2, p. 35. Al-Sam'ānī, *Kitāb al-ansāb*, GMS XX, 1912, folio 439 v. ; Ibn al-Athīr, *Al-Lubāb fi tahdhīb al-ansāb*, Cairo 1369, II : 237.

24. Broomhall, Marshall, *Islam in China*, London (China Inland Mission) 1910, 27 ; Edwin 0. Reischauer & John K. Fairbank, *East Asia : The Great Tradition*, Boston (Houghton Mifflin) 1960, 217.

25. Ali Mohamed Fahmy, *Muslim Sea-Power in the Eastern Mediterranean*, London 1950, pp. 23-27, 82-83 & 111.

26. Al-Balādhurī, *Futūḥ al-buldān*, ed. de Goeje, Leiden (Brill) 1866, 436-37 ; *Chach Nāma*, ed. Daudpotah, Delhi 1939, 96.

27. *Al-Ta'rīkh al-Ya'qūbi*, Najaf 1358, II : 33. For Barthold's comments, *Turkestan Down to the Mongol Invasion*, GMS, 1958, 184-87.

28. Cf. Fatimi, 'First Muslim invasion of the N.W. Frontier of the Indo-Pakistan Sub-continent', *Journal of the Asiatic Society of Pakistan*, Vol. VIII, No. I, 1963, p. 44.

29. D. G. E. Hall, *History of South-East Asia*, London (MacMillan) 1955, pp. 53-55

30. Al-Idrīsī, *Waṣf al-Hind wa mā yujāwiruhā min al-bilād*, ed. S. Maqbul Ahmad, Aligarh (Muslim University) 1954, pp. 21-22. *Riḥla Ibn Jubayr*, GMS V, 1907, p. 70. *Muhadhdhab Riḥla Ibn Baṭṭūṭah*, Cairo 1934, II : 199.

The bigger, sturdier, nailed and caulked ships of the improved design needed an advanced 'industrial' base in the hinterland. They flourished in the Arabian Sea as long as the Tamil empires prospered in South India, and the Abbasids in the Middle East, and the Fatimids in Egypt. At the advent of the twelfth century things had completely changed in these countries. Crusades and Turkish and Mongol invasions brought their sharp decline which was inevitably reflected in the technology employed in shipbuilding. This explains the statements of the European travellers of the thirteenth and fourteenth centuries that we have already quoted in the first section of this paper. Their evidence is corroborated by the later Arab writers like al-Idrīsī writing in the middle of the twelfth, Ibn Jubayr in its last quarter, and Ibn Baṭṭūṭa of the fourteenth century.[30] The famous Ḥarīrī ship, too, is representative of this period of decline.

By the beginning of the fifteenth century political and social conditions on the littoral of the Arabian Sea had stabilised and there was a resurgence of economic and cultural prosperity. This led to the revival of seafaring in the area. With the emergence of Ibn Mājid, the Malemo Cana (*Mu-'allim kanaka*=Master Astronomer Pilot) of Vasco da Gama, the navigational science of the Arabian Sea reached its climax only to meet its anticlimax at the hands of the Portugese.

FOOT-NOTES

1. *Al-Bayān wa 'l-tabyīn*, ed. 'Abd al-Salām Muḥammad Hārūn, Cairo 1948, II. 303, Also, *Kitāb al-ḥayawān*, ed. 'Abd al-Salām Muḥammad Hārūn, Cairo 1938, I. 82, where the epithet *al-Musaṭṭaḥa* (flat-bottomed) is added to explain its being keel-less.

2. *Al-A'laq al-nafīsa*, ed. M. J. de Goeje, *B.G.A. VII*, 1892, 195 f.

3. H. Yule, *The Book of Ser Marco Polo*, London (John Murray), 2nd ed., 1875, I. 111.

4. H. Yule, *Cathay and the Way Thither*, London (Hakluyt), 2nd ed. revised by Cordier, 1913-16, III. 67.

5. Ibid., II. 113.

6. Jordanus, *Mirabilia Descripta*, Eng. tr. H. Yule, London (Hakluyt, 1st Series, Vol. XXXI) 1863, 53.

the two leaders—Muḥammad b. Qāsim and Qutayba b. Muslim who was attacking China from the North—first set foot in that country, give us a clue to read his mind?[27] However, the career of both the generals was, as is well-known, cut short through internal rivalries and the whole question of their strategy now remains problematical.[28]

But the Indian Ocean was no longer the Ocean of Peace that it had been throughout the ancient times when it presented such a happy contrast to the politically troubled waters of the Mediterranean Sea. In the middle of the eighth century of the Christian era, the Abbasid Caliph sent troopships in order to help the T'ang Emperor in putting down his internal revolt, as we have already mentioned above. In 1025, the Chola emperor Rajendra invaded Sumatra and crippled the Srivijaya empire.[29]

On the other hand, al-Ḥajjāj's introduction of a much more improved technology had more sustained peaceful results as well. Spectacular rise of maritime trade, the blossoming forth of cultural and commercial relationship between the Abbasid and Fatimid west and the T'ang and Sung east, complete change in the orientation of China from the inland northwest to the coastal south and east and the rise of Chinese navigation—in all these momentous events the technological revolution brought by al-Ḥajjāj in the art of shipbuilding in the Indian Ocean had its significant share.

III

It does not mean that the sewn ships had disappeared from the watery horizons of the east. Far from it. The pliancy of these ships made them indispensable in the Red Sea and the coastal waters of the peninsular India as both are notorious for their coral reefs. For short and hopping voyages of carrier trade they were very well suited in the conditions of the medieval ages. They have also the advantage of the capability to ride ashore on the heavy surf of the kind one encounters on the coast of 'Umān, and can stand the shock of being landed on a sandy beach from a breaker. All these qualities of sewn ships have enabled them to survive in Arabian waters in spite of the great competition they have to face from the vastly superior ships of modern technology.

in his *Kitāb al-ta'rīkh al-kabīr*, and al-Sam'ānī, in his *Kitāb al-ansāb*, have listed three *qafṭānīs* among the transmitters of the *ḥadīth*-literature.[24]

Hordes of government correspondence, accounts, and commerical and private letters written on papyrus during the early mediaeval time have been unearthed in Egypt. The value of these papyri documents in furnishing the details of the social and economic set-up of those days cannot be overemphasized. The great use to which these could be put has been eminently demonstrated by Professor Goitein in his masterly work on the Mediterranean society. He is also working on his project to delineate the ramifications of the Eastern Trade on the same pattern. The results of his researches are very keenly awaited. In the meantime, Dr Fahmy's presentation of the researches that have already been made on the papyri related to the shipbuilding yards (*dār al-ṣanā'a* or arsenal) at the port of Qulzum (Clysma) after which the Red Sea is called Bahr Qulzum, amply show that during the period between 91/709 and 97/715 there was hectic activity at the arsenal and that iron of two kinds, unrefined and scrap, copper and caulking were much in demand there.[25]

II

The immediate motive of al-Ḥajjāj in these naval preparations was, of course, the removal of pirate-nests of the Sind coast. But the great amount of effort that he put into them seems to point to a much more ambitious target. The new design of ships that he introduced in the eastern waters was not only more sturdy, seaworthy and able to withstand the buffets of the southwestern monsoon,—being iron-fastened and caulked—but because of its being flat-bottomed was also capable of carrying much heavier load. In short, these ships were troop-carriers and they must be very efficient for this purpose as one of these ships is known to have carried the big missile-thrower (*manjanīq*), named 'Arūs, which was so heavy that it could be pulled only by as many as five hundred men. Special arrangements were also made for carrying vinegar apparently as a precaution against sea-sickness. Provision of ample stock of needles and thread was evidently made for mending the sails.[26] If we piece together all these details and put them in their right perspective, it becomes evident that the ambitious ruler of Iraq had far-reaching plans. Does al-Ya'qūbī's report that al-Ḥajjāj promised the governorship of al-Ṣin to whomever of

and most of all for the most laborious and skilful profession of seamanships, he heaps ridicule on his being a *mazūnī*, a contemptuous word for a seaman, which significantly also meant one hailing from 'Umān. In the course of these satirical descriptions he refers to ships "fastened by iron clamps" (*al safīn al-mudahhab*).[18] There is a reference to the evil smell of bilge (*naftīy*) mixed with that of bitumen (*qār*),[19] and the boat built of wood and bitumen is contemptuously compared with the noble breed of horses.[20] There is a significant piece of poetry in which Sulayman b. 'Abd al-Malik is eulogized and the death of the great tyrant, al-Ḥajjāj, is celebrated. In this *qaṣīda* he addresses those who had left for al-Hind and al-Ṣīn sailing on "planks (*alwāḥ*) fitted with sails (*jilāl*)", and proclaims the advent of Islam and justice", because "the scourage of Iraq" had died.[21] This is a significant contemporary evidence of the mass exodus of the 'Alids to India and the Far East because of the persecution that they suffered at the hands of al-Ḥajjāj.

Al-Frazdaq's rival, Jarīr, was not a sympathiser of the 'Alid cause. In a *qaṣīda* eulogising al-Ḥajjāj he waxes eloquent over the naval exploits of his patron. All these verses bear testimony to the revolution wrought by al-Ḥajjāj in the art of shipbuilding in the Arabian Sea. But the most significant, perhaps, are those verses in which a special kind of big ships, called *mirzāb*, are said to carry as many as eighty thousand men to their destination.[22] Because of the realistic diction of the classical Arabian poetry, of which Jarīr was an eminent exponent, we do not have much of a margin to leave for the poetic exaggeration. After a few decades, during the reign of the 'Abbasid Abū Ja'far al-Manṣūr, Arabian ships of the eastern seas did get an opportunity to show their great carrying capacity when at the request of the T'ang Emperor Sui Tsung the 'Abbasid Caliph successfully transported troops large enough to assisst the Chinese emperor in crushing down the revolt of An-lu Shan and in retaking both the eastern and the western capitals of the empire. And what is still more significant is the fact that these troops were in so large a number that in a fit of anger they for some time took hold of the port of Canton.[23]

The amount of iron used in these post-Ḥajjāj ships of the Arabian Sea must be large enough to introduce a new profession of dealers in the scrap iron of broken ships. They were called *qaflānī*. The Imām al-Bukhārī,

rapid land conquests of the early formative days of Islam and their consequent territorial (as apposed to maritime) orientation. Nevertheless, in the "Island" of the Arabs sea was never far off and the Arabic classical poetry that has come down to us has given us some exquisitely chiselled sculptures of the ships in the Arabian Sea and its two gulfs.[12] With the advent of the second century of Hijra (eighth century of the Christian era) one, all of a sudden, comes acrosss a number of references to big, sturdy ships "fastened by iron clamps" and "caulked by bitumen". This coincides with the time when al-Ḥajjāj was preparing for a great naval enterprise.

The first reference that we find to an iron-fastened and caulked ship is in the poetry of al-Nābigha al-Ja'dī, one of the great poets of the Jāhilī period who lived a very long life and died probably in 79/799. Describing Noah's Ark he sings that "she sailed with the utmost swiftness for its caulking, iron-fastening and being built of long and lofty beams of the walnut tree".[13]

But the greatest singer of sailing boats among the classical Arabian poets was 'Abd Allāh b. Ru'ba, known as al-'Ajjāj, who died about 90/708. In a number of his *rajaz* poems he compares the she-camel bearing the litter of his lady-love with the ship coming from "the lands of Mount Sinai (*bilād al-Ṭūr*), i.e., the Gulf of Aqaba, "caulked and fastened with iron-clamps (*al-ḍabbāt*) after her being caulked and having sails (*jilāl*) made of matting (*al-mashjūr*)".[14] This ship is further described as having a nailed Reel (*ju'ju' masmūr*).[15] The word *mismār* for iron nails is an old Semitic word; the Hebrew *masmēr* refers to nails of iron (1 Ch. XXX ii.3) or of gold (2 Ch. iii.9), driven into a wall (Ech. xii.11), or used to secure idols in their place (Is. xli.7 ; Je. x.4).[16] In another *qaṣīda* eulogising Bishr b. Marwān he describes his land journey to the court of Bishr and again compares his camel with a ship. In this description he emphasizes of her being caulked by bitumen (*tuṭla bi-'l-qār*).[17]

Al-Farazdaq (110/728), one of the three greatest poets of the Umayyad period, gives us a number of brilliant pictures of the maritime life of the period while lampooning Muhallab b.Abī Ṣufra, the great general of the Marwānids, who came from the seafaring tribe of al-Azd. Of course, following the bedouin tradition of contempt for all manual skill and labour

ments are made by two other European travellers to the east, of the thirteenth and fourteenth centuries, Friar Odoric[5] and Jordanus.[6] Now, in the light of the above-quoted Arab statements we must revise the sweeping generalizations made about the Portugese influences on the art of shipbuilding in the Indian Ocean.

Al-Jāḥiẓ and Ibn Rusta—both very careful, inquisitive, and authentic writers of the ninth century—seem to have borrowed their valuable information from a common source, most probably *Kitāb al-awā'il* ("The Book of Origins"), which is among the treatises left by al-Madā'inī (752-840) which are lost to us.[7] In fact, al-Jāḥiẓ in one place[8] quotes him by his *kunya*, Abu'l-Ḥasan. It is well-known that al-Madā'inī is our earliest, and the most reliable authority on the history of his period especially for the events that took place in the eastern dominions of the Umayyads.[9] The evidence before us is, therefore, unimpeachable. It is also supported by the contemporary Arabic poetry, the highly useful—but sadly neglected—literature of *'ilm al-rijāl wa'l-ansāb*, the science of the biographical researches related to the transmitters of the ḥadīth-Traditions, and the newly discovered papyri literature.

But for a stone monument resembling a boat with a rounded prow recently discovered by the first extensive archaeological excavations made in the Arabian peninsula,[10] we do not yet possess any visual representation of the early Arab ships. With the decline of the South Arabian civilization the Arabs seem to have lost the arts of sculpture and painting. For this they compensated by developing the poetic art. Charles Lyall, one of the great pioneers in the field of western study of Arabic poetry, wrote eloquently about its qualities which appeared to him "to represent that art which in other lands finds expression in painting, which follows similar methods, and which brings before us the scene with a strength and sudden vividness which can be matched in few other literatures".[11] Unfortunately, this art, as it has been bequeathed to us, appears to have been cultivated mostly by the nomadic, pastoral sections of the Arab society, the *badawīs*, those who rode the "ships of the desert". The seafarers among them, the *baḥ.ī* (mariner) and *'arakī* (fisher), were either no devotees of the Muses or their compositions were lost because of the fear of water the Arab writers seem to have developed due to the vast and

Hajjaj's Reforms in the Art of Shipbuilding in the Indian Ocean

By

PROFESSOR S. QUDRATULLAH FATIMI

Al-Jāḥiẓ (d. 868) writes that al-Ḥajjāj (661-714) was the first to float in the sea ships caulked with bitumen (*al-muqayyara*),[1] nailed (*al-musammara*), neither sewn (*ghayr al-mukharraza*) nor oiled (*al-madhūna*), and without keels (*ghayr dhawāt il-ja'āii*). Ibn Rusta (fl. 903) records this event, in exactly the same words, in the list of "origins" (*al-awā'il*) that he has appended to his geographical treatise, *al-A'lāq al-nafīsa*.[2]

It appears that this important statement of al-Jāḥiẓ and Ibn Rusta refers to the elaborate preparations that al-Ḥajjāj made for getting waters of the Arabian Sea and the Indian Ocean cleared of the menace of the Med pirates who had their bases on the coast of Sind-Markran. The conquest of Sind was certainly one of the most momentous steps that were taken by him in this connection. But to a student of the maritime history of the east the events so inconspicuously recorded by these early Arab writers seems to be no less epoch-making. The object of this paper is to examine this statement in some depth, especially in the perspective of the controversy on the structure of the ships of the Indian Ocean before the Portugese sailed into the eastern seas.

I

It is generally believed that the Portugese introduced, among other things, the art of iron-fastening and caulking to this area and before their advent all Arab ships of the eastern seas were sewn and uncaulked, rather, in the oft-quoted words of Marco Polo, "wretched affairs, and many of them get lost; for they have no iron-fastenings, and are only stitched together with twine made from the coir of the Indian nut",[3] or in the words of an other early European traveller, John of Montecorvino, "mightly frail and uncouth with no iron in them and no caulking".[4] Similar state-

of the messenger.

Solange du nicht "eingeweiht" (āšnā) bist, vernimmst du kein Symbol aus dem Schleier ;
Das Ohr des Fremden (nā nahram) ist kein Ort fur die Botscheaft des göttlichen Boten.

(H 291,5)

تا نگردی آشنا زین پرده رمزی نشنوی
گوش نا محرم نباشد جای پیغام سروش

(: As long as you are not acquainted [meaning, initiated], you do not perceive a symbol from behind the veil. The ear of the stranger [meaning the non-initiated], is no recepticle for the message of the angel or heavenly voice).

Let me remark finally that the other conception of truth and reality produces another conception of the rhetorical figures: While the exoteric orientated Arabian poet as a rule avoids excessive use of the rhetorical arts because he is afraid of the dissipation of reality, the Persian poet can make more use of them, because he is less concerned with the reality of visible things than with a supersensual truth. The verse by Hafis quoted above

No matter how may lovers your boundless beauty may kill a new crowd raises itelf (to her) in love from eternity

is of bad taste if it refers to a human mistress, however, it has a deep meaning if it is taken as an expression of the boundless human yearning for an eternal being. The exotric poet is bound to the sensually appreciable world and the apparently unescapable correlations of space and time. The esoteric poet feels himself beyond space and time, he is according to Nizāmi in *Muhzan al-asrār*, a bulbul-e 'arš, a nightingale at the throne of God, which is confirmed by the following verse of Hafis, by which I should like to close my lecture.

Ich bin jener Vogel, des Zwitschern jeden Morgen und Abend vom Dach des "Thrones" herab ertont

(RS in 64,3—H 377,10)

من آن مرغم که هر شام و سحر
زبام عرش می آید صفیرم

(: I am that bird whose chirping sounds every dawn and dusk from the canopy of the Heavenly Throne).

In the service of such a proclamation of truth, the poet may appear as a seer and proclaimer of secrets and take himself as such.

Nizāmi calls his first epic *Maḫzan al-asrār*—Storehouse of Mysteries and of the last *Iskandernameh*, he says :

در این گنج نامه ز راز جهان
کلید بسی گنج کردم نهان

(In this index of treasurers, I have concealed the keys of many a secret of the world).

As we find it expressed in the works of Nizāmi, Hafis, Sa'di, Jami and so in many other Persian and Urdu poets.

Hafis says of himself: dilam ḫizāne-ye asrār buwd—my heart is a storehouse of secrets; he addresses himself as : ṭūṭi-ye gūyā-ye asrār —a secret-proclaiming parrot; and the similar applies to other Persian and Urdu poets.

Where lies the root in this different conception of the truth by Persian poets? I believe, in the strong Sufi influence furthered by Shī'a environment and accepted as the Sufi-like esoteric or mystical way of thinking transferred itself in poets such as Sanā'ī, Maulānā Ǧalāladdīn Rūmī and Farīduddīn 'Aṭṭār and then more or less influenced the whole of Persian poetry. Shi'a and Sufism are the new platonic trends of Islam for whom creation is a symyol; the exterior, sensual, is partly veil, partly mirror of the interior, supersensual, The poet like the prophet is capable of slightly lifting this veil. The majority of Arabian poets are however, not influenced by Sufism. Based on their Sunnitic attitude they are exoterics and the Arabian poetics are only intersested in this type of poet. Of the great mystical poets of Arabian tongue, such as Ḥallāǧ, 'Umar ibn al-Fāriḍ, Ibn al- 'Araby they take no notice. When the Arabian exorteric poet speaks of wine he means nothing but wine. When the esoteric poet talks of wine, he may mean wine, or 'Irfān, medical knowledge or both of them or even something else. He speaks in symbols based on a knowledge which is passed to him from a world beyond the عالم غیب. Only one who is āšnā (acquainted with or initiated to that عالم غیب) hears the voice

this purposely for the sake of a truth which is more than just a superficial concurrence with the apparent aspect of the world as sought by the Arabian realists.

The past-master in this respect may well have been Niẓāmi. He created such figures as Shirin and Ferhad, Laila and Madjnun whose demeanour typify certain human characters in an idealised form. How consciously Niẓāmi creates his subjects to such truth can be seen from the material which is available. Thus Shirin, in Firdausi's *Shahnameh*, is, in spite of her noble features, a woman who does not fight shy of disposing of her rival by poison. It is possible that Firdausi is closer to the description of historical truth. Niẓāmi, however, who expressly acquits Shirin of the crime of killing her rival stands for a higher truth. He says, for example, in respect of his relationship to *Shahnameh* :

بجای که ناراستی یافتم
بر او زیور راستی بافتم

Wenn ich gefunden was der Wahrheit bar,
Hab ich den Schmuck der Wahrheit drein gewebet.
(: Whenever I found verses bare of truth, I have woven into them the ornament of truth).

The following verse presents the problem even stronger :

Die Lüge, die dem Wahren ähnlich ist,
Ist besser als das Wahre
Das von dem Richtigen geschieden ist.

Let us try to explain this verse with the example of Niẓāmi's creation of Shirin : It may be a lie from an historical point of view that Shirin is free of the blemish of a poisoner. This truth is, however, so distant from moral righteousness as imagined by the poet, that a poetical lie, in fact fiction, is more appropriate to the truth.

Western conception of fiction, at its highest level, is based on this cognition and was already included by the humanist John of Salisbury in the 12th century in the following witty sentence : mendacia poetarum inserviunt veritati—Poet's lies serve the truth.

Often, phantastic reasoning and strong hyperbole arecomm on to one verse, as in such frequent cases where Hafis compares his tears with a river or the sea taking this metaphor verbally: For once this stream shall block the friend's way, should he wish to depart from him:

گه وداع بگریم بدان مشابه که یار
بهر زمین رود آب دیده راه بگیرد

Upon departure, I cry so much that wherever the friend shall go, the tears shall block his path. (RS I,704,6)

In the other case 'Noah's ship', that is the wine, for as you know Noah is taken for the inventor of wine, should save him from the sea :

کشتی باده بیاور که مرا بے رخ دوست
گشت هر گوشهٔ چشم از غم دریائی

Bring me the ship of wine, for without the countenance of the friends, every corner of the eye has become a sea from heartache. (RS III, 86,4=H 456,3)

In their majority the Arabian poetics carried on a lively battle for realistic description. They realised the danger to realism in the exaggerated rhetorical enrichment. They, however, lost the battle for realistic poetry in a field where they were not even aware of their oponent, that of tradition.

The might of tradition was so strong, that the conservative poets felt themselves bound to the traditional contents of the Qaṣīda, in spite of the fact that being city poets, they only know of the Bedouin social environ ment from hearsay.

The fiction which the poetics permit the poets often does not mean more than the invention of these traditional subjects of the Qaṣīda. For instance the so-called Nasīb, the reminiscence of love affairs in the Nomad environment. In order to satisfy a convention, the city poet is required to invent subjects which have little or no connection with his own experience. Quite different from Persian fiction which makes room for itself in Turkish and Urdu poetry, the Persian poet creates historical subjects and tales on artistic principles; he re-invents traditional figures and does

In the following verse Hafis gives grounds for his relationship to deir-e-mughān, the magian's monastery to the eternal flame in his heart of which he speaks as of a real fire :

ازان بدیر مغانم عزیز میدانند
که آتشی که نمیرد همیشه در دل ماست

I am so esteemed by the magian's monastery because an immortal fire always lives in my heart (RSI, 276=H 85, 8)

Why is wine a deliverer of truth? Hafis bases this on that it, like the ancient Greek philosopher Diogenes, or according to Oriental tradition, Plato, is in the bottom of the barrel :

جز فلاطون خم نشین شراب
سر حکمت که گوید باز

Keiner, wenn nicht der wie Plato im Fasse sitzende Wein, offenbart uns das Geheimnis der Weisheit (RSII,66=H 262,2).

Also the natural desire of the lover to touch the lips of his loved one, to lay his hands around his neck, are given phantastic reasons. The lover is love-sick, melancholy and thus requires a mufarriḥ, 'a giver of pleasure', for which the ruby is an ingredient which, however, is owned by the loved one whose lips, in the land of poetry, are the ruby. Thus Hafis can say :

علاج ضعف ما بلب حوالت کن
که این مفرح یاقوت در خزانهٔ تست

Give me the medicament for the sickness of my heart with your lips; the Mufarriḥ of ruby is in thy medicine-chest. (RS I, 54=H 303).

And in another verse he offers his hand as a talisman against the evil eye by whose the beauty of the beloved is threatened.

ای دوست دست حافظ تعویذ چشم زخمت
یا رب ببینم آنرا در گردنت حمائل

: O my friend, the hand of Hafis is a talisman against the evil eye, Would God that I see it as an amulet placed upon your neck !

being transformed into a being with human feelings. The same occurs when another poet claims the vanishing of the moon behind a cloud to be because the moon is ashamed of the poet's friend whose splendour it cannot match. The difference of these two verses lies purely in that a hyperbolic comparison is made in the second: The poet's mistress is incomparably more beautiful than the moon!

Ǧurǧānī is the only Arabian poetician, who perceives and expounds these subtleties, he analyses the phantastic reasoning, he describes the enlivening and humanising of nature and he recognises a further factor connected with the rhetorical figure, the use of metaphor as reality.

The following is an example from an anonymous poet; again given by Ǧurǧānī:

كأن بها من شدة الجرى جنة
وقد البستهن الرياح سلاسلا

It was as if the waterways had run amock
And the winds had therefore put them in chains.

This is based on the comparison of the waves with chains. Then the poet uses this metaphor as reality and invents a reason for the existence of these chains: The river is mad and therefore must be put in chains. In Persian poetry similar things often occur; take the game which develops from the comparison of locks of hair and chains as in the Hafis verse:

عقل اگر داندکه دل دربند زلفش چون خوشست
عاقلان دیوانه گردند از پی زنجیر ما

If the intellect realised how well I feel in the bonds of your lock, the reasonable would become mad for the sake of our chain (i.e. to be put in chains like madmen in the chains of your locks!) (H 4, 4)

The phantastic argumentation, the humanification of nature and the use of the metaphor as reality are rhetoric processes which were cultivated by some Arabian poets and even enjoyed a certain efflorescence in Andalusian poetry but never became at home in the main stream of Arabian poetry. Thus Ǧurǧānī describes phenomena which are more typical to Persian than to Arabian poetry, which may again be shown by a few Hafis verses.

Or verses in which the beloved is described as a fearful despot and murderer, who places innumerable lovers in chains with her locks and who, with the arrows of her looks, can kill :

حسن بے پایان او چندان که عاشق می کشد
زمرهٔ دیگر به عشق از غیب سربر می کند

No matter how many lovers her boundless beauty may kill
a new crowd raises itself in love (to her) from eternity.

Hafis also employs ghuluw frequently in those tahallus verses in which he praises his own art :

غزل گفتی و در سفتی بیا و خوش بخوان حافظ
که بر نظم تو افشاند فلک عقد ثریا را

You have sung ghazals and pierced pearls : come.
That Heaven may shower the pearls of the Pliades on your poetry.

If it applies to the hyperbole that it developed to a much greater extent in Persian poetry than in Arabian, then it also applies to a much greater extent of another rhetorical figure: the phantastic argumentation at-ta'lil at-tahyili, which plays such an important part in Persian poetry Only one Arabian theoretician has discussed this figure of speech, 'Abd al-Qahir al-Ğurğani in his famous *Kitab asrar al-balagha*, and he was not really an Arabian but a Persian. To him this slogan hairu š-ši'ri akdhabuhu refers to this rhetorical figure, which he describes as the most fascinating creation of the muhdathun, the poets of modern style.

What is this figure of speech? Ğurğani describes it with the words: "We speak here of a case where the poet explains a natural process by phantastic reasons un-acceptable to the intellect." The following verse is one of his example :

فالشمس عند غروبها تصفر من فرق الفراق

The sun becomes yellow before setting from fear of the separation (taking leave of the day).

A natural process, the discolouration of the sun in the evening is being justified by a reason only possible in phantasy; the sun is

accept the hyperbole ghulaw, expressing absurdity, only in the field of satire, as for instance in the following satirical verse on the cowardice of the Banū Tamīm one of the leading ancient Arabian tribes.

ولـو أن برغوثا على ظهر نملة
يكر عـلى صفى تميم لـولت

Should a flea, mounted upon an ant, attack the two battle-lines of the Banu Tamim, they would take flight.

On the whole, even Ibn Rašīq is against the ghulūw, though he does not deny that in the new style, the badī', it plays an important part; Mutanabbi, the greatest of all Arabian poets and a master of the strong hyperbole barely wrote any verse without ghulūw. However, Mutanabbi in a way enjoys special rights with Ibn Rašīq and other poetics in view of this mastery. He is permitted things which are out of bounds to their poets.

Normally Ibn Rašīq recommends strong restraint. Not more than one strong hyperbole should be contained in a whole Qaṣīda.

It is seen that on the whole the Arabian tendency is against the strong hyperbole which should only find a footing in Persian poetry. Take verses in which Hafis describes the boundless beauty of the "friend" as follows:

ای قصهٔ بهشت از کویت حکایتی
شرح جمال حور ز رویت روایتی
انفاس عیسی از لب لعلت لطیفه ای
آب خضر ز نوش لبانت کنایتی

Oh thou (who art so beautiful) that the tale of paradise
appears like a story of thy street,
and the description of the beauty of the Houris (only as) a
far-off lore of thy countenance,
the (life-giving) spirit of Jesus (only) a tiny detail of thy ruby
lips,
and Khiser's water of life (only) an indicative transcription of
the draught of thy mouth (RS 11,40) — H 439

excess (isrāf) so that his statements fall within the field of the absurd or closely approach it. Excess (saraf), lying and absurdity (iḥāla) are accepted in no branch of rhetoric except in poetry. Aristotle already discussed poetry and described it (with the conclusion) that the lie is to be found in it more (that is, either 'worth more' or 'more often') than the truth and said that it is acceptable in the art of poetry (*Burhān*)". Also Qudāma b. Ǧa'far, the strongest proponent of the strong hyperbole refers to Aristotle although here as with Isḥāq b. Ibrāhīm there is naturally an error.

There is in fact in Aristotle's poetics a place where the poet Homer is praised for lying. As shown by the coherence, Aristotle here speaks of the so-called paralogism, the fallacy, by which he understands a certain process within the drama, [the tragedy or comedy: The raising of a false expectation with the audience, which upon solution of the error, is to throw them into even greater amazement; for amazement plays a very important part with Aristotle.]

Aristotle can, however, not be made the counsel of the strong hyperbole because he generally advises to moderation in rhetorical respect and rejects every type of excess.

Although Qudāma errs in this respect his hyperbole theory is interesting. "Every school", he says, "who drives hyperbolic to such limits that it extends beyond the existence and enters the field of non-existence aims only at the idea and the achievement of the almost limit within quality. Qudāma quotes a row of verses to illustrate this thesis such as the following from a poem of praise on the Khalif al-Ma'mūn by Abū Nuwās:

واخفت اهل الشرک حتی انه
لتخافک النطف التی لم تخلق

Thou hast placed such fear in the polytheists
That thou art even feared by the seed-drops yet to be created !

Certainly this statement moves beyond reality, but it conveys a far stronger imagination of the fearsome authority of the ruler than a poem which makes no use of ghulūw.

But Qudāma's hyperbole theory had not much influence on Arabic poetry. Qarṭāgannī, whom we have mentioned previously, would like to

for instance, is depicted as more courageous, more generous, the mistress more beautiful than they are in reality. The description does not, however, exceed the limits of possibility. This kind of hyperbole is not queried by any of the mediaeval theoreticians. The other kind of hyperbole called ghuluw, ifrāṭ or ighrāq, however, is another matter. The poet deviates to such an extent from reality that his statements reach the field of absurdity (muḥāl). This type of hyperbole was attacked by a number of poetics. Conservative poets were loath to employ it, whereas the modernists, the muḥdathūn, considered it to be an indispensable component of their new style, the badī'. The opponents of the strong hyperbole expounded two arguments: They violate the truth and are un-Arabian. Characteristic is the voice of Ibn Rašīq in the '*Umda* : "There are people who believe that the poet's virtue shows itself in his knowledge of the various kinds of ighrāq and ghuluw. I consider this form of hyperbole absurd as it is a contradiction of the truth and diverges from the normal and necessary (al-wāğib wal-muta'ārif). The experts (ḥudhdhāq) have said: ḫair al-kalām al-ḥaqā'iq au mā nāsabahā wa qārabahā, that is, the best kind of speech are truthful statements or at least those which are related to or not far from them."

The same Ibn Rašīq quotes another authority critical of the hyperbole. According to this scientist (whose name is not known to us), the hyperbole darkens the sense and this is against the foremost duty of the poet which is to express himself clearly, and it is also contradictory to the traditional renown of the Arabians: fa-inn al-'Araba innamā fuḍḍilat bil-bayāni wal-faṣāḥa. "It is by their clearness and their eloquence that Arabians surmount the others."

Those who expected something un-Arabian in the strong hyperbole were not far wrong. The strong hyperbole was clearly preferred by numerous Arabic-writing poets of Persian origin. A further foreign element is evident with the theoretical defenders of the strong hyperbole. These referred to the ancient Greeks, even to Aristotle himself, whose writings were translated into Arabic. Thus we read in the *Kitāb al burhān fī wuğūh al-bayān*, for instance, written by a little-known scientist of the name of Isḥāq b. Ibrāhīm b. Wahd al Kātib, the following phrases:

"In description and comparison, praise and reproach, the poet can observe moderation (iqtiṣād) as well as exaggerate (mubālagha) even to

Even narrative poems of a few lines are rare in classic Arabian poetry such as the satirical description of a ṣabūḥ, a morning drink, by Ibn al-Mu'tazz or the equally satirical description of a ruinous festival for the host from the pen of a Damascan poet of the 12th century. The rhymed and versified chronicle of the courageous deeds of the Khalif al-Mu'taḍid, by the famous Poet Ibn al-Mu'tazz, is singular in Arabian literature.

The rest of Arabic mathnawis is connected with didactic or scientific topics such as is famous mediaeval urjūzas. It is seen here that it does not concern the difference between the possible and the impossible but more the lack a whole of kind of poetry, the epic. The reasons for this are not easy to determine. One may establish hypotheses; to prove them will barely be possible. It must be pointed out, however, that as a rule the epic develops in feudal society. Thus classical Persian epic leans on ancient and mediaeval Persian epic forms which developed at the royal courts of the Achaemenids and the Sassanians. The restless way of life of the Bedouins does not appear to be propitious to epic poetry. In any case no such form developed with the ancient Arabians. And the extraordinary part played by tradition, the paradigmatic significance which ancient Arabian poetry achieved, in spite of its heathenish character, the fear of every kind of bid'a, the conviction not to require literary assistance from other nations, evidently hindered the creation of an Arabian epic in Islamic times.

The fear of lying, let it be repeated, barely played an important part, otherwise all poets following the slogan, ḫairu š-ši'r akdhabuhu, would have been in a position to make up tales and legends in verse. They evidently did not even have the idea to do so. They were much more concerned about the admissibility of the lie in the field of the rhetoric figures, namely the strong hyperbole, ghulūw and the so-called phantastic argumentation, ḥusnu t-ta'līl or at-ta'līl at-taḫyīlī, with which we shall now concern ourselves.

Let us first discuss the hyperbole

The Arabian poetics differentiate between two kinds of hyperbole (mubālagha). One of these contains a statement, which though it does not conform with reality is imaginable in the field of possibility. The King,

with the fictitious character of the poetry. hādhā qaulun lā fi'l—"that is simply speech not action".—such poets reply to the orthodox zealots. And among them, one may be as frivolous to quote the *Qur'ān*, Sura 24 Verse 226, which says of the heathen poets "yaqulūna mā lā yaf'alūn—"They talk of things which they do not perform"! Thus it is said of the well-known wine-poet Abū Nuwās in a short story from the "*Arabian Nights*" how the poet managed to exculpate himself from being beheaded by the Khalif Hārūn-ar-Rashīd for offensive verses by quoting this part of the *Qur'ān*.

What is the position with the invention of fairytale-like contents in mediaeval Islamic poetry? Here we come across one of the most pronounced differences between Arabian and Persian, as well as Turkish and Urdu poetry. Arabian poetry knows no fiction of fairytale-like subjects. This fact is first established by Ibn Sīnā who also discussed the Aristotelic poetics and in this connection mentions the differences between Greek and Arabian poetry in his voluminous principal work, *Šifā al-nafs*, which is principally based on Aristotle. Ibn Sīnā claims that a legendary story such as *Kalīla wa-Dimna*, where animals comport themselve like humans does not belong to the subject of Arabian poetry. Another later poetician who lived in the 13th century, Ḥāzim al-Qarṭāganni, strongly influenced by Ibn Sīnā, again treated the same facts in his *Minhāğ al-bulaghā'* and expressed them with the aid of a very clear terminology :

Apparently as the only one among the Arabian poets, he coined an expression for fiction, namely "iḫtilāq" and differentiates, as we have just done and according to the actual circumstances of poetry, fiction with the character of reality which he terms "iḫtilāq imkānī", and fiction beyond the range of the possible, "iḫtilāq imtinā'ī". He repeats Ibn Sīnā's claim: "The first kind is frequent in Arabian poetry, the latter totally lacking."

The facts established by Ibn Sīnā and Qarṭāganni, however, only cover one part of the actual deficiency of Arabian poetry; since this does not know of any larger narrative poetry, no matter whether—to quote Qarṭāganni—it concerns iḫtilāq imkānī or iḫtilāq imtinā'ī ; it knows, in one word, no epic.

niggardly. The realism of ancient Arabian poets ended here. Since during the Islamic era the court-poet took the place of the tribal poet, this tendency was even emphasised.

Poets lie—that was a far spread opinion, also in the mediaeval Islamic world. Among these poets there was more than one, a whole leaning or school who were proud of the lying ability. They openly put it forward as their slogan. ḫairu š-ši'ri akdhabuhu—"The best poetry is the most untruthful"!

What was meant by this slogan? To begin with, not the untruthfulness of panegyric poetry. This was furthermore accepted by the proponents of the poetic lie as a necessary evil. This slogan concerned much more two of the fields referred to in the title of our lecture: Fiction and Rhetoric. Let us first discuss fiction. What is understood by this term? The word emanates from the Latin and means "invention". The poet invents something which he has not experienced—an idea familiar to us. This invention can, however, be made in two ways. In a way that the invented subject does not differ from experienceable reality so that it appears realistic—or, that the statements expressed by the poet can only be possible in the sphere of phantasy, such as most of the stories in "Arabian Nights". As far as the realistic invention is concerned it is familiar to the Arabian poets and the poetics the specialists of the علم الشعر also mention it and approve it. It is interesting to note what Qudāma b. Ǧa'far, a poetic of consequence of the 9th century, has to say about it in his *Naqd aš-ši'r*: "The poet is not qualified by his truthfulness, it is only expected of him when tackling a theme, whatever it may be, to produce something good".

The same is meant by the important poetic Ibn Rašīq, active in the 11th century when he writes in his influential book *al-'Umda fī maḥāsin aš-ši'r wa-ādābihi wa-naqdih*: "It belongs to the advantages of poetry that the lie, generally considered a vice, here becomes an embellishment." Fiction thus postulated as a right of the poet, however, has another aspect: Pre-Islamic poetry has a predominant heathenish character: Wine and free love are glorified. With the prohibition of wine by the *Qur'ān*, poetry was threatened by the withdrawal of its main theme. The wine-poets in Islam now had the possibility to excuse the immorality of the contents

art (ṣan'a). He thus also does not have any world-expounding, secret-pronouncing function. The world has been sufficiently revealed through Mohammad's revelation, secrets, in so far as the human is able to perceive them, have been sufficiently unveiled, according to the belief of the new religion.

But also in pre-Islamic times the Arabian poet no longer had a seer's function although he was presumed to be inspired by jinns. In the framework of the Qaṣīda he described the desert with flora and fauna, its life and the life of its tribe ; [the Bedouin hospitality, the barking of the dogs on the approach of nightly visitors, the slaughtering of camels, the camp fire, the cooking pots and the frying spits. He described the desolation of a stormy night, the flooded countryside following a cloud-burst, the hunt and war and last but not least, the joys of wine and love]. He was, in one word, a realist.

Arabian poetics confirm this when they state that Arabian poetry is largely "description" (waṣf). They also confirm the realistic character when they expect it to describe an item in such a way that it is perceptible to the senses.

An Arabian poet is praised for his verse if he "has fully described the majority of the apparent facts and pointed out the features in such detail that the listener would appear to see them before him." Here, therefore, the poet is a painter of words; and his picture shall comply with reality, it shall be true. In this sense pre-Islamic poetry was considered as a kind of historical painting of the past to scientists of the early Islamic era. Bedouin poetry is, according to Ibn 'Abbas, [the cousin of Mohammad], the Arabians' dīwān, dīwān al-'Arab, dīwān being understood here in the sense of archive.

There was, however, something about the reality of Arabian poets which was given to corrupt the striving for exact description of reality; the political part played by the poets.

The ancient Arabian poet was mouthpiece of his tribe. It was upto him to praise his own tribe and to derogate the rival one. His own tribe was eo ipso courageous, generous, noble; the rival cowardly, mean,

In both regions there were times when actually not more was expected of the poet than rhetorical refinement. The origins of the poet, however, point in another direction. They placed him near the prophets. This applies to the ancient Arabian, as well as to the Greek epoch.

According to Plato the poet is an expounder of truth, inspired by his muse, a kind of Peri or female jinn.

Plato, however, laments that poets all too often degraded themselves as servants of lies and thus misused their extraordinary influence and betrayed their calling. Aristotele, although on the whole much more temperately than Plato, occasionally describes poetry as éntheon, divine.

The ancient Arabians considered the poet as possessed by the jinns. The jinns gave him a knowledge which was withheld from other humans. šā'ir originally means "one who knows". The close relationship of poet and prophet has remained alive into modern times, whereby the connection is sometimes seen to be more in the gift of inspiration of the poet and sometimes more in the expounding of the truth. Several great Persian poets have more or less distinctly drawn attention to this connection, as for instance Niẓāmi in the following verses :

Poets are nightingales at the throne of God
(or at his feet—the word 'arš has various meanings)
how should they be similar to others (humans)
When rapt by the fire of their thoughts,
they become related to the angels
The veil of secrecy which poetry is,
is a reflection of the veil of prophecy.

Hafis often says, even if with a slightly playfully-frivolous tone, that he is inspired by the Holy Ghost (rūḥ ul-quds), or by the messenger of the world beyond, surūš-e-'ālam-e-ghaib. Even with the modern Pakistan poet Muhammad Iqbal we find this same self-assessment.

پردهٔ رازی که سخن پروریست   سایه ای از پردهٔ پیغمبریست

Following Mohammad's performance, this opinion is foreign to Arabian poetry. The poet is neither inspired by jinns nor by the angel Gabriel. He draws his poetic faculties from two sources, nature (ṭab') and

Realism, Rhetoric and Fiction of Classic Islam Poetry

PROFESSOR J. C. BÜRGEL

The aim of my exposition is to point out some substantial differences of Arabian and Persian poetry of the classic era, based on the varying appreciation of the question of realism, rhetoric and fiction. To begin with some general reflections on poetry in order to clarify these conceptions. What is poetry?

A modern literary scientist would presumably reply differently to a mediaeval Adib, the Persian differently from an Arab. Modern and mediaeval scientists may well agree that poetry is the art of speech, as music is the art of sound, painting the art of colours and forms.

Speech is the ability reserved to mankind for understanding throughout the world as it presents itself to our eyes and senses and comprehensive to our heart and soul. Speech serves not only our daily worries, it expresses happiness and sorrow, love and hate, belief and congnition. It is the receptacle of our dreams and our reflections to the riddles of the world.

What is so particular about poetry? as all this can also be expressed in prose. In other words, what is the art which defines the poet? Opinions differ substantially on this matter. Some see this art in a particular simplicity and unaffectedness of speech, others on the other hand in rhetoric decor and refinement of rhetorical figures; some expect from the poet a beautiful *description of the world as it presents itself; that is,* they picture him as a sort of painter of words, others expect him to expound and uncover the secrets of the world and of life, that he is a kind of seer or prophet.

The poet as a realist or idealist, as an artistic word-jeweller or a secret-pronouncing expounder of the world, these are alternatives which are of considerable importance to the literary history of the Orient as well as to that of the West.

In the end, the visit to the land of the midnight sun is over, the business trip is over and the Swedish Candida is claimed by her husband. He pleads his need for her and his behaviour does not in the least conform to our conception of a wronged husband's. Julia goes back to her husband, and when the young Oriental keeps harassing and pressing her, she threatens to call the police !

The passage to Europe has become a common experience for the younger generations of Egyptians. Literally thousands of them cross the Mediterranean every year and make short or prolonged stays as the case may be. European literature and civilization are now a widely familiar feature of our life. It is high time that our authors should make their passage to the East. We should remind one another of Byron's famous words "Look to the East, it is the only poetical policy." Admittedly, it is not the only poetical policy at the moment but the experience is highly called for.

ABSTRACTS

The novel is a comparatively modern literary form. The Arabic novel was first written in imitation of the realistic fiction of the West. The rich tradition of narrative fiction in earlier Arabic literature had little influence on the rise of the Arabic novel. Arab Novelists of all ranks have admitted their indebtedness to the realistic European novel of the 19th century and later to the more experimental schools of the 20th. This literary form has been sufficiently naturalized in the atmosphere of Arabic culture that it is now developing along lines of its own.

The conflicting values of the spiritual traditional East and the materlistic advanced West has been a recurrent theme in the Arabic novel. The treatment of this theme has varied with the development of the novel but the plot is usually based on "the passage to Europe". The heroes of the first novels illustrating this theme were commonly students or artists, bewildered by many aspects of Western life. In more recent works Egyptian novelists have explored new scenes besides the traditional Paris setting, usually the Latin Quarter. They have carried their protagonists further north but the sense of bewilderment still remains. It is our hope that future novelists may have the opportunity to carry the action of their novels to the neighbourly East rather than the alien West.

The passage to Europe remained a recurring theme in the Arabic novel. Most commonly the scene of action was Paris and the Latin Quarter popularized by *Asfour Min al-Shark* and the writings of the Forties. The late Fifties marked a change of scene. In *Devil's Bridge* Abd el-Hamid Gouda (عبدالحميد جودة) el-Sahar, an unequal novelist of the same generation as Naguib Mahfouz, places his 'Oriental bird' in Humburg. He is not a dreamy student or an artist any more, but a businessman on a tour of business combined with pleasure, and the scene of action is that part of the city frequented by foreign visitors, the sailor's haunts of brothels and nightclubs. The hero's oriental charm, coupled with his spirituality, is set against the sordid, carnal vice of the place. His achievement is the redemption from her sinful life of one of the nymphs of Hamburg, a very worthy act indeed that does not, however, warrant the long and detailed scenes of temptation which the author supplies and the hero manages to skirt by the breadth of a mere hair.

A more interesting contribution to this theme is typical of what I call the third generation of novelists in Egypt. Fathi Ghanem's فتحي غانم *The Hot and The Cold* (1960) carries the scene further north to Scandinavia. The hero is, again, a business man, a typical Ghanem character, a man in his early thirties who is apparently a shy introvert but is in fact a very strong, dynamic character who manages to get away with a lot. Stockholm and the reputed sexual latitude of the Swedes give him the opportunity to exercise his oriental charm, not in the lower ranks of the nightlife of the city, but on a young and respectable housewife. Ghanem's hero is, in fact, a purely Shavian character and the situation is that of G.B. Shaw's play *Candida*. Yousef Mansour (a number of Ghanem's heroes are called Yousef) pays a visit to Stockholm on business. He makes the acquaintance of the beautiful wife of an elderly Swedish music conductor. They go off on a tour of Stockholm, fall in love, make a trip to Denmark and Norway and visit the arctic circle and the North Cape. This gives the author the chance to introduce scenes into the Arabic novel with which very few readers are familiar. The discrepancy between their respective backgrounds, values and outlook come to the surface in the relationship between the Oriental hero and his Swedish friend, but the novelty of the scene and situation cover up the basic contradictions.

of home, family and the light of Om Hashem. He suffers a severe nervous breakdown, but is helped and nursed back to health by Mary, a fellow student. She takes him to Scotland, trains his eyes to see the beauty of nature, and his body to long walks and healthy physical exercise. The young Oriental adapts finally to this alien European civilization, materialisatic and achievement-oriented, where the cult of nature has replaced the old faith in the Almighty. Ismail makes a brilliant occulist and expects to work wonders in "the country of ophthalmic diseases" as the professors call Egypt.

Ismail's real ordeal starts after his return to Cairo and the old house close to the mosque. The house seems smaller and much poorer, the streets are narrow and dirty and the crowds of blind, diseased and maimed pilgrims and beggars revolt the young man on his setting foot in the place. He is horrified when he sees his mother putting drops of oil from the Qandil in the inflamed eyes of his betrothed, his cousin Fatma. Nothing has changed in those seven years. In a fit of rage Ismail flings the bottle of oil out of the window, rushes into the mosque and shatters the gleaming lamp with his father's cane. He is beaten up by the crowd, but the old attendant soon recognizes him and saves him from their wrath, pleading that the young man is possessed. For many days Ismail lies in bed with his face to the wall, his physical injuries healing, but his mind racked by another breakdown.

When he takes the treatment of his cousin in hand, for some incomprehensible reason he fails. He flies from his home in despair, and thinks going back to England and settling there for good, but he cannot take the final step. Time and again he comes back to the old place and watches the crowd of believers fascinated and horrified. He finally recovers and asks Sheikh Dardire for a bottle of the old oil gleaming in the new lantern. Ismail starts a clinic, not in the modern, fashionable quarters of the city, but in the vicinity of Sayyeda Zeinab where he is needed most. His clients are poor and backward and the waiting room is dirty and crowded but he does good work. He has discarded the slick trappings of his medical training, but keeps the basic scientific as well as humanistic outlook. His art brings healing to thousands of suffering poor, but he can do that only in the shadow of the mosque and with proper respect for the light of Om Hashem.

by the first electric tram which, to the crowd of simple peasant pilgrims to the shrine of Om Hashem, is a monster mercilessly running down a victim or two every day.

The narrator's eye catches the life of the square in a superbly poetic vision. The place has a life of its own, dominated by the presence of Our Lady and her servant Atris, whose modest tomb stands in semi-attendance in the outer court of the mosque. The buying and selling, begging and praying, are all conducted under her auspices and with the invocation of her name. At night, the lantern hanging over the tomb knowingly gleams in the darkness, its familiar beams carrying comfort to the hearts of night-watchers, sipping their coffee in the crowded coffee-houses all around.

People devoutly believe that the oil of the lamp has miraculous medical qualities. Sheikh Dardire, the old attendant, makes good money by selling small quantities in little bottles, but he also gives away a few bottles to the poor, who particularly need it for the treatment of their eyes, thus adding to the number of blind beggars, who crowd the pavements around the mosque.

The hero, Ismail, lives close to the mosque. His father is a corn and seed merchant who has a small shop in thes quare. The world of the whole family revolves in the shadow of Om Hashem. Ismail is the youngest of Haj Ragab's children, and as a school boy, seems to meet all the little tradesman's hopes of his son's rising to the class of educated professionals. The mosque and its precincts are favourite spots for the hero as a little boy and as an adolescent. He lives by the light of the lamp of Om Hashem and loves every rail of the grille around her tomb. He is the friend of the old attendant, and knows every one of the familiar faces around the place. Like all the members of his family he is devoutly religious, but the fervour of adolescence adds a sharp point to his religious experience.

The boy *fails to qualify for the Egyptian School of Medicine* and his father is advised to send him abroad. The family pinches itself to the utmost to finance Ismail's studying *in England. The timid, inexperienced* young man has to adapt himself to living away from the protecting shadow

shrines of our Muslim world. In the text itself, the narrator recalls his favourite spot in the mosque, on the clean straw mats, away from the rich Persian carpets and the gilded ornaments. In the novel, the name of Sayyeda Zeinab is evoked as a reminder of a simple form of worship, religion in its original Oriental form, before it was disfigured by the pomp and ceremony of European civilisation.

The same shrine was again evoked in a famous novel of the forties, *Qandil Om Hashim*. Om Hashim is one of the names of Sayyeda Zeinab. The "qandil" or lantern hanging over her tomb is an obvious symbol of the light of faith. This very short novel has enjoyed an unprecedented popularity among Arab readers. Expanded and adapted for the cinema, theatre and television, the compact original retains its superiority as the condensed vision of a truly sensitive artist. The author, Yehia Haqi, was best qualified to render such a vision.

He grew up in Cairo, not far from the vicinity of the mosque of Sayyeda Zeinab, the meeting-place of pilgrims from every part of the country. As mentioned above, he was attracted to the "Modern School" of writers, that group of enthusiasts who in the early twenties were greatly influenced by European literature, and the great Russians in particular. As a graduate of the Faculty of Law, Yehia Haqi worked for some years in Upper Egypt in an administrative post, which gave him much insight into the seedy and traumatic aspects of the life of stubborn, conservative Upper Egyptians. He later joined the Foreign Office and served as Consul, first in Arab countries, Libya and Saudi-Arabia, then in Europe. Yehia Haqi, a State Prize winner and one of the great men of Arabic letters, to this day bridges the gap between the old and the new generations, as well as between Western influences and Oriental traditions. His voluminous writings, essays, short stories and criticism are a curious mixture of mature experience and youthful freshness of outlook. *Qandil Om Hashim*, is one of his early works, but for many readers is still the most familiar and best appreciated of his publications.

The novel portrays the mosque, the square before it and the network of little streets around it, at the right moment in the history of Cairo; when the medieval aspect of historical sites, like the district of Sayyeda Zeinab, was invaded by modern locomotives. The old square is invaded

perceptive truth of the Frenchman's remarks ; the motto of the novel, "all in one" is given full expression by the end of the narrative.

The hero of *Audat el Ruh* is a young adolescent, Mohsen, often identified with the author himself. In *Asfour Min al Shark (Oriental Bird)* (1938), Tawfik al Hakim carries Mohsen to Paris in the late Twenties, the years of economic depression and deep disillusionment as to the future of modern industrial civilization. The major theme of the novel is the conflict in Mohsen's world between two systems of values. The articulate defence of the East and its spiritual values is introduced, not through Mohsen, but through Ivan, a consumptive Russian worker, a disciple of Tolstoy, whose death-bed words are an exhortation to Mohsen to return to the East, the source of all sound values. It is interesting to note that the author did not attribute the enthusiastic plea for the spirituality of the East to his Oriental hero, but to a Westerner, and an idealist ; like the spirituality of the Middle Ages, it is best appreciated at a distance.

The opposite view is represented by Mohsen's other friend André, a typical practical European, who finally makes good, rising from the ranks of the workers to the managerial class of successful businessmen. He is simple, hard working and friendly, but he has no place for imagination or metaphysics. He gives his Oriental friend very good advice on the subject of Parisian women, which Mohsen wilfully ignores, choosing to treat the office-girl as a goddess, rather than a pretty grisette of flesh and blood.

Mohsen himself is not a typical "Oriental bird" ; he is given to dreaming and contemplation. When he falls in love with Suzy, the box-office cashier of the Odéon Theatre, he invsests her with mystic qualities, associated with his exprериences of Beethoven's Fifth Symphony or Puccini's operas. He is bitterly disappointed in the Parisian girl, who allows him to take her out for a fortnight then abruptly drops him. The dates did not mean much to her. She had a good time and she made her boss jealous, and it was in him she was interested, not in Mohsen. The disappointed Oriental identifies her with Europe; a blue-eyed nymph, intelligent and beautiful but selfish and emotionally shallow.

The novel is dedicated to Sayyeda Zeinab, the grand-daughter of the Prophet, whose mosque in Cairo is one of the most frequently visited

was first published in 1933, but it was written in Paris in 1927 and was dedicated to Saad Zaghloul who died in that year. It is the best example of the curious synthesis I mentioned earlier, the assertion of national character in a literary form emulating the literature of the West. In his autobiographical work, *Sijn el-Umr* (1963), Tawfik el Hakim states clearly that he was in a kind of conflict, whether to write a history of Art, or devote himself to creative writing to introduce new forms and mediums into Arabic. Looking back on those days of his apprenticeship in Paris, he is of course thankful that he chose the latter course of action, and so are we.

نجيب محفوظ Naguib Mahfouz, undisputably the leading Arab Novelist for the last 25 years. was luckier than those first pioneers; he had the work of Tawfik el Hakim, Mazni and Taymour to build on. He too however states clearly that he was primarily inspired by the novel as an art from in the literature of the West. In a famous interview in January 1963, he stated that from 1936 onward he read systematically the great classics of the English, French, Russian, German and American novel, besides the masterpieces of Shakespeare, Goethe, Ibsen, Strindberg, Tenessee Williams and Arthur Miller.

This assertion however, does not imply that the Arabic novel in Egypt has followed slavishly in the steps of European novelists. On the contrary the great novelists in Arabic have made this new art form their own, giving it a distinctively Arabic character.

The conflicting values of East and West

The Arabic novel has frequently been used as a vehicle for resolving the ever recurring theme of conflict between traditional oriental values and the invading technically advanced civilization of the West. Tawfik el Hakim's *Audat al Ruh* or *Resurrection* introduces the conflict on a purely verbal level, an argument between a French archaeologist with deep sympathy and understanding for the Egyptian people and an English inspector, a representative of the ruling British authorities. The Frenchman warns the Englishman to beware of these people, for they have not lost the spirit of the temple. They have vast untapped resources of moral strength, the inheritance of a noble ancient civilization. The cynical Englishman scoffs at these words, but the Revolution of 1919 proves the

or Turkish as the intellectuals of the 19th or 18th century had been. English and French in the orignal or in translations were their means of outlet to the cultures of the world. Dr Hussein Fawzi, a brilliant scientist and essayist who apparently tried his hand at many artistic activities recorded the 'education' of his generation in a series of essays in the weekly number of *Al-Ahram* (Friday) in 1965. He later published them in the *Iqra* series of Dar el-Maaref (June, 1968).

> "We learned the holy *Quran* as children. It set our tongues right and made us truly sensitive to the beauty and genius of the Arabic language. We read a good measure of Classical Arabic literature in the years of our adolescence and early youth, but spiritually and intellectually, we developed and matured in the world of European literature . . ."

Groups of young intellectuals met in the mandaras or male guest quarters of their houses to read the classics of English and French literature. Then followed the discovery of the Great Russians. They dreamt of great modern works they would compose in Arabic on the model of the great Western Classics, dramas, novels and short stories. Yehia Haqi, a young member of the group of "Moderns" in the twenties gives in one of his essays a most interesting account in retrospect, of his infutuation with Russian literature. Dr Hussein Fawzi puts it more bluntly,

> We were all the children of Guy de Maupassant, Balzac, Dostoevsky, Turgenev and Tolstoy. I think we too are descended from Gogol's *Overcoat*,

referring to the famous sentence that the Russian novel was born out of Gogol's *Overcoat*. *Zeinab*, admittedly the first Egyptian novel published, in 1914, was written by Dr Moh. Hussein Heikal in Switzerland out of the author's nostalgia for home. The heroine, a simple peasant girl, has shades of the romantic heroines of French literature and dies of consumption, probably the first of a long line of heroines who die for love in the Arabic novel.

Moh. Abd el-Qader el Mazni, one of the pioneers of the Arabic novel in the thirties wrote in frank imitation of the Russians The first truly great novel in Arabic, عودة الروح *Audat el Ruh* by Tawfik al-Hakim

The English novel as such was first produced in England in the 18th century and in Egypt in the 20th. There seem to be startling similarities in the social and cultural conditions as well as in the reaction of classical established literary opinion, which attended the rise of this new literary form in both countries. The rise of the middle class to social and cultural prominence, the growth of literacy, the steady developing of printing and of publishing as a trade, the development of journalism and consequently of a simple written prose free of flowery ornaments and much closer to the language of every day life, and the increasing number of female readers, creating a market for easy light reading, all were factors that contributed to the rise and popularity of the new literary form. The taste for such reading was created by the great number of translations published since the turn of the century.

In fact the vigorous movement of translation from English and French is the major literary influence in Arabic literature since the beginning of this century.

Modern Egypt was born in the Arabic figurative sense of the word with the great National Revolution of 1919. Much of the literature of the early century was naturally inspired by the Revolution. When it suffered a number of set-backs in the twenties, the young writers asserted their revolutionary sympathies by dedicating their work to Saad Zaghloul, the great leader of the Revolution of 1919.

Some of the first specimens of the novel as a new literary form were dedicated to him. It was one way of asserting the individual independent character of Egypt. That generation saw no contradiction in imitating European literary forms as the novel or the drama, while claiming political independence from an Imperialist European power. One way of asserting their maturity as a nation was the emulation of literary examples from the West. Fortunately for all students of modern Arabic literature we have among us, still active and hale some of those pioneers and their associates, who were young enthusiastic students at the time of the 1919 Revolution. It is their generation that has created modern Egypt and their reminiscent essays are most interesting as well as richly informative.

They were educated in Government schools established after the British occupation of Egypt. They were none of them familiar with Persian

European Influences on the Modern Arabic Novel in Egypt

By

DR. FATMA MOUSSA MAHMOUD

The Arabic novel, like the drama and the short story was borrowed almost entirely from the West. Classical Arabic literature is rich in narrative fiction or 'qasas' of all kinds. Tales, anecdotes and quasi-historical narratives abound in famous compendiums such as Massoudi's *Meadows of Gold*, Yaqut's *Geographical Dictionary* and Maqrizy's *Khitat*. They make enthralling reading because of their strange mixture of the marvellous and the historically authentic. In later centuries the form of prose narrative known as the *maqama* was mainly designed to set off the authors' command of decorative diction. Oriental folk literature was rich with tales narrated orally. *The Arabian Nights* or *Alf Leila wa Leila* were transmitted over the wide area of Arabic speaking countries by mere word of mouth. The opening years of the 18th Century saw their first translation into French. Their translation into English *via* Antoine Galland's French translation helped towards the rise of the English novel as a new literary form.

The Sira or prose romance narrated by itinerant bards was also popular all over Arabic speaking countries. These early prototypes of Arabic narrative fiction testify to the fertility and wide scope of Arab imagination, but they have had little influence on the rise of the novel in Arabic. The novel is probably the most 'modern' of established literary forms in all languages. I am not concerned with *any* form of narrative fiction but with that organized vision of life, expressed in "a fictitious narrative in prose, of considerable length, showing characters in action, with more or less close adherence to the principle of realism." This working definition by Prof. *Ernest Baker* the famous historian of the English novel is probably the simplest and most efficient in our discussions of the novel in any language.

are found in Arabic and Persian loan-words in Turkish. In conclusion, a few points deserve mention. Firstly, until we have printed editions of *Kitāb al-'Ain* and *Kitāb al-Jīm*, with indices of the lexical content in modern dictionary arrangement, considerable information in this field may exist effectively out of reach of scholars. Secondly, scholars will also have to consult Middle Persian vocabulary, together with such as is available for South Arabian. Here it must be stressed that much Persian vocabulary was probably current in pre-Islamic Arabia, including the Western coastal area from Mecca southwards; hence the quotations from Hu<u>dh</u>ail poets. The popular conception that Persian vocabulary came into Arabic largely as a result of Arab conquests may require modifying. The presence of Persian words in the *Qur'ān* has long been recognised. Some of them are acknowledged in the *Jamhara*.

It must be confessed that, despite the shortcomings of an untidy mind, Ibn Duraid emerges with considerable merit from the examination I have made. Of course he lacked modern philological knowledge. And he was partly affected by the medieval Arab's indifference to foreign languages. Thus, while he knows a lot of Persian words, he seems ignorant of Persian syntax. But he was keenly interested in etymology. In fact, he may be regarded as one of the pioneers in the sphere of foreign loan-words in Arabic. His derivations are often accurate or near the mark. His success can be gauged from the fact that, until modern times, what he wrote on this subject was repeated almost verbatim again and again.

---

1. *Arabic Lexicography*, Leiden 1960, 49.
2. Hyderabad (India), 1344 A.H.
3. Vol. III, 499 ff.
4. From photostats of the microfilm of the Baghdad MS in my possession.
5. For a tabulation of such Pehelvi forms, see Geiger and Kuhn, *Grundriss der Iranischen Philologie*, Strassbourg, 1895-1901, Vol. I (i), 277 ff.
6. *Gawaliki's Almu'arrab*, Leipzig 1867.
7. Quadri—and quinqui-literals are listed in haphazard order in each chapter, after triliterals. Skimming through these lists in the MS, the reader is quite likely to miss what he is searching for.
8. Escorial MS, rev. p. 11.
9. *Persian-English Dictionary*, London 1892.
10. Beirut, 1307 A.H., I, 33.
11. III, 347, col. 1.

means التجار النفن يلزمون المعادن that is, "merchants who frequent mines" or "merchants who confine themselves to metals/minerals."

Such examples of the vicissitudes of Persian words in Arabic could be multiplied. I will end, however, with only two more. First, *dardaq* (دردق) which Ibn Duraid defines as الصغار من كل شيء. The poetical example given, by al-A'shā, uses it of young palm trees, if Ibn Duraid is to be credited. He had already included the word in the body of the dictionary,[11] telling us that whereas it originally meant "small/young people", it was extended to everything small. Khalīl had already defined it as "the Young of camels and people", adding the word *dardāq* (درداق) which means "a compact, smooth, flat hill-top". Jauharī defines it as "children", quoting the same poem, and adding "sometimes they used it for the young of camels, but al-Aṣma'ī used it for everything young."

This quotation from al-A'shā is really introduced to illustrate the word *bustān* (بستان), which considerably troubled Arabic philologers. On the face of it, it might be a genuine Arabic word on the measure *fu'lān*. But Jawālīqī was at pains to point out that no reliable Arab authority had ever acknowledged the existence of the root b-s-t. Incidentally, Ibn Duraid defines it as "palm trees". Jawālīqī bears this out, quoting not only al-A'shā, but also Jarīr and some *rajaz*-writers. I have been unable to find the word in Khalīl, Shaibānī or Jauharī. Fīrūzābādī does not define it, doubtless because it was so familiar a word. He tells us that it is Arabicised from *bustan*, without telling us from which language. Strangely, he gives بساتون as well as بساتين as plurals. With his interest in place names, he informs us that Bustān Ibn 'Āmir near Mecca is the "meeting place" (مجتمع) of the Syrian and Yemeni palms. So perhaps we are back with Ibn Duraid's definition. Are we to understand that this was the place where the Syrian type of palm stretched to the North, and the Yemeni type to the South? In modern Persian, *būstān/bustān* of course means a garden. In Arabic it is regarded as more properly a fruit-garden or orchard, but in practice it is used of any garden.

It is hoped that the above examples will have given some idea of the development of words and of lexicographical procedure as applied to Persian loan-words in Arabic. Similar anomalies and points of interest

Ibn Duraid achieves the extreme of ingenious absurdity in his derivation of *qurdumānī* (قردمانى), which is probably not Persian anyway. Without attempting to define it, he derives it from Persian كرد و ماند (كرد و ماندـ) Arabic : *'Amila fa-baqiya* "he made and it remained." Khalīl had defined it as "a sort of coat of mail" (ضرب من الدروهم). If meant as a joke, Ibn Duraid's definition would be widitty, though not on a par with a similar pun by al-Sharīf al-Raḍī : كربلا ما زلت كربا و بلا. Jauharī distinguishes two words. One ending in *alif maqṣūra* (قردمانى caraway) he explains as a medicine derived from Greek *karawya*. The other, *qurdamānī*, he describes as "a stuffed cloak used for war", on the authority of Abū 'Ubaida. He supports it with the quotation from Labīd already used by Khalīl. Fīrūzābādī follows suit, omitting the supporting quotation. As is known, the *Qāmūs* was an abridgement of the author's larger-scale lexicon, omitting most of the *shawāhid*. Jawālīqī, as usual, gives all the preceding information, adding that it was a weapon of the kings of Persia (سلاح الاكاسرة).

There are some Persian words in the *Jamhara* which, as far as I have been able to find so far, are in neither Khalīl nor Shaibānī. For example, *qūsh* (قوش) is given as a corruption of *kūchak* (كوچك) with a quotation from the Omeyyad *rajaz* poet Ru'ba ibn al-'Ajjāj. No Arabic definition is included. Jauharī and Fīrūzābādī tell us that it means "small-bodied". *Fanzaj* (فنزج), also occurring as *fanjakān* (فنجكان) is defined by Ibn Duraid as *dastband* (دستبند). Jauharī, followed by Fīrūzābādī, tells us that it is a dance with joined hands, پنجه in Persian. No doubt he means پنجه (palm).

An interesting corruption of Persian in the *Jamhara* occurs where we read that "the people of Medina call pig's trotters (الاكارع) *bāligha*, that is to say, *payhā* (پايها)". Jauharī gives Abū 'Ubaid as the authority for this, but makes the word look rather more Arabic by adding a "hamza on the line" after the final alif (بالغاء). The *Qāmūs* does likewise.

In cross-checking these medieval dictionaries one occasionally meets an apparent "freak", where one lexicographer differs completely from the rest. A case in point is *darābina* (درابنة), Arabic broken plural of دربان = بواب (doorkeeper). To Khalīl, however, the word merely

Ibn Duraid's interest in etymology, and ingenuity in using the information he obtained, can be seen in his explanation of *buhraj* (بهرج), (Fīrūzābādī, *bahraj*). He defines it as 'useless' (*bāṭil* باطل) and derives it from the Persian negative adjective *nubahra* (نبهره = profitless). Unfortunately, there is a lacuna in Sachau's edition of Jawālīqī[6] where this word might occur. I have not succeeded in finding this word in Khalīl, though it might be there.[7] It is, however, in *Kitāb al-jīm*,[8] where Shaibānī merely writes : وقال بهرج درهم بهرج و دراهم بهرج

Jauharī defines it as "the useless and bad of anything. *dirham bahraj*", and classes it vaguely as Arabicised. Fīrūzābādī says it means الباطل والردى but apparently considers it Arabic. He also introduces the verb *bahraja*, and defines the verbal noun (بهرجة) as "diverting something from its direct course to another." Here we find illustrated the tendency for a single foreign word taken into Arabic to form one or more verbs and other nouns.

Equally ingenious is Ibn Duraid's entry on *samarraj* (سمرج), which he equates with Persian *sā marrat* (سه مرات). He defines it as tax (*kharāj*) collected in three instalments. He quotes the use of the word in a *rajaz* poet identified by Khalīl and Jauharī as the Omeyyad al-'Ajjaj. Khalīl merely defines the word as جباية الخراج (tax collection), without mentioning the three instalments. Could he have thought this point unworthy of mention, or was it a later fabrication? To me, Ibn Duraid's etymology seems too good to be true. If it is true, then it is a rare if not example of an Arabic word (*marra*, pl. *marrāt*) not only being combined with a Persian numeral, but being given a Pehlevi ending (K/g).

Another compound source incorporating a Persian numeral is *dayābūdh*, said to be *duwwābūdh* in Persian. This word is odd for an Arabic broken plural, to say the least. The meaning given is "cloth woven in double woof." Jauharī gives the source as *dū pūdh* (دو پوذ). By Fīrūzābādī's time apparently the singular *daibūdh* (ديبوذ) was in use in Arabic, with both *dayābūdh* and *dayābīdh* as broken plurals, with final dāl sometimes replacing dhāl. According to Steingass,[9] *dū pūd* or *dū pūdah* (دو پوده / دو پود) means cloth woven in streaks or stripes of two colours. *Pud* is the woof or cross threads of cloth, the opposite of *tār*, the warp or lengthwise threads.

interest to Ibn Duraid's comments. It is interesting to note that his poetical supporting examples are often from the Hudhail tribe. Now this tribe lived south-east of Mecca, nowhere near Persia. Moreover, poets quoted are sometimes pre-Islamic as well as Omeyyad. We are led to suspect that there was quite definite Persian influence in pre-Islamic and early Islamic poetry, similar to that in music.

On the other hand, Islamic scholars writing in Arabic were notoriously neglectful, not to say ignorant, of any other languages apart from *lughat al-ḍād* (لغة الضاد), the language of the *Qur'an*. Is there, I wonder, any significance in the fact that Khalīl used the term dakhīl (دخيل - intruder) of foreign words? Thus, while Ibn Duraid must be given pride of place among the lexicographers for this knowledge of derivation, he is apparently ignorant of the common Pehlevi noun/adjective ending in k(g), which appears in Arabic as kāf, qāf, ghain or jīm.[5] All he realised was that some Arabic words ending in these letters were forms of contemporary Persian words ending in the letter *he*. For example, he mentions that the people of Iraq call a sort of silk *saraq* (سرق) meaning *sarah* (سره), "and it was Arabicised". The *Qāmūs* tells us that it means strips of silk, without mentioning that it is Persian. Jawālīqī, following Jauharī, merely adds to Ibn Duraid that *sarah* means *jayyid* (جيد - excellent) in Persian. In fact, one of the meanings of the word in Persian is pure, unmixed, and it was thus applied to good, as opposed to forged, money. As used of silk, it implied whiteness. Ibn Duraid recognised khandaq (خندق) as Persian *kandah* (كنده), Arabic *maḥfūr* (محفور) and he is followed by Jawālīqī. Yet Jauharī ignores the word.

On the other hand, in at least one instance, Ibn Duraid took this final to be an abbreviation of the Persian past participle *kardah* (كرده) made, done, *Muhraq* (مهرق=parchment) he explains as rags for writing on, polished with shells, *ay muhr kard, ay ṣuqilat bi l-kharaz*. He does not appear to know the passive verb in Persian. He had obviously heard the word *muhra* (مهره = a shell used for smoothing). But *muhr* means, among other things, a seal, and *muhr kard* (مهر كرد) would mean "he sealed".

an uncritical compendium of previous works quoted practically verbatim, even to the poetical examples. The main sources seem to have been ibn Duraid's *Jamhara*, *Gharīb al-muṣannaf* by Abū'Ubaida (773-837) and Ibn Qutaiba's *Adab al-Kātib* though only these authors' names are mentioned, not the titles of their books.

Of the authors of the works I have consulted, Khalīl was born in Oman and worked in Basra, but he spent some time in the Persian region; for his dictionary is believeed to have been compiled in Khorasan. Ibn Duraid belonged to an Oman tribe but was brought up in Basra. However, he spent some time in Fārs, where he wrote his *Jamhara*, dedicating it to the Governor and his son. Jauharī was born in Transoxiana, but spent much of his life in the Arab world. Yet his *Ṣaḥāḥ* was compiled in Khorasan. Fīrūzābādī was probably the most Persian of them all, being born near Shiraz. Yet he spent a good deal of his life in other countries, ranging from India to the Yemen. He probably wrote his *Qāmus* in the latter country. Jawālīqī, despite his Persian name, was a native of Baghdad. Thus the geographical affiliations of these lexicographers does not give us much clue to the possible reliability or otherwise of their etymological information.

In general, the later the date of a dictionary, the more Persian vocabulary it included. This is only to be expected, as Persian influence on Arabic culture increased sharply from the advent of the Abbasids onwards. Again, in general, the acknowledgement of Persian origins increased—though at times the term *mu'arrab*, omitting *fārisī*, was used. But again, many Persian words had been taken over by Persian writers in their Arabicised forms. This did not assist accurate etymology. The Arabicised form might be considered to be the Persian original; or, on the other hand, it might be supposed to be a 'pure' Arabic word adopted into Persian. A case in point is *'askar* (عسكر), which Ibn Duraid rightly derives from Persian *lashkar* (لشكر). But Jauharī appears to regard it as Arabic. Fīrūzābādī recognises it as Persian, without mentioning the Persian original.

It is not surprising that the Persian source should escape later lexicographers, especially where the Arabic form resembled Middle Persian or Pehlevi, albeit corrupted to some degree. This factor gives added

Persian Vocabulary in the *Jamhara* of Ibn Duraid (837-934 A.D.)

By
PROFESSOR JOHN A. HAYWOOD
University of Durham

The subject of non-Arabic vocabulary in the Medieval Arabic dictionaries has as yet received scant attention from scholars. Elsewhere,[1] in discussing Ibn Duraid's *Jamhara*, the second major Arabic dictionary chronologically speaking, I drew attention to the numerous supplementary chapters which follow the dictionary proper, as printed in the Hyderabad (India) edition,[2] including the one of foreign vocabulary. This chapter[3] is entitled "باب ما تكلمت به العرب حتى صار كاللغة" (The chapter on such foreign speech as the Arabs spoke until it became like the language, i.e., until it was recognised as idiomatic). While this chapter deals with words derived from several languages, it is the first section, dealing with Persian, which is the subject of this paper. This contains about thirty words. Further Persian words are mixed with the section headed "Among that taken from Syrian". Some of these words—though not all—have already occurred in the dictionary proper; while the latter also contains some Persian words not found in the supplementary chapter. But then, the *Jamhara*, though written by a great scholar, and of enormous interest, is a ramshackle work. In examining this section, I thought it might be of some interest to compare the definitions and derivations given with the entries for the same roots in the first Arabic dictionary, *Kitāb al 'ain* of al-Khalīl ibn Ahmad (718-791)[4] written a century earlier, and in two later dictionaries the *Ṣaḥāḥ* of al-Jauharī (d. 1007) and the famous *Qāmūs* of al-Fīrūzābādī (1326-1414). A sidelong glance was also cast at the dictionary/vocabulary *Kitāb al-Jīm* by Khalil's contemporary, Abu 'Amr al-Shaibānī from the Escorial manuscript, without much result. Finally, the standard reference on Persian vocabulary in Arabic, *Kitāb al-mu 'arrab* by al-Jawālīqī (1073-1134) was consulted. I must make it clear at the start that the latter work is largely



28. Page 9.

29. *Al-Isālm*, pp. 56-57.

30. Page 23 (Fr. tr., p. 18 ; Eng. tr., p. 39).

31. '*Aqā'id*, p. 31; cf. *Ris. taw.*, pp. 52, 159 (Fr. tr., pp. 37, 108-109; Eng. tr., pp. 56, 127).

32. References above, n. 22.

33. Pages 4-5.

34. Pages 15, 20 (Fr. tr., pp. 12, 17 ; Eng. tr., pp. 35, 38) and n. 1 by Riḍā'.

35. *Ris. taw.*, p. 44 (Fr. tr., p. 32 ; Eng. tr., p. 53) ; cf. similar emphasis on reason in *al-Islām*, pp. 48, 51.

36. E.g., pp. 8-9 ; cf. pp. 33-34, 57.

37. '*Aqā'id*, pp. 49-51 ; *Ris. taw.*, pp. 24-43 (Fr. tr., pp. 20-32 ; Eng. tr., pp. 41-52, ed. Mitchel, p. LVI ; Harry Austryn Wolfson, *The Philosophy of Spinoza* (2 vols. ; Cambridge, Mass. : Harvard University Press, 1934), I, 187-88, 193-94 ; Majid Fakhry, "The Classical Islamic Arguments for the Existence of God", *Muslim World*, XLVII (1957), 135.

38. '*Aqā'id*, p. 50 ; *Ris. taw.*, pp. 41-43 (Fr. tr., pp. 31-32 ; Eng. tr., pp. 51-52) ; cf. pp. 31-32 (Fr. tr.. pp. 24-25 ; Eng. tr.. pp. 45-46).

39. '*Aqā'id*, pp. 4, 74-78 ; *Ris. taw.*, pp. 3, 52, 129, 152, 201 (Fr. tr., pp. 3, 36, 88-89, 104, 137 ; Eng. tr., pp. 28, 56, 108, 123, 155).

5. Al-Bannā', *Min khuṭab Ḥasan al-Bannā'*, Vol. I : *Kayfa nafham al-Islām* (Damascus : Maṭba'at al-Ittiḥād al Sharqī, (1949 ?]), p. 14 ; Husaini, *op. cit.*, p. 41.

6. Idem, *Mudhakkirāt al-da'wa wa 'l-dā'iyya* (Cairo : Dār al-Kitāb al-'Arabī bi-Miṣr, (ca. 1951), pp. 49-50.

7. Idem, *Muqaddima fī 'l-tafsīr wa tafsīr al-Fātiḥa* (Cairo : al-Maṭba'at al-'Ālimiyya, n.d.), p. 20 ; Mitchell, *op. cit.*, p. 322.

8. Idem, *Barnāmaj thaqafī mihnī li-'l-mudarrasīn* (Cairo, 1952), p. 7 ; (Mitchell, *op. cit.*, p. 323.

9. " *'Allah' fī 'l-'aqidat al-islāmiyya*" in his *Salām wa buḥūth ukhra* (Cairo : Dār al-Fikr al-Islāmī, 1957), p. 54, n. I.

10. Ed. Raḍwān Muḥammad Raḍwān (Cairo: Dār al-Kitāb al-'Arabī, 1371/1951), pp. 14, 66.

11. (6th ed., Cairo : Maṭba'at al-Manār, 1351/[1932]), p. 48 n.

12. See, e.g., *Risālat al-Tawḥīd* (12th ed., Cairo : *al-Manār*, 1366/1946), pp. 45, 201, 202, 203 (R. Caspar, *op. cit.*, p. 161, n.1. Also notice that 'Abduh's espousal of the creation of the *Qur'ān* in the first edition of the *Risālah* [Cairo : Būlāq, 1315/1897 ; French trans. B. Mitchel and Moustapha Rasik, *Risālat al-tawḥīd* (*Paris : Librairie* Orientaliste Paul Geuthner, 1925), pp. 33-34] is deleted in subsequent editions and in its place are extensive notes by Riḍā on the orthodox view of the speech of God's essence (*nafs*), which is eternal and His expressed (*lafẓ*) speech, which is created (6th ed., p. 45, n. 1).

13. *'Aqā'id*, pp. 74-78 ; *Ris. taw.* (6th ed.) p. 202 [French trans., pp. 137-38 ; English trans. Ishaq Musa'ad and Kenneth Cragg, *The Theology of Unity* (London : George Allen and Unwin Ltd., 1966), pp. 155-56.]

14. Page 77.

15. *'Aqā'id*, pp. 64-65, 74 ; *Ris. taw.*, pp. 8, 17-18, 54-55, 61, 124-25 (Fr. tr., pp. 7, 14,-15, 38, 43, 85 ; Eng. tr., pp. 31-32, 36-37, 58, 63, 104).

16. *'Aqā'id*, pp. 4, 21, 51, 74 ; *Ris. taw.*, pp. 2-3, 65, 89, 202 (Fr. tr., pp. 2-3, 46, 61, 138 ; Eng. tr., pp. 27-28, 66, 81, 156).

17. *'Aqā'id*, p. 21 ; cf. *Ris. taw.*, pp. 3, 65 (Fr. tr., pp. 3, 46 ; Eng. tr., pp. 28, 66).

18. *'Aqā'id*, pp. 13, 49; *Ris. taw.*, pp. 50-52 (Fr. tr., pp. 35-37; Eng. tr., pp. 54-56).

19. *'Aqā'id*, pp. 4, 9 ; 'Abduh, *Islām wa 'l-Naṣrāniyya*, ed. Rashīd Riḍā' (8th ed. ; Cairo : Dār al-Manār, 1373/1954), p. 57.

20. *'Aqā'id*, pp. 14, 15, 20.

21. *Ris. taw.*, p. 202 (Fr. tr., p. 137 ; Eng. tr., p. 156) ; cf. Caspar, "Le Renouveau," p. 162 ; O.Amin, *'Abduh : Eassai*, pp. 134-35.

22. *'Aqā'id*, pp. 14, 66 ; *Ris. taw.*, p. 48 (Fr. tr., p. 34 ; Eng. tr., p. 53).

23. See above nn. 9, 11.

24. Pages 162-63.

25. Page 49.

26. Pages 46, 48, 61.

27. Page 91 (Fr. tr., p. 62; Eng. tr., p. 82).

by the Muslim Brethren. These facts have been confirmed by conversations the present writer has had with Muḥammad al-Ghazali, a close associate of al-Banna for many years. It has been demonstrated that al-Banna evidently quoted from Rida's edition of the *Risālah* when he wrote his *'Aqā'id.* Furthermore, the structure of thought and even the wording of the two men have parallels which go beyond what could reasonably be expected apart from al-Banna's dependence on 'Abduh and the milieu which the latter helped to create. The reasons for the similarity of their views stem from more than al-Banna's apparent use of the *Risālah.* 'Abduh's theological writing ascribes less prominence to reason than does his apologetic writing, and the men have been compared primarily in the area of theology. Also 'Abduh is most conservative in his doctrine of God, and that is the only area where they can be compared in depth because the *'Aqā'id* was never completed beyond this doctrine. The differences between the two men have been noted by others and are too obvious to need development here. The paper has merely sought to point out that the extent of the similarity between the two men and the theological influence of 'Abduh on al-Banna has not been sufficiently appreciated.

FOOT-NOTES

1. Louis Gardet and M. M. Anawati, *Introduction à la theologie musulmane* (Paris : J. Vrin, 1948), pp. 83-86; R. Caspar, "Le renouveau du Mo'tazilisme", MIDEO, IV (1957), pp. 157-172, esp. 158, nn. 2-5 ; Osman Amin, *Muhammad 'Adbuh : Essai sur ses idées philosophiques et religieuses,* (Cairo : Imprimerie Misr, 1944), pp. 43--53, 99, 136 ; and Jacques Jomier, *Le commentaire coranique du Manar* (Paris : Maisonneuve, 1954), pp. 67-69.

2. Christina Phelps Harris, *Nationalism and Revolution in Egypt : The Role of the Muslim Brotherhood* (The Hague : Mouton, 1964), p. 161.

3. Al-Ḥajjājī, Aḥmad Anas., *Ruḥ wa rayḥān,* (Cairo : Dār Iḥyā' al-kutub al-'Arabiyya, 1365/1946), p. 121 : Ishak Musa Husaini, *The Moslem Brethren,* trans. John F. Brown and John Racy (Beirut : Khayat's, 1956), p. 108 ; Richard P. Mitchell, *The Society of the Muslim Brothers,* (London : Oxford University Press, 1969), pp. 321-28.

4. Al-Ḥajjājī, *op. cit.,* pp. 101-13 ; Husaini, *op. cit.,* p. 26.

to Avicenna and Al-Fārābī.[37] 'Abduh had argued that, if there were a number of necessary beings, irreconcilable discord (*khilāf*) would result from their power to determine things (*taṣarruf*) but this disorder (*fasād*) is rationally impossible. Al-Fārābī, while using these same Arabic words, argues briefly that for one or more creators to have the power to determine things would render some of the attributes of others ineffective, which is *ta'ṭīl* (divesting God of His attributes). Thus the force of his arguments was not like 'Abduh's, that a multiplicity of "necessary beings" would lead to a rational impossibility, but that more than one creator would lead to heresy. Thus he used one aspect of the nature of God to prove another aspect.[38]

Though a detailed comparison of the *contents* of 'Abduh's *Risālah* and al-Banna's *'Aqā'id* is impossible here, a comparison of their treatment of the anthropomorphic terms described to God in the *Qur'ān* will help us to see further the relationship between the two men. They both sought, in the tradition of the Reformers, to return to the example of the Ancestors (*salaf*), but accepted the legitimacy of both *tafwīḍ* (leaving their meaning to God) and *ta'wīl* (interpreting them), recognizing that man could not understand the nature of the attributes so had to leave their meaning to God, and recognizing that the corporeal terms could not be taken literally, so some interpretation was necessary. Yet al-Banna appeared more content with the agnostic position than 'Abduh was in reality, for the latter implied that these terms were to be interpreted metaphorically when he insisted that they were easily understood by their original hearers.[39]

In conclusion, the *'Aqā'id* of al-Banna shows a closer relationship to the theological writings of 'Abduh than some previous studies would suggest. As noted at the beginning of this paper, 'Abduh has at times been portrayed as a free-thinker and rationalist; while al-Banna has been thought of as a strict Hanbalite who relied solely on the literal interpretation of the *Qur'ān* and the Sunna. A strong case can be made for these interpretations, but they have tended to obscure the considerable dependence of al-Banna on the theological writing of 'Abduh, in particular on the respective roles of reason and authority in theology.

We have noted that al-Banna considered himself in the reforming tradition of 'Abduh and recommended the use of the *Risālat al-tawḥīd*

beliefs (*'aqīda*) .... from any other source than the Book of God and the Sunna of His Apostle".[29] Reason and authority are likewise held to be complementary foundations in 'Abduh's *Risālah* where, in figures of speech similar to his *al-Islām* and al-Banna's *'Aqā'id*, he affirmed: "The Islamic religion possesses unity in its beliefs (*'aqā'id*) and is not based upon divergent foundations (*qawā'id*) : reason (*'aql*) is one of the strongest of its supports (*a'wān*) and that which has been transmitted (*naql*) is one of firmest of its pillars (*arkān*)".[30]

There are also similarities between the two men's writings with respect to the limits of reason. According to both of them, man has specifically been barred from using reason to investigate the essence (*dhāt*) of God.[31] Again the above-mentioned quotation which al-Banna evidently derived from 'Abduh is used to support these limits: "Reflect concerning the creation of God but do not reflect concerning God, for you will certainly never be able to fathom Him".[32]

Both men made a clear demarcation between the sphere of secular science and philosophy—where reason's role was unrestricted—and the sphere of theology—where its role was carefully controlled. In order to guard himself against the charge of violating this demarcation, al-Banna was careful to point out that his use of modern theories to deduce the Islamic beliefs was not done "as a means of mingling (*mazj*) and mixing (*ikhtilāṭ*) them".[33] This statement not only echoes ones of 'Abduh and Rida in the *Risālah* but even uses words from the same two Arabic roots to describe the unwarranted mixing.[34]

There is a difference in emphasis, however, between the writings of 'Abduh and al-Banna in the role of reason in theology. In one place the former even gave the revealed Law the function of corroborating (*ta'yīd*) the attributes of God which had been arrived at through reason.[35] But al-Banna was careful always to give reason the secondary function of corroborating (*ta'yīd*) what had been established by revelation.[36] Furthermore, 'Abduh featured the rational arguments for the existence of God at the beginning of the *Risālah* while al-Banna gave them a secondary role. And al-Banna mentioned but did not develop the argument from contingency—the argument that 'Abduh made foundational in his *Risālah* and which can be traced through the theological literature

the chain of transmitters or the text of some of the traditions themselves to the criticism that 'Abduh sometimes practiced.[21]

Rather it is surprisingly in their use of reason and statements about it that striking similarities are found between the writings of the two men, both in thought and wording. Both support the use of reason in theology by quoting the same tradition (*ḥadīth*): "Reflect concerning the creation of God...."[22] And, as noted above, al-Banna evidently obtained this quotation from Rida's edition of 'Abduh's, *Risālat al-Tawḥīd*.[23] The same quotation with its documentation by Rida is also found in 'Abduh's *al-Islām wa 'l-Naṣrāniyyu*.[24]

The parallels in thought and wording between al-Banna's *'Aqā'id* and the latter work are seen in still another argument for the use of reason in theology. Al-Banna approved of buttressing the establishment of the attributes of God by rational proofs (*adilla 'aqliyya*) and logical deductions by analogy (*aqyisa manṭiqiyya*) on the grounds that "reason (*'aql*) is the foundation (*asās*) of knowledge".[25] 'Abduh had affirmed that some of God's attributes could be deduced by sound analogy (*qiyās*) and rational proof (*al-dalīl-al-aqlī*). Then he added, as the first principle of Islam, that reasoning (*al-naẓar al-'aqlī*) was Islam's primary foundation (*asās*).[26] Likewise in the *Risālah* 'Abduh argued that "thought (*fikr*) and reason (*'aql*) are the pillar (*rukn*) of life and the foundation(*asās*) of existence".[27]

The same tension between reason and authority is seen in both men's works and with sufficient parallels in thoughts and words as to suggest an influence of the former upon the latter when these are considered in conjunction with the facts that have been pointed out, that al-Banna recommended the study of 'Abduh's *Risālah* and evidently quoted directly from it. As noted, al-Banna asserted that reason is "the foundation (*asās*) of knowledge" ; yet on the other hand he affirmed that the *Qur'ān* and the Sunna are "the foundation (*asās*) of the Islamic beliefs (*'aqā'id*)".[28] As 'Abduh's first principle of Islam has been seen to correspond to al-Banna's reference to reason so his fifth principle corresponds with al-Banna's references to the *Qur'ān* and the Sunna. In the latter principle 'Abduh attempted to treat the topic of religious authority "from its foundation (*asās*)" and asserted that "it is not necessary for the Muslim to take his

twice in his *'Aqā'id*[10] and said that the documentation is found in a footnote by Rashid Rida to 'Abduh's *Risālat al-Tawḥīd*.[11] Thus the edition that al-Banna used was not the original unedited one of 1897 but one of the later ones that had been interpreted by Rida in a slightly more conservative way.[12]

Having seen that al-Banna recommended that 'Abduh's *Risālah* be read and that there is evidence that he consulted the former work when writing his *'Aqā'id*, we shall compare the contents of the two works. In particular we shall consider some of their characteristics and theological methods.

When we turn to the **characteristics** of their works, we see that both had an *irenic spirit*. For example, in their treatment of the corporeal terms ascribed to God in the *Qur'ān*, both men accepted the legitimacy of the slightly divergent views of the Ancestors (*salaf*—who accepted these terms without comment, leaving their meaning to God) and the Successors (*khalaf*—who interpreted these terms whenever their literal meaning appeared impossible).[13] Yet there is no evidence of direct dependence since al-Banna supports his view by references to al-Nawawī (d. 676/1277) and al-Rāzī (d. 606/1209),[14] not 'Abduh. Yet this emphasis of al-Banna and 'Abduh on conciliation and the broad middle ways involved a rejection of extremism in either direction, such as anthropomorphism (*tashbīh*) or divesting God of his attributes (*ta'ṭīl*).[15]

Secondly, both are **popular** in form of presentation, with a conscious effort to avoid technical terms and arguments.[16] Likewise, both are **practical**. For example, al-Banna declined to discuss whether the name "Allah" was derived, not only because it was controversial but also because nothing practical resulted from it.[17] And when both men claimed that man could not know the true nature of things or of God's attributes, they were quick to add that man did not need this knowledge.[18]

When we look at their **theological method** we see that both understandably believed that doctrine should be based on the two sources of authority, the *Qur'ān* and the Sunna[19]. In this al-Banna accepted the traditional criterion of authenticity for the traditions (i.e., whether its chain of transmitters was sound).[20] Nowhere, however, did he subject

The Influence of Muhammad 'Abduh on Hasan al-Banna's *'Aqa'id*

By

DR. J. DUDLEY WOODBERRY
Harvard University

'Abduh has at times been portrayed as a free-thinker and rationalist.[1] On the other hand, al-Banna has been thought of as a strict Hanbalite who relied solely on the literal interpretation of the *Qur'ān* and the Sunna and who, unlike 'Abduh, saw no need for a restatement of Muslim doctrine.[2] The present paper will seek to test the validity of these views with respect to the major writings of both men on the doctrine of God.

First, it should be noted that al-Banna considered that his movement, the Muslim Brethren, was in the reforming tradition associated with 'Abduh and his more conservative follower Rashid Rida. But the Brethren saw themselves as the ones who brought the previous reforms to practical fruition in a total program that applied to all areas of life.[3] His father, who influenced him greatly, had studied at al-Azhar when 'Abduh was there.[4] Al-Banna's sympathy with the spirit of the reforming movement is seen in his reference to the message of his Society as "a Salafiyya Message".[5] He used to go to the Salafiyya bookstore and meet with Rida and others of this group.[6] And he considered their journal *al-Manār* "the greatest influence in the service of Islam for this era in Egypt and elsewhere".[7]

Secondly, of more significance is the fact that 'Abduh's *Risālat al-Tawḥīd* was included, with a limited number of general studies of the faith by al-Banna and his colleague Muhammad al-Ghazali, in a reading list for teachers of the Society of the Muslim Brethren.[8]

Thirdly, in addition to this recommendation of the book, it is evident that al-Banna consulted 'Abduh's *Risālah* when he wrote his *'Aqā'id*, for in a subsequent summary and revision of the contents of the *'Aqā'id*,[9] al-Banna reproduced a quotation and its documentation that appeared

College's dignity and fame as one of the best centres of Oriental Studies in the sub-continent. I congratulate them on their splendid achievement, and hope that the College will survive long enough to celebrate many more centenaries of its fruitful career. My best wishes go with it.

Today's after-noon session of the Arabic and Islamic Studies Section promises to be a really interesting one as we have here with us a number of distinguished Pakistani and foreign scholars who have come to read their learned papers bearing on very diverse topics. I am sure all of you are looking forward eagerly to listen to them, and so I would now cut short my address and request Dr Ehsan Elahie Rana to kindly commence the proceedings of the meeting forthwith.

Thank you.

DR MOHAMMAD WAHID MIRZA

I continued to be in touch with Professor M. Shafi after I went away to Lucknow in 1925, and occasionally wrote articles at his behest for the Oriental College Magazine which had attained a remarkably high literary standard under his capable editorship. I also met him as well as Dr Mohammad Iqbal, Professor of Persian at the Oriental College, from time to time in Lahore or Lucknow where they used to be invited to attend the meetings of the Committees of Courses in Arabic and Persian respectively. Other teachers of the Oriental College whom I had the pleasure of meeting during my stay in Lahore, included Dr Barkat Ali Kuraishi and Maulavi Syed Mohammad Talha, as well as Dr Syed Mohammad Abdullah, now Chief Editor, *Urdu Encyclopaedia of Islam*, and Hafiz Mahmud Sherani.

When I came back to Lahore in 1962 to join the editorial staff of the *Urdu Encyclopaedia*, some of these old contacts were renewed and several new ones formed, and thus my close association with the Oriental College received a fresh lease of life. I have had an opportunity since then of participating in several of its academic and extra-curricular activities, and remember particularly the occasion when I was asked by Dr S. M. Abdullah, the then Principal of the College, to preside at a lecture by the well-known Turkish scholar Sharafuddin Iz jointly with Mian Bashir Ahmad—a happy innovation of his, which aroused considerable curiosity and interest among the auidence. It is, therefore, a matter of great pride and pleasure for me, as indeed for all those who have been connected with it in one capacity or another, to see this old seat of Oriental Learning complete the first one hundred years of its eventful life. Our thoughts on this memorable occasion naturally go back to the former College principals, especially Dr A.C. Woolner and Professor Mohammad Shafi. They are no longer with us, but some of their able pupils and associate are still there, and one could confidently hope that under thier wholesome inspiration the College will continue to grow from strength to strength with the active support of its well-wishers and present custodians, including Justice S.A. Rahman, Principal Ebadat Brelvi, and Dr Ehsan Elahi Rana and his younger colleagues who have done more than any one else to make the Centenary celebrations a success. The fairly large number of foreign scholars who are attending this Congress is eloquent testimony to their zeal and enthusiasm and is symbolic of the

Address

by

DR. M. WAHID MIRZA

Ladies and gentlemen,

I consider it a great privilege to have been invited to preside at this meeting of the Arabic and Islamic Studies section of the International Congress which is being held in connection with the first centenary celebrations of the Lahore Oriental College, and wish to express my gratitude to its organisers, particularly to Dr Ehsan Elahie Rana, its able and energetic Secretary, for their kind invitation.

My association with the Oriental College goes back to the years 1919-1921, when I was a student of the M.A. class in Arabic at the Government College, Lahore, and in accordance with the inter-collegiate classes system then in vogue, had to attend lectures twice a week at this College also. Maulavi Najmuddin, a fine gentleman and a profound scholar, used to teach us the *Mukhtasar al-Ma'ani* of Sa'duddin al-Taftazani, while Professor Mohammad Shafi, who had recently replaced Dr. Azeemuddin as Professor of Arabic, taught history of Arabic literature and Ibn Qutaiba's *Kitab al-Shi'r wa'l-Shu'ara*, the rest of the prescribed courses were taught by our College Professor of Arabic, Dr Sadruddin, with the exception of *Tafsir-i-Baidawi*, which was taught by another renowned scholar, Maulavi Asghar Ali Roohi of the Islamia College, Lahore. Having passed the M.A. examination in 1921, I worked for another two years as a research student under the watchful guidance of Professor Mohammad Shafi. The Punjab University having awarded me the Mcleod, Patiala and Bahawalpur State Scholarships for this purpose and although I used to work in the University Library, where Professor M. Shafi had also his seat, I had frequent occasion to visit the Oriental College and to watch its progress from close quarters. I still cherish the fondest memory of those early days and feel the greatest admiration for the learned teachers with whom I came into contact during that period.



پروفیسر ڈاکٹر وحید مرزا

Memani all have mainly striven to work for humanity and universal peace, yet, without a shred of doubt we can say that it is due to the intellectual results produced by them that in the thirties of this century the conception of Pakistan emerged in the minds of the people of this sub-continent. Therefore we may regard the Oriental College, viewed in this light, as engaged in the same cause and leagued in a holy confederacy with Islam; we may consider the teachers, professors and poets and thinkers who happen to be associated with this institution as preparing the way, by a special dispensation of God's providence, for the creation of a separate homeland for the Muslims of this country.

This is a fact well worthy of attention; nor is it a matter of vain or idle speculation to examine the causes which led to so remarkable a result!

Now, to celebrate the first centenary of the Oriental College, though for some unavoidable circumstances belated by two years or three, and to commemorate the glorious achievements of our fore-runners and to pay them due homage, we have gathered together today in the fold of an International Congress of Orientalists. Most fortunately for us, a pretty large number of renowned scholars of Arabic, Persian, Urdu and Islamic Studies hailing from Afghanistan, the Arab countries, England, Germany, Iran, the Netherlands, Soviet Union, Turkey and the United States have joined us on the occasion. We are indeed very grateful to them. We also thank our friends and colleagues from the various Universities and Research Institutes of Pakistan for their participation in this Congress to make it a success.

To preside over this session of the Congress reserved for Arabic and Islamic Learning, we have invited Professor Dr. Muhammad Waheed Mirza the great pupil of the late Mawlawi Muhammad Shafi. We express our deep gratitude to him for having accepted our humble request. We are indeed proud of Professor Waheed Mirza.

Now, with my head bowing, I stand and wait for Professor Waheed Mirza who would kindly conduct himself to the dais and occupy the chair.

(Dr RANA M. N. EHSAN ELAHIE)

بسم الله الرّحمن الرّحیم

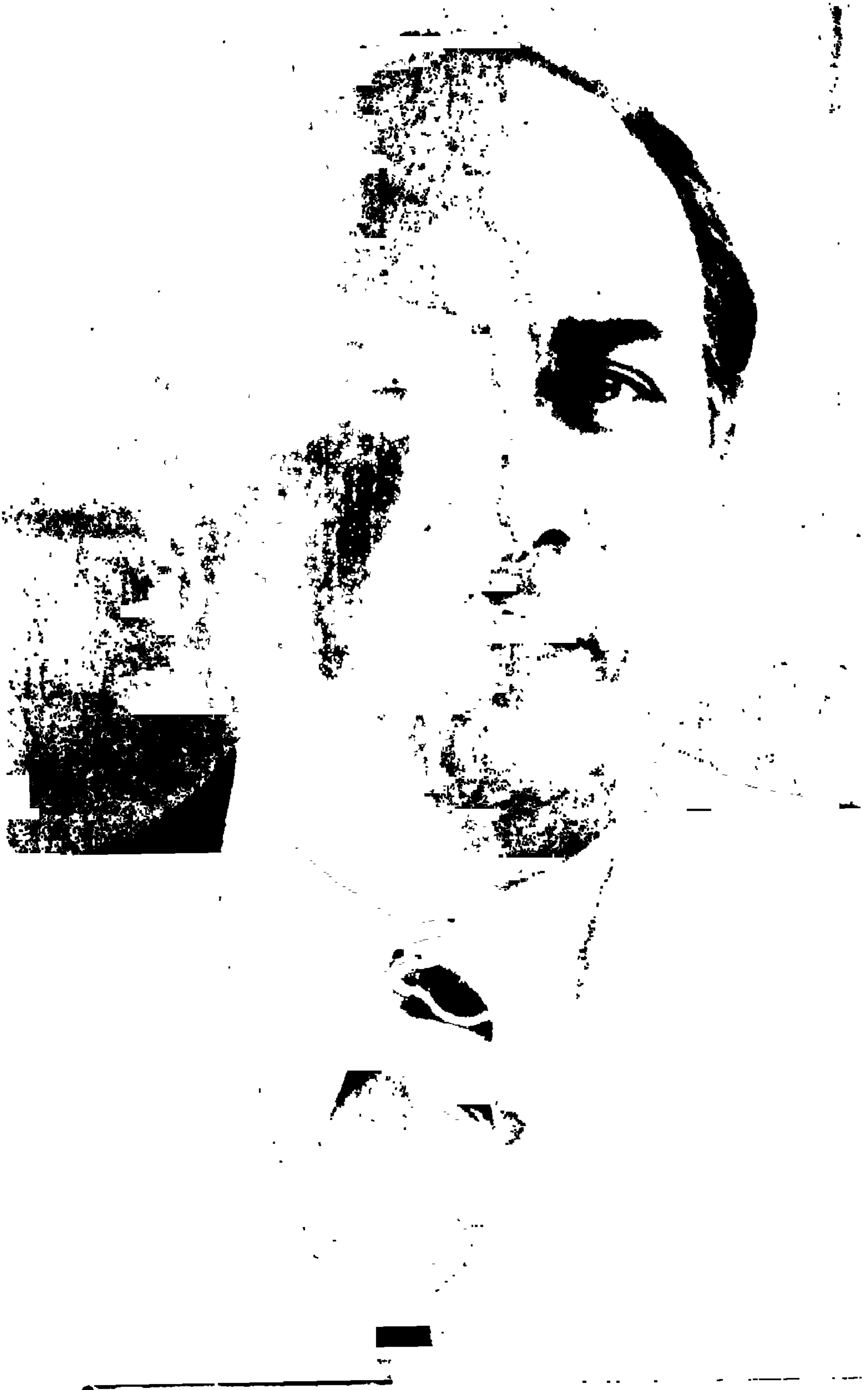
الحمد لله ربّ العالمین و احسن التحیّات و السلام علی خاتم النبیین ورحمة للعالمین سیّدنا محمد و علی آله واصحابه اجمعین . امّا بعد

Ladies and gentlemen,

To describe the Oriental College, or to properly relish the fruits of the labours of its builders, a man should be an old Old-Boy of this old seat of learning. He should have long looked upon its gates and class-rooms with a feeling of almost religious reverence. He should have regarded it as ennobled by the achievements of its illustrious teachers, and have recognised in them his own progenitors. The records of its early history should have been familiar to him from his childhood—have sprung up, as it were, spontaneously in his mind, and have grown with his growth. Nor should the period of its remote antiquity be to him a land of shadows in which unsubstantial figures move before his eyes as if he were entranced in a dream.

This, we gladly confess, is not our case. None of us has so far lived so long, and have only few of us worked so hard. We can talk of this College with avowing the fact, that it is impossible, at this time, to convey or entertain an idea of the Oriental College such as it appeared of old to the eyes of one of its pioneer teachers or their pupils. But there is another point of view from which we love to contemplate it—one which supplies us with reflections of deeper interest, and raises in the heart sublimer emotions than could have been ever suggested in the earliest days by the sight of this College to its teacher or student.

To the Oriental College, it is to be attributed that precisely at the season when such a channel of general communication was most needed, there existed here ample provision for studying Urdu besides the Classical Languages of the Muslims—Arabic and Persian—and Islamic Law. Although the early teachers and students of this College, like Dr Leitner, Sir Aurelstein. A. C. Woolner, Sir Muhammad Iqbal, Mawlawi Muhammad Shafi, Mahmud Sherani, Dr Iqbal, Lachman Sarup and



ڈاکٹر رانا احسان الٰہی ۔ صدر شعبۂ عربی

and labour with which he undertook a survey of this area, collected material and presented it to scholars. Although Linguistics as a sci has assumed greater significance today, Dr. Lietner's work still rem the most authoritative and scientific account of the languages and dia of this area. The greatest homage that we can pay to the memory of Lietner will be a monograph on his life and works—a task which I h this small article will induce our young scholars, to undertake and c forward the tradition of true scholarship associated with the great n of Dr. Lietner. I will end this by a statement of institutions with w Dr. Lietner has been associated.

1. The oriental section of King's College, London, 1861.
2. The London Society of German Savans (1864).
3. A debating society in London.
4. Foundation member Anthropological Society, Vienna, 1869.
5. Government College, Lahore, 1864.
6. The Anjuman-i-Punjab (Between 1864-1872).
7. Punjab University College with four faculties of Arts, Orie Languages, medicine and Law.
8. The Oriental College, originally an oriental school, which other schools was supported by the Anjman-i-Punjab befor Punjab University College was established.
9. Organised and opened to regular official inspection for the time in Punjab 50 Female schools in the Rawalpindi circle in 1
10. Was the first European President of a native committee fe-male Education 1864.
11. Started 22 Muhammaden and Hindu denominational sc by subscription and a number of secular government schools.
12. Opened a higher English school preparing for university mat lation at Gujrat.
13. Founded English school at Lahore.
14. First Registrar, University of the Punjab.

THIRD SESSION

☆

ARABIC & ISLAMIC LEARNING

☆

1. Dr Rana M. N. Ehsan Elahie
2. Dr M. Wahid Mirza
3. Dr J. Dudley Woodberry
4. Professor John A. Haywood
5. Dr Fatma Moussa Mahmoud
6. Professor J. C. Burgel
7. Professor S. Qudratullah Fatimi
8. Dr S. M. Yusaf
9. Zarina Akhter Kardar

6. The Travellers Vade Mecum in Gilgiti, Astori, Guraizi, Chilasi, Kandia, Kashmiri.

7. A comparative vocabulary and grammar of the languages of Hindu Kush with Kashmiri—Eleven languages discovered or investigated for the first time.

8. An account of the countries and inhabitants of Lugman, Daranur, Petsh, Chitral, Bajaur, and the various parts of Kafiristan—with Dialogues, songs etc. in several languages.

9. A sketch of secret trade dialect and of the argots on the Panjab Frontier.

10. The inscriptions, songs and literature of Kashmiris—Text and Translation.

11. Introduction to a Philosophical grammar of Arabic (in English).

12. Arabic grammar (Urdu).

13. Arabic grammar (Arabic)

14. The theory and practice of Education with special reference to Education in India.

15. The races of Turkey.

16. Sinin-ul-Islam, being a sketch of the History and Literature of Muhammadanism and their place in universal History, for the use of Maulvis and European students of Urdu. Parts I, II, III.

17. A comparative vocabulary and grammar of the Dardu languages. Parts, I, II, III.

18. Discovery of graeco-Buddhistic sculptures at Takht-i-Bahai.

19. The Simla Dialect.

20. Adventures of a Siah Posh Kafir.

21. Scheme for the establishment of a University in the Panjab :

Scholars who have studied Lietner's works, especially thoserelating to his researches into the History, Languages and cultures of the area which is now known as Dardistan—a name first given to it by Dr. Lietner are impressed both with his methodology as were as the spirit of courage

Arts and industry were added to it. These details are given in the first prospectus of the College.

Actually the government of India sanctioned the foundation of the University college under its Order No. 9 dated 10th June 1869. It was named as University college but it was clearly indicated that as soon as sufficient students were enrolled in the college for education and examination, the status of a full university would be bestowed. When Dr. Lietner joined the government college in 1864, it began by four students and by 1872 it had an undergraduate enrolment of over 60 students. The story of the progress from University college to a full university in 1882 is very interesting, but time would not permit me to relate it. Dr. Lietner's efforts secured financial assistance from Kashmir, Patiala, Kapurthala, Jind, Nabha and Nahan states as well as individuals from the Province. Dr. Lietner was made the first Registrar of the University which office be retained until towards the end of 1886 when he returned to London.

Back in London, Dr. Lietner continued his interest in the oriental languages and at Woking he established an oriental institute. Through his efforts and the generous donations of Begum of Bhopal and Nawab Sir Salar Jung of Hyderabad a mosque was also established at Woking. Lietner's death on April 22, 1899 brought to an end the career of great orientalist, a linguist, an anthropologist, a scholar and great educational administrator.

Dr. Lietners contribution in the field of Archeology, Anthropology and Linguistic studies is indeed very great. The following list of his work will give some idea of the extent of his fields of interest and scholarship.

1. Results of a tour in Dardistan. First published in Lahore in parts I, II and III and reprinted under the Title 'Dardistan' in 100 copies for exclusive use of scholars with rare map and original photos.

2. A brief account of a tour in 1866 through Zanskar, Ladak, Little Tibet, Kashmir, and Gilgit.

3. A full account of Mr. Hayward's death.

4. The Race and Language of Kandia or Kilia.

5. Further details regarding the Manners, Legends etc. of Chilas and other Shin countries.

ately this aspect of the movement did not go too far beyond the planning stage, but a Government Book Depot was established at Lahore and we have it on the authority of Moulana Hali that some translations from English into Urdu were actually completed and eminent writers like Hali were engaged to give final and finishing touches to these translations. Writings of both Hali and Azad carry the indirect influence of these sources, specially Hali's criticism is a departure from the traditional Urdu literary criticism and is indirectly borrowed from western sources—so are some of the essays of Moulana Mohammad Husain Azad.

The fourth objective of the movement was defined as follows:

"The elevation of the standard of English Education to the level of the reforms which are ever being carried out in Europe and by studying languages, History, Philosophy, and Law on the "Comparative method" as adapted to the mental disposition of Mohammadans and Hindus respectively."

This statement contains a number of factors which are of great importance. One of these is the employment of a comparative method which was calculated to give a rational outlook in education, but perhaps the most significant conclusion is a recognition of the different mental disposition of Muhammadans and Hindus respectively. This recognition justifies the planning of education for Mussalmans and Hindus separately in accordance with their different ideologies and aspirations as two major nations of the sub-continent.

Sir Donald Macleod, then governor of the Province of Punjab approved the movement and with his consent a committee of European members issued a manifesto. But the movement was opposed by the Education Department and more vocally by the Calcutta University. This lead to a prolonged controversy and ultimately the portion of the movement relating to the support of vernacular literature was adopted and the Calcutta University made some concessions in favour of Oriental Languages.

Thus early in 1870 a University College was established at Lahore, and the government college of Lahore and Delhi (the medical schools, English and Vernacular), an oriental college, law classes and a school in

officials, persons from public life, philanthropists and donors which indirectly implied the development of self-government in all matters connected with education.

2. The second important objective in the oriental movement the revival of the study of the classical languages of the Indo-Pakistan sub-continent. In a restricted sense the term Classical Languages included Sanskrit for the Hindus and Arabic for the Muslims. Promotion of Classical Languages, particularly Sanskrit, received acceleration from some other quarters. The Historic statement of Sir William Jones in 1786 had stressed this in the following words :—

"The Sanskrit Language, whatever be its antiquaity, is of a wonderful structure: more perfect than the Greek, more copious than the Latin, and more exquisitely refined than either, yet bearing to both of them a stronger affinity, both in the root of verbs and in the forms of grammar, that could not possibly have been produced by accident, so strong indeed, that no philosopher would examine all these without believing them to have sprung from some common sources, which, perhaps, no longer exists."

Arabic had its own importance for the Muslims of the sub-continent. It was the language of the Holy Quran, of Traditions of Hadis, of the sources of Islamic Philosophy, History and culture and the very term 'Alim' or 'learned implied a scholar of Arabic in the Tradition school. To these must be added persian which remained for centuries not only the court language but the idiom of culture and literary expression. The oriental movement took full note of the significance of these languages. The third significant objective of the movement was to bring European science and Education within the reach of the masses. For this purpose it was considered essential that the vernacular languages should be developed to play their role in the progress of education and for this purpose they again have to fall back upon classical sources—Sanskrit, Arabic and Persian. It was also planned to translate works of science in these vernaculars. This was the second attempt of its nature sponsored by government agencies in the sub-continent. The first was the Delhi college and its society for the translation of scientific books into Urdu and for this purpose definite instructions were prepared and principles were laid down for translating or coining new scientific terminology. Unfortun-

then Director of Education Col. Holroyd and associated with the Anjuman were such eminent people as Maulana Mohammad Husain Azad and Maulana Altaf Husain Hali. In the report submitted to both Houses of Parliament the aims and objects of the Anjuman have been laid down "for the diffusion of useful knowledge, the discussion of subjects possessing literary and scientific interest, and for the free expression of native opinion on questions of social and political reform. The Anjuman opened a Free Public Library and a Free Reading Room and arranged popular lectures and recitation of Poetry. The establishment of the Anjuman-i-Punjab and particularly the public lectures and mushairas organized by the Anjuman are a land mark in the History of Urdu Literature. Contemplating a change in traditional poetry and encouraging the spirit of experiment, the mushairas arranged under the auspices of the Anjuman replaced the old mushairas where all poets composed poetry on the pattern of a given line, attempting to surpass each other in the selection of rhymes only, by a symposium where the participants attempted narrative or descriptive poems on a given theme. It is claimed that this was the beginning of a new era the era of modern Urdu poetry.

Through the efforts of Dr. Lietner and some members of the Anjuman, including the eminent Sanskrit scholar Pandit Radha Kishan a movement was launched for the preservation and catalogueing of Sanskrit manuscripts. But perhaps the most important contribution of the Anjuman was towards the 'Oriental Movement'. This oriental movement was directly responsible for the future development of education in Punjab and initially had the following objectives :—

1. The Foundation of a national university in the Punjab.

Three universities were already established at Calcutta, Bombay and Madras and these were the first universities in the sub-continent established by the British authorities, but all the three were only examining universities. The proposed university of the Punjab was to be an examining university as well as a Teaching University. As a matter of fact more emphasis was to be placed on the teaching side of the university to give it a distinctive character from the other three universities. While these three universities were mainly Government universities, it was proposed that this university should be a bold step in associating with Government

This was the state of affairs of higher learning or English Education which was offered as a substitute for traditional classical learning of both the Hindus and the Muslims in this country which was condemned as outdated and useless. It is true that the system of traditional education had failed to develop in recent years and did not keep pace with the requirements of a changing era, yet no body would doubt its thoroughness and depth. The substitute now offered was not only unrelated to the problems, the historical and social background of the country, it was definitely most superficial and could hardly be expected to produce any good results. This higher education was preceded by teaching in elementary school. Dr. Lietner has described the conditions prevailing in such school, the materials used and the type of education provided. According to him some of the maps used in these schools actually showed the Sahara Desert run through Spain.

The problem of educational reform for Dr. Lietner was related to the instructions issued from the India Office in a despatch in 1854 in which the main principle laid down was to "pave the way for abolition of the Government Schools by means of voluntary organizations, but its provisions were definitely a set back for the natives. For example the grant-in-aid rules provided government assistance for such schools only as employed the English Language and followed the curriculum provided by the Government. Traditionally educational institutions were maintained by the rich public minded patrons of learning and for this purpose endowments were created. Some of these were later on utilised for the purpose for which they were never meant and were sometimes definitely against the will and wishes of the donors. As an example we may quote the Waqf known as Ghaziuddin Hyder's Waqf for the establishment of a seat of oriental learning but which was surrendered to the Delhi College and when after 1857 the College was closed down, nothing further is known about the disposal of its funds.

Dr. Lietner was primarily concerned with the organization and progress of the Government College, but for the overall achievement Dr. Lietner planned to create public opinion and encourage cooperation of the local population in his project of educational development. He founded the famous Anjuman-i-Punjab for which he secured the cooperation of the

Dr. Lietner and his Contribution to Higher Education and Research in Indo-Pakistan Sub-continent

DR. ABULAIS SIDDIQI
Professor of Urdu, University of Karachi

In the year 1864, the Punjab Government offered the Principalship of the Government College Lahore for an open competition. The college had just been founded and the authorities were anxious to appoint a person fully capable of shouldering the responsibility of a seat of higher learning in an area which had a long established tradition of learning and culture and thus demanded a person of a very high calibre to take the initiative and to launch a programme of educational reforms. Dr. G. W. Lietner applied for the post and received the appointment. He reached Lahore towards the end of the year 1864, somewhere in November. He found that the entire system of the so-called English Education needed a complete and immediate overhaul. The following extract will give some idea of the affairs as Dr. Lietner analysed them[1]:—

He describes the Government Educational System as "having little real hold on the people, who in sullen silence felt themselves to be disregarded and their ancient civilization despised. There was indeed, we are told, a system of so-called English Education, consisting chiefly of instruction in Mathematics and random or fragmentary selections of more or less known authors. One of the coursees contained portions of Mr. Dixon's 'Life of Bacon', Prescotts, "Essay on Chateaubrand's Essay on Milton" Campbells 'Rehetoric' and Roger's Italy as a curriculum of English Literature for advanced students, whilst in mental philosophy, Abercombie, in history, a few notices of the history of Jews and of Rome, or Greece, were deemed sufficient."

(1) Extract from Reports of the Vienna Universal Exhibation of 1873 presented to both Houses of Parliament by Command of Her Majesty quoted in Dardistan—by Dr. G. W. Lietner Exclusive Edition of 100 copies. Appendix.

The College has never been noted for its social and athletic life, but, at the moment, it is comparatively rich in both. As for research and publication, the original functions of the College, it is perhaps the most productive sector of the University. However, a new trend has been observed for sometime past. Emphasis has shifted from research to literary criticism. Even sympathetic critics do not feel very happy with this departure from tradition. For some time past the College has had two visiting professors, one in the department of Persian and the other in that of Arabic. through the generosity of the Iranian and Egyptian Governments respectively.

In 1967. the University of the Punjab decided to published authentic collated editions of the whole lot of Ghalib's works in prose and verse as part of the Centenary Celebrations of the poet. The greater share of responsibility for executing this project carried to completion by the end of 1968, was assigned to some members of the Oriental College Faculty. The College also benefited, on the occasion, by the Creation of a second Chair in Urdu, its in cumbent being called Ghalib professor of Urdu.

In the fall of 1971, the University decided to establish a department of Punjabi in the College, With one exception its entire teaching staff is drawn from outside the University. Finally, under the recent educational reforms the Heads of Departments have been redesignated Chairmen. A Chairman will hold office for two years and yield place to his immediate junior. Such a novel arrangement occasioned a considerable debate in the country where it was first proposed. The plan has its merits as well as drawbacks. It is expected to relieve many senior scholars of their administrative responsibilities and enable them to give uninterrupted attention to study and research.

So much for what has gone before. The College has shown a great deal of adaptability in changing circumstances. It has still to learn a good deal from its own past. This will ensure the continuity of all that is best in its tradition.

courses in French, German, Spanish and Turkish were added to the existing teaching facilities. While these classes continue to be maintained, their popularity has not come up to earlier expectations.

As the University Act of 1954 transferred the conduct of Oriental titles examination to the newlycreated Board of Secondary Education, these classes had to be discontinued. This took away from the College one of its basic functions. The University assumed direct management of the teaching of European and other foreign languages, but the status quo was soon restored. In 1958, a Languages unit was inaugurated in the College with the co-operation of the British Council. Staffed by British and American experts, it dealt with phonetics and other technical aspects of English language teaching. The Unit was wound up a few years latter.

This account may be rounded off with a summary of the remaining features of the post-Independence period. Students from some Asian and even European countries have, from time to time, added a new element to the College population. Although numerically small, the presence of this class is felt in one way or another. The number of girl students has registered a phenomenal change and they now constitute the majority on rools. This unexpected influx elicited the novel suggestion that the College should have two Unions instead of one; one for boys and the other for girls. But the proposal was talked out in course of time. Strangely enough, there is not a single lady scholar on the teaching staff of the College which is overwhelmingly feminine in composition.

Duly recognizing the importance of Urdu as the national language, the reforms of 1959, provided increased facilities for its teaching and made it a compulsory subject of study up to the Intermediate student standard. Those who proceeded to despise separate courses, Easy, normal and advanced for various Categories of students probably misjudged the intent and spirit of State policy. The enrolment in M.A. Urdu rocketed as a result of vastly increased demand for teachers of Urdu at the High School and Intermediate stages. The Classes in the subject continue, to overflow with boys and girls in spite of the fact that the torrential supply has already outstipped the demand.

institution was ill-concealed. They gave the verdict that the attainments of the products of this College did not compare favourably with those of the graduates turned out by the Arts Colleges. This was a fallacious generalization. Mr. Abdulla Yusaf Ali, himself a member of the Committee, wrote a vigorous note of dissent denying the validity of majority conclusion. But the charge-sheet acquired some plausibility by sheer repetition and has since been plied as a weapon by critics who have used it with more vigour than discrimination.

Dr. A. C. Woolner who had started as principal of the Oriental College and University Registrar in 1903 served as Vice-Chancellor of the University for about eight years till his death in 1936. His long tenure in this high office greatly added to the prestige of the College whose problems and priorities received immediate attention of the administration. An idea of the esteem in which he was held can be formed from the fact that while the statues of all foreigners were removed from public places after Independence, Woolner's statue remains where it was originally fixed in 1937. Dr. Woolner was succeeded by Maulavi Mohammad Shafi who was a ripe scholar and a wide-awake administrator. His active association with the College ended with his retirement in 1942, but he continued to serve the University in different capacities till long afterwards.

Vast changes followed in the wake of Independence in 1947. The administration and teaching work of the College were disrupted for a while. Non-Muslim teachers migrated in India and the departments of Hindi, Gurmukhi and Sanskrit had to be closed down. Some hard thinking was done on issues of importance in the altered context. The College organized, on behalf of the University, an All-Pakistan Urdu Conference in 1948. The purpose of this gathering was to devise ways and means to give to Urdu its rightful place in the new country. The Conference set up a number of sub-committees to deal with a variety of questions like reform of the script and establishment of an Urdu Academy. Some of these projects like the Encyclopaedia of Islam made considerable headway, but others languished for want of sustained interest.

The M.A. degree in Urdu was instituted by the Punjab University in 1948 and the Oriental College assumed responsibility for its teaching on an intercollegiate basis as was the case with other disciplines. Language

and old-timers who duly passed on their limitations to the pupils. Some fresh air was badly needed in this area. Consequently, the Heads of Arabic and Persian departments decided to devote personal attention to these classes to ensure that the students acquired some familiarity with modern methods of instruction.

The Oriental college was able to make a substantial contribution to the promotion of the study of Islamic History, a subject that had failed to strike roots on account of the apathy of the University Department of History. Teachers from this college volunteered to fill the gap and the subject got a start from which it might otherwise have waited for another 25 years.

The Oriental College Magazine was started in 1925. Its primary object was to publish the results of scholarly researches as also to assist the movement for wider dissemination of the Arabic and Persian languages. It shaped well and came to be demanded by all mentionable centres of Arabic and Persian studies in the Western Universities. The College was also assigned the duty of collecting manuscripts of historical or literary value for the Punjab University Library. Senior teachers responded enthusiastically. They established contacts far and wide and undertook long journeys to examine widely-scattered private collections. Thus was built up the enormous collection of Persian and Arabic manuscripts of the University Library, which, in many respects, is unique in the country.

The college had, so far, functioned without a building of its own. The present structure was completed and occupied in 1925. The College hostel standing in its vicinity was completed in 1929.

In 1932, the Government of the province appointed a committee, presided over by the well-known educationist George Anderson, to look into the administration of the Punjab University. What had led to this inquest were the wide-spread complaints against certain monopolies within the University and the exposure of some glaring instances of discrimination against Muslims as a community. The Committee conveniently bypassed the main issue and made use of its other terms of reference to deal with the Oriental College at some length. The hostility of committeemen to this

tion into a purely Oriental School and created barriers between Oriental learning and modern disciplines which this very College had succeeded in removing only a decade before. In many ways the development was unfortunate. The College lost its influence and its numbers dwindled.

By a regulation of the year 1900, the holders of Oriental titles (like Munshi, Alim and Fazil) were permitted to take the High School, Intermediate or B.A. examinations of the Punjab University in English only, in accordance with rules of eligibility. If successful they would be qualified to receive a degree or diploma of the same worth as given to those who had passed these examinations as regular students with all subjects. This was by no means a concession as graduates of this category were generally found to have achieved a greater degree of maturity in their studies. However, this rule afforded a great deal of encouragement to large numbers of students who wanted to take to the study of English language alongside of their classical studies.

As time went by, the Oreintal College was able to acquire a sizable library as it regularly received publications of various learned bodies from inside the country as well as abroad. The greater part of this collection was gifted in 1913 to the University Library. This deed of transfer is a landmark in the history of the Punjab University Library whose holdings were insignificant till then.

The University decision to modernize the teaching of classical languages in 1911 necessitated the appointment of professors versed in modern techniques of research. This had the effect of eliminating gradually the older type of scholar from the field of higher teaching.

The years 1919 to 1947 are, by common consent, regarded as the "golden age" of the Oriental College. Outstanding scholars like Maulvi Mohammad Shafi, Dr. Suriyakanta, and Dr. Mohammad Iqbal joined around the early 20's. Hafiz Mahmud Khan Shirani came in 1928. Important changes of syllabi were introduced in the Oriental titles classes in Arabic to make the study of this language meaningful for the students. Some elements of General Knowledge and History were added to the curriculum which had been preponderantly and oppressively literary. The Oriental titles classes had, thus far, been exclusively taught by traditionalists

The Punjab University received its charter of incorporation in 1882. Even though the sponsors of the original University movement had taken an *uncompromising stand* on the encouragement of "vernaculars" and patronage and protection of the Oriental Classics, the Punjab University, in its broad outlines, was a replica of the existing Universities. To placate the donors, the Statute created a degree-awarding division within the University which was invested with a degree of "pre-eminence" over other faculties. In practice this did not turn out to be much. Pre-eminence of the Oriental faculty remained a theoretical proposition. Be that as it may, the Oriental College, at once, took its place both as a nucleus and a base of the new seat of learning. The first Convocation of the University was held on 18 November 1882 at which the Registrar, Dr. Leitner, read out the summary of the annual report in Urdu. The College remained undisturbed for a while. But changes were bound to come. What actually followed after a brief interlude may be conveniently called the rationalization of teaching arrangements. In 1884, the Government College was relieved of its teaching responsibilities in respect of Arabic and Persian and the two Government College professors of these subjects—Mohammad Husain Azad being one of them—were made over to the Oriental College. Government College students taking up Arabic and Persian began to study these subjects at the Oriental College. Under this "exchange programme" Oriental College students of English sat in the classes conducted by Government College professors. Students from Medical and Veternary schools attended classes in indigenous medicine at the Oriental College. But this commonwealth of learning was short-lived. About this time were also started the Master of Oriental Learning and Bachelor of Oriental Learning classes which represented the most characteristics feature of this College.

The administration of the College virtually collapsed during the temporary absence of Dr. Leitner. A committee of inquiry was appointed in 1884 to suggest improvements. This body recommended another scheme of rationalization under which the Engineering and Medical classes of the Oriental College were shifted to the Mayo School (now National College) of Arts and the Medical School (now College) respectively. The Law classes were, however, retained. This plan of re-grouping debarred the admission of B.A. students to the Oriental College. It turned the institu-

to open an Oriental school which was raised to the status of a college in 1872. From its first home in the walled city, it was shifted to a rented building in Anarkali in the following year. In 1875 it was allowed to share with the Government College the newly constructed building for that college. Dr. Leitner, not unnaturally, came to preside over this institution as well. How this plurality of benefices was viewed by the contemporaries is not quite known. Formulated by the Principal, the objectives of the Oriental College included teaching was well as research and publication. Nine fellowships were endowed for the latter two purposes. Two journals, one in Arabic and the other in Sanskrit, were brought out at the same time. When they stopped publication is not clear from the available accounts, nor is it possible to trace copies of either at this distance of time.

Dr. Leitner, a stern disciplinarian, but a sympathetic teacher, gave the guide-lines of teaching methods to his colleagues. He stressed philological approach to the study of languages and historical and sociological approach to the study of literature. He emphasized the importance of creative work and warned against total dependence on works of translation in the realm of higher learning. The Government was far from sympathetic to the infant institution and made no provision for grant-in-aid. The College wss not merely an Oriental College as we understand the term today. It handled a wide range of subjects which included Civil Law, Engineering Drawing, Mensuration, Mathematics, Photography, History, Geography, Moral Philosophy, Rhetoric, Muslim Law, Hindu Law, Shia Law of inheritance, Jurisprudence, Civics, Logic, Geology etc. etc. Instruction was mostly imparted in Urdu. The textbooks on these and other subjects are still preserved in the Punjab University Library. Rules of admission were flexible. A pass in the Matriculation Examination was the minimum qualification for admission. But non-Matriculates, who could give some evidence of their capacity to profit from the courses of instruction, were not denied the opportunity. The College drew students from Kabul, Tibet and Swat as well as from some Central Asian Countries. Designations of teachers would sound odd today. They were called superintendents. Fellows were later redesignated Readers.

ment departments to be organized and it started functioning in 1856. The first College of Western education, that is to say, the Government College, Lahore was opened in 1864. An orientalist of eminence, Dr. Leitner, who had occupied the chair of Muslim Law at King's College, London, was selected as the first principal of that College which was then affiliated to Calcutta University. After some experience in his new environment, Dr. Leitner was disenchanted with the Calcutta system which, in his opinion, was inherently unsound as it encouraged learning by rote and alienated the students from their own values and traditions. That communication in a foreign medium cannot lead to meaningful education, was his watchward. He sorted out his ideas and mustered sufficient support for his plans. He made up his mind to emancipate the Punjab from the academic tyranny of Calcutta. With the co-operation of local notables he helped organize the Anjuman-i-Punjab in 1865. It was from this forum that he began to advocate the establishment of an Oriental University in the province. He envisaged a seat of learning that would employ country languages to disseminate Western learning and revive enlightened interest in the study of Oriental classics. This project was liberally subsidized from various quarters including some of the ruling princes of the Punjab states.

As no University could be established without the concurrence of the Central Government, the proposal occasioned a prolific back-and-forth correspondence between central and provincial governments. The Government of India was not very enthusiastic about a scheme emphasizing the importance of Oriental learning and country languages. The massive effort did not bring about the desired results. The Central Government would not go beyond sanctioning the establishment of a Punjab University College as the first provisional step towards the University. In the days when a professor of Physics could be easily persuaded to slip into the chair of History and division of labour was not a recognized principle of educational management, Dr. Leitner became the first principal of this College and Registrar of the embryonic University in addition to his responsibilities at the Government College. The University College, it appears, was neither here nor there. It only existed on paper.

The donors were sorely disappointed as the University of their dreams was still far off. Part of the funds collected for the University was utilized

THE ORIENTAL COLLEGE
(UNIVERSITY OF THE PUNJAB)
A brief history

BY

DR. ABDUL HAMID

The Oriental College was the outcome of a popular educational movement launched in the Punjab in the 60's of the last century. Headed by the energetic Orientalist, Dr. Leitner, the leaders of the movement aimed at developing a pattern of higher education in the province different from the one established by the British rulers in other parts of the sub-continent. They stood for a system of modern learning based on the cultural tradition of the people. Founded in 1872, the Oriental College preceded the establishment of the University of the Punjab by a decade. It has passed through numerous vicissitudes and its duties and functions have been expanding or shrinking under different circumstances, so that it has been transformed beyond recognition in the course of a century of its existence. At times it was belittled as a refuge of orthodoxy and obscurantism. Occasionally the attitude of its critics in authority has manaced its very existence. But rain or shine the College has steadily adhered to its original objectives of research and publication and largely lived up to them. In its formative phase it was fortunate in attracting some outstanding Orientalists like Leitner, Aurel Stien, Thomas Arnold and Woolner and such scholars like Mohammad Husain Azad, Faizul Hasan of Saharanpur and Mufti Mohammad Abdullah of Tonk to its teaching staff who gave it a distinctive stamp. The famous engineer-philanthropist Ganga Ram was associated with the College as a teacher of Engineering and Iqbal worked here for four years during which period he completed two monographs.

At the very outset it would be useful to attempt a brief survey of the circumstances leading to the establishment of this College. The Punjab was conquered by the British in 1849 and its civil administration was built up gradually. The department of Education was one of the first Govern-

which our new generation can easily furnish, thanks to modern means of photostats, and clipping, instead of copying with hand-written texts, to avòid copying-mistakes.

For Arabic literature, of which I am not a specialist, I have often found the necessity of a poetical index of all the verses (*abyaat*) in Arabic. The Oriental College has produced such a useful index for the dictionary *Lisaan al-'Arab*. One requires such an index for all the diwaans of Arab poets, giving the first as well as the last word of the *bait*, and the index shelf they may even preserve the entire verse. They should not be arranged according to meters, as in the Lisaan al-'Arab index, but alphabetically, since in editing MSS, when one comes acroos a mutilated verse, one does not know the real meter of the verse cited. Here too, one can get photostates of the diwaans, and paste clipped verses on separate cards, with references of the date, page, *qasida* or *bait* number of diwan etc.

This sort of work is not a simple luxury, it is remunerative. When such indexes of the Quran, the Hadith, the Tasauwuf, the Arabic poetry will have considerably advanced, not to say completed, foreign scholars will demand information, and the Index-Institute will furnish on remuneration: a means of earning foreign currency.

These are some humble ideas, a dream if one likes to qualify, yet not at all impossible to realize. Perhaps the zinda-dilaan-e-Punjab are yet capable to do that, for themselves and for the entire world of science.

Long live Oriental College, long live its responsibles!

ages also, could be taken notice of. I would further suggest a special section for Quranic disctionary: every word of the Quran could be represented in all the languages of the world. Supposing if the Quran is translatsd in English language by 80 persons, the word *Rahmaan* would show which English translator has rendered it by which equivalent. And this for all the languages of the world, beginning with the more important languages of the world. Future translations would benefit from this material. It goes without saying that the sense of a word is better explained in a foreign language. To an Arab, *Rahm* is *rahm*, he understands it well, but he cannot explain it easily in other words. If we say for instance mercy, or pity or any such word, that explains better.

The Hadith: To find out a Hadith, there have been since very old times indexes of key words. The more recent and more practical is no doubt the Leiden edition of *al-Mu jam al-Mufahras*, which, with the exception of the volume of names of persons and places, is now published. It is very useful no doubt, yet is not the last word on the subject. Just an instance: theother day I was searching the hadith in which the Prophet (peace be upon him) is reported to have said that when Dajjaal will come, he will remain only for 40 days, of which the first day would be as long as a year, the second will be as long as a month, the third as long as a week, the rest of the 37 days would be long as our normal present days. The Leiden index of the late Prof. Wensinck gave the references of several Hadith books, like Abu Daawood etc., but not the *Saheeh* of Imam Muslim! Although it is cited also in that most authentic collection of the sayings of the Prophet. That is to say, the Leiden work is not very exhaustive. Further, it has indexed the *Sihaah Sitta* and four other non-Hadith works, like Ibn Sa'd etc. But there are other very important Hadith collections of early date, works of the teachers of Bukhaari and Muslim, and even teachers of these latter. Hammaam ibn Munabbih, Ma'mar ibn Raashid, 'Abdur-Razzaaq ibn Hammaam Humaidi, Sa'eed ibn Mansoor, Ibn Abi Shaibah and so on. Again there are printed or MS works of Baihaqi, Tabaraani, Dailami, Bazzaaz and many others devoted exclusively to the Hadith. And a part from them, there are sayings of the Prophet cited in books of Tafseer, Fiqh, Tasauwufetc., which are sometimes not found in the extent hadith works. An exhaustive index, with very copious cross-references is the desiderata

As to the Quranology, our young generation must have no more than a very vague idea of the Institute of the Quranic Research of the University of Munich, Germany. Three generations ago, it was founded principally for two works: collect the old MSS of the Quran from all over the wolrd and collate them word by word, in order to discover the "variants" in the Quran; and to index, verse by verse, the commentaries of the Quran, of all the different epochs and countries, for knowing the evolution of the understanding of the sacred text.

The Director of the third generation, Prof. Pretzl had told me in 1933, that some 42000 copies of the MSS of the Quran, complete or fragmentary, had been collected in that institute, dating from the first century of the Hijra to later more modern epochs. The work of collation was going on, yet till that time nothing sensational was discovered. There were a few mistakes of copiests that had come to the notice. But they were mistakes of copiests, and no variants, since the same different readings were never found in any other copy. The works of *tajweed* and *ikhtilaaf al-masaahif* also procured some differences, yet they proved to be commentaries, and did absolutely not change sense of the verse concerned. *'adu shawad sabab-e-khair gar khudaa khwaahad*: the work of collating MSS of the Quran was undertaken with motifs of discrediting the authenticity of the extant Quran, but that finished by establishing it more firmly and irrefutably. Man proposes and God disposes!

As to the indexing of the commentaries, it was more intellectual than proselytizing. Since in the Quran there are six thousand odd verses, as many boxes were installed in a huge shelf, and in each box the sense of the verse according to different commentators was chronologically arranged. And it was easy to find out at a glance what Muslims of different countries and epochs understood of a word or a verse. But this was confirned to Arabic commentaries only.

During the second world war, American bombs fell on this Institute, and the library and the *personnel*, including the director, disappeared for ever.

I would humbly suggest that the indexing of the commentaries should again be taken in hand in Lahore. One may widen the scope and commenaries in Arabic, Persian, Urdu, Turkish, May be other Pakistani langu-

The educational policy based on Macaulay project was not only to impose a foreign language as medium of instruction to the people, with all the handicaps that it entails by killing originality, excess of burden on mind etc., but also "Christianize" the teaching. This was more subtle: outwardly the teaching was secular, but, on the one hand "Christian Colleges", which came out like mushrooms everywhere, became more attractive that the best governmental colleges; and on the other hand, under the guise of English literature, all sorts of missionary books were prescribed in the syllabi: be that Golden Treasury in poetry or Pilgrims Progress in prose, and so on and so forth. Waqfs of Islamic institutions were diabolically confiscated, and there was practically no scope for the alumni of the private religious schools. But still Islam did not die in British India.

That was not all. Arabic and Persian were taught in the Universities, but as languages, shred of the real literary treasures they contained, treasures which concerned the spiritual heritage. Not content with this mutilation, even the teachers of these "sacred" languages were appointed from among the Britishers or Europeans. To the woe of the Britishers, the unexpected result was that it created *desi Orientalists* who were abreast of the falsifications of the interested, and political-minded *badesi* writers on the subject, and also knew the necessary technique to dynamite and blow up the anti-Islamic literature. The Britishers had greater dread of Abdullah Yusuf Ali and Muhammad Shafi than the maulanas of Deoband and Saharanpore, whose writings after all remained inside the country, and did not reach readers in England.

Now that all this is a past history, it is our duty to repair the past mistakes and plan for a better future, learning from the experiences, local as well as foreign.

Some Suggestions

It goes without saying that the basis of Islamic heritage will remain the Quran, the Hadith, the Tassauwuf and the Arabic literature in general. Our ancestors have rendered services to these subjects of which any nation would be proud. But as all human institutions, there will always remain something more, something new to do.

Oriental College Zinda-Bad

(Dr. Muhammad Hamidullah—Paris)

There is a world-wide saying "Man proposes, God disposes", the sense of which is found in Arabic, Persian, Turkish, Russian, French, German and many other languages. I recall it in connection with the centenary of the University Oriental College of Lahore.

The British, although somehow succeeded in ousting the Mughal Empire from power, yet they always suffered from an inferiority complex with regard to what the Mughal rulers had created in the sub-Himalayan continent. If the new-comers were suspicious, politically, of Muslims, that was natural : which conqueror is not that vis-a-vis his predecessor in power? But the Britishers suffered from that complex even intellectually and culturally. And took all humanly possible steps against it, but——man proposes and it is God who disposes :

They saw that the sweet Persian language is not only the most-widely spoken language in the world, but also that it has become the repository of the Islamic religion, which had eclipsed Christianity wherever it went. The first step was to oust Persian from the country. After Plassy, Urdu was "imposed" on the people, and the motive was that a language void of Islamic literature would, the more easily let Muslims foreget Islam and, perhaps, embrace the worshipping of the Cross.

When the Muslim savants were confronted with the fait accompli, they immediately set to work, and soon Urdu became one of the richest languages in Islamic lore, with unforeseeable prospects.

Then came Lord Macaulay with his risky proposal of anglicizing the British India, and, as he himself bluntly confessed, the intention was that the inhabitants of the country should be "desi" in body and "English or Pardesi" in soul. But it was this very foreign education that created Iqbal, Jinnah and Gandhi who definitely buried the British ghost, liberating the country from enemy yoke.

SECOND SESSION

SYMPOSIUM:

(Academic Services of the Oriental College)

PAPERS :

Dr. Muhammad Hameedullah (Paris)

Dr. Abdul Hamid (Lahore)

Dr. Abul Lais Siddiqi (Karachi)

Faizul Hasan Saharanpuri, Shams-ul-'Ulama M. Abdul Hakim Kalanauri, Shams-ul-'Ulama Mufti M. Muhammad Abdullah Tonki, Shams-ul-Ulama M. Muhammad Hussain Azad, Allamah Dr. Sir Muhammad Iqbal, Dr. Sir Mark Aurel Stein, Sir Thomas Arnold, Dr. A. C. Woolner, Dr. Maulvi Muhammad Shafi, Dr. Lakshaman Sarup, Mr. Abdul Aziz Maimon, S. Aulad Hussain Shadan Bilgrami, Hafiz Muhammad Mahmud Khan Sherani, Dr. Mohan Singh Diwanah, Dr. Benarsi Das Jain, Dr. Surya Kant, Dr. Sayyid Abdullah, Dr. Muhammad Baqir, Sh. Sir Abdul Qadir, Dr. Sh. Inayat Ullah and Professor Viqar Azim. The College is now headed by Dr. Edbadat Brelvi, a well-known critic and literateur. For fear of prolonging the list, I have refrained from mentioning more names whereas the fact is that there are others also who have advanced the tradition of research, writing and criticism and who have contributed to the sum-total of learning and erudition associated with the Oriental College, Lahore, some of them are still on the College staff. Among them is Dr. Ghulam Hussain Zulfiqar on whose History of the University Oriental College, I have drawn considerably, while preparing this address. The individual and collective efforts of all these scholars have assisted in identifiying that tradition of intellectual excellence which is responsible not only for the assignment of a place of dignity and reverence, to oriental languages and literature in this country but also helped to successfully project the Oriental College as respected centre of learning and research, at the international level. We bow our heads in reverential gratitude before the Almighty that we have been granted the grace to see this day of rejoicing. We pray that this institution may continue to flourish and disseminate the fruits of its research and learning and that it may endure to see hundreds of such celebrations in the future.

Amen!

S. A. Rahman

Ex-Principal of the College, was appointed its Chief-Editor and Head of the Department. After his demise, several other scholars assumed responsibility of this project, one after another. The present incumbent is Dr. Sayyid Muhammad Abdullah, Ex-Principal of the College.

In view of the growing importance of Urdu, due to the enthusiastic efforts of Dr. Sayyid Abdullah, an All-Pakistan Urdu Conference was held in 1948, under the auspices of the Punjab University. In December 1965 A. C., the first Pakistan Oriental Conference was organised in Lahore in which scholars from abroad also participated. Dr. Sayyid Abdullah, Dr. Muhammad Baqir, Professor of Persian, Dr. Sh. Inayat Ullah, Professor of Arabic and other teachers of the Oriental College rendered signal services to make it a success. During the Conference deliberations, the Urdu Academy was formed with the primary object of making available the elements of modern scientific knowledge in Urdu. Dr. Bashir Ahmad, Vice-Chancellor and after his death, Dr. Raziuddin Siddiqi became Director of the Academy with Dr. Sayyid Abdullah as General Secretary. The Academy is still alive and kicking under the general supervision of Dr. Sayyid Abdullah. His solicitude and hard work blossomed into a West Pakistan Urdu Conference in Lahore in 1959 A.C. The late Baba-i-Urdu, Dr. Maulvi Abdul Haq, presided over the Conference which was responsible for several important proposals for making Urdu the medium of education in the Province. Some of these recommendations were incorporated, by the National Education Commission of 1959, in its report. An 'Urdu Tadris Conference was also organised in the College by Dr. Muhammad Abdullah and Professor Viqar Azim in 1961 A. C. The University created the post of Ghalib Professor of Urdu, to which Professor Viqar Azim was appointed. Dr. Sayyid Abdullah retired as Principal in 1966 and Dr. Muhammad Baqir Professor of Persian was appointed in his place. On the latter's retirement from service, the present Principal, Dr. Ebadat Brelvi, assumed the headship of the College. Professor Viqar Azim had also retired from service and the Ghalib Professorship of Urdu was also assigned to Dr. Ebadat Brelvi.

This is in brief the Oriental College story. Among those devoted souls whose labours at different times, helped to shape and develop this institution, one may mention a few such as Dr. G. W. Leitner, M.

Sanskrit, Hindi and Gurmukhi Departments in the College were suspended. Gradually conditions improved and in October, 1948 A.C., M. A. (Urdu) classes were started in the College. In 1949 A.C., Adib Fazil and Adib Alim classes were added. Diploma and Certificate classes in some oriental and western languages including French, German, Russian, Spanish, Turkish, Arabic, Persian and Japanese were also inaugurated. Dr. Muhammad Iqbal passed away on the 21st May, 1948 and Dr. Barkat Ali Kureshi, Professor of Arabic assumed the office of Principal of the Oriental College. For a time, he went away as Pakistan Ambassador to Syria, Lebanon and Jordan but he returned as Principal of the College on the 10th June, 1951. He was superannuated from service in 1954 and Dr. Sayyid Abdullah, the head of the Urdu Department, was appointed Principal. During this period, the great scholar and benefactor of Urdu, Sh. Sir Abdul Qadir, participated in lecture work in the Department in an honorary capacity. The Arabic Department of the College also had the benefit of some guest teachers from Egypt and Syria, like Al-Sayyid Amin al-Misri, Al-Sayyid Ibrahim al-Rohayyam and Al-Sayyid Foazi Hasan Khalil. At the present time, Dr. Ahmad Ali Panahi of Iran is also assisting in instruction work in the Persian Department.

A new University Act was promulgated in 1954 A.C., and in the new dispensation, the Alim and Fazil classes went out of the University's jurisdiction and their examinations were assigned to the Board for Intermediate and Secondary Education. In this fashion, the oldest instructional arrangements in the College were eclipsed. This was followed by the closure of Alim classes but in 1954 A. C., Fazil classes were restarted. In June 1958, a new Department of Linguistics and Phonetics was set up with the cooperation of the British Council. The Professor and Reader in this Department hail from England and America. Certificate and Diploma classes in Linguistics and Phonetics were instituted in this Department which also undertook language research projects. This period is also remarkable for the increase in the number of girl students in the College. Scholars from Malaya, Uganda, Africa, Italy, Japan, America, France, England, Turkey and Iran studied in this College from time to time. In 1950 A. C., the important project of the Urdu Encyclopaedia of Islam received the assent of the University and Dr. Maulvi Muhammad Shafi,

Through the efforts of Sir John Maynard, the Vice-Chancellor of the University, the Oriental College acquired its own separate building in 1925 A. C. According to the Principal, Dr. A. C. Woolner, this was the seventh occasion on which the Oriental College had changed its habitant. This year is also notable for the fact that from February 1925, the Oriental College Magazine began to appear with Professor Maulvi Muhammad Shafi as its Editor-in-Chief. In 1926 A.C., the Maynard Hall named after its founder, and belonging jointly to the Law College, and the Oriental College, was constructed. For its hostel, the Oriental College had to wait till 1929 A. C. The College had by now, virtually become the Oriental Learning Section of the Punjab University, in which instructional as well as research activities were being pursued. In 1928 A. C., the College Principal, Dr. Woolner had also assumed the office of Vice-Chancellor of the Punjab University. In this very year, three lecturerships. in Urdu, Hindi and Gurmukhi, were instituted and the renowned scholar, Hafiz Muhammad Mahmud Khan Sherani, Dr. Benarsi Das Jain (the compiler of the Punjabi-English Dictionary) and S. (later Dr.) Mohan Singh Diwanah, were appointed to these posts, respectively. In 1932-33 A. C., the Anderson University-Commission subjected the arrangements for the Alim and Fazil classes in the College, to stringent criticism and recommended the amalgamation of the Oriental Languages classes with the Arts Schools and Colleges.

On Dr. Woolner's demise in 1936 A.C., Prof. Maulvi Muhammad Shafi became the Principal of the College. In 1937 A.C., "The Anjuman Arabi wa Farsi" was founded and it started its own Research Magazine. When M. Muhammad Shafi retired as Principal in 1942 A. C., Dr. Lakshaman Sarup, Professor of Sanskrit, took his place. In 1946 A.C., Dr. Lakshman Sarup departed from this world and he was replaced by Dr. Muhammad Iqbal, Prof. of Persian. It may be mentioned that the valuable collection of manuscripts, in Sanskrit, Persian and Arabic, in the Punjab University Library, owes its existence to the devoted efforts of Dr. Woolner, Dr. Muhammad Shafi and H. Muhammad Mahmud Sherani.

The fifth epoch in the College History, started with the country's independence and is continuing till today. In its beginning, the non-Muslim staff of the college migrated to Bharat. As a consequence, the

tance came to be given to specialised study of scientific, literary, linguistic and phonetic aspects of Oriental Languages beside a general instruction in Eastern and Western thought, in accordance with the dictates of the modern "era." In this period, the College was headed for some time by the famous Archaeologist. Sir Mark Aurel Stein, and after him, the renowned scholar Sir T. W. Arnold graced that office. The audience might recall that Allamah Iqbal had written a poem in memory of Prof. Arnold who was his teacher.

In 1900 A.C., it became possible for those who had passed the Alim and Fazil classes, to obtain Certificates or Degrees for the Matriculation, F.A., B.A., and B.O.L., on passing in the relevant English paper only.

The next distinctive period in the College history extends from 1911 A.C. to 1918 A.C. It was in 1913 A.C. that the Punjab University pure purchased the building of the Convent School, to which both the Law College and the Oriental College were shifted. In 1910-11 A. C., the retrenchment axe fell on the School section of the College and its closure was ordered. The B.O.L. classes suffered a similar fate. After 1913 A.C., classes in Oriental languages for B.A. students were also stopped as the Government College made its own teaching arrangements for them. In this period we hear for the first time of provision for sports in the College. A Football team came into being in 1912 A.C. and facilities were provided for students to play Badminton and for boating on the Ravi river. In 1913-14 A.C., the respectable collection of books in the Oriental College Library, was transferred to the Punjab University Library. This must have been a very welcome addition for the latter institution for we learn from its History that in 1903 A. C. it could boast of only two Almirahs which exhausted its bibliographic wealth.

The period between 1919 A.C. and 1947 A.C. constitutes the fourth epoch in the College history. In the latter year, in August, the independent State of Pakistan emerged on the world map. During this time, the work of teaching Oriental Languages to students of B.A. Hons., Hons. School and M.A. classes, was assigned in stages, to the Oriental College. An M.A. class in Persian was also inaugurated. Beside the instruction work in the degree and M.A. classes, provision was also made in the College for higher research at the level of Ph.D. and D. Litt. degrees.

In 1884 A.C., the Arabic and Sanskrit Departments in the Government College Lahore were closed, and, as a consequence, the celebrated Mr. Muhammad Hussain Azad (Assistant Professor of Arabic) and Professor Bhagwan Das (Assistant Professor of Sanskrit) were transferred from that College to the Oriental College staff. In the year 1899 A.C., S. Muhammad Iqbal (later Allama, Dr. Sir) having passed his M.A. in Philosophy from the Government College joined the Oriental College as McLeod-Punjab Arabic Reader and remained associated with the teaching work and the writing and compilation of books in the College for four years. An Urdu translation of Walker's *Civics* and a book in Urdu on Economics are mementos of his stay as Reader in the Oriental College. In this period, B.O.L. and M.O.L. classes were also started in the College. B.A. students used to attend classes in Oriental Languages in the Oriental College, and for the study of English, they used to go to the Government College. This cooperative system of teaching was carried on successfully between the Oriental College, the Government College, the Medical School, the Training College and the Veterinary College to the benefit of all.

Some important changes were initiated in the Oriental College during this period. The classes for the sciences and technical subjects were closed. The Engineering classes were transferred to the Mayo School of Arts in June 1888 A.C. Later these classes became part of the Government Engineering College, Mughalpura. The Tibb Unani and Ayur-Vedic classes were likewise shifted to the Medical School and after some time, they were assigned to the Islamia College and the D.A.V. College respectively. The Tibbiyyah College run by the Anjuman Himayat-i-Islam Lahore grew out of these classes. The Law classes continued for some time in the College but later they also suffered closure. M.A. classes in Arabic and Sanskrit were inaugurated with effect from 1888-89 A.C. Admission of students who wanted to appear in the Entrance, F.A. and B.A. Examinations, through the medium of English, was stopped, in the Oriental College, Arts Faculty. Thus ended the many sided character of the College, which had practically conferred the status of a Dar al-'Ulum on the Oriental College. As Dr. Ghulam Husain Zulfiqar says in his *History of the Oriental College*, "After this, the Oriental College was reduced to a Centre of instruction and research in Oriental Languages, wherein more impor-

in the College. Beside the classical Languages of Arabic, Persian and Sanskrit, classes in Urdu, Hindi, Gurumkhi and Pashto, also existed. The students were prepared for twenty six examinations. These included in the Arts section, Entrance Examination (Urdu and Hindi), Proficiency, High Proficiency, Hons. in Arts (Oriental Languages, History and Mathematics), in the Oriental Languages and Literature section, Munshi, Munshi Alim, Munshi Fazil, Maulvi, Maulvi Alim, Maulvi-Fazil, Pragg, Basharad, Shastri ; in the Law section, Legal Titles (Sharh-i-Islami), Legal Titiles (Dharam Shastra); in Unani Tibb, Hakim Hadhiq, 'Umadh-tul-Hukama, Zubdah-tul-Hukama ; in Ayur-Vedic, Vaidyah, Bahikhak, Raj Vaidyah ; in Civil Engineering, First Examination; for vernacular offices (Rvenue, Penal Code, Finance); in Gurumkhi Buddiman and Vidvan and an Examination in Arithmatic and Calligraphy (for public services posts). Over and above these, instruction in Arabic, Persian, and Sanskrit syllabi prescribed by the Calcutta University for F. A. and B. A. examinations was also imparted in this College. The information will not be without interest that in the year 1875 A.C., the later renowned writer and Historian, Maulana Shibli Nomani, came to Lahore and studied the Hamasah, under the fostering care of M. Faiz-ul-Hasan Saharanpuri, the Head of the Arabic Department. As he had arrived after the admissions were over, he was allowed to sit in class as a Casual student.

The second epoch in the life of the College start with 1882 A.C., and ends with 1910 A.C. On the 14th October, 1882, the Punjab University came into existence, with Dr. Leitner as its first Registrar. A separate Oriental Faculty was set up in the University and permission was granted for the award of B.O.L. and M.O.L. Degrees. The first Convocation of the Punjab University took place on the 18th November, 1882. Lord Ripon, the Viceroy of India, attended this function, in his capacity of Patron of the University. The one thing that deserves prominent mention is that on this occasion Dr. Leitner read out a summary of the annual report of the University in Urdu and had the honour of being the first to initiate this tradition. It was appropriate that the University awarded the Degree of D.O.L. (honoris causa) to Dr. Leitner in this Convocation in recognition of the excellent services he had rendered to the cause of Oriental Learning.

The Oriental College encountered several vicissitudes of fortune during its existence. Initially it was housed in rented buildings inside the old City of Lahore. In 1874 A.C., when the building of the Government College Lahore was completed, the Oriental College was also accommodated in a corner of it. But the dominant partner in the building kept on squeezing out the Oriental College from the portion it occupied. Dr. Leitner who was already working as Principal of the Government College and Registrar of the University College, was appointed the first Principal of the Oriental College, in addition to his other duties. For seven years he worked as such in an honorary capacity but on the 18th of August 1877 A.C., he accepted a monthly salary of Rs. 500/- p.m. Over and above his administrative duties, the burden of superintending and guiding Research and publications also rested on his broad shoulders. Later this Department was headed by other savants. The objects aimed at in the Oriental College included instruction in languages and sciences as well as research, preparation of books and their printing and publication. With this object in view, Research Fellowships were instituted in the College. Two learned Research monthlies, one in Arabic and the other in Persian were also brought out. The Arabic Magazine "Shiafal Sudur" was edited by M. Faizul Hasan Saharanpuri while the Sanskrit monthly "Vidyo-dai" had Professor Rikhikesh Shastri as its Editor. The intellectual climate in the College owed much to the singleminded devotion and hard work of its first Principal.

The spirit of detachment and independence prevailing in the College can be judged from the fact that it received no financial grant from the Government. Only, a few rooms in the Government College building were made available for its accommodation and for this generosity, adequate return was made in the shape of instructional assistance to the Government College, in certain subjects. The expenses of the Oriental College were met from donations from the common people and contributions made by the chiefs and magnates of the Punjab. Of course, the College was formally affiliated to the University College which was a Government aided institution.

The first period of the life of the Oriental College covers 12 years from 1870 A.C. to 1882 A.C. Instruction in several subjects went on

and text books began to be compiled in and translated into this language. The Education Department was established on a regular basis in the Punjab in January 1856. Company Rule ended in 1858 A.C. and the sub-continent began to owe allegiance directly to the British Crown. The Government College Lahore was set up in 1864 A.C. This institution used to prepare students for the Calcutta University examinations. In this very year, Dr. G.W. Leitner, was appointed Principal of the Government College. The Anjuman Punjab owed its formation on the 21st January 1865 A.C. to his solicitude and efforts. The declared objects of this institution included the revivification of Oriental learning. In a meeting of the Anjuman held in August 1865, Dr. Leitner presented his concept of an Oriental University to the audience and it evoked enthusiastic response. The University envisaged by him was to be one in which, to qoute his own words "Oriental Languages would form the base of education and through their medium, European learning would be imparted". The Oriental University plan was forwarded to the Government, but did not receive immediate acceptance. On the 27th May, 1868, the Punjab Government recommended to the Indian Government the establishment of a University at Lahore on the plea that the methodology of the Calcutta University was not in harmony with the educational requirements of the Punjab. In a letter dated the 11th February 1869, despatched by the Provincial Government to the Central Government occurs this interesting appraisal of the existing system of education in the English medium : "It is manifest that those who received higher education, get alienated from their fellow citizens and the moral consequences of such an education have not been commendable". The Oriental University was not established but the 8th of December, 1869, A.C., saw the foundation of the University College, Lahore. Later this institution came to be known as the Punjab University College and Dr. Leitner was appointed its first Registrar. The question of the advancement of Oriental Languages and Learning provided the subject of debate in a meeting of the Senate of the University College. As a result, a school of oriental learning was decided to be set up. Till March 1872 A.C., this institution was known as the Oriental School but later it was designated 'the Oriental College' and college classes were also started in it, beside the school classes.

Address

By

DR. JUSTICE S. A. REHMAN,
Chairman Centenary Committee

Ladies & Gentlemen!

It is a matter of great privilege and signal honour for me that I have been vouchsafed this opportunity to address this historic assemblage of distinguished scholars and savants. In today's gathering are present some votaries of knowledge and learning, who have travelled long distances to be with us to participate in the Centenary celebrations of the Oriental College, Lahore. With their participation, this function has acquired greater dignity and new dimensions. I hope and trust that their stay in the historic city of Lahore will have pleasant associations for them. I wish to assure them that thier kindness and indulgence will remain with us as a precious and cherished memory and that we feel highly indebted to them.

The normal span of human life, according to the Psalmist, is three score years and ten. I am unable to conjecture the feelings of a person who crosses this dividing line and approaches the centennial limit. At least I can lay claim to no such personal experience. In any event, according to the revealed scripture, this will probably be the lowest of the low stages of life. But perhaps this kind of limitation in the case of institutions would be tantamount to *lese-majestie*, I imagine that in respect of institutional entities, there ought to be an equation between antiquity and excellence for the very fact of immunity from the ravages of time would be a pointer to its utility. In the light of this thought, the Centenary Celebrations of the Oriental College need no justification and the point of their significance requires no gloss.

It was in 1849 A.C. that the Punjab region was brought under the British sway. Persian was the state language during the Sikh regime. With the advent of the British, Urdu replaced Persian as the official and state language. Urdu became the medium of instruction in schools too



ڈاکٹر جسٹس ایس اے رحمان، صدر مجلس یوم تاسیس اورینٹل کالج

On the occasion of the first Convocation of the University of the Punjab held on 18 November 1882, the Viceroy, Lord Ripon, who was Patron of the University, expressed his satisfaction at the fact that the leaders of the Punjab had taken interest in the establishment of this University and had also given financial help. Lord Ripon said :

> "I rejoice to think that this institution of education should be managed and administered, so far as may be, by the leading men of the district, and thus that great political object which the Government of India of to-day have so much at heart, of aiding and advancing the political training of the people in the conduct of their own local affairs will be greatly furthered and assisted....The time has fully come when it should be one of the foremost objects of the British Government in India to provide, so far as a Government within proper limits can, for the intellectual training and for the social and political development of the people."

The expressions like "so far as may be", "within proper limits", reflect the political objectives of the Government of that time. Today, however, the object of this institution is to produce full political, cultural and literary consciousness. Only in the light of these aims can this institution go through the various stages of its progress. This institution is to be developed into a National Institute of Languages of the Punjab. It is our desire that the Government of Pakistan should give it the status of a Centre of Excellence.

In the end, I offer my heartfelt felicitations to this great seat of learning on its Centenary and extend a warm welcome to the distinguished delegates. I would, however, make bold to point out that on the occasion of such celebrations it is customary to assess the past and the present. While satisfaction is expressed over one's past achievements, new resolutions have to be made and new plans prepared for progress in the future. Let us all resolve today that we will enhance the glory of this institution and foster the growth of its intellectual and scholarly pursuits. No impediments will be allowed to stand in the way of the achievement of these objectives.

MOHAMMAD AJMAL

Lahore,
12 March 1973.

The biggest problem facing our teachers and students at present is to achieve meaningfulness and significance in our literature and other fields of learning. A student wishes to establish a relationship between life and whatever he studies and learns. In the modern age there are no water-tight comparatments between various disciplines. They are all inter-related. Oriental learning could also be viewed from this angle. It is essential that a training in Linguistics should be imparted in an institution of Oriental learning. Linguistics is a science, and Semantics is one of its important branches. Under the influence of Noam Chomsky, Psycho-linguistics is also rapidly developing. It is necessary that these branches of learning should also be introduced in this College and encouraged to develop here. The teachers, who have so far been framing syllabi and courses of reading in the stereotyped manner, should now introduce such changes as would enable a student, who speaks Punjabi at home, to co-relate this mother tongue with the linguistic and semantic characteristics of Persian, Arabic and Urdu.

But even this is not enough. Literature should encompass all spheres of life, forge links with all branches of learning, try to reach the common man and interpret his desires and aspirations. Literature will, therefore, have to be judged against the background of History. Philosophy, Economics, Sociology and Psychology. New canons of literary criticism will have to be evolved. It is easier to say :

ما قصهٔ سکندر و دارا نخوانده‌ایم   از ما بجز حکایت مهر و وفا مپرس

(We have not studied the history of Alexander and Darius,
Don't ask from us anything but the story of love and faithfulness)

But often the conflict between Alexander and Darius kills the emotions of love and faithfulness in the common man. Literature cannot escape the impact of the conflict between Alexander and Darius,. Even if it tries to do so, it cannot avoid the use of symbols relating to such a conflict. I would, therefore, appeal to those who write romantic stories of love and fidelity that they should observe the natural emotions of man against the background of the conflict between Alexander and Darius. Only thus will the young students discover a meaning in their education, and educationist and scholars will infuse life and vigour in their teaching and writings.

Ninety-one years ago, in 1882, Sir Charles Aitchison made the following observations about the setting up of this institution in the Governor-General's Council :

"That while the highest honours of the University be reserved for those who attain the highest form of education, which, it is admitted, can only at present be attained by those possessing a thorough knowledge of English, the University also recognize and honour literary merit and learning in the case of those unacquainted with the English language."

These observations are a clear indication of the way of thinking of a member of the ruling class. How far have we revolted against these aims and ideas? In the present world conditions it is essential for us to learn the English language and acquire proficiency in it. But can we describe this proficiency in English as the highest category of learning? The more we develop awareness of our past traditions and culture, the stronger will became our collective ego.

This College has a glorious past; its present is no less so. But so far we have no clear concept of its future shape. In the modern age no institution or person deserves to survive without going through a constant process of growth and development. Survival depends upon breadth of vision and a willingness to adjust to the changing times.

I took my M.A. in Philosophy from the Government College, Lahore, about thirty years ago. Having no other job, I took admission to the M.A. Persian Class at the Oriental College. After about a month I left this College. One reason why I gave up the study of Persian was that the type of training, which Philosophy had imparted to me, required a critical and bold analysis of words and images to achieve a close approximation of thought and expression. In the Persian language, on the other hand, the prolific use of words and the unimpeded flow of language made the use of reason and critical analysis almost an impossible task. I could not stand the strain of this whirlpool of ambiguity and so discontinued my study of Persian. This even occurred thirty years ago and perhaps it is still under its influence that I have formulated some ideas about the future shape of this great institution.

The biggest problem facing our teachers and students at present is to achieve meaningfulness and significance in our literature and other fields of learning. A student wishes to establish a relationship between life and whatever he studies and learns. In the modern age there are no water-tight comparatments between various disciplines. They are all inter-related. Oriental learning could also be viewed from this angle. It is essential that a training in Linguistics should be imparted in an institution of Oriental learning. Linguistics is a science, and Semantics is one of its important branches. Under the influence of Noam Chomsky, Psycho-linguistics is also rapidly developing. It is necessary that these branches of learning should also be introduced in this College and encouraged to develop here. The teachers, who have so far been framing syllabi and courses of reading in the stereotyped manner, should now introduce such changes as would enable a student, who speaks Punjabi at home, to co-relate this mother tongue with the linguistic and semantic characteristics of Persian, Arabic and Urdu.

But even this is not enough. Literature should encompass all spheres of life, forge links with all branches of learning, try to reach the common man and interpret his desires and aspirations. Literature will, therefore, have to be judged against the background of History, Philosophy, Economics, Sociology and Psychology. New canons of literary criticism will have to be evolved. It is easier to say :

ما قصهٔ سکندر و دارا نخوانده ایم — از ما بجز حکایت مهر و وفا مپرس

(We have not studied the history of Alexander and Darius,
Don't ask from us anything but the story of love and faithfulness)

But often the conflict between Alexander and Darius kills the emotions of love and faithfulness in the common man. Literature cannot escape the impact of the conflict between Alexander and Darius,. Even if it tries to do so, it cannot avoid the use of symbols relating to such a conflict. I would, therefore, appeal to those who write romantic stories of love and fidelity that they should observe the natural emotions of man against the background of the conflict between Alexander and Darius. Only thus will the young students discover a meaning in their education, and educationist and scholars will infuse life and vigour in their teaching and writings.

Ninety-one years ago, in 1882, Sir Charles Aitchison made the following observations about the setting up of this institution in the Governor-General's Council :

> "That while the highest honours of the University be reserved for those who attain the highest form of education, which, it is admitted, can only at present be attained by those possessing a thorough knowledge of English, the University also recognize and honour literary merit and learning in the case of those unacquainted with the English language."

These observations are a clear indication of the way of thinking of a member of the ruling class. How far have we revolted against these aims and ideas? In the present world conditions it is essential for us to learn the English language and acquire proficiency in it. But can we describe this proficiency in English as the highest category of learning? The more we develop awareness of our past traditions and culture, the stronger will became our collective ego.

This College has a glorious past; its present is no less so. But so far we have no clear concept of its future shape. In the modern age no institution or person deserves to survive without going through a constant process of growth and development. Survival depends upon breadth of vision and a willingness to adjust to the changing times.

I took my M.A. in Philosophy from the Government College, Lahore, about thirty years ago. Having no other job, I took admission to the M.A. Persian Class at the Oriental College. After about a month I left this College. One reason why I gave up the study of Persian was that the type of training, which Philosophy had imparted to me, required a critical and bold analysis of words and images to achieve a close approximation of thought and expression. In the Persian language, on the other hand, the prolific use of words and the unimpeded flow of language made the use of reason and critical analysis almost an impossible task. I could not stand the strain of this whirlpool of ambiguity and so discontinued my study of Persian. This even occurred thirty years ago and perhaps it is still under its influence that I have formulated some ideas about the future shape of this great institution.

Address of Welcome

BY

DR. MOHAMMAD AJMAL

Vice-Chancellor, University of the Punjab

Honourable Chief Guest, respected delegates, ladies and gentlemen!

We have assembled here today to celebrate the Centenary of the University Oriental College. It is not easy to assess the achievements of this institution during the last hundred years. Even so we can claim that this College has rendered valuable services in the field of Oriental learning and literature in a spirit of selfless dedication. Eminent scholars like Dr. G. W. Leitner, Dr. A. C. Woolner, Hafiz Mahmud Sheerani, Maulana Shadan Bilgrami, Professor Maulvi Muhammad Shafi and Dr. Muhammad Iqbal worked and taught in this institution. They imparted sound scholarship to their pupils and inspired them with love and zeal for learning. The poet-philosopher of Islam, Allama Muhammad Iqbal, also served in this institution as McLeod Reader in Arabic for sometime in 1899. Instruction was also imparted here in the fields of Civil Engineering, and *Yunani* and *Ayurvedic* Medicines, but later on this heterogeneous combination of subjects was found unsatisfactory and, therefore, instruction in these subjects was transferred to other institutions. This College has a glorious past. Teaching in the various fields of Oriental learning is being imported in this institution for the last hundred years. In the beginning the foreign rulers wished to provide a justification for their claim that Western literature and culture were far superior to Eastern literature and culture, but such is the irony of the dialectical processes set in motion by imperialism that the study of these very subjects brought self-awareness and awakening to the Muslims of the sub-continent. The ego of the enslaved nations is sought to be destroyed by their colonial masters; and their self-respect is undermined. The wounds of the injured ego can only be healed by a recollection of their glorious past. Though it satisfied the colonial rulers, feeling of contempt towards their subjects, yet in a way it proved a blessing for the latter in as much as it strengthened their ego and self-respect.



ڈاکٹر محمد اجمل (وائس چانسلر)

in touch with the modern literary trends. The exhibition of the Oriental College publications will amply prove that our teachers have not ignored the new trends of criticism and literature and that they have been keenly studying the new trends in life and literature. The students trained in this institution are today holding important 'positions in society, as teachers, writers, journalists and poets. Now that the present Government has decided to raise the national language to its proper position, it is hoped that our students will find more opportunities to serve the national interests.

We are fully prepared to shoulder our responsibilities in the work of nation-building. Urdu language has immense potentialities and is capable of fulfilling the demands of national life. It however requires collective efforts to dig out the hidden possibilities of this language. We have a will to perform this laborious task. The history of this College is a record of our keeping pace with the changing times, and in future too we shall try to cope with the new social demands.

Ladies and Gentlemen ! The students and teachers of the Oriental College with their traditions and work have raised the reputation of the College not only in this country but also abroad. This institution is respected in every university in the world. The distinguished delegates from different countries, attending this centenary, are another proof of the international reputation of this institution.

With these words, I once again welcome you, ladies and gentlemen and thank you for the trouble you have taken by participating in our centenary celerations.

EBADAT BRELVI

Lahore,
12th March, 1973.

this account that, side by side with maintaining the old tradition of the classical studies, we had to make important changes in the syllabi and courses of reading in view of the modern demands. Our teachers made valuable study tours of Iran and different Arab countries for assimilating the modern idiom and modern literary trends. Hence important changes were made in the syllabi and courses of reading of these languages. Thus with the combination of the classical and the modern trends new life has been infused in the teaching of Arabic and Persian languages.

It was in 1948 that the Department of Urdu, our national language, was opened in this College. In the beginning, famous writers and poets like Sir Abdul Qadir, Maulana Salahuddin and Dr. M. D. Taseer voluntarily associated themselves with the teaching in the Urdu Department, but permanent teaching staff was engaged in due course of time and within a few years the Department of Urdu became a flourishing department, alive with its literary, critical and research activities. After 1960 the number of students increased to more than three hundred in the M.A. (Previous and Final) Classes, but due to shortage of space, we had to reduce the number to two hundred in both classes.

The teachers of the Department of Urdu have been constantly in touch with the glorious traditions of linguistic and historical research. Within a few years the research and critical works of this Department got recognition not only in this sub-continent, but also in the universities abroad where Urdu language is taught. It will not amount to self praise if I say that this department has been the most important centre of critical and research activities during the last twenty years, under such scholars of repute as Dr. Syed Abdullah, Dr. Abdul Lais Siddiqi and Professor Syed Viqar Azim. The research work done at the M.A. and Ph.D. levels in Urdu during the last few years, both quantitatively and qualitatively, is of such a value that no other University can match it. More than two dozen of Ph.D. theses have been written out of which some have been published and widely acclaimed. M.A. theses number about five hundred, a large number of these are worth publishing and we are making a plan for it.

Ladies and Gentlemen ! It is true that we have been mainly busy in teaching and research of the classical literature, yet we are constantly

Muhammad Shafi and Hafiz Mahmud Sheerani spent a large span of their life in search of old manuscripts. It was due to their untiring labour that the Punjab University Library was enriched by a large number of Arabic, Persian, Urdu and Punjabi manuscripts and rare books. The efforts of these scholars formed a golden period in the history of this College.

Ladies and Gentlemen ! The Oriental College Magazine, first published in February 1925, is a very important event, for till today it is an important representation of the research activities of this College and is a link between us and the Orientalists of the world. This Magazine is a specimen of the research activities, *viz.* the study of historic perspective, establishment of facts, critical analysis, search of the old sources, compilation and editing, etc., which constitute the salient features of the Oriental College School of Criticism and Research. Besides the Oriental College Magazine, the Arabic and Persian Society of the College and the Oriental Publications Fund have also been publishing some important research work. This tradition still continues in this College.

After the estabilshment of Pakistan the Oriental College turned a new leaf in its history. The Departments of Sanskrit and Hindi had to be closed down, as the teachers of these departments migrated to India. In the changed circumstances, the Oriental Departments of Adib, Alim and Fazil Classes had to be closed down for they no more attracted students. Instead, M.A. Classes in Urdu were started in the College which soon became a major department of our national language. Diploma and Certificate Classes were also opened in French, Spanish, German. Italian and Turkish languages and a new Department of Punjabi was added to the College last year. M.A. Classes in Punjabi have opened new vistas for literary and research activities.

Ladies and Gentlemen ! As you know, the Oriental knowledge is the basis of this College and the sources of this knowledge are mainly in Arabic and Persian languages. The importance of these languages increased with the advent of Pakistan, for these are not only the basis of our culture and tradition, but are also an important link between Pakistan and other important countries of Central Asia and Africa. It was on

to presume that the same book inspired Maulana Shibli towards his historical studies. The monthly literary and research journal of the Oriental College entitled *Shifa-as-Sadoor* was also published under the editorship of Maulana Faizul Hasan, which encouraged the research activity and formed the literary taste in the early days of this College.

It was during this early period that Maulana Faizul Hasan. Maulana Abdul Hakim Kalanoori, Mufti Muhammad Abdullah Tonki, Maulana Muhammad Husain Azad, Maulvi Muhammad-ud-Din Mukhtar and others actively participated in the editing and translation of many classical works. It was due to the literary and research work of these great scholars and teachers that by the end of the 19th century this institution became distinguished for its contributions in the domain of knowledge.

Ladies and Gentlemen ! In the very beginning of the 20th century this institution had the good fortune of having a Principal of the stature of the great scholar of international fame, Dr. A. C. Woolner, who remained its Principal from 1903-1936. Dr. A. C. Woolner was a scholar of Sanskrit and besides his philological interests, he was an expert in editing and research. His love of knowledge and fine administration created an atmosphere conducive to literary and research activities in the College. The teachers and scholars of this College drank deep from the different sources of learning, both in East and West. Dr. A. C. Woolner and Dr. Laxmi Swarup were educated at Oxford; Dr. Maulvi Muhammad Shafi and Dr. Muhammad Iqbal obtained their degrees from Cambridge under the guidance of Professor E. G. Brown. Dr. Azim-ud-Din took his Ph. D. Degree in Philology from Germany. Hafiz Mahmud Khan Sheerani took instruction from Dr. Arnold in London. Mufti Abdullah Tonki, Maulana Shadan Bilgrami and Maulvi Abdul Aziz-al-Memoni studied under the local scholars of repute. The combination of the Western critical attitude and zeal for research with the Eastern thought and knowledge raised the standard of teaching and research and the old traditions of this College got a new life. In the new circumstances, the work of research, study of the old manuscripts and establishing the historical background of the great classical works got an impetus, not known before. These efforts spread a general taste for searching and editing of the old manuscripts in the whole sub-continent. Dr. Maulvi

to the students from lower middle classes, who could not afford expensive education in other educational institutions. Among those who were educated in this College in adverse circumstances and rose to eminence on account of their learning and scholarship, are Professor Abdul Aziz-al-Memani, Maulana Imtiaz Ali Khan Arshi, Dr. Andalib Shadani, Dr. Syed Abdullah and Dr. Muhammad Baqir.

Ladies and Gentlemen! One important feature of the teaching of Oriental Studies in this College has been its use of modern methods and techniques and its high academic standards. It combined the Western methods of research with the Eastern depth of knowledge. It was Dr. G. W. Leitner who emphasised the need of philological research and the historical perspective in the teaching of literature and language. This point of view was accepted by the Orientalists in this College, which added a new dimension in their teaching of Oriental languages.

From among a number of great scholars only one example need be given here. Maulana Faizul Hasan Saharanpuri, who was already an eminent scholar, revolutionized the teaching of Arabic language and literature in the Oriental College. At a time when the Arabic scholars were busy in the subtleties of the later Arabic poetry, the Maulana emphasised earlier Arabic poetry and stressed its linguistic and literary qualities. His teaching of the *Himasa* was so popular that the students of Arabic literature came to Lahore to attend his lectures from distant places in the Sub-continent. Allama Shibli Nomani too was attracted by the Maulana's scholarship and was his pupil. Maulana Syed Muhammad Sulaiman Nadvi says about the Maulana : "The Maulana was a Literateur of such a great stature that the time did not produce his equal within the last hundreds of years."

Besides the new methods and techniques of teaching, the tradition of linguistic and historical research was also established in the same early period. The teachers of Arabic and Persian were usually ignorant of the historic background of the literature and language. In 1871 Dr. G. W. Lietner wrote a short history of the Arabic language and Islamic studies in two volumes, under the title *Sanin-i-Islam* in collaboration with Maulana Faizul Hasan and some other teachers. It will not be improper

Address of Welcome

PROFESSOR DR. EBADAT BRELVI
Principal Oriental College
Lahore

Mr. Chairman and Hon'ble Guests !

It is a great pleasure for me to be in the distinguished company of eminent scholars from East and West, assembled here to celebrate the Centenary of the University Oriental College. I welcome all the delegates from different universities and educational institutions, who have come to attend this Conference in token of the recognition of the services rendered by this College.

Ladies and Gentlemen ! We are sorry for not having been able to arrange these celebrations at the scheduled time. These celebrations should have been held in 1970, as Dr. G. W. Leitner's proposals of 1865 regarding the establishment of an Oriental University was finally put into effect in 1870 in the form of an Oriental School. But as you all know, during these few years our country underwent a political crisis which is not yet over, but we have snatched this occasion for our very simple celebrations and we hope that this august gathering of the Orientalists will be auspicious for our institution.

This memorable gathering of the scholars from East and West reminds us of the great services rendered by the Oriental College at every phase of its life of more than a hundred years. The founder of this College, Dr. G. W. Leitner, revived the tradition of cooperation between the local and the external Orientalists which was for the first time established in the Fort William College and later in the Old Delhi College. These two institutions, however, had limited sphere of activity and were short-lived. The Oriental College worked on a larger plan; apart from the teaching of oriental languages, it included in its sphere editing, compilation, translation, criticism and research, and this it has continued doing for more than a hundred years, despite many handicaps. One of the most important feature of this College had been the imparting very cheap education



٦

پروفیسر ڈاکٹر عبادت بریلوی، پرنسپل یونیورسٹی اورینٹل کالج، لاہور
سیکرٹری جنرل جشن صد سالہ

FIRST SESSION

☆

INAUGURAL

☆

ADDRESSES

by

DR. EBADAT BRELVI
DR. MOHAMMAD AJMAL
DR. JUSTICE S.A. RAHMAN

Professor Faiz Ahmad Faiz,
Islamabad.
Mr. Qadratullah Fatmi,
Islamabad.
Syed Sibt-e-Hasan Rizvi,
Rawalpindi.
Hafiz Tufail Mohammad
Dr. Iftikhar Ahmad Ghauri,
Jauharabad.
Dr. Wazir Agha,
Sargodha.

Peshawar

Mr. Abdul Hashim Khan,
Vice-Chancellor,
Peshawar University.
Dr. M. Shamsuddin Siddiqui,
Peshawar University.
Dr. Syed Murtaza Jaffery,
Peshawar University.
Dr. K. B. Nasim,
Peshawar University.
Dr. Mir Wali Khan,
Peshawar University.
Mr. Khatir Ghaznavi,
Peshawar University.

Quetta

Professor Karrar Hussain,
Baluchistan University.
Mr. Khalil Siddiqui,
Blauchistan University.

Sahiwal

Professor Agha Amjad Ali,
Sahiwal.
Dr. A. D. Nasim,
Sahiwal.

List of Pakistani Delegates

Karachi

Dr. Mahmood Hussain,
Vice-Chancellor.
Dr. Riaz-ul-Islam,
Karachi University.
Dr. Abu Lais Siddiqi,
Karachi University.
Dr. Farman Fatehpuri,
Karachi University.
Dr. Manzoor Ahmad,
Karachi University.
Dr. Abid Ali Khan,
Karachi.
Dr. Muhammad Yousuf,
Karachi.
Professor Mumtaz Hussain
Karachi.

Hyderabad

Professor Ghulam Mustafa Shah,
Vice-Chancellor, Hyderabad University.
Dr. Ghulam Mustafa Khan,
University of Hyderabad.
Dr. A.W. Halepota,
Hyderabad.
Dr. Nabi Bakhsh Kazi,
Hyderabad.

Rawalpindi, Islamabad.

Dr. Miss Kaneez Yousuf,
Islamabad University.
Dr. Ahmad Hasan Dani,
Islamabad University.

Mashed

Professor Jalal-e-Meteeni,
University of Mashed.

Professor A. Mishkatodini,
University of Mashed.

United States of America

Dr. Carlo Coppola,
Oakland University, Michigan,
U.S.A.

Dr. Dudley Woodberry, (Harvard)

U.S.S.R.

Professor Mara Stepannients,
Professor of Oriental Philosophy,
Institute of Philosophy, Moscow.

United Kingdom

Professor Ralph Russell,
Head, Urdu Studies,
Department of India-Pakistan and Ceylon,
School of Oriental and African Studies, University of London.

Mr. John Haywood,
Director,
School of Oriental Studies,
University of Durham.

Netherlands

Professor J.M.S. Baljon,
University of Leiden,
Netherland.

List of Foreign Delegates

Turkey

Professeor Abdulkadir Karahan,
University of Istanbul.

Republic Arab of Egypt :

Dr. Shaikh Muhammad al-Fahham,
Rector, Al-Azhar University,
Cairo.

Dr. Fatma Moussa, Mahmoud,
Cairo University.

Saudi Arabia

Dr. Mahmood Zaini,
King Abdulaziz University,
Saudi Arabia.

Shaikh Mohammad Ibn Nasir al-Aboudi,
Jamia Islamia,
Medina,
Saudi-Arabia.

Iran

Profeseor Mujtaba Meenavi,
University of Tehran.

Professor Nasir-ud-Din Shah-Hussani,
University of Tehran.

Professor Muzahar Musaffa,
University of Tehran.

Mrs. Muzahar Musaffa,
University of Tehran.

LIST OF DELEGATES

Saturday, 17 *March*, 1973

FIRST SESSION

9 A.M.

SENATE HALL

PUNJABI LANGUAGE AND LITERATURE

Inauguration .. CHAUDHRI MUMTAZ AHMAD KAHLOON, Minister Auqaf, Punjab Government

Chairman .. PROF. ALLAMA ALAUDDIN SIDDIQI

1. Dr. Laceq Babari
2. Mirza Maqbool Baig Badakhshani
3. Mr. Asghar Saleem
4. Dr. Agha Yamin
5. Dr. Ghulam Hussain Zulfiqar
6. Begum Razia Madad Ali

SECOND SESSION

11 A.M.

Chairman .. PROF. SUFI GHULAM MUSTAFA TABASSUM

PAPERS

1. Prof. Jilani Kamran
2. Dr. Waheed Qureshi
3. Mr. Ishfaq Ahmad
4. Prof. Qayyum Nazar
5. Mr. Ain ul Haq Faridkoti
6. Mr. Ismail Bhatti

THIRD SESSION

2 P.M.

(Symposiums: Problems of Oriental and Islamic Learning)

Chairman .. PROF. Dr. A. K. KARAHAN, Istanbul University

All delegates will participate.

Friday, 16th March, 1973

FIRST SESSION

9-A.M.

SENATE HALL

URDU LANGUAGE. LITERATURE, HISTORY AND CULTURE OF MUSLIMS OF INDO-PAK SUB-CONTINENT

Inauguration .. MAULANA KAUSAR NIAZI,
Minister of Information Haj and Auqaf, Pakistan Government

Chairman .. PROFESSOR RALPH RUSSELL,
School of Oriental and African Studies, University of London.

PAPERS

1. Dr. Carlo Coppola, (Michigan, U.S.A.)
2. Professor J.M.S. Baljon (Holland)
3. Professor Hamid Ahmad Khan, (Ex-Vice-Chancellor, Punjab University)
4. Professor Mara Stepanients (USSR)
5. Prof. Dr. Riazul Islam (Karachi University)
6. Prof. Dr. Ghulam Mustafa Khan (Sind University, Hyderabad),
7. Dr. Mohammad Shamsuddin Siddiqi (Peshawar University)
8. Dr. Farman Fatehpuri (Karachi University)
9. Mr. Khatir Ghaznavi (Peshawar University)
10. Maulana Jaafar Qasimi (Ulema Academy, Lahore)

SECOND SESSION

2 P.M.

SENATE HALL

Chairman .. PROF. Dr. GHULAM MUSTAFA KHAN
(Sind University, Hyderabad)

PAPERS

1. Professor Ralph Russell (SOAS, University of London)
2. Professor Dr. A. H. Dani (Islamabad University)
3. Professor Dr. Abul Lais Siddiqi (Karachi University)
4. Dr. Manzur Ahmad (Karachi University)
5. Prof. Dr. S. M. Abdullah
7. Professor Sufi Ghulam Mustafa Tabassum (Lahore)
8. Professor Syed Viqar Azim
9. Dr. A. D. Nasim, (Government College, Sahiwal).
10. Dr. I. A. Ghauri (Jauharabad)
11. Dr. Syed Murtaza Jaafari (Peshawar)

Thursday, 15th March, 1973

FIRST SESSION

9-A.M.

SENATE HALL

PERSIAN AND IRANIAN STUDIES

Inauguration .. H.E. AQAI MANUTCHEHR ZELLI,
Ambassador of Iran

Chairman . PROFESSOR NASIRUDDIN SHAH-HOSEINI,
Teheran, Iran

PAPERS

Professor Dr. Jalal Matini (Mashed, Iran)
Professor Dr. Wafiullah Samiyee (Kabul, Afghanistan)
Professor Dr. Mehdi Mohaghegh (Teheran, Iran)
Professor Dr. Abdul Mohsin Meshkatoddini, (Meshed, Iran)
Professor John Haywood (Durham, U.K.)
Professor Dr. A.A. Panahi (Iran)
Professor Dr. Syed Abdullah
Professor Dr. Muhammad Baqir
Professor Dr. Abdul Shakoor Ahsan
Syed Vazirul Hasan Abedi
Dr. Syed Muhammad Akram Shah

SECOND SESSION

2-P.M.

SENATE HALL

Chairman .. PROFESSOR WAFIULLAH SAMIYEE,
Kabul, Afghanistan.

PAPERS

Professor Nasiruddin Shah Hoseini, (Teheran, Iran)
Professor Sayeed Afghani, (Kabul, Afghanistan)
Professor Abdulkadir Karahan, (Istanbul, Turkey)
Professor Ziauddin Sajjadi, (Teheran, Iran)
Professor Ghulam Mustafa Khan, (Hyderabad, Sind)
Professor Sufi Ghulam Mustafa Tabassum
Dr. Abid Ali Khan (Karachi)
Dr. K. B. Nasim (Peshawar)
Dr. Mian Bashir Husain
Dr. Agha Yamin Khan
Dr. Aftab Asghar

Wednesday, 14th March, 1973

FIRST SESSION

9-A.M.

SENATE HALL

ARABIC AND ISLAMIC LEARNING

Inauguration .. **H.E. Dr. M. AL-SAADANI,**
Ambassador of the Royal Kingdom of Morroco in Pakistan

Chairman .. **Prof. J.M.S. BALJON (Leiden, Holland)**

PAPERS

Dr. Dudley Woodberry Harvard (U.S.A.)
Dr. Fatima-Moussa Mahmoud (Cairo)
Prof. Qudratullah Fatmi (Islamabad)
Dr. Pir Mohammad Hasan (Rawalpindi)
Dr. Rashid Ahmad (Lahore)
Maulana Abdulquddus (Peshawar)
Dr. Abid Ahmad Ali
Prof. Dr. Mara Stepannients (USSR)
Prof. Dr. Shaikh Inayatullah (Lahore)
Dr. Zulfiqar Ali Malik
Dr. Abdur-Rahman Wali Shah (Islamabad)

SECOND SESSION

2-P.M.

Chairman .. **Prof. Dr. M.M. FAHHAM,**
Rector, Al Azhar University, Cairo

PAPERS

Prof. Dr. J.M.S. Balgon (Netherland)
Dr. M. Khaled (Morocco)
Prof. S. M. Yusuf (Karachi)
Miss Asma Rashid (Multan)
Prof. Abdul Maqsood Shalgamy (Cairo)
Dr. Mahmood Zaini (Jeddah)
Dr. Mir Wali Khan (Peshawar)

SECOND SESSION

2 P.M. Senate Hall

Chairman .. **PROFESSOR FAIZ AHMAD FAIZ**
Director, National Council of Arts.

Shaikh Mohammad al-Fahham (al-Azhar)

Ch. Ghulam Rasool Azhar

Aqa Bedar Bakht Khan

Professor Allama Alauddin Siddiqi

Professor Sufi Ghulam Mustafa Tabassum

Mr. Ahmad Nadim Qasmi

Dr. Abdullah Chughtai

Professor Kh. Salahuddin

Dr. Ghulam Yasin Khan Niazi

Prof. Kh. Muhammad Aslam

Professor John Haywood (Durham)

Professor Ralph Russel (London)

Professor Dr. Abdulkadir Karahan

Professor Tahir Farooqi

Maulana Abdulquddus

Hakim Nayyar Wasti

Mr. Ishrat Rahmani

Dr. Sabir Ali Khan

Professor Siddiq Kaleem

Miss Altaf Fatima

Malik Bashirur-Rahman

Amjad Islam Amjad

Hasan Rizvi

Muzaffar Abbas

FIRST SESSION

10 A.M. Sentate Hall

Inauguration .. Mr. MOHAMMAD HANIF RAMAY,
Finance Minister, Punjab Government

Chairman .. PROFESSOR HAMID AHMAD KHAN
Ex-Vice-Chancellor, Punjab University, Lahore

PAPERS

Professor Sheikh Abdur Rashid

Dr. Muhammad Hamidullah (Paris)

Professor Dr. Muhammad Waheed Mirza

Professor Annemarie Schimell (Germany)

Professor Dr. Abdul Hameed

Dr. S.R. Wasti

Professor Dr. S.M. Abdullah

Professor Dr. Muhammad Baqir

Professor Syed Viqar Azim

Dr. Wazir Agha

Dr. Waheed Qureshi

Dr. Ghulam Hussain

Dr. Nazir Hasan Zaidi

Professor Dr. A.S. Ahsan

Syed Vazirul Hasan Abedi

Dr. Rana Ehsan Elahie

Dr. Ebadat Brelvi

Monday, 12th March, 1973, 4 p.m.

PUNJAB UNIVERSITY SENATE HALL

INAUGURAL SESSION

Welcome Address .. Dr. EBADAT BRELVI,
Principal, University Oriental College,
Dean, Faculty of Oriental and Islamic Learning,
Secretary-General

Messages .. Secretary-General

Welcome Address .. Dr. MUHAMMAD AJMAL,
Vice-Chancellor,
Chairman, Reception Committee

Address .. Dr. JUSTICE S. A. RAHMAN,
Chairman, Centenary Committee

Inaugural Address .. MALIK MERAJ KHALID,
Chief Minister, Punjab

Thanks .. Secretary-General

Reception of Delegates and other Guests by the

PUNJAB UNIVERSITY, LAHORE
5.30 P.M.

UNIVERSITY ORIENTAL COLLEGE
Dinner—8 P.M.

Tuesday, 13th March, 1973
9 A.M.

UNIVERSITY ORIENTAL COLLEGE, LAHORE

Exhibition of published works of the scholars associated with the University Oriental College

Inauguration .. Dr. ABDUL KHALIQ,
Minister of Education,
Government of the Punjab, Lahore

(Symposium: Academic Services of the University Oriental College)

UNIVERSTY ORIENTAL COLLEGE

UNIVERSITY OF THE PUNJAB, LAHORE

CENTENARY CELEBRATIONS 1973

International Congress of Orientalists

PROGRAMME

12th March-17 *March*, 1973

PROGRAMME

Message

From

INSTITUTE OF CENTRAL & WEST ASIAN STUDIES
KARACHI

It is indeed great occasion that you are celebrating today centena of Oriental College with which great scholars have been associated ar which provided great impetus to scholarship in our country. I hope ar pray you may preserve and entrich all the sacred traditions of this gre institute of learning. I welcome distinguished scholars from abroad partic pating in this session of the congress of Orientalists and trust their valuab contribution to its deliberations will inspire the scholars of our countr and thus help in bringing about mutual understanding and goodwill amor the people of the world. On my behalf as well as on behalf of my institut I wish you all success and offer our full cooperation.

HUSSAMUDDIN RASHDI.
Chairman

Message

From

THE UNIVERSITY OF JORDAN
FACULTY OF ARTS
AMMAN

Date Oct., 10, 1972.

Dear Professor Ebadat Brelvi,

It gives me greatest pleasure to accept your kind invitation to participate in the celebration of the centenary of your college. We, here in Jordan, appreciate the great role you have been playing in promoting the Islamic relationship between the moslem people in Pakistan and their brothers in the Arab world. We appreciate too the efforts you have been making towards the advancement of the Arabic studies.

I am glad to inform you that Dr. Yousef El-Haleese, Ph.D. General Linguistics and Phonetics London University, at the English Department in Jordan University has delightedly accepted to participate in this grand occasion and he is going to read a paper on emphasis (التفخيم) in some of the Arabic dialects. I should appreciate it very much if you would send him an official invitation as soon as possible.

Thanks for the hospitality you are offering us, and I should be obliged if you let me know as soon as possible how you are going to arrange for our tickets, Amman-Lahore-Amman, in order to make the necessary arrangements for this trip, with your University and the Jordanian authorities.

May I kindly draw your attention to the fact that I only hold the post of an associate professor at the Arabic Department and *not the post of the* Deanship at the Faculty of Arts as you address me in your letters.

I am looking forward to hearing from you soon.

Yours sincerely,
IBRAHIM MAHMOUD
(Associate Professor),
The Arabic Department
University of Jordan.

Message

From

ORIENTALISCHES INSTITUT DER UNIVERSITAT WIEN
UNIVERSITATSSTRASSE 7N

September 27th, 1972.

Dear Sir,

We herewith acknowledge receipt of your letter dated September 14th 1972 and thank you very much for your kind invitation to participate in the Congress of Orientalists on the occasion of the Centenary of your College in December, 1972.

It is with the deepest regret that we see ourselves obliged to inform you that our participation is unfortunately made impossible by previously made arrangements scheduled for this time. We, therefore, must restrict ourselves to the expression of our very best wishes for the success of your Congress.

Thanking you again for your kind invitation, we remain,

Yours sincerely,
(O. Univ. Prof. Dr. Hans L. Gottschalk)

Message

From

FREIE UNIVERSITAT, BERLIN
INSTITUTE FUR ISLAMWISSENSCHAFT

12-10-1972

Dear Professor Brelvi,

The President of our University has forwarded to me your kind invitation to take part in the celebrations for the Centenary of your distinguished College.

We have learned with great interest that the University Oriental College of Lahore, which undoubtedly is one of the greatest centers of Islamic Studies in the world, is now already concluding the first century of its history.

We should have been very happy to appear personally in order to present our best wishes at this occasion, to establish direct contact with the learned scholars working in the College, and to join as well as the other guests in the festivities and the discussions of our fields of study. Unfortunately, we are not able to do so, owing to our current obligations.

We express our sincere wish that the University Oriental College of Lahore will continue to flourish and to contribute to the advancement of Islamic Studies. We hope also that it will be possible to maintain and extend the relations which have been established between us.

With best regards,

Yours very sincerely,

PROF. DR. FRITZ STEPPAT)

Muslim world) that whenever Islam has remained true to its pure theistic essence, great scientific fruits were achieved. For me Western Civilization, cannot be identified with Christian Civilisation but it is Greek, Roman, Christian and Muslim, Islam being a vital part of our common culrutal heritage.

I hope, therefore, that the meritorious work of your Oriental (for me, as you see, also........... Occidental!) College will continue to be inspired by this truly Islamic spirit of "critical research of Truth", as it was in its past 100 years.

Yours truly,

PROF. ALESSANDRO BAUSANI
Head of the Department of Islamic Studies
University of Rome (Italy).

Message

From

Professor A. Bausani University of Rome (Italy)

Rome, Nov. 29th, 1972.

Dear Dr. Brelvi,

As you know, I shall not be able to participate in the Oriental College's Centenary Celebrations. But as an admirer of the work of the College and especially of its valuable scientific journal "Oriental College Magazine", I feel as my duty and pleasure to write to you expressing my most sincere wishes of good work and proficuous study for your College, in this happy occasion.

Science, of which the Holy Prophet said, as everybody knows اطلبوا العلم ولو كان في الصين has always been in Islamic Culture not a suprastructurla and ephemeral phenomenon but part of the very essence of Islam. It has always been my opinion that the logical issue of *tauhid*, if properly understood, is also experimental science. In spite of the confusion made by some mystical and gnostic thinkers of Islam who tried to reshape Islamic culture into an "Asicatic" and pantheistic frame, for me *tauhid* in the Qur'anic sense does not mean.. لا موجود الا الله. Pantheism would lead us to consider everything "holy" as God, and, therefore, renders experimental science impossible. *Tauhid* means simply what it is, لا اله الا الله in other words that all sacredness and all true values (not all being) are concentrated in Allah and come from Him. The things of this world are not "scared", as He is, but are created by Him "Seriously" ما خلقنا هذا باطلا This world is not thereofre a *nisti-ye-hest-numay* (as the mystic 'Azizuddin Nasafi puts it) but a serious plurality of things created by God to be studied experimentally and utilized by man, his Khalifah on earth.

History shows (it would be enough to mention al-Biruni and the great Muslim thinker Ibn Rushd from both the farthest corners of the Medieval

Message

From

UNIVERSITY OF HAWAII

Asian Studies Program

October 12, 1972.

Dear Professor Brelvi:

It is with the deepest regret that we are unable to accept the invitation by your College to attend the Centenary Congress of Orientalists. The The delay in answering your kind and thoughtful invitation, sent to our Chancellor, is occasioned by some extended efforts to secure the necessary combinatios of personnel and funds. Although we cannot attend, we do note with admiration the contributions your College has made to Oriental Studies and that the Congress seems well-planned.

Salutations to you on this occasion.

Yours sincerely,
D.W.Y. KWOK
Director

sabbatical leave in 1974-75 in Pakistan. Hence there will be a time when we shall meet in person—in the future, unfortunately, but nevertheless a genuine possibility.

Please let me reiterate my sincere gratitude to you for the kind invitation to attend the celebrations. In addition, I am most touched that you feel my participation is worthy of your going to the University of the Punjab and the Government of Pakistan to see if they could provide me with funds. This is a truly generous gesture on your part and I appreciate it deeply. However, I do not feel that it would be right for me to accept this kind offer, however, tentative. I am a *nau-ciz* in the field of South Asian Studies, in spite of my teaching position and my editorship. Such funds, if available, should be spent on getting other bigger names who are unable to come on their own. But let me say once again: I do appreciate your thoughtfulness.

Will there be any sort of publication to come out of this celebration? If so, I shall be most grateful to receive a copy of it, together with the various programs, etc., etc. which might be passed out to participants.

I shall be looking forward to hearing from you regarding the arrival of my papers and your reactions to them. In the meantime, I wish you and the participations the best of success in this undertaking.

With warm regard,

DR. CARLO COPPOLA
Assistant Professor of Hindi-Urdu and Linguistics,
Editor, *Mahfil, A Quarterly of South Asian Literature.*

Message

From

Dr. Carlo Coppola
OAKLAND UNIVERSITY
Rochester, Michigan 48063

My dear Dr. Brelvi,

It is with considerable disappointment that I must inform you that my request for funds to attend the centennial celebratings for the founding of Oriental College has been turned down and as a result, I shall not be able to attend as I had hoped to do. I am truly sorry, as is my university: however, it's simply a matter of money, and there is none for such international travel. I have, however, been given a small stipend in order to send you a dozen copies of my two papers, I have completed them both and they are ready to be reproduced and mailed via air to you. I shall be sending you back issues of Journal *Mahfils*, together with some covers of other issues. I hope that if there is a book display of any sort, you will display the journal with any other publications involved. My one paper runs about 54 pages (with footnotes) and the other runs about 20 pages; it will be rather expensive to reproduce these and to send them airmail. I mention this only because I do not want to leave the impression that my university was not solidly behind my participation in the conference. They were certainly anxious to have me go, but circumstances prevent this. Hence, as a sort of compensation, they are anxious that I sent these papers to you.

I myself would be very interested in any response to the paper I have done on the Progressive Movement. Especially any comments you would care to make on it. I have written both the papers in English, since it will be the via medium. If I had had more time, I would have done them in Urdu (with the able assistance of Dr Munib ur Rahman).

The fact that there are people in Lahore who would like to meet with me is very heartening. I am most pleased. I shall be most delighted to hear from any of them. In addition, it is my hope that I shall spend my

Message

From

UNIVERSITY OF PENNSYLVANIA
PHILADELPHIA 19104

November 7, 1972

Dear Principal Brelvi,

I regret that the University of Pennsylvania is unable to send a delegate to the International Congress of Orientalists to be held at Punjab University Oriental College on the occasion of its Centenary Celebrations.

I would like to congratulate the College on its illustrious past, and express every good wish for the future.

Sincerely yours,
D.J.O. 'KANE
Acting Dean

Message

From

PROFESSOR ANNEMARIE SCHIMMEL

December 2, 1972

Dear Professor Brelvi,

Thank you very much for your letter of November 20. I am sorry to learn that no German scholar will attend the meeting, but as I told you, the days immediately before Christmas are the worst time for all the European scholars.

As to me, I have to add another reason for not coming. My mother is seriously ill, and I cannot leave her alone for the time being. Dr. Weischer conveyed your message to me on the phone, he was very sorry that he was unable to attend.

I hope you have got someone from Harvard—Cantwell Smith would be very suitable, of course.

If I had a paper ready I would not hesitate to send it for the conference, but unfortunately, I am so caught in two voluminous book-projects that nothing is ready at the moment.

Yet, I hope that inspite of some external impediments your celebration will be a great success, and I send you my very best wishes and kind regards, together with greetings to all the colleagues who have the good fortune of attending your function.

Sincerely yours,
ANNEMARIE SCHIMMEL
Harvard University

Message

From

HARVARD UNIVERSITY
CENTRE FOR MIDDLE EASTERN STUDIES
1737 CAMBRIDGE STREET
CAMBRIDGE, MASSACHUSETTS 02138

It makes me very happy to express the best wishes for Oriental College Lahore on behalf of the Chair of Indo-Muslim Culture in the Department of Near Eastern Languages and Literatures at Harvard University.

We all are aware of the great importance of Oriental College for the study of Islamic languages, literatures, and civilisation. A sound tradition of scholarship has been maintained through a whole century, and we hope and wish that this tradition will be maintained throughout the centuries to come. Oriental College has always been a home for truly scholarly work, and the names of the great masters of Islamic Studies which have built up this tradition—like Sir Thomas Arnold—and those who have broadened and deepened it—like Professor Shafi, Dr. Iqbal—will always remain honoured among the orientalists in East and West.

I deeply regret that I shall not be able to join the group of scholars who will gather in Lahore for the celebration of this great and important event; but my very best wishes for all the participants as well as for the happy continuation of the College's work in the years to come will be with you.

With every good wish for the future of Oriental College.

ANNEMARIE SCHIMMEL
Professor of Indo-Muslim Culture
Harvard University, Mass.

Message

From

Professor W. C. Smith

CENTER FOR THE STUDY OF WORLD RELIGIONS
HARVARD UNIVERSITY

December 9, 1972

Dear Dr. Ebadat Brelvi,

It is a matter of delight to me to learn that Oriental College is celebrating its Centenary this month with a Congress devoted to Oriental learning ; a matter of pride that I should have been among those invited ; and a matter of deep personal regret that it has not proven possible for me to come to Lahore to take part. My affection for Lahore, my respect for Oriental College and my nostalgia for my personal links with each of them, make me ardently wish that it were possible for me to be present. Such an opportunity to re-establish my contacts with old friends in Pakistan would have been particularly welcome.

The many facetra and impressive work for which the College has long been renowned is an inspiration to us all. May the coming century carry forward the great tradition that you inherit. I wish you and the College extremely well the celebrations ; and I shall be gratified if you would kindly convey my warm personal regards to my many friends who will be present.

WILFRED Cantwell SMITH
Professor of World Religions
and Director
Harvard University (U.S.A.).

Message

From

UNIVERSITY OF TORONTO
DEPARTMENT OF ISLAMIC STUDIES
TORONTO 181, CANADA

November 30, 1973.

Dear Dr. Brelvi,

On behalf of my colleagues, I would like to extend to you our warmest good wishes on the occasion of the Centenary of University Oriental College.

Yours sincerely,
R. M. SAVORY,
Chairman,

Message

From

UNIVERSITY OF TORONTO

September 27, 1972

Dear Dr. Brelvi,

Dr. John R. Evans, the new President of the University of Toronto has asked me to express his regrets that the University of Toronto will not be able to send scholar delegates to the celebration of the Centenary of University Oriental College.

Dr. Evans and his colleagues here congratulate you on your achievements and wish you well.

J.H. SWORD,
Vice-President,
Institutional Relations & Planning.

Message

From

UNIVERSITY OF OTTAWA

October 24, 1972.

Dear Professor Brelvi,

Thank you very much for your kind invitation to attend the Centenary of the University Oriental College from December 18th to the 23rd.

Unfortunately, it will be impossible for the University of Ottawa to be represented at this Congress week.

However, I take pleasure in extending the very best wishes of the University of Ottawa on this memorable occasion.

Yours sincerely,
(ROGER GUINDON, O.M.I.)
Rector.

Message

From

PROFESSOR CHARLES ADAMS

McGILL UNIVERSITY

MONTREAL

INSTITUTE OF ISLAMIC STUDIES

March 2, 1973.

Dear Dr. Brelvi,

I am in receipt of your letter dated February 20, 1973 your reference 70, 30/G-31/O.C., in which you invite me to take part in the International Congress of Orientalists to celebrate the centenary of the Punjab University Oriental College. I am very grateful to you for thinking of me in connection with these celebrations since I have something of a personal association with the Oriental College and much nostalgia for the city of Lahore which is a kind of second home to me. I fear, however, that I shall not be able to take part. Your letter arrived on my desk only ten days before the celebrations are to begin. Even if I could somehow make arrangements for another person to take over my duties here in the University, the sheer physical arrangements for travelling to Lahore would be impossible on this short notice. I am very sorry to miss, what I am sure will be a splendid occasion, but under the circumstances I can only offer you my best wishes for the success of the congress and assure you of my regrets that I will not be there.

Sincerely,

CHARLES J. ADAMS
Director,
Institute of Islamic Studies

Message

From

THE QUEEN'S UNIVERSITY
BELFAST, NORTHERN IRELAND

9th October, 1972.

Dear Principal Brelvi,

Thank you very much for your letter of 16 September inviting this University to send a representative to the centenary celebrations of your College in December 1972. I am sorry to say that we have not got on the staff a suitable Orientalist who would be able to attend.

I should like, however, to thank you for your kind invitation and to send many good wishes for the occasion.

Yours sincerely,
F. ARTHUR VICE. O.B.E., Ph. D.
The Vice-Chancellor

Message

From

PROFESSOR J.N.D. NORMAN ANDERSON
UNIVERSITY OF LONDON
INSTITUTE OF ADVANCED LEGAL STUDIES
25 RUSSELL SQUARE, LONDON, WC1
ENGLAND

23rd October, 1972.

Dear Dr. Brelvi,

I returned to my office this morning after a visit to North America to find your letter No. 601/Gr-31/O.C., of the 14 (or 16th) September awaiting me. So I write at once to congratulate you on the centenary of your College which you hope to celebrate in December.

I should, of course, have been deligated to have attended this ceremony and participated in your celebrations ; but I am afraid it is quite impossible for me to get away from London again so soon, and at such short notice. I am so sorry.

With best wishes,

Yours sincerely,
PROF. J.N.D. NORMAN ANDERSON
Director

Message

From

UNIVERSITY OF GLASGOW

4th October, 1972.

Dear Principal Brelvi,

I have been asked by the Principal of the University, Sir, Charles Wilson, to reply to your letter of 14th September, in which you invite us to send representatives to the centenary celebrations of your College.

I regret that we are unable to send anybody to participate in these celebrations, but we send you our good wishes and hope that you will have a very successful meeting with stimulating research papers from those taking part. Your College has played an important part in the field of oriental studies and we hope that it will continue to do so.

Yours sincerely,
PROF. R.A. RANKIN, M.A., Sc.D.,
Clerk of Senate

Message

From

PROFESSOR J.A. BOYLE
UNIVERSITY OF MANCHESTER

On the occasion of the centenary celebrations of the Oriental College I should like to convey my sincere congratulations to everyone concerned with teaching and research at that famous institute.

Many scholars have played their part in the achievements of the past 100 years. However the recent commemoration of the 650th anniversary of the death of the Iranian statesman and historian Rashid al-Din prompts me to single out for special mention that great savant, the late Principal of *the College, Maulavi Mohammad Shafi, one of whose innumerable services* to Oriental learning was his edition of Rashid's correspondence, which, coupled with the historian's recently discovered *Vaqf-Namh*, will provide the material for a whole new generation of researchers into the social and economic history of Iran.

May the second century of the College's existence be as fruitful in scholarship as the first ;

PROF. J.A. BOYLE
Deptt. of Persian Studies
University of Manchester
London (U.K.).

Message

From

PROFESSOR R. B. SERGEANT
UNIVERSITY OF CAMBRIDGE
MIDDLE EAST CENTRE

23rd October, 1972

Dear Professor Brelvi,

Thank you for the honour of your invitation to attend the Centenary of the Oriental College in December next. This I should naturally very much like to do, but unfortunately as I was abroad for most of the summer I can hardly ask the University for another grant so soon to come to Lahore. May I however take the opportunity both of thanking you for your preferred hospitality and of wishing you a pleasant and successful Centenary Congress.

With kindest regards,

Yours sincerely,
R. B. SERGEANT
Director

Message

From

UNIVERSITY OF CAMBRIDGE

To

UNIVERSITY OF THE PANJAB

We, the Chancellor, Masters and Scholars of the University of Cambridge, are honoured to be represented at the centenary celebration of the Oriental College of the University of the Punjab. Having in mind the close links which our University has long had with Pakistan, it gives us special pleasure to send, through our delegate Rafi Muhamad Chaudhri, Doctor of Philosophy and a member of Fitzwilliam College, Fellow of the Pakistan Academy of Sciences and Honorary Professor of Physics in the University of the Punjab, our greetings on this auspicious occasion.

Message

From

UNIVERSITY OF OXFORD

10th November 1972.

The University of Oxford is happy to be represented at the centenary celebrations of University Oriental College in Lahore from 12 to 17 March, 1973, by Professor Siraj ud Din, formerly a member of Exeter College, and Master of Arts and Bachelor of Letters of the University.

Through Professor Siraj ud Din, the Chancellor, Masters and Scholars of the University of Oxford send their congratulations and cordial good wishes to the Principal, Members of the Faculty and Students of the University Oriental College at Lahore, on this historic occasion.

Yours sincerely,
GEOFFREY CASTON
Registrar

Message

From

PROFESSOR C.H. PHILIPS, DIRECTOR
SCHOOL OF ORIENTAL AND AFRICAN STUDIES
UNIVERSITY OF LONDON
MALET STREET, LONDON,
W. C. IE 7 HP

30 November 1972

On behalf of my colleagues here, I send greetings to you on the auspicious occasion of the centenary of the University Oriental College which has done so much to promote the advancement of Oriental learnin over the years. We trust that the College will go from strength to strengt in the years to come.

It is fitting that part of the College's celebrations should take the form of an International Congress of Orientalists, and I should like to take thi opportunity of wishing the Congress every success. I am sorry that cannot be with you.

C.H. PHILIPS
Director

Message

From

THE PRESIDENT OF PAKISTAN

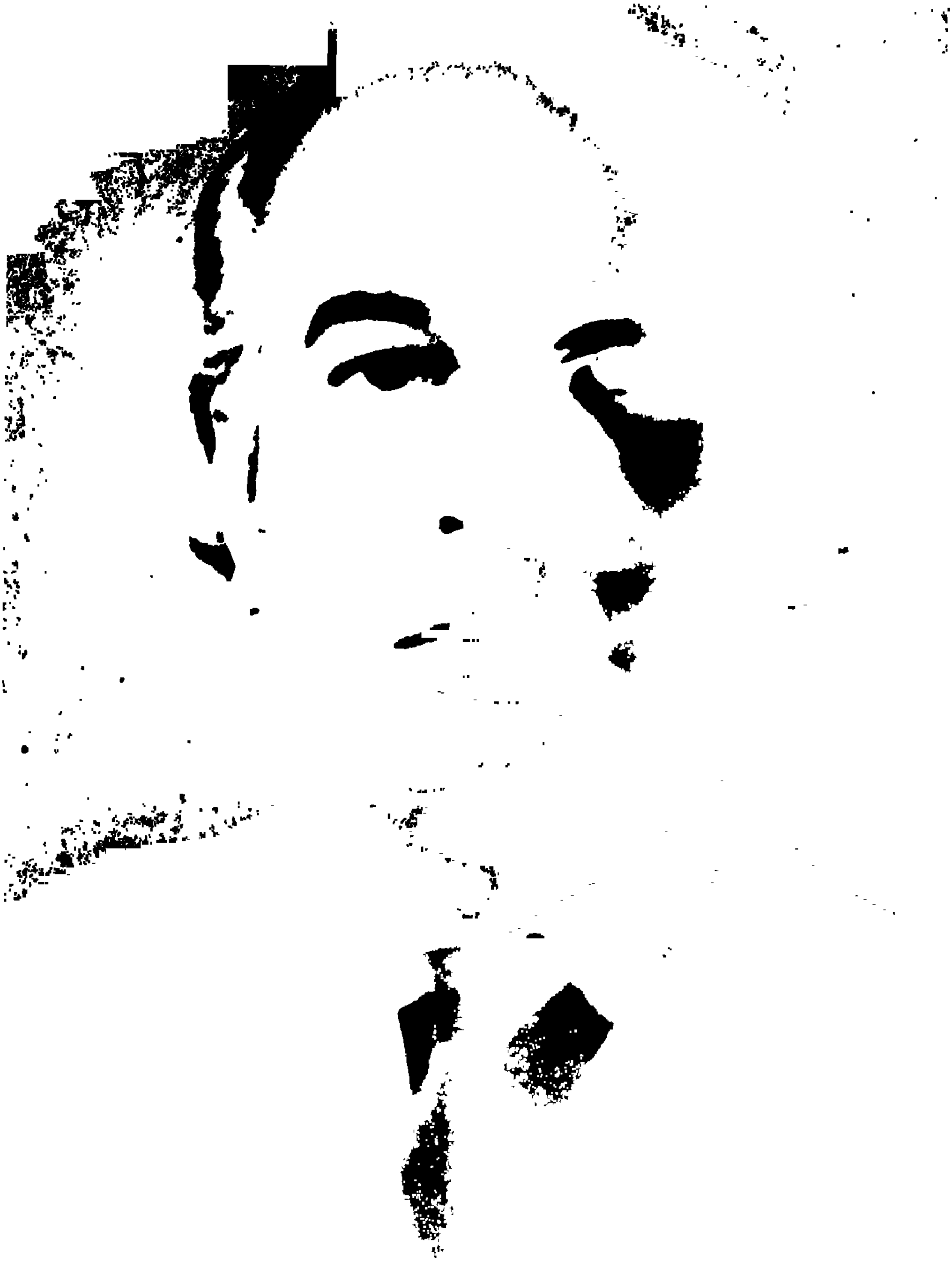
I have learnt with pleasure that University Oriental College, Lahore, University of the Punjab, is celebrating its Centenary on 12th March, 1973 and that an International Conference of Orientalists is also being held on the occasion.

This College is the oldest institution of Oriental languages and studies in this part of the world. It can also rightly be described as the confluence of the Orient and the Occident. A galaxy of scholars like G. W. Leintner Dr. Stratton, Dr. Woolner, Maulana Muhammad Hussain Azad, Maulana Faizul Hassan, Allama Iqbal and Dr. Shafi, to name only a few, have been associated with this institution and they did pioneering research in the languages of the South East Asian sub-continent and Central Asia, and their contributions have been internationally recognised.

The new Education Policy of Pakistan lays due emphasis on the teaching of Pakistani languages and studies of contemporary societies. I have no doubt that the Oriental College will continue to play even a greater role in the Educational and Cultural Development of Pakistan in the days to come.

I wish the College, its staff and distinguished scholars, who are attending the International Congress of Orientalists, the best of success in their deliberations.

ZULFIKAR ALI BHUTTO
President
Islamic Republic of Pakistan



جناب ذوالفقار علی بھٹو، صدر پاکستان

MESSAGES

during the Congress are included in this report to give a vivid picture of the Centenary.

I am extremely grateful to the President (Now Prime Minister of Pakistan) Mr. Zulfikar Ali Bhutto for having shown interest in the College Centenary. He, very graciously, sent a valuable message for the occasion which is being published in this volume. I must also thank the Federal Government of Pakistan, the Punjab Government and the University of the Punjab for their kind co-operation in connection with the Centenary celebrations. I owe deep thanks to Maulana Kausar Niazi, Minister of Auqaf, who despite the National Assembly Session, attended the Centenary at my request and delivered a fine address. Mr. Faiz Ahmad Faiz should also be thanked for sparing a few hours to preside over a session. Dr. Muhammad Ajmal, Vice-Chancellor (Now Secretary Education, Government of Pakistan), Dr. Justice S.A. Rahman and the late Professor Khwaja Salahuddin guided me, co-operated and contributed greatly to the success of the Congress. They deserve deep thanks. I am also thankful to His Excellency the Ambassador of Iran in Pakistan, Aqai Manuchehre-Zelli, who at my request, came to Lahore from Islamabad and presided over the session of the Congress pertaining to Persian language and literature

Thanks are also due to my colleagues who actively co-operated with me in organizing the Centenary Celebrations and in compiling and editing of these proceedings. Chief among them are Dr. Rana Ehsan Elahie, Syed Vazirul Hasan Abidi, Dr. Mian Bashir Hussain, Dr. S. Nazir Hasan Zaidi, Syed Sajjad Baqir Rizvi, Dr. Obaid Ullah Khan, Dr. Tabassum Kashmiri, and Mr. Sohail Ahmad Khan who have, at my request, translated certain articles and gone through the proofs of the composed material.

Ebadat Brelvi
Principal,
University Oriental College, Lahore.

Preface

We thank Almighty God for having successfully celebrated the Oriental College Centenary. The Congress of the Orientalists, organized on this occasion, was successful beyond our expectation. It was attended by the representatives of almost all important Universities and Research Centres of the world, which in itself is a complement to our great institution. The delegates who attended the Congress were either subscribed by their respective Governments, or given grants by their Universities. We are thankful to the respective Governments, Universities and Research Institutes for their co-operation with the Oriental College. The institutions which could not be represented, sent their goodwill messages. The delegates who attended, contributed learned papers in the Congress. We, on this occasion, offer our heartful thanks to all of them.

The Oriental College Centenary Celebrations and the Congress of the Orientalists continued from March 12, 1973 to March 17, 1973. The different sessions were held daily from 9 a.m. in the morning to 5 p.m. in the evening. Renowned scholars contributed their learned papers before enormous audience. The Senate Hall of the University was always packed to capacity. The patience and attention of the audience were remarkable. There used to be pin-drop silence, and except the voice of the speaker no other sound could be heard. We owe the success to Almighty Allah to whom all thanks are due. I have been a witness to a number of important Conferences of the Orientalists, during my stay in London, but never had the opportunity to see such a large gathering in any of them. Neither could I find such an atmosphere as was created in various sessions of the Conference of our Centenary Celebrations.

We have the pleasure to present here full report of all that happened in the Congress. The Programme we set, the addresses given by important personalities, the papers read in different sessions, all have been collected here. It includes a reportage which gives a vivid picture of all that happened during these celebrations. Many of the photographs taken

PREFACE

Sixth Session

Resolutions

A List of Photographs

Second Session

Symposium (Academic Services of the Oriental College) :

Third Session

Arabic and Islamic Learning :

Fourth Session

Persian Language, Literature and Iranian Studies :

Fifth Session

Urdu Language, Literature, History and Culture of the Muslims of Indo-Pakistan Sub-Continent :

CONTENTS

Editorial Board

Vol. 50 : Nos. 1, 2, 3, 4 1974 Serial Nos. 196, 197, 198, 199

ORIENTAL COLLEGE MAGAZINE

CENTENARY NUMBER
CONTAINING
PROCEEDINGS AND RESEARCH PAPERS OF THE
INTERNATIONAL CONGRESS OF ORIENTALISTS
MARCH 1973

Editor
DR. EBADAT BRELVI
Principal
University Oriental College, Lahore

UNIVERSITY ORIENTAL COLLEGE
LAHORE